مجلسِ علمیہ طیلسانینِ عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد دکن

جلد اول
جنوری ۱۹۳۷ء

نمبر ۱
بہمن ۱۳۴۶ف

مجلس علمیہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ

بازار گھانسی

حیدرآباد دکن

مجلس ادارت

منتظم اعزازی

مجلۂ طیلسانین

فہرست مضامین

جلد اول	جنوری سنہ ۱۹۳۷ء م بہمن سنہ ۱۳۴۶ف	نمبر ۱

سید مہدی حسین (عثمانیہ) منتظم اعزازی

نے

"زندہ طلسمات فائن آرٹ پرنٹنگ پریس" میں چھپواکر دفتر مجلہ طیلسانیین بازار گھانسی حیدرآباد دکن سے شایع کیا۔

اداریہ

یہ مجلہ طیلسانین عثمانیہ کا ترجمان ہے۔ اس میں انہیں کے حالات و خیالات ہر تیسرے ماہ پیش کئے جائیں گے۔ اس کی اشاعت میں بڑی دقتیں پیش آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج سے کئی سال پیشتر شایع ہونے کی جگہ یہ اس قدر تعویق سے جاری ہو رہا ہے۔ سرکار سے مجلہ کی اشاعت کی اجازت حاصل کرنی اور دوسری مشکلات سد راہ تھیں۔ بحمد اللہ اب یہ دونوں منزلیں طے ہو چکی ہیں اور توقع ہے کہ یہ دیر سے آنے والا ہر طرح سے درست ثابت ہوگا اور ملک کی توقعات جو اس سے وابستہ ہیں خاطر خواہ پوری ہوں گی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے اگرچہ ایک ایسی عظیم الشان جامعہ کے شایان شان تعداد میں طیلسانین نہیں نکلے، لیکن یہ ملک کی خوش قسمتی ہے کہ جامعہ نے کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور دیا اور اگرچہ کہ حقیقی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن جتنے بھی سپوت ہر سال اس جامعہ سے سندیں حاصل کر کے نکلتے ہیں ان میں ایک کافی تعداد ایسے طیلسانیوں کی ہوتی ہے جو اپنے اپنے عرصۂ عمل میں برابر سرگرم کار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی و ادبی کارنامے ماہرین کی نظروں میں قابل قدر قرار پاتے ہیں۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی ہر سالانہ کانفرنس میں فرزندان جامعہ عثمانیہ کی علمی و ادبی فتوحات کی نمائش کی جاتی ہے۔ جو کوئی اس نمائش کو دیکھ کر باہر نکلتا ہے اس پر ملک کے نونہالوں کے کارناموں کا ایک خوش آئند اثر مرتب ہوتا ہے۔ سائنس، ریاضی، فلسفہ، طب، انجینیری، تاریخ، تنقید، شعر و سخن، افسانے اور ڈرامے غرض علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں طیلسانیوں کی اس مختصر سی جماعت نے اپنی ذہنی کاوشوں سے اضافہ نہ کیا ہو اور خوشی کی بات تو یہ ہے کہ بعض اصحاب نے اپنے اپنے موضوع سے متعلق اجتہادی شان حاصل کر لی ہے۔

انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کانفرنسوں کی ان علمی نمایشوں کی سیر کرنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کے بعض علمی کارنامے ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے کیونکہ ہر نمایش میں بعض قلمی مسودات بھی اُن کی نظر سے گذرتے ہیں اور یہ صرف نمونتاً زیر دارے ہیں۔ جملہ طیلسانئین عثمانیہ کو ایسے ذرائع حاصل نہیں ہیں کہ وہ اپنی تصنیفات و تالیفات و تراجم یا مقالوں یا مضامین کو شایع کرکے منظر عام پر لاسکیں۔ افسوس ہے کہ ملک میں باوجود ہمہ جہتی ترقی کے ایسے اشاعت خانے اب تک قائم نہ ہو سکے جو علمی و ادبی کتابوں کو شایع کرتے یا ایک طرف تو مصنفین و مولفین کی امداد کرتے اور دوسری طرف اُردو ادبیات کے خزانے کو مالا مال کر سکتے۔

ان حالات کے پیش نظر ضروری تھا کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جاتا جو جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتا اور اس ادارے کا انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہی سے متعلق ہونا مناسب بھی تھا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس انجمن کے کارکنوں کو شروع ہی سے اس کا احساس رہا اور انھوں نے ایک مجلس علمیہ بنا کر یہ کام اس کے تفویض کر دیا۔

مجلس علمیہ گذشتہ دو تین سال سے طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی کارناموں کے تحفظ و اشاعت کے متعلق غور و خوض اور عملی تدابیر میں مصروف ہے۔ اس نے اپنی برادری کی علمی تصنیفات کی نشر و اشاعت کے کام کا آغاز اس مجلہ کی اجرائی سے کیا ہے۔ اس مجلہ میں طیلسانئین کے لکھے ہوئے علمی و ادبی مضامین اور شعر و سخن کے نمونوں کے علاوہ فی الحال اُن مقالوں کو بھی بالاقساط شایع کیا جا رہا ہے جن کو ام اے و ام ایس سی وغیرہ کے امتحانوں کے لیے طیلسانئین عثمانیہ نے قلمبند کیا تھا اور جن کو ممتحنوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور لکھنے والوں کو امتحان میں کامیاب قرار دیا۔ ان میں سے اکثر مقالے اپنی تحقیقات کا نتیجہ اور ضروری معلومات کے حامل ہیں۔ ان کی اشاعت سے علم و فضل و معلومات اور ادبیات اُردو میں معتد بہ اضافہ ہوگا۔

مجلس علمیہ نے یہ التزام کیا ہے کہ مجلے میں شایع کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقالوں کو کتابی صورتوں میں بھی شایع کر دیا جائے۔ چنانچہ جہاں کسی مقالے کی جملہ اقساط اس مجلہ میں چھپ جائیں گی اس کے ساتھ ہی وہ مقالہ کتابی صورت میں بھی عوام کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح سے توقع ہے کہ چند سال میں طیلسانئین عثمانیہ کے

جملہ بلند پایہ مقالے جو اس وقت اہل ذوق کی نظروں سے پوشیدہ ہیں منظر عام پر آجائیں گے۔

جملہ طیلسانئین میں اس امر کا بھی لحاظ رکھا جائے گا کہ اُردو کی اعلیٰ درجے کی جملہ مطبوعات پر مستند اور معیاری تنقیدیں طیلسانئین ہی سے لکھوائی جائیں کیونکہ آج خدا کے فضل سے طیلسانیوں کی برادری میں ہر علم و فن کے ماہر افراد موجود ہیں اور یہ تنقیدیں جہاں اُن کی علمی و فنی معلومات کی آئینہ دار ہوں گی اُردو زبان و ادب کے رجحانات اور جدید ترین ضروریات کی مشیر و رہنما بھی ثابت ہوں گی۔

اہل ذوق نوجوانوں اور پُر خلوص کارکنوں کی اُردو زبان کو عہد حاضر میں جید ضرورت ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر جامعہ عثمانیہ کے سپوت اپنی زبان کی خدمت گذاری میں دوسروں سے پیش پیش ثابت ہوں اُن کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ اُردو زبان کے تحفظ و استحکام کے لیے ہر طرح کے ایثار کو گوارا کریں عہد حاضہ میں اُردو زبان کی کشتی ایک تلاطم خیز سمندر میں ڈگمگا رہی ہے ضرورت ہے کہ اس کی ناخدائی کے لیے ایسے ہی تازہ دم اور مستقد نوجوان آگے بڑھیں۔ ہندوستان کی کوئی اور جامعہ اپنے فرزندوں سے اُردو زبان کی امداد اور تحفظ کے لیے اس طرح توقع نہیں رکھ سکتی جس طرح جامعہ عثمانیہ کی توقعات اس کے سپوتوں سے وابستہ ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ اُردو زبان و ادب کے خدمت گذار ہر سال کم ہوتے جارہے ہیں اور افسوس اس کا ہے کہ اُن کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے اس سال منشی پریم چند، حضرت اصغر گونڈوی، نورالحسن نیر جیسے قدردانان اُردو نے دنیا سے منہ موڑ لیا ان میں سے ہر ایک اُردو زبان و ادب کی خدمت میں منہمک تھا۔ اُردو ادب کی عجیب بدبختی ہے کہ طیلسانئین عثمانیہ کی برادری میں سے بھی ایک نوجوان خدمت گذار اُردو مولوی شیخ چاند صاحب ام اے ال ال بی' ریسرچ اسکالر مصنف ملک عنبر' ایکناتھ و مرزا رفیع سودا (حیات و کلام پر تبصرہ) نے بھی بے وقت انتقال کیا۔ وہ اگرچہ نوجوان تھے لیکن محنت و ریاضت اور اُردو کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہوگئے تھے کثرت کار نے اُن کے تنومند قویٰ کو ایسا مضمحل کر دیا تھا کہ وقت سے پہلے وہ موت کے آہنی پنجے کا شکار ہوگئے۔ مرحوم نے انجمن ترقی اُردو کی بڑی تندہی سے خدمات انجام دیں اُردو شاعروں کے جملہ تذکرے اور قدیم اُردو کتابیں وغیرہ جو گذشتہ چند سال سے انجمن نے شایع کیں ان سب کی ترتیب و تہذیب و فراہمی مواد وغیرہ میں مرحوم نے جو زحمتیں اُٹھائی ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انجمن کی لغتوں کے کام میں بھی انھوں نے جانکاہ حصہ لیا ہے روزانہ مسلسل چھ چھ گھنٹے وہ مختلف مترجمین کے

پاس سے آئے ہوئے مسودوں کی ترتیب اور اُن کو مطبع میں جانے کے قابل بنانے اور پروفوں کے دیکھنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو قدیم اُردو کتابیں جمع کرنے اور دور دراز دیہات اور مقامات میں سفر کرکے کتابیں حاصل کرنے میں بھی شیخ چاند مرحوم سے زیادہ کسی اور نے مدد نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ان تمام نایاب اور بیش بہا قلمی نسخوں کی بسیط فہرستیں بھی مرتب کرلی تھیں۔ افسوس ہے کہ وہ اپنے کام کو پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکے۔ انھوں نے رسالہ اُردو میں جو تحقیقی مضامین اور اُردو کی مطبوعات پر تنقیدیں لکھی ہیں وہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ اگرچہ وہ اُردو زبان و ادب پر کام کرنے والوں میں سب سے کم عمر تھے لیکن کثرت مطالعہ اور اُردو ادب کے سچے ذوق نے اُن کے نقطہ نظر اور معلومات کو بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں سے زیادہ سنجیدہ اور وقیع بنا دیا تھا۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں انھوں نے اُردو زبان اور ادب پر کافی دسترس حاصل کرلی تھی اور کام کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کرلی تھی کہ اگر وہ زندہ رہتے تو مولوی صاحب کے سچے جانشین اور اُردو زبان کے مخلص خدمتگذار ثابت ہوتے۔ اس جواں مرگ کی موت سے مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ ساتھ جملہ طیلسانیین عثمانیہ کو سخت صدمہ پہنچا۔

طیلسانیین عثمانیہ ایک اور ہستی کی وفات سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور یہ ہستی اگرچہ عمر کے لحاظ سے جوان نہیں تھی لیکن کام کرنے کے ولولوں اور ہمت کے نقطۂ نظر سے نوجوانوں سے زیادہ قابل قدر تھی، یہ مسٹر میکنزی نائب معین امیر جامعہ ہیں جن کی وفات نے جامعہ کے جملہ بہی خواہوں کو مایوس کر دیا۔ اس قلیل عرصے میں جامعہ کی خدمت کے لیے آنجہانی نے جس طرح سے کام کا آغاز کیا تھا وہ ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی ذات سے جامعہ عثمانیہ پوری طرح بہرہ مند ہوتی۔ طیلسانیین عثمانیہ آئندہ ان صدموں کو بھلا نہ سکتے اگر نواب مہدی یار جنگ بہادر جیسی علم دوست اور پُر خلوص ہستی اُن کی کاربراری اور رہ نمائی کے لیے موجود نہ ہوتی۔

نواب مہدی یار جنگ بہادر ایک عالم و فاضل اور محسن اُردو "بابا" کے قابل فخر فرزند ہیں۔ انھیں علم و فضل کا ذوق ورثہ میں ملا ہے اور اب یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ اُردو زبان و ادب کی دلچسپی اور امداد کے لحاظ سے بھی وہ اپنے والد کے سچے جانشین ہیں۔ جامعہ اور طیلسانیین کے مفاد کو ہر وقت ترجیح دیتے رہتے ہیں۔ طلبا دوستی میں حیدرآباد میں آج اُن کی نظیر نہیں معلوم ہوتا ہے کہ طالب علموں سے ملنے میں انھیں دلی مسرت ہوتی ہے اور علم دوستوں کی ملاقات کے لیے وہ اپنے مصروف اوقات میں سے

کچھ نہ کچھ حصہ ضرور نکال لیتے ہیں۔ ہم اس کو جامعہ عثمانیہ اور ملک کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تعلیمات اور جامعہ کی وزارت سے سرفراز کیا گیا۔ نواب صاحب کو اُردو سے اس قدر دلچسپی ہے کہ باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اُردو کانفرنس کی شرکت کے لیے علیگڈھ جانے کا موقع نکال لیا اور وہاں ہر اجلاس میں خاص طور پر دلچسپی لی اور آخری اجلاس کی صدارت بھی فرمائی اس میں آپ نے اُردو زبان کے متعلق بصیرت افروز خطبہ ارشاد کیا جو اس کانفرنس کی مطبوعہ رپورٹ میں شایع ہو چکا ہے۔ یہ سب امور ظاہر کرتے ہیں کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر سے بہتر معین اور امیر جامعہ ہم کو نہیں مل سکتا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ آپ اپنی جامعہ کے ذریعہ تعلیم یعنی زبان اُردو کے استحکام اور فرزندان جامعہ کی اُردو خدمتگزاریوں کی قدر افزائی فرماتے رہیں گے۔

اس سلسلہ میں علیگڈھ کی اُردو کانفرنس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے گذشتہ دس سال کے عرصہ میں اُردو زبان کی خدمت میں قابل قدر حصہ لیا ہے اور اب ضرورت تھی کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کرکے اُردو کے تحفظ و استحکام کے لیے بھی تیار ہو جائے۔ گذشتہ چند سال میں ہندوستان کی سیاسی فضا بہت کچھ بدل چکی ہے۔ برادران وطن جو پہلے باہمی اتحاد و اتفاق کا پرچار کیا کرتے تھے اور اسی لیے باہمی اختلافات اور تفرقوں کو دُور کرنے کی خاطر ہندوستانی کو تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دیا تھا اب ہندی کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور اُردو کی مخالفت میں کسی پاس و مروت کا لحاظ رکھے بغیر سرگرم کار ہیں۔ ایسی صورت میں انجمن ترقی اُردو جیسے منظم اور مستعد ادارہ کا اہم فریضہ ہے کہ وہ تمام ہندوستان میں اپنی شاخیں پھیلائے اور ایک مرکزی مقام سے اُردو کی تحفظ و اشاعت اور تبلیغ کا کام شروع کرے۔ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا کہ شعرا و مصنفین اپنے اپنے کنج خمول میں بیٹھے ہوئے خیالی اور مصنوعی شعر و سخن اور تصنیفات سے جی بہلائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ میدانوں میں نکل کر اُردو بولنے والوں کے احساسات کو گرمائیں تاکہ ان کی کوششوں سے تمام اُردو دنیا میں اپنی زبان کی حفاظت و استحکام کا خیال برقی رو کی طرح دوڑ جائے۔

اس ضرورت کے پیش نظر مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اُردو کے مستعد معتمد نے اکتوبر ۲۴، ۲۵ ؍ ۱۹۳۶ء کی تاریخوں میں علیگڈھ میں ایک کانفرنس منعقد کی جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے اُردو زبان و ادبیات کے متعدد ماہرین جمع ہوئے تھے، پہلے اجلاس میں کانفرنس نے ایک مجلس مشاورت بھی مقرر کر دی تھی جس نے

بعد غور و خوض حسب ذیل کمیٹیاں بنائی اور اُن کے اراکین کا انتخاب کیا۔ (۱) اصلاح زبان کی کمیٹی (۲) ادبی کمیٹی۔ (۳) اشاعت خانہ کمیٹی۔ اس کے علاوہ طے پایا کہ برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں اُردو کی اشاعت کے مرکز قائم کئے جائیں، چنانچہ ہر صوبہ میں اس قسم کے مرکز متعین کئے گئے۔

اسی اثناء میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے آل انڈیا اُردو کانفرنس کی ۶۸ صفحوں کی روئداد بھی شایع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن نے اپنے کام کو محض کانفرنس تک محدود نہیں رکھا، بلکہ وہ برابر سرگرم کار ہے۔ ضرورت ہے کہ متذکرۂ بالا کمیٹیوں کے اجلاس بھی جلد منعقد ہوں تاکہ بہت جلد عملی کام کا آغاز ہو سکے۔ اس قسم کے کاموں میں ہاتھ بٹانا طیلسانئین عثمانیہ پر بھی فرض ہے اور یقین ہے کہ اگر انھیں کام کا موقع دیا جائے تو وہ اپنی جملہ قوتوں کے ساتھ اس میں منہمک ہو جائیں گے۔

طیلسانئین جامعہ عثمانیہ کا ایک ضروری فریضہ اپنے ملک و مالک کی وفاداری اور خیر خواہی ہے۔ اور اس خصوص میں اس جامعہ کی خوش قسمتی قابل رشک ہے کیونکہ یہ بارہا ثابت ہو چکا ہے کہ اس کے سپوت اپنے ملک اور مالک کی بہبودی اور جاں نثاری کو ہر وقت اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

یہ اطلاع اُردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یقیناً موجب مسرت ہو گی کہ حیدر آباد کی مشہور درسگاہ سٹی کالج نے اُردوئے قدیم کے بڑے شاعر ولی اورنگ آبادی کا دو صد سالہ جشن یادگار منانے کا اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں بہ سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر دکنی تصنیفات اور تصاویر کی ایک بے نظیر نمائش بھی منعقد ہو گی۔ حیدر آباد کے بعض مشہور اور صاحب ذوق امیروں کے ذاتی کتب خانوں کی وہ نادر اور نایاب کتابیں اور تصویریں منظر عام پر آئیں گی جن کے آج تک نام ہی سُنے جاتے تھے۔ ہم جناب صدر صاحب سٹی کالج اور دیگر کارکنان جشن یوم ولی کو اس ادبی خدمت پر مخلصانہ مبارکباد دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ

افاداتِ فلسفہ

آخر یابد ہر کہ ز صد قش جوید — تخمے کہ بجا فتاد آخر روید

گویند کہ ہر کہ یافت حرفے نہ زند — نے نے غلط است ہر کہ یابد گوید (شاہ بدخشی)

ہیگل کا قول ہے کہ "جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادت گاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ و پیراستہ ہے لیکن جس میں قدس الاقداس ہی کا وجود نہیں۔" جس طرح ہر متمدن قوم کا ادب و فن ہوتا ہے، معاشرتی و مذہبی زندگی ہوتی ہے، اسی طرح اس کا فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ مشرق میں اپنشدوں اور مغرب میں فلاطون کے زمانے سے فلاسفہ کا یہ کام رہا ہے کہ نصب العینوں کی تشکیل کریں اور یہ بتلائیں کہ حیاتِ انسانی کے کن کن تجربات کو اہم یا مرکزی قرار دیا جائے اور اس طرح قوم کی رہبری کریں۔ فلسفہ زندگیوں کو بدلتا رہا ہے اسی معنی میں یہ تخلیقی ہے۔ "تہذیب یا تمدن عملی فلسفہ ہے۔"

کن افادات کی بنا پر فلسفہ کو یہ رتبہ حاصل رہا ہے؟ ان ہی کی مختصر تشریح اس وقت پیش کی جا رہی ہے ع

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی!

(۱) فلسفہ عملی ہے:- اول قدم پر عام یقین کے خلاف ہم یہ بتلائیں گے کہ فلسفہ عملی ہے۔ نوالس نے کہا تھا کہ "فلسفہ طبخِ نان کے کام کا نہیں لیکن وہ ہمیں خدا، آزادی اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے"۔ فلسفہ آپ سے مخاطبت کرتا ہے:

یک دم غمِ جاں بخور غمِ ناں تا کے — در پرورشِ ایں تنِ ناداں تا کے

اندر رہِ طبلِ شکم و نائے گلو — ایں رقصِ زنخ بضربِ دنداں تا کے (رومی)

تنِ ناداں کی پرورش میں ہمہ تن مصروف ہو کر آپ اس سے انکار کیجیے۔ شک کے جنوں میں خندہ زناں ہو کر پوچھیے کیا واقعی فلسفہ خدا، آزادی، حیات بعد الموت کا یقین دلاتا ہے؟ بس بس ع

درِ خود نگر و فضولی آغاز مکن

کیا فخر رازی نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ ؎

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

ہاں فلسفہ ہمیں ان چیزوں کا یقین عطا نہیں کرتا، جو چیزیں ہمیں آسانی سے ملتی ہیں ہم ان کی قدر بھی تو نہیں کرتے! فلسفہ طبخ نان کے کام کا نہیں، لیکن یہ ضرور طباخ کی زندگی میں نئے معنی پیدا کرتا ہے اور خود طبخ نان کو اہمیت بخشتا ہے۔ کوتاہ و تنگ نظرانہ افادی مقاصد، مادی منافع، فلسفہ کے محرک ہیں اور نہ کبھی رہے ہیں۔ تاہم گلبرٹ چیسٹرٹن کے اس قول میں ایک صداقت پنہاں ہے کہ "لینڈ لیڈی کے لیے جو کسی کرایہ دار کو اپنے مکان میں لینا چاہتی ہے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کرایہ دار کی آمدنی کیا ہے؟ لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ جاننا ہے کہ اس کا فلسفۂ حیات کیا ہے؟"

اگر انسان کی زندگی کے لیے صرف روٹی ہی ضروری اور کافی ہے، اگر رقص زنخ و ضرب دنداں ہی کو وہ مشغلۂ حیات سمجھتا ہے تو پھر وہ صاف طور پر بغیر شرم و حیا کے کیوں نہیں پوچھتا کہ شاعری اور موسیقی و گلہائے شاداب کا کیا عملی فائدہ ہے؟ ان سے وہ کیوں محظوظ ہوتا ہے؟ موجودہ تمدن کی تن آسانیوں کے باوجود انسان کا ذہن حیرت و محبت سے متہیج ہوتا ہے اور صداقت و جمال وغیرہ کا شیفتہ و فریفتہ ہے،" اور یہی فلسفہ کے اقدار ہیں۔

لیکن ذرا اس امر کی تحقیق تو کیجیے کہ ہم کسی چیز کو عملی کیوں کہتے ہیں اور کب کہتے ہیں؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہ عملی کہلاتی ہے؟ بلا شبہ ہم عملی کے معنی کو صرف روپیہ کمانے کی قابلیت ہی کی حد تک محدود نہیں کر سکتے، گو ہمارا یہ یقین ہے کہ فلسفہ اس قابلیت میں کسی قسم کا نقص نہیں پیدا کرتا بلکہ انسان کو ایک مرفہ الحال جماعت کا رکن بنانے میں مدد کرتا ہے لیکن فلسفہ کی حقیقی عملیت کے ایک اور معنی ہیں، فلسفہ عملی ہے اس لیے کہ وہ

(۱) تمام مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے

(۲) تمام اشیا، واقعات، تجربات اور تمام اشخاص کو ان کے تمام علائق و اضافات میں رکھ کر سمجھنے میں مدد دیتا ہے

(۳) ہمارے مقاصد و غایات، ہماری تعلیم، صنعت و حرفت، حکومت و مملکت، اخلاق و آداب و مذہب پر کامل و متوافق طور پر غور و فکر کرنے پر ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے

(۴) حیات انسانی کے معنی اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق ایک باعزت نظری تصور قایم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ زندگی پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرد کو جماعت یا معاشرہ میں ایک پاک وصاف وکارآمد زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ شہری ہونے کی حیثیت سے وہ محض روپیہ کمانے کی مشین نہیں بلکہ وہ ایک شوہر بھی ہے اور باپ بھی، وہ ایک ہمسایہ ہے جو نظم و قانون، صحت عامہ مکانات کے حسن و آسائش اور نئی پود کی صحت اخلاقی سے گہری عملی دلچسپی رکھتا ہے، ان چیزوں سے عقلی دلچسپی رکھنا زندگی پر من حیث کل نظر ڈالنا ہے اور یہی فلسفہ ہے۔ سقراط نے ہمیں تنبیہ کی تھی کہ جس زندگی کا غائر نظر سے امتحان نہ کیا گیا ہو وہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں۔ اب انسان ہونے کے معنی عملی ہونے کے ہیں۔ اور عملی ہونے کے معنی زندگی کی غایات و اقدار اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور و فکر کرنے کے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور فلسفی شلر کہتا ہے کہ "یہ نہایت جرأت کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نہج فکری اپنی ہدایت و ماہیت کے لحاظ سے بالکلیہ عملی ہے فلسفہ کے انتہائی مسائل وہی ہیں جو زندگی کے عملی مسائل کے نتائج تک پہنچنے سے حاصل ہوئے ہیں ان کا تعلق اس نظریہ سے ہے جس کی توثیق ہر عمل کو کرنی چاہیئے۔"

(۲) فلسفے کے مختلف شعبے خود مفید ہیں:-

فلسفے کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالو تو تمہیں خود ان مسائل و اغراض کے مفید ہونے کا یقین ہو جائے گا، مثلاً منطق استدلال کے حصول سے بحث کرتی ہے۔ وہ استناج صائب کے شرائط کا مطالعہ کرتی ہے۔ کیا ہم سب فکر و استدلال کے معاملہ میں غیر محتاط و متناقص واقع نہیں ہوئے ہیں؟ کیا ہمیں کسی دائرۂ عمل میں کمال حاصل کرنے کے لیے یا کسی معاملہ میں عملی طور پر کامیاب ہونے کے لیے تفکر و استدلال میں متوافق ہونے کی ضرورت نہیں؟ ان مسائل سے کوئی دوسرا مضمون بحث نہیں کرتا۔

اخلاقیات حیات اخلاقی کے اصول و معیارات سے بحث کرتی ہے۔ "مفتاح خزاین سعادت" دنیوی پیش کرتی ہے۔ راہ عمل سجھاتی ہے، نیکی کی طرف لے جاتی ہے، آدمیت کو لحم و شحم و پوست پر مشتمل نہیں قرار دیتی بلکہ رضائے دوست اصل انسانیت قرار دیتی ہے۔ دیکھو اس رباعی میں اخلاق کے کیا گر بیان ہوئے ہیں:-

بانفس بہا د کن شجاعت این است   بر خویش امیر شو امارت این است

انگشت بہ حرف عیب مردم مگذار   مفتاح خزائن سعادت این است

کیا یہ انسان کو حقیقی معنی میں عملی اور کامیاب بنانے کے لیے کافی نہیں اور کیا ان کی ہر فرد بشر کو ضرورت نہیں؟

فلسفۂ معاشرت حیات انسانی کے ان غایات و اقدار سے بحث کرتا ہے جن کا تحقق حیات معاشری و ادارات مدنیہ میں ہوتا ہے جس کے علم کے بغیر زندگی حقیقی معنی میں کامل نہیں ہوتی۔ علمیات یا نظریۂ علم فکر کے شعوری و غیر شعوری مفروضات کا امتحان کرتا ہے۔ مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشیاتی و تعلیمی ادبیات پر خامہ فرسائی کرنے والے، نیز علمائے سائنس نہ اتنی فرصت رکھتے ہیں اور نہ انھیں اس قدر دلچسپی ہوتی ہے کہ ان تجریدی معاملات کا امتحان کریں، خصوصاً شاعری ایسے تصورات سے مملو ہوتی ہے جس کے تضمنات و مدلولات کا امتحان ضروری ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیات کائنات و زندگی کا ایک جامع نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اور فلسفہ کے دوسرے شعبے ان سوالات کی تحقیق کرتے ہیں جن کے اٹھانے پر عقل انسانی مجبول و مجبور ہے۔ تہذیب کی ساری تاریخ میں قدیم اہل یونان سے لے کر ہمارے زمانہ تک انسان نے ان مسائل کی تحقیق میں بے اندازہ سرور حاصل کیا ہے، اور اس تحقیق سے جو بصیرت حاصل ہوئی ہے وہ اسکے لیے آرام جاں ثابت ہوئی ہے۔ اس کی دلکشی ہمیں اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے۔ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دلفریبی ہے اس سے زیادہ نہیں۔

(۳) فلسفہ علم کو جامعیت بخشتا ہے۔

فلسفہ علم میں وحدت پیدا کرتا ہے، حیات فکری میں وحدت پائی جاتی ہے، لہٰذا علم میں بھی وحدت ضروری ہے۔ عقل نظریات میں توافق و جامعیت کی متلاشی ہوتی ہے، اسی کی تشفی کرتے ہوئے فلسفہ زندگی کے تمام مخصوص اغراض میں رشتۂ وحدت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس (علوم) انسان و عالم کے متعلق واقعات، نظریات و قوانین کا توضیحی و تحلیلی بیان پیش کرتے ہیں۔ یہ محض طریقے اور راستے بتلاتے ہیں، فلسفہ ان کے برخلاف ترکیبی و توجیہی واقع ہوا ہے۔ یہ زندگی کے وسیع تر غایات و مقاصد و اقدار سے بحث کرتا ہے۔ یہ ہمیں اقدار کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جب غایات و اقدار پر غور و فکر کر لی جاتی ہے، عام اصول کا استحکام ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کے ہر عملی اقدام پر رہبری و ہدایت کا چراغ ضیا پاشی کے لیے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔

(۳) فلسفہ ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ کس چیز کے متعلق سوال کریں اور سوال کس طرح کریں :-
بعض دفعہ فلسفہ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ فلسفہ نہ کسی مسئلہ کو حل کرتا ہے اور نہ کسی سوال کا قطعیت کیساتھ جواب دیتا ہے۔ سائنس کے برخلاف جو ضروری اور اہم سوالات کے مخصوص جواب دیا کرتی ہے فلسفہ محض سوالات کو اٹھاتا ہے اور جواب کسی کا نہیں دیتا ؎

آں قوم کہ راہ بیں فتادند شدند   کس را بیقیں خبر نہ دادند شدند

آں عقدہ کہ ہیچ کس ندانست کشاد   ہر یک بندے براں نہادند شدند   (طوسی)

ذرا توقف کیجئے اور ایک وقت میں ایک سوال کیجئے۔ کیا آپ کسی ایسی سائنس کا نام بتا سکتے ہیں جس نے کسی بھی اہم سوال کا یقینی وقطعی جواب دیا ہو؟ سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح سائنس میں نظریات واعتقادات سینما کی متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند عالمگیر اہمیت رکھنے والے نظریات کا ذکر کریں گے۔

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کی ابتدا کی توجیہ لاپلاس کے سدیمی مفروضے Rebular hypothesis سے کی جاتی تھی۔ کانٹ نے اس نظریہ کو اب سے پہلے پیش کیا تھا۔ لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور پروفیسر مولٹن نے اسکی توجیہ میں Plaretesinab hypothesis پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی Origin of Species (اصل انواع) ارتقا کی انجیل سمجھی جاتی تھی۔ آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے!

عمل ارتقا کی توجیہ تغیرات Variations کی بجائے تحولات Mutations سے ہونے لگی ہے۔ اب مسٹر کیامریہ کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہمیں تفاوت راہ! نیوٹن نے حرکت کے لیے بعض قوانین بنائے دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا! اب اینسٹائن اس کی تردید کر رہا ہے۔ مے تیر، رم فورڈ، ڈے وی، اور صدہا علمائے سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی اور ردرفورڈ، پنکارے جدید سائنس کے ان انتہائی عقائد میں شک پیدا کر رہے ہیں۔

پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیان ہے، اور فطرت کے عدیم التیغر اور ابدی قوانین مادّے کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہوگئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعوٰی کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی دقعت رکھتے ہوں کسی زمانے میں ریاضیات کو متیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلاثہ صاحب اولاد ہو گئے، جز کل کے اتنا بڑا ہو گیا، اور اینسٹائن نے ثابت کر دیا کہ دو نقاط کے درمیان ایک خط مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے۔ فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا مسٹر وگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے۔ اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دیتے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت و تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے، اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے! آئے دن ہر ایماندار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ جھوٹ کا دریا ہے، ہر ایماندار Egyptologist (عالم مصریات) سنین و ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!!

اسی خوش کن سرکس کو نظروں کی سامنے رکھ کر نور نشتے نے کہا ہے کہ "دنیا میں کوئی شے اتنی سریع الزوال یا گریز پا نہیں جتنی کہ سائنٹفک تھیوری، اور نہ ہی کوئی شے اتنی فرسودہ پھپھوند بھری متعفن اور سڑی جتنی کہ پرانی سائنٹفک تھیوری۔ علمائے سائنس فلسفیوں پر یہ کہہ کر طعن کرتے ہیں کہ اس پیشہ کے لوگ ایک دوسرے کی تردید کرتے رہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ طعن علمائے سائنس پر بھی اتنی ہی صحیح ہے۔" اسی لیے ان دونوں بختیہ کار و بالغ نظر علمائے سائنس اپنے بیان میں نہایت محتاط اور متواضع واقع ہوئے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ سائنس بھی زیادہ سوالات اٹھاتی ہیں اور بہت کم کا جواب دیتے ہیں۔ سائنس واقعات کو جمع کرتے ہیں اور ان پر قوانین و نظریات کو مرتب کرتے ہیں، اور ان ہی اعلیٰ تعمیمات کے متعلق علمائے سائنس ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں صورت حال وہی ہے جس کی توقع کی جانی چاہیئے، چونکہ انسان کو تمام واقعات کا علم نہیں، لہٰذا مسائل کے حل میں مختلف علما مختلف مفروضات و مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اختلاف آرا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی معنی میں فخر رازی کے ان اشعار کو لیجیے،

جن میں سے ایک شعر کا اوپر بیان ہوا ؎

ہرگز دلِ من ز علم محروم نشد
کم ماند اسرار کہ مفہوم نشد!

ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد!

سائنس و فلسفہ دونوں کی تاریخ انسان کے علم کے ناقص و ناکامل ہونے کو بتلا رہی ہے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ؎

من می نگرم ز بلندی نا استاد
عجز ست بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

لیکن سائنس اور فلسفہ کے متخالف و متضاد مسالک ایک دوسری کی تکمیل کرتے ہیں اور تحقیق و تدقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں فلسفہ بھی سائنس کی طرح انسان کے علم کی کمیت و کیفیت میں اضافہ کر رہا ہے وہ انسان کی فہم کو جلا بخش رہا ہے، روشن کر رہا ہے اور دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے رہا ہے۔

فلسفہ کی ناکامیوں کو ماننے کے باوجود (جو سائنس کی ناکامیوں کی طرح قابل شرم ہیں) ہم کہتے ہیں کہ فلسفہ اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرتا ہے اور اپنے طالب علم کو دیدۂ بینا عطا کرتا ہے اگر وہ صرف یہ سکھلاتا ہے کہ عقلی طور پر کونسے سوالات کئے جا سکتے ہیں اور کونسے سوالات نہیں کئے جا سکتے بقول پروفیسر کالنگن کے "اگر فلسفہ استنطاق کے سوا کچھ نہیں تو یہ کم از کم ہمارے سوالات کو مشکل کرتا ہے، ان کو ایک دوسرے سے متوافق بناتا ہے، بلفظِ واحد ہم کو عقلی سوالات پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جاننا اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی جاننا کہ ہم جانتے کیوں نہیں، ایک قسم کا فائدہ ہے"۔ برٹرنڈ رسل کے اس قول میں صداقت بھری ہے کہ "دراصل فلسفہ کا فائدہ زیادہ تر اس حیرت و عدم یقین ہی پر مشتمل ہے۔ جس شخص کی خمیر میں فلسفہ کی آمیزش نہیں اس کی زندگی ایسے زندان میں بسر ہوتی ہے جس کی کچھ تیلیاں تو فہم عام کے تعصبات نے گھڑی ہیں، کچھ اس کے زمانہ اور قوم کے اعتقادی تیقنات نے، اور کچھ ان اذعانات نے جو اس کے ذہن میں بغیر عقل و فہم کے اشتراک و رضامندی کے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا محدود و متعین و واضح ہو جاتی ہے، عام اشیا اسکے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں کرتیں، اور غیر مانوس امکانات کو وہ حقارت کے ساتھ رد کر دیتا ہے"۔ بقول براؤننگ کے اس قسم کے لوگ ان حیوانات کے مانند ہوتے ہیں جن کی محدود مٹی میں شک کی مستنیر شعاعیں اپنی تابناکیاں نہیں دکھلاتیں! "فلسفہ مانوس اشیا کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساس تحیر کو

ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔" فلسفہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ وہ ہمارے مفروضات وظنیات سابقہ سے ہمیں
واقف کرتا ہے اور ان پر شک کرنا سکھلاتا ہے اسی معنی میں کانٹ نے کہا تھا There is no philosophy
there is only Philosophisnig فلسفہ نہیں تفلسف اصل شے ہے!" ہمیں علم کی
خواہش ہے کامل ومکمل صداقت کے ہم جویا ہیں، لیکن سوچ وتوسعی میں بھی اتنی ہی لذت ہے جتنی حصول میں!
غالب کے دل سے اس لذت کو پوچھو جو اس کی "سعی لاحاصل" میں تھی! بوعلی سینا کی طرح ہم بھی کہیں گے :-

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار بشتافت   یک موئے نہ دانست ولے موئے شگافت

اندر دلِ من ہزار خورشید بتافت   وآخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

فلسفہ گو "کمال ذرہ" تک پہنچ نہ سکا اور سائنس کب ذرہ کی ماہیت سے واقف ہے، لیکن دل تو تفلسف و
تفکر کی وجہ سے ہزار خورشید تاباں کی طرح چمک اُٹھا۔

(۵) فلسفہ فرد کو کائنات میں اپنی جگہ پہچاننے میں مدد دیتا ہے :-

فرد کا فطرت میں کیا مقام ہے؟ میں کون ہوں ؏

سرگشتہ بہ عالم ز پئے چیستم؟

انسان حیوانات سے وابستہ بھی ہے اور اپنی عقل وفکر کی وجہ سے ان سے ممیز بھی۔ کیا ہی تعجب کی بات ہے کہ
وہ دوسرے حیوانات کی طرح قوانین جبر کے ماتحت بھی ہے اور صداقت، حسن وخیر کا جویا و طالب بھی،
سوائے فلسفہ کے ان عمیق مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔

طبیعی علوم دوربین اور خوردبین کی مدد سے مکان کے حدود کو پیچھے ہٹائے جا رہے ہیں اور نئے
عوالم کا انکشاف کر رہے ہیں۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ہمارا یہ سیارۂ زمین جس پر ہماری بود وباش
ہے اپنے آفتاب سمیت جو ایک قریب الموت ستارہ ہے کروڑوں ستاروں، آفتابوں اور سیاروں میں
ایک ناچیز ذرۂ خاک ہے، تو انسان کے قد وقامت کے یہ چھ فیٹ کتنے حقیر معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے
برخلاف جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی مخلوق قوۃ فکر رکھتی ہے، احساس وتخیل کی قابلیت رکھتی ہے،
اور ان کی مدد سے اجرام سماوی کی عظیم الشان ترتیب پر غور کرتی ہے اور زمین کے نباتی وحیوانی عجائب پر

سر دھنتی ہے تو پھر انسان کی عظمت و وقعت مبرہن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پیاسکل نے کہا تھا "انسان محض ایک نے کی مانند ہے۔ فطرت کی کمزور ترین نے، لیکن وہ فکر کرنے والی، سوچ بچار کرنے والی نے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساری کائنات اس کو کچلنے کے لیے ہتھیار بند ہو جائے۔ ہوا کا ایک جھونکا، پانی کا ایک قطرہ اس کے مارنے کے لیے کافی ہے، لیکن اگر کائنات انسان کو کچل بھی ڈالے تب بھی انسان اپنے مارنے والے سے زیادہ شریف ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مر رہا ہے اور کائنات کو اس فائدہ کا کوئی علم نہیں جو اس کو انسان پر حاصل ہے۔" اس طرح کائنات میں اپنی حیثیت و منزلت سے واقف ہونا نفس کو قوی بناتا ہے! انسان کی زندگی کو گراں قدر و باوقعت قرار دیتا ہے۔ مشاہدہ و قوتِ فکری کی وجہ سے انسان (گو جزی طریقہ ہی سے سہی) یہ سمجھتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات ایک نظام رکھتی ہے۔ قانون و ہم آہنگی کی اس پر حکومت ہے اور انسان اس کا ذی علم ناظر ہے۔

علاوہ ازیں فلسفہ انسان کو اس پیچیدہ و مرکب نظام معاشرت میں اپنی جگہ کے پہچاننے میں مدد دیتا ہے، خود معاشرت کی ترکیب کئی متداخل اداروں سے ہوئی ہے جن میں ہم خاندان، حکومت، مذہبی محکموں اور صناعی اداروں کا ذکر سکتے ہیں۔ فرد کو موجودہ زمانے کی اس پیچیدہ معاشرت میں حصہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نظام معاشرت کا من حیث الکل ایک صاف واضح اور اجاگر تصور ذہن میں رکھے اور متقابلہ معاشرہی اقدار سے واقف ہو۔ فلسفہ معاشرت اس مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے، فرد کو ایک اچھے شہری بننے کے قابل بناتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم تحقق ذات کو بلند ترین اخلاقی غایت قرار دیں جو دوسرے نفوس کے باہمی اشتراک کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس غایت کے حصول کے لیے دنیا اور زندگی کا ایک جامع اور مستوعب علم ضروری قرار پاتا ہے! انسان کی بہترین مسرت اور اس کی ترقی و تکمیل ان اشیاء، واقعات و اعمال کے جاننے اور ان کی قدر کرنے پر منحصر ہوتی ہے، جن کے درمیان اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے! اس کی ذات، فکر، احساس و عمل، اس کے وجود کی ساری قدر و اہمیت، اپنا سارا مواد یہیں سے حاصل کرتے ہیں! اس کی اخلاقی، مذہبی اور جمالیاتی فطرت کا مکمل تحقق خارجی دنیا ہی کی مخالطت و مصاحبت سے ممکن ہے! انسان جس قدر اپنی ذات سے واقف ہوتا جا رہا ہے،

اسی قدر زیادہ اس کو صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی ذات کا تحقق فطرت و معاشرت کے مساس و اتصال ہی سے ممکن ہے۔ انسان کی زندگی خلا میں نشو و نما نہیں پا سکتی۔ فلسفہ نہ صرف تحقق ذات کے معنی کی توضیح و تعریف کرتا ہے بلکہ اس کے حصول کے طریقے بتلاتا ہے۔

فلسفہ اپنے طالب علم کا تعارف بنی نوع انسان کے عظیم الشان مفکرین و ذہنی قائدین سے کراتا ہے۔ ان تخلیقی ذہنوں کی صحبت سے زیادہ شخصیت انسانی کو غنی و کامل بنانے میں کوئی شئے موثر نہیں۔ فلاطون نے کہا تھا کہ ”دنیا میں چند ایسے ملہم وجود ہیں جن کی صحبت لاقیمت ہے“۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی　　　یا در رہِ دیں صاحب دردے گردی

ایں را بجز از صحبت مرداں مطلب　　　مردے گردی چو گرد مردے گردی

فلسفہ انسان کو اس مجلس میں پہنچاتا ہے جہاں سقراط و افلاطون، ارسطو و ابیکورس، فلاطینوس و سینٹ آگسٹائن، ٹامس اکوئیناس، ابن سینا و الغزالی، ابن رشد، ڈیکارٹ و اسپنوزا، بارکلے، ہیوم، کانٹ و ہیگل، اسپنسر و ولیم جیمس، شلی و کیٹس اور گوئٹے، باخ اور واگنر خندہ پیشانی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں، اور ہم جب تک سننے راضی ہوں ہم سے گفتگو کرنے آمادہ ہیں۔ خدائے لایزال کے اس شہر میں جہاں یہ مجلس آراستہ ہے لاتعنا ہی خزائن ہمارے سامنے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں صرف آگے بڑھ کر ان سے مالا مال ہونا ہے۔

(۶) فلسفہ ہمیں جمالیاتی لذت بخشتا ہے:-

فلسفہ ایک نہایت اہم معنی میں اپنی غایت آپ ہے۔ لذتِ جمال کی طرح فلسفیانہ غور و فکر اپنی آپ منزل ہے۔ فلسفہ کی نظری قیمت کے لیے حجت و استدلال پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ ثابت کرنا کہ انسان کو حصول صحت کی کوشش کرنی چاہیئے۔ دوستی و محبت قائم کرنی چاہیئے۔ سیرت اخلاقی کی تکمیل کرنی چاہیئے۔ شعر پڑھنا اور موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ جو لوگ ان تجربات و اقدار سے واقف نہ ہوں وہ حجت سے قائل نہیں ہو سکتے۔ ان کی اصلی قیمت شخصی و باطنی ہوتی ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا احساس دوسروں میں پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ افلاطون کسی جگہ

خیر و صواب کے افادی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہیں اُن کی ہستی زیادہ حقیقی ہوتی ہے۔" ارسطو شہریت اور دنیوی معاملات میں حصہ لے کر ذات کی تکمیل و تحقیق کو سراہتا ہے لیکن وہ ایک صحیح معنی میں تعلیم یافتہ شخص کی فکری زندگی کو حیات کی اعلیٰ ترین غایت قرار دیتا ہے۔ اسپنوزا کو "خدا کی عقلی محبت میں" اور صوفی کو صداقت، خیر و جمال کی وحدت کی بصیرت میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ کس طرح ظاہر کی جا سکتی ہے؟ برٹرنڈ رسل جب دنیائے معاشرت کے اختلال و اضطراب، شر و فساد سے ہٹ کر ریاضیات و منطق کے دایمی حقایق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو جو سکون، راحت و طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ صوفی کے نمایت و سرور و فرحت سے زیادہ مختلف نہیں۔

غرض فلسفہ کے شیدا کو فلسفیانہ غور و فکر کی زندگی میں وہی لذت ملتی ہے جو عاشق کو حسن و محبت میں، اور حسن و عشق کی طرح فلسفہ کے متعلق بھی نظمی حزیں کی زبان میں ہم کہیں گے ؎

ہر چند کہ حسن و عشق مستور بہ است　　آیاتِ نیاز و ناز مشہور بہ است
ہر سینہ کہ داغ نیست خشتِ لحد است　　زاں لب کہ نہ نالید لبِ گور بہ است

ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ایم۔اے عثمانیہ پی ایچ ڈی لندن بیرسٹر ایٹ لا

اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

سُلجھ رہے ہیں خیالاتِ زندگی میرے
اُبھر رہے ہیں کمالاتِ زندگی میرے
ترقیوں پہ ہیں حالاتِ زندگی میرے
اب ایک درد کی دنیا میں پل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

پھر آج عیش و مسرت سمجھ میں آتی ہے
پھر آج دہر کی قسمت سمجھ میں آتی ہے
پھر آج قلب کی عظمت سمجھ میں آتی ہے
حریمِ قدس سے گر کر سنبھل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

مری نگاہ سے اب اُٹھ رہے ہیں پردۂ راز
مرے خیال میں آتی ہے طاقتِ پرواز
مری حیات میں پیدا ہوا ہے سوز و گداز
پھر آج شمع کی صورت پگھل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

مری نگاہ میں جلوے سمائے جاتے ہیں
وہ میری روح میں کچھ گنگنائے جاتے ہیں
حریمِ ناز کے پردے اُٹھائے جاتے ہیں
فلک کی روشنیوں میں نکل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

میں طورِ وادیٔ ایمن پہ رقص کرتا ہوں
میں کائنات کے گلشن پہ رقص کرتا ہوں
میں حسن و عشق کے دامن پہ رقص کرتا ہوں
پھر آج صورتِ پروانہ جل رہا ہوں میں
اب ایک شعر کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

محمد عبدالقیوم خاں باقی ایم اے (عثمانیہ)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مختصر سیاسی تاریخ

باب اول

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت

تمہید بانی سلطنت یوسف عادل شاہ کے بعد سے ابراہیم ثانی تک چار بادشاہ تخت نشین ہوئے اسمٰعیل عادل شاہ نے تقریباً پچیس سال نہایت کامیاب حکومت کی اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ملو عادل شاہ تخت نشین ہوا، مگر سخت نا اہل ہونے کی وجہ سے چھ مہینے کے اندر ہی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم اول سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کے زمانہ حکومت میں ایک طرف شولاپور اور کلیانی کے نہایت اہم قلعے ہاتھ سے نکل گئے جن پر نظام شاہیوں کا تصرف ہو گیا اور دوسری طرف رائچور اور مدگل کے مابہ النزاع علاقوں پر وجیانگر کا قبضہ ہو گیا اس طریقے سے جب علی عادل شاہ تخت نشین ہوا ہے بیجاپور کے نہایت اہم اور سرحدی قلعے جن کے واسطے پچھلے بادشاہوں کے زمانہ میں کافی خوں ریزیاں ہو چکی تھیں دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ علی عادل شاہ کے بعد ابراہیم ثانی تخت نشین ہوا مگر اس کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عادل شاہ کے زمانہ حکومت پر ذرا تفصیل سے ایک نظر ڈال لی جائے

علی عادل شاہ اول ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۸ء میں جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔ اس کا زمانہ حکومت بیجاپور کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے دور میں بیجاپوری سلطنت کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اور حدود سلطنت میں توسیع عمل میں آئی بلکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے اگر ایک طرف معاشی خوش حالی ملک میں پیدا ہو چلی تھی تو دوسری طرف تمدن اور معاشرت کی ترقی علوم و فنون کی ہر دل عزیزی اور اُن کا پھیلاؤ اس چیز کو ظاہر کر رہا ہے کہ ملک بحیثیت مجموعی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ علی عادل شاہ اپنے تدبر و فراست و

معاملہ فہمی اور سیاسی دور اندیشی کی بدولت ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے انتقال سے پہلے اپنے رقیبوں اور دشمنوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا جو ہمیشہ بیجاپور کی بربادی کے درپے رہتے تھے اور اس کے جیتے جی کسی کی ہمت نہ بڑھتی تھی کہ اس کے مقبوضات پر دست تصرف دراز کریں۔

علی تخت نشین ہوتے ہی ریاست کے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ مدگل و رائچور وجیانگر کے راجہ کے قبضے میں تھے اور وجیانگر کی طاقت اس وقت انتہائی عروج پر تھی ایسی صورت میں اس مقتدر اور باحیثیت ریاست سے مقابلہ کرنا خود اپنی بربادی کا بیڑا اُٹھانا تھا اور برخلاف اس کے اگر وجیانگر کو دوست بنا لیا جائے اور وہاں کے راجہ سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے جائیں تو کم از کم بیجاپوری ریاست کے دوسرے دشمنوں کو نیچا دکھانے کا اچھا موقع مل سکتا تھا۔ اسی غرض سے علی عادل شاہ نے شروع ہی سے اس امر کی کوشش کی کہ رام راج والیٔ وجیانگر کو اپنا دوست بنائے چنانچہ بوتراب شیرازی اور کشور خاں کو ریاست بیجاپور کے سفیروں کی حیثیت سے دربار وجیانگر میں روانہ کیا گیا۔ ان سفیروں کی بڑی آؤبھگت ہوئی اور انکو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ خود رام راج نے ان سفیروں کی روانگی کے وقت اپنے مقربین سے ایک شخص کو اس غرض سے بیجاپور روانہ کیا کہ دربار وجیانگر کی طرف سے علی عادل شاہ کی تخت نشینی پر مبارکباد دے۔ اس اثناء میں رام راج کے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ **علی عادل شاہ** اس نئے اتحاد کی بنیادوں کو اور مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے بہ نفس نفیس عازم وجیانگر ہوا کہ رسم تعزیت ادا کرے اور رام راج سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرے۔ صرف ایک سو ہمراہیوں کے ساتھ اتنا فاصلہ طے کر کے محض رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے علی عادل شاہ کا اس طرح بید ھڑک ایک غیر ریاست میں چلا آنا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دشمن اور خون کی پیاسی رہی ہو رام راج کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ شاہ بیجاپور کا اعلیٰ پیمانہ پر استقبال کیا گیا اور اس کی آمد کی خوشی میں نہایت شاندار ضیافتیں کی گئیں۔ رام راج کی بیوی نے بھی علی عادل شاہ سے پردہ نہیں کیا بلکہ اس کو اپنا متبنیٰ کر لیا۔ غرض وجیانگر کی طرف سے تاجدار بیجاپور کی خوب خاطر و مدارات کی گئی اور ان دونوں والیان ریاست کے درمیان نہایت ہی گہرا اتحاد قائم ہو گیا لیکن علی عادل شاہ کی روانگی کے

وقت رام راج سے ایک ایسی حرکت ہوئی جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ وجیانگر کے راجہ سے اس کی بد دماغی کا کسی نہ کسی وقت ضرور بدلہ لیا جائے گا۔ فی الحال علی عادل شاہ خون کے گھونٹ پیکر خاموش رہ گیا مگر موقع کی تلاش میں تھا کہ رام راج کی اس حرکت کا خوب اچھی طرح بدلہ لے۔

رام راج کی جو حرکت علی عادل شاہ کو ناگوار گذری وہ یہ تھی کہ جب علی عادل شاہ نے بیجاپور کے ارادے سے وجیانگر کو خیرباد کہا تو رام راج نے علی عادل شاہ کو پہنچانے کے لئے خود تو کوئی زحمت گوارا نہیں کی البتہ اپنے عہدہ داران ریاست کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ علی عادل شاہ کو سرحد تک چھوڑ آئیں۔ رام راج کی اس حرکت سے اس کی لاپروائی، بے اعتنائی، غرور و نخوت اور اسلامی بادشاہوں کی کم وقعتی ظاہر ہوتی ہے۔ علی عادل شاہ نے اس کو محسوس کیا مگر وقت کے وقت خاموشی کو مناسب جانکر اپنی ناخوشی کو ظاہر ہونے نہ دیا۔

بیجاپور واپس آتے ہی علی عادل شاہ نے اپنے پرانے منصوبے کی تکمیل کی طرف توجہ کی کلیانی اور شولاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اُسے ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتا تھا اور اُس نے دراصل رام راج سے اتنی ساری دوستی اور اتحاد محض اس وجہ سے پیدا کیا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو وجیانگر کی فوجوں کی مدد سے ان کھوئے ہوئے علاقوں کو حاصل کیا جائے چنانچہ شاہ حسین انجو کو حسین نظام شاہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ کلیانی اور شولاپور کی واپسی کے متعلق گفت و شنید کرے مگر حسین نظام شاہ کب ان باتوں کو سننے والا تھا۔ اُس نے ان دونوں علاقوں[1] کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیا۔ ایک اور سفیر[2] بھی بیجاپور سے بغرض مصالحت روانہ کیا گیا مگر نظام شاہ نے ان میں سے کسی کی نہ سُنی اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخر کار جنگ تک نوبت پہنچی۔ وجیانگر کی فوجیں بھی مدد کے لئے بیجاپوری افواج سے آملیں۔ ان متحدہ فوجوں کا جب احمد نگری علاقوں پر حملہ ہوا تو حسین نظام شاہ نے مقاومت کی تاب نہ دیکھی اور مجبوراً اس شرط پر راضی ہو گیا کہ کلیانی کا قلعہ بیجاپور کے حوالے کر دیا جائے۔

لہ۔ علی عادل شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر دونوں قلعے واپس نہیں کئے جا سکتے ہیں تو کم از کم کلیانی کا قلعہ ہی واپس کر دیا جائے۔ (فرشتہ)۔

لہ۔ اس سفیر کا نام سید علی تھا۔

چنانچہ اس پر عمل ہوا اور مصالحت ہوگئی مگر جیسے ہی غنیم کی فوج واپس ہوئی حسین نظام شاہ ابراہیم قطب شاہ سے مدد کا خواستگار ہوا اور اس اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے اپنی لڑکی بی بی جمالی کو والی گولکنڈہ سے بیاہ دیا۔ اب گولکنڈہ اور احمد نگر کی فوجوں نے پھر کلیانی کا محاصرہ کرلیا جب علی عادل شاہ کو اس کی خبر لگی تو اس نے رام راج کو اپنی مدد پر دوبارہ طلب کیا۔ رام راج تو ایسے موقعوں کو غنیمت ہی سمجھتا تھا۔ فوراً آموجود ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ بجائے اس کے کہ ایسے وقت اپنے حلیف اور خسر کی مدد کرتا۔ اُلٹے رام راج اور علی عادل شاہ سے جا ملا جیسے ہی یہ خبر نظام شاہ کو ملی تو وہ فوراً احمد نگر کی طرف چلدیا اور جنیر کے قلعے میں محصور ہوگیا۔ علی عادل شاہ نے مع اپنے حلیفوں کے خود بھی احمد نگر کا رُخ کیا اس کا محاصرہ کرلیا گیا۔ مگر چونکہ ابراہیم قطب شاہ خفیہ طور پر محصورین کی مدد کر رہا تھا قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ اور علی عادل شاہ نے یہ خیال کرکے کہ محصورین کو پوشیدہ طور پر مدد پہنچ رہی ہے محاصرہ کا اُٹھا لینا ہی مناسب سمجھا اور شولاپور کے محاصرہ پر رام راج کو آمادہ کیا مگر کشور خاں کی رائے سے بجائے شولاپور، نلدرگ کے محاصرہ کی رائے ٹھیری۔ کیونکہ کشور خاں نے خفیہ طور پر علی عادل شاہ کو سمجھایا کہ شولاپور کا قلعہ نہایت ہی اہم اور سرحدی قلعہ ہے اگر اس وقت رام راج کی مدد سے اُسے فتح کیا جائے گا تو لامحالہ رام راج جو پہلے ہی سے بہت بد دماغ اور مغرور ہوچلا ہے اُسے اپنے قبضے میں لانا چاہیگا۔ اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اس وقت شولاپور کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے اور اس کی بجائے نلدرگ کا محاصرہ کرلیا جائے۔ علی عادل شاہ کو کشور خاں کی یہ صائب رائے بہت پسند آئی چنانچہ اسی بناء پر اُس نے رام راج کو قلعۂ مذکور کی طرف متوجہ ہونے پر راضی کرلیا۔ اس قلعہ کو جو ایک ہندو راجہ کا بنوایا ہوا تھا مسمار کردیا گیا اور از سر نو اُسی مقام پر ایک نیا قلعہ تیار کیا گیا جس کا نام شاہ درگ[ل] رکھا گیا اور یہ قلعہ بعد میں چلکر ایک نہایت ہی مضبوط اور اہم سرحدی قلعہ ہوگیا۔ ان انتظامات سے فارغ ہوکر ہر سہ بادشاہ اپنے اپنے

[ل] "باستظہار رام راج در محلیکہ قلعۂ قدیم موسوم بہ نلدرگ بنائے نمودہ یکی از راجہ ہائے پیشیں بود مندرس و منہدم گردیدہ از سر نو بہ سنگ و گچ بنائے تازہ و باستحکام تمام باتمام رسانیدہ موسوم بہ شاہ درگ ساخت" بساتین صفحہ ۸۸ فرشتہ سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے مقالہ سوم، روضہ دوم صفحہ ۳۷۔

ملک کی طرف واپس گئے۔

وجیانگر کی بربادی علی عادل شاہ کو، اگرچہ رام راج کی اعانت سے نظام شاہی علاقوں کو خوب تباہ کرنے اور ایک خاندانی دشمن کو نیچا دکھانے کا موقع ملا مگر بحیثیت مجموعی وہ اپنی ان کامیابیوں سے خوش نہیں ہوا، اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ علی عادل شاہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ رام راج کی قوت ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور وہ سلاطین دکن کو خاطر میں تک نہیں لاتا ہے اور پھر حسین نظام شاہ کے خلاف اس نے علی عادل شاہ کو مدد کیا دی ہے گویا اپنے نزدیک اسے بن داموں خرید لیا ہے۔ گذشتہ جنگ میں اس نے حلیفوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ نہ صرف علی عادل شاہ بلکہ ابراہیم قطب شاہ بھی اس سے سخت ناراض ہو گیا تھا۔ احمد نگر کے حملے کے سلسلہ میں وجیانگر کی ہندو فوج نے مسلمانوں کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا۔ اُن کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگائی اور اسلامی تبرکات کی ایسی بے حُرمتی کی کہ تمام اسلامی بادشاہوں نے اس کو بری طرح محسوس کیا اور یہ خوب سمجھنے لگے تھے کہ اگر آج احمد نگر کی باری ہے تو کل ہماری۔ غرض وجیانگر کی فوج کا یہ طرز عمل رام راج کا یہ غرور اور سلاطین کے ساتھ اس کا یہ ذلیل برتاؤ گویا خود اُس کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ اُس کی بد دماغی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ان بادشاہوں کے سفیر جب کبھی اس کے دربار میں حاضر ہوتے تو اُن کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان کی ہر طرح تحقیر کیجاتی یہ تمام چیزیں ایسی نہ تھیں جن سے کہ چشم پوشی کیجا سکتی ان وجوہات کی بناء پر سلاطین دکن پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے اس پر طرّہ یہ ہوا کہ رام راج نے نلدرگ سے واپسی کے وقت اپنے بھائی وینکٹادری کو تھوڑی سی فوج دیکر قطب شاہ اور عادل شاہ کے سرحدی علاقوں پر بھیجدیا کہ اُن کی تسخیر عمل میں لائی جائے ان دونوں بادشاہوں نے اس نئی بلا کو ٹالنے کے لئے مجبوراً چند علاقے رام راج کے حوالے[۱] کر دیئے۔ اس طرح علی عادل شاہ کو اس جنگ سے

---

[۱] علی عادل شاہ نے اتیگیر اور ناگر کوب کے علاقے رام راج کو دیئے اور قطب شاہ کیوبلی کنڈہ کنور اور پانگل سے دست بردار ہو گیا

جس میں کہ رام راج کی مدد حاصل کی گئی تھی فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گیا۔ شولاپور جس کے لئے یہ جنگ ہوئی تھی وہ تو ہاتھ نہ آسکا یا اس کی طرف فی الحال توجہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ نظام شاہ کو شکستیں تو بیشک ہوئیں مگر بیجاپور کو اُن سے کچھ بھی فائدہ نہوا اور اگر کچھ ہوا تو یہی کہ اُلٹے دو علاقے ہاتھ سے نکل گئے غرض ان تمام واقعات نے علی عادل شاہ کو بھڑکایا اور وہ اس قدر غضب آلود ہوا کہ اُس نے دل میں ٹھان لی کہ اب رام راج سے اس کا بدلہ لینا چاہیئے مگر جب اُس نے اپنی حالت پر نظر کی تو دیکھا کہ تن تنہا اس کا مقابلہ کرنا تو ممکن ہی نہیں اور پھر مشیرانِ[له] سلطنت نے یہ رائے دی کہ یکہ و تنہا رام راج سے مقابلے کا خیال کرنا دانشمندی سے بعید ہے کیونکہ اُس کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے اس کی ریاست نہایت وسیع اور خوش حال ہے اس کی آمدنی کے ذرائع اَن گنت ہیں اس کے ہاں ایک نہایت زبردست جرّار اور آزمودہ کار فوج ہر وقت تیار رہتی ہے غرض ہر حیثیت سے وہ ایک مقتدر راجہ ہے اگر اس کو شکست دینی منظور ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ دوسرے سلاطین دکن سے رابطۂ اتحاد پیدا کیا جائے اور اُن کو اپنا ہم خیال کرکے رام راج کی سرکوبی کیطرف توجہ کی جائے۔

اس بنا پر ایک ایلچی کو قطب شاہ والئ گولکنڈہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ اس اتحاد کی بابت گفت و شنید کرے اور اس کا عندیہ لے جب قطب شاہ، عادل شاہ کے اس ارادے سے واقف ہوا تو بصد خوشی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ حسین نظام شاہ اور عادل شاہ کے درمیان اس انداز سے صلح کرا دی جائے گی کہ پچھلی ساری رنجشیں دور ہو جائیں چنانچہ اُس نے اپنے دربار سے ایک نہایت ہی ہوشیار اور تجربہ کار شخص کو سفیر بنا کر پہلے بیجاپور روانہ کیا کہ علی عادل شاہ کو اس کے ارادوں سے واقف کر دے اور پھر نظام شاہی دربار کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یہ سفیر مصطفےٰ خاں اردستانی تھا جو ہر حیثیت سے اُس زمانے کے بہت ہی قابل، دانشمند اور با تدبیر اشخاص میں شمار

له۔ بالخصوص کشور خاں لاری اور ابو تراب شیرازی اس معاملہ میں پیش پیش تھے۔ بیجاپوری دربار میں تدبر کے اعتبار سے یہ لوگ بہت نامور تھے اکثر اہم معاملات میں ان سے رائے لیجاتی تھی اور بہت سارے اہم کام انھیں کے سپرد کئے جاتے تھے۔

ہونے کے قابل ہے (اس کا تفصیلی ذکر کسی اور جگہ آئیگا) مصطفےٰ خاں اپنے بادشاہ کے حکم کے مطابق پہلے
بیجاپور آیا اور علی عادل شاہ سے استصواب رائے کر کے حسین نظام شاہ والئ احمد نگر کے پاس پہنچا اور مجوزہ اتحاد
کے متعلق گفت و شنید کرنے لگا۔ حسین نظام شاہ تو رام راج کے خون کا پیاسا تھا کیونکہ اُس کی بدولت
اس کو اتنے نقصانات اُٹھانے پڑے تھے، شکستیں کھائی تھیں اور ذلیل و خوار ہونا پڑا تھا جب اس کو یہ معلوم
ہوا کہ عادل شاہ اور قطب شاہ، رام راج کی بربادی کے درپے ہیں تو بخوشی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوگیا
بالآخر قطب شاہی سفیر کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ
سے بیاہ دے اور شولا پور کا قلعہ جس کے متعلق اتنی لڑائیاں ہو چکی تھیں لڑکی کے جہیز میں دیدیا جائے اور
اس طرح دونوں بادشاہوں کے درمیان جو فتنہ و فساد کی جڑ ہے اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی
یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ کی شادی علی عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ سے ہو جائے
ان نئے رشتوں کے جڑنے کا مقصد یہ تھا کہ پُرانی رنجشیں اور عداوتیں دور ہوں اور از سرِ نو ایک نہایت ہی
مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم ہو جائے۔ غرض ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب قرارداد یہ شادیاں ہوگئیں
اور علی عادل شاہ کو نہ صرف قلعۂ شولا پور مل گیا جس کے لئے وہ اس قدر بے قرار تھا بلکہ چاند بی بی کی
ذات میں وہ دُرِ نایاب بھی ہاتھ آیا کہ بیجاپور کی قسمت جاگ اُٹھی جب ان دونوں سلاطین کو شادی کی
مہمانیوں اور میزبانیوں سے فرصت ملی تو وہ معاملاتِ رزم کی طرف متوجہ ہوئے اس عرصے میں
علی برید والئ بیدر سے نامہ و پیام ہو چکا تھا اس نے بھی رام راج کی سرکوبی کے لئے ان سلاطین کا ساتھ
دینے کا وعدہ کیا چنانچہ ان چار بادشاہوں کی فوجیں عازم وجیا نگر ہوئیں۔ جنگ کے اعلان سے قبل
علی عادل شاہ نے حجت کے طور پر رام راج کو کہلا بھیجا کہ مدگل، اور رائچور، ناگری کوب کے علاقے جو بیجاپور کی
سلطنت ابد مدت سے تعلق رکھتے ہیں اور جن پر والئ وجیا نگر نے ناجائز دست تصرف دراز کر رکھا ہے
فوراً واپس کر دیئے جائیں مگر یہ تو ظاہر ہی تھا کہ رام راج اُن کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیگا چنانچہ اس نے
نہ صرف انکار کیا بلکہ پیغام رساں ایلچیوں کو نہایت حقارت اور ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔
یہاں سلاطین دکن تیار ہی بیٹھے تھے فوجوں کو فوراً کوچ کا حکم ہوا جب رام راج کو اسلامی فوجوں کی آمد کی خبر

لہ۔ فرشتہ۔

لگی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے یقین کامل تھا کہ اس کی زبردست فوج ان بادشاہوں کو شکست فاش دیگی۔ لیکن بہر حال لڑنا تو ضروری تھا اُس نے اپنی سپاہ کو آراستہ کر کے غنیم کی طرف توجہ کی سب سے پہلے اُس نے اپنے چھوٹے بھائی تیم راج کو بیس ہزار سوار، ایک لاکھ پیدل اور پانچسو ہاتھی سمیت دریائے کرشنا کی طرف روانہ کیا کہ دریا پر قبضہ کر کے دشمنوں کے عبور کا راستہ مسدود کر دیا جائے اور اس کے بعد اُسکا منجھلا بھائی ایک کثیر فوج کے ساتھ آموجود ہوا اور سب کے آخر میں خود رام راج اپنی بقیہ ساری فوج لیکر (جس کے جھنڈے کے نیچے کئی راجہ اور راجکمار تھے) نہایت تزک و احتشام کے ساتھ غنیم کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ مشہور اور فیصلہ کُن جنگ تالی کوٹ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ تالیکوٹ دراصل ایک چھوٹا سا موضع ہے جو اُس وقت حدود عادل شاہیہ میں واقع تھا چونکہ سلاطین دکن نے اُسے اپنا مستقر بنایا تھا اور کچھ عرصے تک انھوں نے یہاں قیام بھی کیا تھا اس لئے یہ جنگ اسی مقام کے نام سے مشہور ہوئی۔ دراصل جنگ، تالیکوٹ سے بیس میل کے فاصلے پر دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے پر ہوئی۔ غرض کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو کرشنا اُن کے درمیان حائل تھی تیم راج نے نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ پہنچکر، رام راج کے حکم کے مطابق دریا کے تمام راستوں پر قبضہ کر رکھا تھا کہ دشمن عبور نہ کرنے پائیں۔ جب سلاطین دکن نے دیکھا کہ اس طرح اُن کا راستہ روکدیا گیا ہے تو انھوں نے ایک چال چلی۔ بظاہر انھوں نے اس مقام سے کوچ دیا جہاں پر کہ اُن کا پڑاؤ تھا اور دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے۔ اور برابر تین روز تک بڑھتے رہے اس سے تیم راج اس دھوکے میں آگیا کہ وہ کسی دوسرے مقام سے دریا عبور کیا چاہتے ہیں۔ لہذا اس نے بھی اس کا ساتھ دیا اور اس مقام کو چھوڑ چلا جس پر کہ وہ قابض تھا۔ تین دن کے بعد جب یکایک اسلامی فوجیں رات کے اندھیرے میں پھر اُسی مقام کی طرف پلٹ پڑیں جہاں سے کہ انھوں نے کوچ کیا تھا تو وجیانگر یونکو اسکی ذرا خبر نہوئی اور جب خبر ہوئی تو اسلامی فوج بہت آگے نکل گئی تھی اور اُن سے پہلے پہنچکر دریا کے اس راستے پر قبضہ کر لیا جہاں پر تین دن پہلے رام راج کی فوجوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا اس طریقے سے اسلامی فوجوں کو بآسانی دریا کے عبور کرنے کا

موقع مل گیا۔ ہندو، مسلمانوں کی اس چالاکی سے حیران ہو گئے مگر موقع کھو چکے تھے اور مسلمان نہایت عمدہ مقام پر قبضہ کر چکے تھے۔ رام راج کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی اپنی فوج پر بہت بگڑا لیکن کیا کر سکتا تھا جب اس کی بقیہ فوج جو پیچھے رہ گئی تھی اُس سے آملی تو جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

متحدین کی فوج کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ قلب میں حسین نظام شاہ، میمنہ پر عادل شاہ اور میسرہ پر قطب شاہ اور علی برید۔ اسی طرح رام راج خود قلب میں رہا اور میمنہ و میسرہ پر اپنے دونوں بھائیوں وینکٹادری اور یتم راج کو مقرر کیا۔ رام راج کی لاپروائی اور رعونت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب جنگ شروع ہوئی تو اُس نے سنگھاسن میں بیٹھکر میدان میں جانیکا ارادہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہونے سے قطعاً انکار کیا۔ حالانکہ مقربین اور دیگر سرداران فوج نے ہر چند عرض کی کہ جنگ میں یہ سواری خطرناک ثابت ہوئی ہے مناسب یہ ہے کہ حضور گھوڑے پر سوار ہوں مگر رام راج نے اسکی مطلق پرواہ نہ کی جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا کہ یہ جنگ نہیں بازی طفلاں ہے اس لئے زیادہ احتیاط کی چنداں ضرورت نہیں ابھی وجیانگر کے سورما اپنا رنگ جمائیں گے اور متحدین کی فوجوں کو بھاگتے ہی بنیگی۔ بھلا وجیانگری سیلاب کے آگے یہ مور و ملخ کس شمار و قطار میں ہیں۔ غرض وہ اپنے نزدیک سمجھے ہوئے تھا کہ چند لمحوں میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا اور وجیانگر کو فتح و نصرت کے جھنڈے بلند کرنیکا موقع ملیگا لیکن اُس روز کی جنگ کا حشر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جب دونوں فوجیں اچھی طرح گتھ گئیں اور لڑائی گھمسان کی ہونے لگی تو متحدین نے اپنی شہزوری اور دلاوری کے ایسے ایسے ثبوت دئے کہ رام راج کے دانت کھٹے ہو گئے۔ رام راج نے خلاف توقع جنگ کا جو یہ حال دیکھا تو سنگھاسن سے اُتر کر ایک مرصع اور زرنگار تخت پر جلوہ افروز ہوا اور اپنی فوج کے سورماؤں اور سپاہیوں کے دل بڑھانے کے لئے بے دریغ روپیہ نچھاور کرنے لگا زر و جواہرات قیمتی زیورات اور دیگر بیش بہا اشیا اپنی فوج میں تقسیم کیں۔ راجہ کی اس فیاضی سے وجیانگر کی فوج میں جانثاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ جان توڑ کوششیں کرنے لگے کہ متحدین کو مغلوب و پسپا کر دیں اور

حقیقت یہ ہے کہ رام راج کی طرف سے اس وقت پرُزور حملے ہو رہے تھے اور قریب تھا کہ متحدین کے پیر اکھڑ جائیں۔ قطب شاہ اور عادل شاہ کو فتح کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی مگر حسین نظام شاہ نہ صرف ثابت قدمی سے خود لڑتا رہا بلکہ اپنے حلیفوں کی بھی بڑی ہمت افزائی کی اس کی یہ دلیری اور ثابت قدمی اپنا کام کرگئی۔ قطب شاہ اور عادل شاہ جو فتح سے مایوس ہو رہے تھے ازسرنو اپنی قوت کو مجتمع کر کے اس پر تلُ گئے کہ جان جائے یا رہے مگر میدان کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے۔ اسطرح میدان کارزار پھر ایکبار گرم ہوگیا

اسی اثناء میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ جس نے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا حسین نظام شاہ کی فوج کا ایک مست ہاتھی جنگ کی ہماہمی سے پریشان ہوکر رام راج کی فوج میں گھُس پڑا۔ رام راج جنگ کی حالت دیگرگوں دیکھ کر اپنے زر نگار تخت سے اتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہوا ہی چاہتا تھا کہ یہ مست ہاتھی معہ فیلبان اسُ طرف جا نکلا۔ وجیانگری فوج پہلے ہی سے پریشان ہو چکی تھی اور سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو اپنے پرائے کی خبر نہ تھی کہ اس ہاتھی کی بدمستیوں نے انُھیں اور بھی زیادہ پریشان کر دیا جنِ کہ وہ کہار جو راجہ کے سنگھاسن کو سنبھالے ہوئے تھے رام راج کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود اپنی جان بچانے کے لئے میدان سے رفوچکر ہو گئے۔ جب یہ ہاتھی قریب پہنچا تو اس مرصع اور زر نگار انباری کو دیکھ کر فیلبان کے منہ میں پانی بھر آیا اور چاہتا تھا کہ اسُ پر قبضہ کرلے۔ راجہ کے جانثاروں میں سے ایک شخص نے چلایا کہ زنہار مہاراج کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اگر تم اس کی سواری کے لئے گھوڑا لادو تو تمہیں سرفراز کرے گا فیلبان نے جو یہ سُنا کہ رام راج یہی ہے تو فوراً بڑھ کر اسُے اپنی حراست میں لے لیا اور نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ اپنے آقا حسین نظام شاہ کے پاس اسُے پہنچا دیا حسین نظام شاہ اس غیر متوقع کامیابی سے بہت خوش ہوا اور فوراً اپنے مشیروں کی رائے سے رام راج کو قتل کروادیا کہ کہیں عادل شاہ کو خبر نہو جائے جو اس کی فرزندی کا دم بھرتا تھا۔ اس طرح یہ ہاتھ آیا ہوا شکار پھر کہیں چھوٹ نہ جائے۔ رام راج کا سر کاٹ کر نیزے پر لٹکایا گیا۔ وجیانگری فوج نے جو یہ حال دیکھا تو اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہوگئے۔ سردار کے مارے جانے کے بعد وہ کونسی فوج ہے جو جم کر لڑسکتی ہے متحدین کے مقابلے کی اب انُ میں ہمت نہ رہی۔ ایسی وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں وجیانگر کی یہ زبردست فوج پریشان اور منتشر ہوئی کہ قیامت کی

تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی کوئی کسی کے حال سے آگاہ نہ تھا جس کا
جس طرف منہ اُٹھا وہ اسی طرف بھاگ کر جان بچاتا تھا غرض وجیانگریوں کو اس میدان میں زبردست
شکست ہوئی اُن کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا گیا اور جب خوب اچھی طرح ان کی خبر لے لی گئی تو
متحدین نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس جنگ نے وجیانگریوں کو ایسا برباد کیا اور ان کی قوت کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ
سنبھل نہ سکے۔ یوں تو لڑائیاں ہوتی ہیں اور فریقین میں سے کسی نہ کسی کو شکست ہونا ضروری ہے مگر
یہ شکست ایسی شکست تھی کہ وجیانگر کی عظیم الشان اور باحیثیت سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔
وہ جاہ و حشم، وہ مال و دولت جو صدہا سال کی کوششوں کے بعد وجیانگر کو نصیب ہوئی تھی، چند دنوں
میں نیست و نابود ہو گئی۔ جنگ تالیکوٹ نے دراصل دکن کے اسلامی بادشاہوں کے حق میں فیصلہ کر دیا
اس کے بعد بہت عرصے تک کوئی ہندو سلطنت اُن کے مقابلے میں کھڑی نہ ہو سکی چونکہ تالیکوٹ کی جنگ
دکن کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان کی فیصلہ کُن جنگوں میں شمار ہوتی ہے اس لئے
اس کا تذکرہ بہ تفصیل کیا گیا نیز اس وجہ سے بھی کہ اس جنگ نے دکن کی تاریخ پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے
ہیں اور وجیانگر کی بربادی نے دکن کی سیاسیات کو یکلخت بدل دیا ہے۔ وجیانگر کے برباد ہونے سے
پہلے اسلامی ریاستوں کو اپنے ایک زبردست حریف کا خوف ہر وقت لگا رہتا تھا اور اس لئے وہ
اپنے کو سنبھالے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپس میں متحد بھی ہو جاتے تھے مگر جب اس بڑے دشمن کا
خاتمہ ہو گیا تو اُن کی آپس کی کشمکش اور بڑھ گئی اور وہ کھُلے بندوں ایک دوسرے سے دست و گریباں
ہونے لگے۔ اُن کے آپس کی کشمکشوں کی یہ غیر معمولی زیادتیاں بالآخر ان سلطنتوں کے زوال کا ایک اہم
سبب ثابت ہوئیں۔ اس طریقے سے وجیانگر کی بربادی بالواسطہ خود ان اسلامی ریاستوں کے تدریجی زوال
اور کمزوری کا باعث ہوئیں۔

جب ایکبارگی اس طاقتور دشمن اور مارآستیں کو کچل دیا گیا تو سلاطین دکن کی نظریں وجیانگر کے زرخیز
اور وسیع حصہ ہائے ملک پر پڑنے لگیں۔ ہر ایک کو اس کی فکر تھی کہ اس برباد شدہ ریاست کے کچھ غیر محفوظ

علاقوں کو اپنے قبضے میں کر لے۔ سب سے پہلے علی عادل شاہ نے اس معاملے میں پیشقدمی کی کیونکہ اس کو اس کا موقع مل گیا تھا۔ حسین نظام شاہ کا انتقال تالیکوٹ کی جنگ کے تھوڑے ہی زمانہ بعد ہو گیا اور احمد نگر میں اس وقت ایک کم عمر لڑکا بادشاہی کر رہا تھا۔ یہ لڑکا مرتضیٰ نظام شاہ ہے اس کی ماں خونزہ ہمایوں سلطان سلطنت کے کاروبار چلا رہی تھی جب احمد نگر میں یہ تبدیلی پیدا ہوگئی تو علی عادل شاہ کو اس جانب سے کوئی خطرہ نہیں رہا اور اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی فوجوں کو وجیانگر کے علاقوں میں بغرض فتوحات مشغول کر دیا۔ وینکٹا دری نے احمد نگر سے مدد طلب کی خونزہ ہمایوں سلطان نے اس غرض سے کہ بیجاپور کی طاقت ان فتوحات سے بہت بڑھ نہ جائے فوراً توازن قوت کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر وینکٹادری کی مدد کے طور پر بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ علی عادل شاہ کو دارالخلافہ کی محافظت کی غرض سے فوراً اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ احمد نگری فوج سے کچھ لڑائیاں ہوئیں لیکن چونکہ جنگ کی اصلی غایت پوری ہو چکی تھی اس لئے نظام شاہی فوجوں نے بیجاپور سے کوچ کر دیا۔

علی عادل شاہ کی فتوحات علی عادل شاہ کا آخری زمانہ ان فتوحات سے بھرپور نظر آتا ہے جو اس نے وجیانگر کے علاقے میں حاصل کیں۔ یوں تو اس زمانے میں احمد نگر پر بھی حملہ کیا گیا اور گووا کو بھی حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، مگر یہ دونوں حملے ناکام رہے۔ اس لئے علی عادل شاہ نے قلعۂ ادھونی کی تسخیر کے لئے فوجیں بھیجیں۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ تھا جس پر رام راج کے کسی سردار نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ خودمختارانہ حکومت کر رہا تھا۔ آنکس خاں اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے بیجاپور سے روانہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ آٹھ ہزار سوار کا ایک منتخب دستہ کئی توپ خانے اور بہت سی پیدل فوج بھی روانہ کی گئی ایک طویل اور پُرخطر محاصرے کے بعد یہ مضبوط قلعہ ہاتھ آیا۔ آدھونی کے زبردست قلعہ کی فتح کی وجہ سے علی عادل شاہ کا وقار بڑھ گیا اور وہ مزید فتوحات کا خواہشمند تھا لیکن اطمینان کے ساتھ اپنی فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ احمد نگر سے ایک معاہدہ کر لیا جائے تاکہ اُسکی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ علی عادل شاہ کو اپنی پہلی کوشش یاد تھی کہ اس نے اُدھر وجیانگر کی ریاست میں قدم بڑھائے اور اِدھر احمد نگری فوج بیجاپور پر آدھمکی۔ اب وہ اس صورت حال کے اعادہ کو پسند

نہ کرتا تھا اس لئے اُس نے مرتضیٰ نظام شاہ سے سرحد پر ملاقات کی (مرتضیٰ نظام شاہ اُسوقت معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا) اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ علی عادل شاہ بلاخوف وخطر وجیانگر کے علاقوں پر قابض ہو، اس میں ریاست احمدنگر کو کوئی تعرض نہ ہوگا اور مرتضیٰ نظام شاہ اگر ممکن ہو تو برار کی ریاست پر قبضہ کرے بیجاپور کی ریاست اس معاملہ میں کوئی اعتراض نہ کرے گی مگر یہ شرط علی عادل شاہ کیساتھ بڑھادی گئی کہ وہ وجیانگر میں اپنی فتوحات کو اسی حد تک پھیلائے کہ مفتوحہ علاقہ کا رقبہ برار کی سلطنت سے زیادہ نہو۔ اس کا یہ مقصد تھا کہ برار اگر فتح ہو بھی جائے تو ایک مختصر او رمحدود رقبہ کی دیاست ہے اور اس سے احمد نگر کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا لیکن وجیانگر کی عظیم الشان ریاست برباد ہونے کے بعد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے ممکن ہے کہ علی عادل شاہ اس عہد نامے سے فائدہ اٹھاکر اتنے علاقے حاصل کرے کہ اس کی ریاست کی وسعت میں اضافہ ہو جائے۔ اگر یہ صورت ہو تو پھر بیجاپور دوسری دکنی سلطنتوں پر بآسانی غلبہ پاسکے گا اور یہ چیز توازن قوت کے اُس اصول کے بالکل منافی ثابت ہوتی جس کی اب تک حفاظت کیجارہی تھی یہ شرط دراصل اسی توازن کے قائم رکھنے کے لئے لگائی گئی تھی۔

جب اس معاہدے کے بعد احمدنگر کی جانب سے اطمینان ہوگیا تو علی عادل شاہ کی فوجیں وجیانگر کے وسیع اور زرخیز میدانوں کی فتوحات میں مشغول ہوگئیں اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مضبوط قلعے جو کسی وقت ریاست وجیانگر کا ایک جزء تھے بیجاپوری مقبوضات میں داخل ہوگئے۔ ان فتوحات میں، طورکل، دھاروار، بنکاپور، جرہ، چندرگوٹی، کروراور باسسلور کی فتح قابل ذکر ہے ان علاقوں پر جو راجہ و راجکمار حاکم تھے انھیں یا تو بالکل مفتوح کرلیا گیا یا اُن کو بیجاپور کا باج گذار اور مطیع و منقاد بناکر چھوڑا گیا اس طریقے سے علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ان فتوحات کی بناپر بیجاپور کی ریاست کے حدود میں بڑی توسیع عمل میں آئی اور اسی اعتبار سے اس سلطنت کی عظمت و وقار میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان فتوحات کے سلسلے میں مصطفےٰ خاں اردستانی نے اپنی بڑی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور اُن میں اکثر مقامات اُسی کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے اس لئے علی عادل شاہ نے اُسے نہیں

جاگیریں دیدی تھیں اور نئے مفتوحہ مقامات کا گورنر بنایا تھا۔ ایک عرصے تک وسعت سلطنت اور توسیع حدود کا سلسلہ جاری رہا۔ اکثر مضبوط اور مستحکم قلعے فتح ہوتے جارہے تھے اور بیجاپور کی ریاست ہر حیثیت سے مائل بہ ترقی نظر آتی تھی۔ علی عادل شاہ کا یہ آخری زمانہ جنگ تالیکوٹ کے بعد سے کم وبیش کرناٹک اور مالابار کے علاقوں کی فتح میں گذرجاتا ہے حتیٰ کہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء میں علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت سلطنت بیجاپور کی غیر معمولی وسعت عمل میں آچکی تھی نئے نئے ملاباری علاقے اور مضبوط قلعے فتح ہو چکے تھے۔ وجیانگر کی سی زبردست اور عظیم الشان ریاست (جو اسلامی ریاستوں کی سب سے بڑی دشمن اور حریف ریاست تھی) کا خاتمہ ہوچکا تھا دکن کی تاریخ سے اس طاقت کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ ادھر ہندوؤں کی یہ زبردست سلطنت برباد ہوئی اور اس طرف شمال میں برار کی چھوٹی سی ریاست بھی دکن کے سیاسی نقشہ سے غائب ہوچکی تھی۔ احمد نگر کی ریاست نے اس معاہدے کے تحت (جس کا ذکر کیا گیا) برار کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا چونکہ برار کی ریاست کا خاتمہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ہوتا ہے اور یہ بھی دکن کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے اس کے متعلق بھی دو چار جملے لکھ دینے چاہئیں۔

برار کا خاتمہ برار کی ریاست ابتداہی سے بہت چھوٹے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ قوت حاصل نہ کرسکی۔ برہان عماد شاہ کے زمانے میں جبکہ بادشاہ (برہان) بالکل کم عمر تھا تفال خاں نے (جو یہاں کا ایک مقتدر وزیر اعظم تھا) شاہی خاندان کو الگ کرکے سلطنت کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا یہی دار وگیر اور کس مپرسی کا عالم تھا کہ برابر احمد نگر کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ اور مرتضیٰ نظام شاہ کا پہلے ہی سے ارادہ تھا کہ تفال خاں کو الگ کرکے برار کو اپنے قبضے میں کرلے۔ اسی خواہش کی تکمیل کی غرض سے اس نے علی عادل شاہ سے وہ معاہدہ کیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس معاہدے کی وجہ سے اسے برار پر ایک اخلاقی حق حاصل ہوگیا ادھر خود سلطنت برار تفال خاں کی غاصبانہ کارروائیوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھی۔ مرتضیٰ نے ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں برار پر

حملہ کر دیا۔ تغال خاں کو شکست دی اور سلطنت برار کو احمد نگر کا ایک جزٗ بنا لیا۔ برہان عماد شاہ اور تغال خاں قید کر دئے گئے اور یہیں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انکو زہر دیا گیا تھا اس طرح ۱۵۷۲ء میں برار کے عماد شاہیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے بعد دکن کی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ کر لینا کچھ غیر مفید نہ ہوگا۔ اس وقت دکن میں تین زبردست ریاستیں تھیں :۔

(۱) بیجاپور

(۲) احمد نگر

(۳) گولکنڈہ

ان کے علاوہ تین اور طاقتیں تھیں جن کی سیاسی اہمیت فی الحال کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔

(۱) بیدر

(۲) پرتگیزی

(۳) خاندیس

بیدر اس وقت روبہ زوال تھا اور وہ دن دور نہ تھے جبکہ وہ عادل شاہی سلطنت کا جزو بن جائے[1]۔ اب رہ گیا خاندیس سو اس کی اہمیت اس وقت سے بڑھنے لگتی ہے جب سے کہ دکنی ریاستوں کا مغلوں سے تعلق شروع ہوتا ہے۔ خاندیس کبھی کبھی دکنی ریاستوں کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا مگر نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ، کہ کہیں ان کے آئے دن کے فسادات اور جھگڑوں کی وجہ سے اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ پرتگیزی اپنے ساحلی مقبوضات کو برابر ترقی دے رہے تھے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ علی عادل شاہ نے اپنے آخری زمانے میں گوا کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس طرح اس وقت دکن میں چھ سیاسی قوتیں تھیں مگر فی الحال چند ریاستوں سے ہم کو

---

[1] فرشتہ ۱۰۲۹ھ میں بیدر عادل شاہی مقبوضات میں داخل ہو گیا۔

براہِ راست تعلق ہے وہ اول الذکر تین ریاستیں ہیں اور در اصل اس زمانے کی دکنی سیاسیات کا محور بھی یہی تھیں۔

یہ تو خالص دکنی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ تھا اس زمانے کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانے میں تخت دہلی پر اکبر اعظم جلوہ گر تھا اور اس کی قوت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی مگر فی الحال اُسے اتنا موقع نہ تھا کہ شمال سے بے توجہی کر کے جنوب کی طرف رُخ کرتا مگر پھر بھی یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں اکبر کی نگاہیں دکن پر پڑ رہی تھیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تفال خاں کے معاملے میں مرتضیٰ نظام شاہ کو ایک امتناعی حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں کو روک دے گو اس کی ایک نہ سُنی گئی مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے معاملات مغلیہ حکومت کی توجہ کا مرکز بننا شروع ہو گئے تھے۔
اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ دربار بیجاپور میں مغلیہ حکومت کی جانب سے علی عادل شاہ کے اسی آخری زمانے میں دو سفیر آئے ہوئے تھے۔ پہلے حکیم علی گیلانی اکبر کے نمایندے کی حیثیت سے بیجاپور آیا اور یہاں سے بہت کچھ تحفہ و تحائف کے ساتھ رخصت ہوا۔ دوسرا شخص جو بحیثیت سفیر کے یہاں آیا وہ حکیم عین الملک شیرازی ہے اور یہ شخص ابھی بیجاپور ہی میں تھا کہ علی عادل شاہ[1] قتل کر دیا گیا یہ واقعات صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ مغل اس وقت دکن سے بے خبر نہ تھے۔

اس طریقے سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی کے وقت دکن کی خارجی فضا کچھ صاف نہ تھی اور اس وقت دکنی ریاستوں کے سامنے بہت کچھ اہم مسائل موجود تھے جن کی طرف فوری توجہ کی سخت ضرورت تھی مگر ان ریاستوں کی اندرونی حالتیں خود اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی تھیں کہ خارجی معاملات کو پس پشت ڈالنا لازمی ہو گیا تھا۔

---

[1] علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق مختلف روایتیں ہیں جس میں خواجہ سراؤں والی روایت زیادہ مشہور و عام ہے لیکن یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ان تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ، تذکرۃ الملوک و بساتین السلاطین۔

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک اندرونی حالت

پچھلی سطروں میں اس فضاء کو پیش کیا گیا جو ابراہیم کی تخت نشینی کے وقت بیجاپور کی سلطنت کو خارجی طور پر گھیری ہوئی تھی اب کچھ اندرونی ماحول کا بھی اندازہ کر لینا چاہیئے۔ بادشاہ کی کسنی کی وجہ سے ملک میں علی عادل شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُمراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کی کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نئے بادشاہ کی تخت نشینی ملک کو سخت پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس وجہ سے کہ اُمرا کی خود غرضیاں، ان کی نا اتفاقیاں اور اُن کی باہمی رقابتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ملک اور بادشاہ کے ساتھ ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہیں۔ اگرچہ علی عادل شاہ نے مرتے وقت ایک نہایت وسیع، مضبوط اور مستحکم ریاست اپنے جانشین کے لئے چھوڑی تھی لیکن ان اُمراء کی خود غرضیوں کی وجہ سے یہ زبردست سلطنت ورطۂ تباہی میں گھر جاتی ہے۔ اُمراء نے ذاتی اغراض اور ذاتی مفاد کے لیئے جو لڑائی جھگڑوں کی ابتداء کی تھی وہ اس قدر خطرناک صورت اختیار کر لی کہ قریب تھا کہ بیجاپور کی ریاست خود غرضیوں کا شکار ہو جائے مگر بعض حالات نے جن کا آئندہ تفصیلاً ذکر کیا جائیگا، بیجاپور کی سلطنت کو تباہی سے محفوظ رکھا۔ اس اندرونی خرابی کی وجہ سے بیرونی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہونا پڑا یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح بیرونی فضاء دکنی سلطنتوں کی مشترک تھی اسی طرح اندرونی ماحول بھی اس زمانے کی ریاستوں میں قریب قریب یکساں تھا جو حال بیجاپور کا ابراہیم کی کسنی میں رہا تقریباً وہی حال احمد نگر کا مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد سے ہو گیا۔ یہاں بھی اُمراء کا ضرورت سے زیادہ طاقتور ہو جانا اور پھر اُن کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کو سخت نقصان پہنچا۔ ان ریاستوں کی اندرونی خرابیوں کا خود اُن کے حق میں ایک مضر نتیجہ یہ ہوا کہ مغل اُن پر بآسانی چھا گئے ورنہ اگر یہ خرابی اس زمانے میں نہ پیدا ہوتی اور یہ ریاستیں آپس میں متحد رہتیں تو ممکن نہ تھا کہ مغل ایک انچ بھی اپنی فتوحات کے سلسلے میں دکن میں آگے بڑھ سکے۔"

یہ ایسی خرابی تھی جس کی وجہ سے دکنی ریاستوں نے بہت نقصان اُٹھایا۔ آئندہ صفحات میں

یہ چیز خود بخود واضح ہو جائے گی کہ اُمرا اور سرداروں کی ناموافقت اور عدم اتحاد نے ملک کو کس قدر شدید نقصان پہنچایا۔ ابراہیم کی کمسنی کا طویل زمانہ (تقریباً دس سال کا ہوتا ہے) بیجاپور کیلئے نہایت پُرآشوب ثابت ہوا۔ عادل شاہیہ خاندان کی اقبال مندی اور بعض بہی خواہان ریاست کی وفاداری، نمک حلالی اور حق شناسی سمجھنا چاہیئے کہ بیجاپور برباد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جب آخر کار "یہ طویل تولیت" کا دور ختم ہوا اور ابراہیم نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو پھر اُسی آب و تاب اور اُسی عزت و وقار کے ساتھ اُس نے بیجاپور پر حکومت کی جیسے کہ علی عادل شاہ یا اُس کے پہلے لایق اور بہتر بادشاہوں نے کی تھی اور دراصل اس وقت سے بیجاپور کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

ابراہیم کی تخت نشینی ابتدائی زندگی تعلیم و تربیت اور کیریکٹر

باب دوم

ابراہیم کی تخت نشینی | علی عادل شاہ کا جب انتقال ہوا تو اس کا بھتیجا ابراہیم تخت نشیں کیا گیا۔ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے بھائی طہماسپ کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اپنی زندگی ہی میں اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس کے بعد اس کا جانشین ابراہیم ہوگا چنانچہ ۹۸۷ھ میں ایک جشن[1] کیا گیا اور ابراہیم ولیعہد مقرر کیا گیا اس کے دوسرے ہی سال ۹۸۸ھ میں علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت ابراہیم کی عمر ۹ سال تھی۔ وارث تخت و تاج کی کمسنی ہمیشہ بغاوتوں کی محرک اور فسادات کا باعث ہوتی ہے اور ہر شخص ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نئے نئے دعویدار سلطنت پیدا ہو جاتے ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ملک میں ایک فتنۂ عظیم نہ برپا ہو جائے۔ علی عادل شاہ کے بعد تقریباً یہی صورت حال تھی اگرچہ ابراہیم کو

---

[1] اس جشن کے متعلق فرشتہ یوں رقمطراز ہے "در ماہ شوال سنہ سبع و ثمانین و تسعماۃ (۹۸۷) چونکہ آنحضرت را فرزند نبود برادر زادۂ خود شہزادہ ابراہیم بن طہماسپ را ولیعہد ساختہ با اُمراء و ارکان دولت گفت کہ بعد از من پادشاہ شما اینست"۔ اسی سال سنّت خلیل اللہ کے مطابق شہزادے کی ختنہ کی گئی اس خوشی میں ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلے میں فرشتہ شہزادے کی اقبال مندی کے مطابق ایک قصہ بیان کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شہزادے کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا۔ آتشبازی کا بھی خوب انتظام تھا۔ شومئے اتفاق سے مجمع میں آگ لگ گئی۔ قریب ۷۰۰ سات سو نفوس نذر آتش ہو گئے مگر شہزادے کو جو اسی مجمع میں تھا کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا اور وہ صحیح و سلامت بچکر نکل گیا۔ (فرشتہ مقالہ سوم، روضہ دوم)۔

ولیعہدی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی شہزادے کا حقیقی بھائی اسمٰعیل موجود تھا جو ہر طریقے سے تخت و تاج کا اسی طرح حقدار تھا جیسے کہ خود ابراہیم۔ الا اس کے کہ ابراہیم کو پہلے ہی سے ولیعہد بنا دئیے جانیکا تفوق بھی حاصل تھا مگر "حیلہ جو را بہانہ بسیار" کے مصداق خود اس شہزادے کی موجودگی ہی بہت کافی تھی کہ فتنہ پرداز اور ستمرد اشخاص اس کے حقوق کی حمایت کے حیلے سے ملک کے امن و امان میں خلل انداز ہوں۔ اس بدامنی و فتنہ و فساد کے روکنے کے لئے افضل خاں نے جو علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں وکیل السلطنت کے عہدہ پر فائز تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اندر سے قلعے کے دروازے بند کرا دئے اور کسی کو داخل ہونیکی اجازت نہ دی۔ افضل خاں چاہتا تھا کہ انتظامات ٹھیک کرنے سے پہلے علی عادل شاہ کی وفات کی خبر ملک میں نہ پھیلے مگر باوجود اس احتیاط کے تھوڑے ہی عرصے میں یہ خبر عام ہو گئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تمام ملک میں ایک پریشانی پیدا ہو گئی اور صبح ہوتے ہوتے اکثر اُمرا و اعیان قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئے وہ اسی تشویش میں تھے کہ دیکھئے کس کو بادشاہ بنایا جاتا ہے بالآخر ایک شخص کو اس جماعت کا سفیر بنا کر افضل خاں کے پاس روانہ کیا گیا کہ جانشینی کی نسبت جو تصفیہ کیا گیا ہے اس سے آگہی حاصل کر کے واپس آئے۔ جب افضل خاں سے استصواب رائے کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جو تمام اُمرا اور ارکان دولت کی رائے ہو اسی پر عمل کیا جائیگا۔ اس پر اُمرا نے وہیں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ شاہ کمال الدین فتح اللہ اور دیگر مدبران سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ علی عادل شاہ نے اپنی زندگی میں جو تصفیہ کیا ہے وہی بحال رکھا جائے ابراہیم جو حقیقی وارث تخت و تاج ہے علی عادل شاہ کا جانشین قرار دیا جائے۔ میر مرتضٰی خاں انجو کو افضل خاں کے پاس اس گذارش کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ تمام اعیان و ارکان دولت نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ جلد از جلد اس پر عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ چونکہ ابراہیم کم عمر ہے اور معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے ایک متولی کی ضرورت ہے۔ افضل خاں جو پہلے سے ہی "وکیل السلطنت" کے ممتاز عہدے پر فائز ہے بادشاہ کی کمسنی تک متولی یا نائب السلطنت کی نئی خدمت بھی انجام دے۔ افضل خاں نہایت دانا اور تجربہ کار آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ بارگراں اپنے کندھوں پر اُٹھانا آسان نہیں۔ بادشاہ کمسن ہے، فتنہ و فساد برپا ہونیکا اندیشہ ہے اور

ان کا سدباب کوئی آسان کام نہیں اس لئے اس نے "متولی حکومت" کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن فی الحال یہ رائے دی کہ "چار معتبر اشخاص کو قلعے کے اندر بلا لیا جائے پھر ان کے مشورے سے ابراہیم کو تخت نشین کر دیا جائے گا" چنانچہ شاہ کمال الدین، فتح اللہ، مرتضیٰ خاں آنجو، منجن خاں اور بسیر کو ملک کشور خاں (جو کامل خاں کا داماد تھا) قلعے میں داخل کر لئے گئے۔ آپس میں تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی جلد از جلد عمل میں آنی چاہیئے۔ اس کے بعد تخت نشینی کی کارروائی کو ابراہیم زبیری ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ "بر دروازۂ حرم محترم رسیدند، ابراہیم عادل شاہ را از اندرون، بیرون آوردہ، بر بالائے برج، بر مسند عزت و شوکت نشاندہ چتر سبز زرنگاری کہ لازمہ عادل شاہیہ بود، بر سرا فراشتند۔ اعیان و ارکان درگاہ اول زمین بوس شدہ سلام و تہنیت بہ داختند و نذور از نظر گزرانیدند و بعد ازاں تمام خلائق از بروں سجدات شکر بجا آوردہ باز گشتند"[1]

ابراہیم کی تعلیم و تربیت و کیرکٹر

ابراہیم کی تخت نشینی سے پہلے کے حالات کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس کے سن پیدائش اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تواریخ بالکل ساکت ہیں لیکن چونکہ جس وقت وہ تخت نشین ہوا ہے اس کی عمر تقریباً دس سال تھی[2] اور اس کا سن جلوس ۹۸۸ھ ہے۔ لہٰذا نہایت آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ۹۷۸ھ میں وہ پیدا ہوا۔ علی عادل شاہ ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اس نے اپنے بھائی طہماسپ کی آنکھیں نکلوا دیں اور نظر بند کر دیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم اپنے باپ کی قید کے زمانے میں جبکہ اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں پیدا ہوا ہے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے علی عادل شاہ نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مظلوم بھائی کے بچوں کو لیکر پال لیا تھا۔ ابراہیم چونکہ سب میں بڑا تھا اُسے اپنا ولیعہد اور جانشین بھی مقرر کر دیا۔ اس غرض سے کہ وہ آئندہ بادشاہ ہونے والا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی خاص توجہ

---

[1] بساطین السلاطین۔

[2] فرشتہ جس وقت ابراہیم تخت نشین ہوا ہے وہ اپنی عمر کے نو سال ختم کر چکا تھا اور قریب قریب دس سال اس کی عمر تھی۔

گیگئی۔ یوں تو اپنے دونوں بھتیجوں کو علی عادل شاہ عزیز رکھتا تھا اور اُن کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی مگر بادشاہ کی توجہ خاص طور پر ابراہیم کی طرف مبذول رہتی تھی۔

ابراہیم بچپن سے ہی نہایت سنجیدہ، متین اور بُردبار واقع ہوا تھا۔ اس کی کم عمری میں اُسکی پیشانی سے آثار بزرگی و برتری ہویدا تھے۔ بساتین کے مصنف نے ابراہیم کی ان خصوصیات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے "و آں ہنگام (بر وقت تخت نشینی) مدارج عمرش از نہ سالگی تجاوز نہ کردہ بود ہم و آں صغر سن بکمال تمکین و سنجیدگی و حدت فہم انصاف داشت از ناصیۂ خورگی آثار بزرگی ہویدا بود۔"[1] اور فرشتہ[2] اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اس نو عمری میں جبکہ عموماً بچوں کا دل کھیل کُود میں لگا رہتا ہے، ابراہیم قطعاً ان وقت خراب کرنیوالی دلچسپیوں سے احتراز کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ وہ خوشنویسی کی مشق کیا کرتا تھا۔ اور اپنے زمانے کے مطابق اُس نے نہ صرف تحصیل علوم کی طرف ہی کوشش کی بلکہ فنون سپہ گری کا بہت اچھا ماہر ہو گیا۔ بالخصوص گھوڑے کی سواری، نیزہ بازی اور دیگر آلات حرب کے استعمال سے اُس نے خاصی اچھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔ یہ دراصل اُس زمانے کے اصول تعلیم و تربیت کی خوبی تھی کہ سپاہیانہ فنون کو دائرہ تعلیم سے خارج نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی تھی اور ماہر فنون سپہ گری کو بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس چیز کو ایسی ہر دلعزیزی اور ایسی عام مقبولیت حاصل تھی کہ صرف بادشاہوں اور والیان ریاست کے لئے ہی ان فنون کا حاصل کرنا ضروری اور لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے اس قسم کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی اسی وجہ سے اُس زمانے کا بچہ بچہ سپاہی ہوتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں ہمسایہ قوتوں یا ریاستوں سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے اور میدان کارزار ہمیشہ گرم رہتا تھا لہذا یہ ایک قومی ضرورت ہو گئی تھی کہ ہر شخص آلات حرب کے استعمال سے

[1]۔ بساتین السلاطین، صفحہ ۱۹۴۔

[2]۔ فرشتہ مقالہ سوم صفحہ ۴۔

واقف رہے تاکہ وقت پڑے تو اپنی اور اپنی قوم و ملک کی محافظت و بقا کے لئے وہ اپنے دشمنوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکے۔ اسی وجہ سے بلالحاظ پیشہ و طبقہ ہر شخص ان مردانہ فنون سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا جب فنون سپہ گری کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا ور ملک میں جب اس کو اتنی اہمیت دی جاتی ہو تو ظاہر ہے کہ بادشاہ جو پورے ملک کا نگہبان اور محافظ سمجھا جاتا تھا بھلا اُن سے کیسے اغماض برت سکتا اُس پر تو اپنے اعلیٰ منصب کی عظمت و شوکت کے اعتبار سے ان فنون میں کامل مہارت رکھنا ضروری تھا یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں شہزادوں اور وارثانِ تخت و تاج کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اُن میں بہادری اور مردانگی کے جوہر پیدا ہوں اور وہ سپاہیانہ فنون سے کامل طور پر واقف رہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا معیار یہ تھا کہ بادشاہ کی پہلی ضرورت فنونِ سپہ گری سے واقفیت سمجھی جاتی تھی۔ اور بعد میں کتابی علوم کی تحصیل کا خیال کیا جاتا تھا۔ غرض ابراہیم کو بھی اس زمانے کے معیار کے مطابق تعلیم دی گئی اور جہاں وہ ایک طرف علمی قابلیتیں حاصل کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف وہ ایک بہادر سپاہی اور واقف رموز حرب بھی ہو رہا تھا مگر ابھی یہ تعلیم ختم ہونے پائی تھی اور وہ اس کے ابتدائی منازل ہی طے کر رہا تھا کہ اسکے سر پرست اور چچا علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ گو تخت نشینی کے بعد بھی کم عمری کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ چاند بی بی اور مختلف متولیانِ ریاست کے زیر نگرانی جاری رہا مگر وقتاً فوقتاً ان مختارانِ سلطنت کی باہمی کشمکش اور فسادات کی بنا پر بادشاہ کے سلسلۂ تعلیم و تربیت میں بہت حرج ہوا مگر خود یہ بغاوتیں اور فسادات جو اس کی نو عمری میں اُسے گھیرے ہوئے تھے قدرتی تعلیم سے کچھ کم نہ تھے۔ ابراہیم ان سے بہت کچھ سبق لے سکتا تھا اگر یہ سچ ہے کہ نامساعد حالات انسان کو سچی اور بہترین تربیت دیتے ہیں۔

علی عادل شاہ کے قبل از وقت مر جانے سے ابراہیم کی تربیت کا بار چاند بی بی پر پڑا یہ فرہیں اور دانشمند عورت ہر طریقے سے اس کام کے لئے موزوں تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر چاند بی بی اس وقت بیجا پور میں معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے موجود نہ ہوتی تو شاید ابراہیم کو حقیقی معنی میں

بادشاہ ہونا نصیب بھی ہوتا کیونکہ ہر وہ شخص جو مختار[1] یا متولی مقرر کیا جاتا، بادشاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھاکر اور اپنی قوت و اقتدار کے نشہ میں بےخود ہوکر یہ چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو اصل خاندان کو ایک طرف کر کے خود ہی سلطنت کا مالک بن جائے۔ بیجاپور کی تاریخ میں خصوصاً ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں کہ سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو عین وقت پر عورتوں نے بچالیا چنانچہ جب یوسف عادل شاہ کا انتقال ہوا اور اس کا جانشین اسمٰعیل کم عمری میں تخت نشین ہوا تو کمال خاں[2] نے نمک حرامی پر کمر باندھی تھی مگر بوبوجی خانم[3] کے حسن تدبیر، شجاعت اور دلیری اور دل شاد آغا[4] کی ہمت مردانہ نے اس کے ان تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اسی طریقے سے اب جبکہ ابراہیم چھوٹا تھا، متولیان ریاست یکے بعد دیگرے سلطنت پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگے تھے مگر یہ ابراہیم کی خوش قسمتی اور عادل شاہی خاندان کی اقبال مندی تھی کہ اس وقت چاند بی بی جیسی عورت موجود تھی جو ابراہیم کے حقوق کی مردانہ وار حفاظت کرتی رہی۔ اور ان سرکش اور متمرد وزیران سلطنت کی باغیانہ اور غاصبانہ کوششوں کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ غرض ابراہیم ایک دانائے روزگار عورت کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتا رہا اور تربیت حاصل کرتا رہا۔

تخت نشین ہونے کے بعد یہ معمول تھا کہ سوائے چہارشنبہ اور جمعہ کے باقی ایام میں یہ کمسن بادشاہ دربار کرتا اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ تمام اُمرائے دولت اور اعیان سلطنت سلام کے لئے حاضر ہوتے، اور بادشاہ کی موجودگی میں تمام کاروبار سلطنت انجام پاتے تھے۔ اس طریقے سے

---

[1] ابراہیم کے عہد کے متولیان ریاست کی مفسدانہ اور غاصبانہ کارروائیوں کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئیگی۔

[2] کمال خاں اسمٰعیل عادل شاہ کے ابتدائی عہد میں متولی ریاست رہا مگر نمک حرامی کر کے چاہتا تھا کہ تخت خود غصب کرلے۔

[3] بوبوجی خانم یوسف عادل شاہ کی بیوی اور اسمٰعیل کی ماں تھی یہ عورت مرہٹہ نسل سے تعلق رکھتی تھی (فرشتہ)

[4] دل شاد آغا غضنفر بیگ کی بہن تھی۔ یوسف عادل شاہ غضنفر بیگ کو بہت چاہتا تھا اور اپنا بھائی کہتا تھا۔ اس اعتبار سے اُس کی بہن بھی محل میں رسوخ رکھتی تھی غضنفر بیگ ایک جاں نثار اور بہادر جنرل تھا۔

گویا اس کو امور سلطنت سے واقف کرایا جاتا اور معاملات ملکی کی انجام دہی کے اصول سے آگہی بخشی جاتی تھی تاکہ جب وہ سن بلوغ کو پہنچکر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے تو منصب شاہی کے تمام فرائض سے کما حقہٗ واقف اور آگاہ رہے۔ اسی زمانے سے ابراہیم میں اسقدر فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا کہ جب کسی نے ایک روز معمول سے زیادہ دیر ہو جانے پر بادشاہ سے کہا "امروز از نشست چنیں دیر (شدہ است) البتہ بہ ذات عالی کوفت و ماندگی رسیدہ باشد۔ اکنوں باستراحت میل فرمائید۔ بزبان گوہر نشاں فرمودند کہ مہمی الحال بما حوالہ شد آسانی و استراحت را گنجائش ندارد"[1]

اس جواب سے اس کی مستعدی اور فرض شناسی کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نوعمری کے دو ایک نہایت دلچسپ واقعات ہیں جن سے اسکی طبیعت کی متانت، سنجیدگی اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے کشور خاں کے اقتدار کا زمانہ تھا اور وہ ایسی حکومت کر رہا تھا جیسا کہ وہ خود بادشاہ ہے اتفاقاً ابراہیم کی والدہ کو کچھ جواہر کی ضرورت ہوئی کشور خاں نے ہیرے اور جواہر بھیجے تو سہی لیکن وہ ادنیٰ درجے کے تھے۔ اس پر بڑی بی صاحبہ (والدۂ ابراہیم) بہت بگڑیں اور اُن کی شاہانہ طبیعت کو یہ بہت ناگوار گذرا کہ ایک متولی ریاست بادشاہِ وقت کی والدہ کے لئے جو تحفہ بھیجے وہ اس قدر معمولی اور ادنیٰ درجے کا ہو۔ اس نے ذرا بھی شاہی ادب ملحوظ نہ رکھا۔ اُن کے نزدیک اس کی اس حرکت سے شاہی خاندان کی تحقیر و تذلیل ہوتی تھی۔ شدہ شدہ ابراہیم کو اپنی والدہ کی رنجش کا حال معلوم ہوا اس نے جس نازک پیرایہ میں اپنی ماں کی تسلی و دلجوئی کی ہے اس کا حسب ذیل الفاظ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے "سلطاں بہ خدمت والدۂ خویش عرض پرداخت کہ قبلہ گاہا اگر سلطنت از ماست، ہرچہ است از ماست و اگر غیر از خواہد بود ایں راہم بما کہ خواہد گذاشت چہ الفاظ شریف آزردہ میداریدٰ"[1]
واقعی یہ گفتگو ایک دس سالہ لڑکے کی زبانی حیرت انگیز ہے جس سے اس کی انتہائی دانشمندی کا

---

[1] ۱۔۲۔ بساتین السلاطین۔

اظہار ہوتا ہے۔ متانت کا یہ عالم تھا کہ بہت کم گفتگو کرتا تھا اور جب اس کی کم سخنی کے متعلق ایک بار استفسار کیا گیا تو جواب دیا کہ بادشاہوں کا وقار اور اُن کی عظمت و شوکت کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ متانت و سنجیدگی اختیار کریں[1]۔ غرض ان واقعات سے اس کی طبیعت کی خصوصیات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ واقعات خود اپنی جگہ کچھ ایسے زیادہ اہم نہیں لیکن اُن کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک دس سالہ لڑکا ان متین و سنجیدہ خیالات کا حامل ہے جو شاید اُس سے کہیں زیادہ بڑی عمر والے لوگوں میں نہیں پائے جاتے۔

ابراہیم کی تعلیم و تربیت اور اس کے کیرکٹر پر بحث کرتے ہوئے دو ایک چیزوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وہ بہت کمسنی میں تخت نشین ہوا۔ برابر دس سال تک سلطنت کے کاروبار مختلف متولیان ریاست کے زیر نگرانی چلتے رہے۔ اس دس سالہ دور میں بادشاہ کمسن ہونے کے اعتبار سے بالکل پس پشت ہو جاتا ہے۔ معاملات سلطنت میں اس کا ذرا دخل نہیں، اس کے اختیارات اور اس کے اثرات بالکل صفر۔ پوری دہ سالہ تاریخ محض بیرونی حملوں اور اندرونی کشمکشوں سے پُر نظر آتی ہے۔ متولیان ریاست کی آپس کی رقابتیں، دشمنیاں اور اُن کی خود غرضیاں ریاست بیجاپور کو ایک زبردست الجھن میں ڈالدیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخوں میں اس کمسن بادشاہ سے متعلق واقعات کا پتہ بڑی مشکل سے کہیں کہیں ملتا ہے اور جو کچھ واقعات ملتے ہیں وہ متولیان ریاست کی کارگذاریاں، اُن کا عروج و زوال، اُن کی آپس کی کشمکش، اُن کی خانہ جنگیاں اور کچھ بیرونی حملے ہیں۔ بادشاہ اس کی تعلیم و تربیت، اس کا کردار، اس کے مشاغل، اس کی دلچسپیاں، اس کی سیاسی حیثیت اور مختلف متولیوں سے اس کے تعلقات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ اگر کہیں بادشاہ تھوڑا بہت منظر عام پر آتا ہے تو وہ دلاور خاں کی تولیت کا آخری زمانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ٹھیک طور پر اندازہ نہیں

[1] بساتین السلاطین۔

کر سکتے کہ اس طویل دور میں ابراہیم کیا کرتا رہا اور اس کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی اور وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے کیسے متاثر ہو رہا تھا۔ یوں تو تھوڑے سے بہت حالات ملتے ہیں مگر وہ بھی جستہ جستہ۔ تفصیلاً اس موضوع پر کہیں مواد نہیں ملتا کیونکہ مورخ کی نگاہ تمام تر متولیان ریاست کی کارگذاریوں اور ان کے حالات پر رہتی ہے اور وہ اس دور میں بادشاہ کو بالکل پس پشت کر دیتا ہے۔[1] جب صورت حال یہ ہو تو مجبوراً اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے کردار کا اندازہ لگانے کے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد خود کو جس قسم کا انسان ثابت کیا اور اپنا جو بنا یا کیرکٹر لیکر وہ تخت شاہی پر جلوہ افگن ہوا اسی کی مدد سے اس کی اس دس سالہ زندگی اور کردار پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ یہ تو مسلمہ ہے کہ خواہ یہ دس سالہ دور ملک اور بادشاہ کے لئے بحیثیت مجموعی مفید ثابت ہوا ہو یا مضر، بہرحال ابراہیم کے کیرکٹر کی تشکیل کا دور رہے۔ جو کچھ بھی ابراہیم حقیقی معنیٰ میں بادشاہ ہونے کے بعد رہا اور جیسا کچھ بھی اس نے خود کو ثابت کیا ہے وہ اسی دس سالہ دور کے اثرات اور واقعات کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کے صحیح مذاق کا نشو و نما اس کے کیرکٹر کا ارتقا اس کی طبیعت کے رجحانات و میلانات کی تشکیل وہ سب کچھ اسی دور کے ممنونِ احسان ہیں اور ہونے چاہئیں۔

ان تمہیدی سطور کے بعد پھر ہم ابراہیم کے کیرکٹر کے تدریجی ارتقا کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن واقعات سے بھی مدد لیجائیگی جو اس دس سالہ دور سے باہر ہیں اور جو ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کے کارنامے ہیں۔

کامل خاں، کشور خاں اور اخلاص خاں کے زمانہ ہائے حکومت کچھ ایسے زیادہ نہیں دو سال

---

[1] ملاحظہ ہو معصر تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ التحفتہ الملوک، بادشاہ کے حالات اور اسکے اوصاف اسکے کیرکٹر اور اسکے مشاغل کے متعلق اس وقت سے تفصیل دیجانے لگتی ہے جبکہ متولیوں کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور بادشاہ بہ نفس نفیس مہمات ملکی انجام دینے لگتا ہے بچپن کے حالات بہت کم کھلتے ہیں۔

گذر جاتے ہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں یہ تین متولیان ریاست یکے بعد دیگرے حاوی ہوتے گئے اور اپنی اپنی ڈھائی دن کی بادشاہت مناکر عملی سیاسیات کے منظر عام سے غائب ہو گئے۔ اس کے بعد دلاور خاں کی حکومت کا زمانہ آتا ہے اس نے کامل آٹھ سال بیجاپور پر حکمرانی کی۔ اس کے دور میں بادشاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چونکہ دلاور خاں خود ایک عالم و فاضل آدمی تھا اس لئے اس کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول رہی۔ اس نے نہ صرف بادشاہ کے تحصیل علم کا سامان کیا بلکہ مردانہ فنون اور کھیل کود کی طرف بھی ابراہیم کو راغب رکھا جو جسمانی حالت کو درست رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو بادشاہ کے اُستاد اور اتالیق مقرر کیا۔ ایک قرآن مجید اور دیگر عربی و فارسی کتابوں کی تعلیم دیتا تھا۔ دوسرا بادشاہ کے کھیل کود کے سامان کی فراہمی کا انتظام کرتا تھا اور چوگان بازی میں خود بادشاہ کا شریک رہتا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دلاور خاں کے عہد میں بادشاہ کی دماغی اور جسمانی نشوونما کا خاص لحاظ رکھا گیا اگرچہ مزید معلومات اس سلسلے میں ہم نہیں پہنچتے لیکن یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں بادشاہ کی تربیت کی طرف اچھی توجہ کی گئی۔ اگرچہ یہ آٹھ سالہ دور اندرونی و بیرونی پریشانیوں سے پاک صاف نہ رہا لیکن پھر بھی دلاور خاں نے اپنی اُس ذمہ داری سے چشم پوشی نہ کی جو بادشاہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق اس پر عائد تھی۔ ان توجہات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم میں ایک لطیف، سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق پیدا ہو گیا تھا جبکہ بہ نفس نفیس اس نے مہمات ملکی کی انجام دہی کی طرف توجہ کی۔

ابراہیم کو فنون لطیفہ سے خاص دلچسپی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لطیف فنون کے واسطے وہ ایک نہایت ہی موزوں اور نازک طبیعت، قدرت کی طرف سے لیکر آیا تھا فنون لطیفہ میں بالخصوص اس کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ مختلف تواریخ سے واضح ہے کہ

لہ۔ دلاور خاں کے کارناموں کا جہاں ذکر آئیگا اس پر کچھ مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

وہ اس فن میں اپنے زمانے کا اُستاد تھا اور اکثر با کمال لوگ اس کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کو باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے اس کو موسیقی پر اتنا زبردست عبور حاصل تھا کہ اس نے ایک کتاب جو "نورس"[1] کے نام سے موسوم ہے خاص اس فن پر تصنیف کی ہے اور اس کتاب پر مشہور شاعر ظہوری نے اپنا وہ مشہور دیباچہ لکھا ہے جو آج فارسی نثر کا ایک بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ بادشاہ چونکہ اس فن کا دالہ و شیدا تھا اس کے دور میں موسیقی کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور ملک میں تین باقاعدہ موسیقی داں طبقے پیدا ہو گئے (۱) حضوری (۲) درباری (۳) شہری۔ حضوری وہ لوگ تھے جن کو خاص بادشاہ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہو۔ درباری حضوریوں سے اکتساب کرتے تھے۔ اس دوسرے طبقے کا فرض تھا۔ (طبقۂ درباری کا) کہ عامۂ خلائق میں اس فن کو ہر دلعزیز بنائے۔ اور جو بھی اس فن کے مشتاق و قدر داں ہوں اُن کو اس لطیف فن کی تعلیم دیں (لیکن یہ واضح رہے کہ اس میں جبر کا پہلو قطعاً نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا) بادشاہ نے بڑی فیاضی کے ساتھ علم موسیقی کی سرپرستی کی۔ ہر اہل کمال اور اہل فن کو سرکاری طور پر مالی امداد ملا کرتی تھی اور باقاعدہ تنخواہیں بھی مقرر تھیں۔[2]

یہ تو پہلے ہی بتلا دیا گیا ہے کہ بادشاہ اس فن کا زبردست ماہر تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت خوش گلو اور خوش آواز تھا اس خداداد آواز کے ساتھ اس کی محنت اور اس کے شوق نے اس کی موسیقی کی خوبیوں کو چار چاند لگا دئیے تھے۔ غرض وہ فن موسیقی کا دالہ و شیدا، اس کا ماہر اور اس کا زبردست سرپرست تھا اور خوب دل کھول کر اس نے اس فن لطیف کی سرپرستی کی۔

تولیت کے دور میں کہیں یہ ذکر نہیں آتا کہ بادشاہ کو اس فن کے سکھانے کا کوئی

---

[1] "نورس" ایک نایاب کتاب ہے جو ابراہیم سے منسوب کیجاتی ہے۔ "بساتین"

[2] "بساتین السلاطین"

خاص انتظام کیا گیا تھا لیکن چونکہ ابراہیم کے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی راگ کی دلچسپیوں اور اس کے موسیقی کے مشاغل کا ذکر آتا ہے اس لئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے سے ہی وہ اس فن کا اکتساب کر رہا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ متولیان ریاست نے بادشاہ کو لہو ولعب میں مبتلا کر کے خود ہمیشہ حکومت پر قابض رہنے کی غرض سے ابراہیم کو ناچ، گانے کی طرف متوجہ کر دیا ہو مگر، بہرحال اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ یہ دلچسپی متولیوں کی پیدا کردہ ہے لیکن یہ بھی صاف وصریح ہے کہ اُسی زمانے سے ابراہیم اس فن کا اکتساب کر رہا تھا خواہ متولیان ریاست نے اس فن کو حاصل . . . . . کرنے کی ترغیب دی ہو یا اُس کو اُس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ابتدا ہی سے حاصل کیجاتی ہیں۔ جب آواز پختہ ہو جائے تو اس میں کمال پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ موسیقی کے خطاطی، مصوری اور نقاشی میں بھی بادشاہ کو کامل مہارت حاصل تھی۔ اس کی خوشنویسی کے متعلق "بساتین" کے یہ الفاظ ہیں "اگرچہ درآں زمان خوشنویسان اقالیم جمع آمدہ بودند۔ ولے بادشاہ، بادشاہِ قلمہا بود۔ ثُلث و نسخ و نستعلیق را بہ آں درجہ حُسن و متانت رسانیدہ بود کہ برخطوط خوش قلمانِ عصر قلم نسخ کشیدہ۔"[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا خوشنویس واقع ہوا تھا۔ اس کے ان فنونِ لطیفہ کی قابلیتوں سے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی نقاشی و مصوری کے کمال کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان فنونِ لطیفہ کی (جس کا خود وہ ایک زبردست ماہر تھا) اس نے خوب ہی فیاضی کے ساتھ سرپرستی کی مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی فیاضیاں اور سرپرستیاں محض رنگیلے پن کی حد تک ہی تھیں بلکہ وہ دیگر علوم و فنون کا بھی بڑا سرپرست تھا چنانچہ اس کا دربار علماء و فضلاء و دیگر باکمال لوگوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ یہاں پر ان تمام کی تفصیلات دینا نہ تو ممکن ہے

[1] بساتین السلاطین۔

اور نہ ضروری (کیونکہ اس باب میں ابراہیم کی قابلیتوں اور اس کے کیرکٹر سے بحث کیگئی ہے۔ سرسری طور پر اس کی علمی سرپرستی کا ذکر کیا گیا ہے) صرف چند قابل قدر ہستیوں کے نام گنوانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مولانا ملک قمی، ملا ظہوری، رفیع الدین شیرازی، محمد قاسم فرشتہ اور شاہنواز خاں جیسے باکمال لوگ اس کے دربار میں موجود تھے انھوں نے اس بادشاہ کی سرپرستی میں اپنی علمی، ادبی، تاریخی اور فنی خدمات سے ملک کو سیراب کیا ظہوری[1] جیسا کچھ بھی شاعر تھا اور شعرا میں جو کچھ بھی حیثیت اس کو حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ملک قمی کا بھی شاعری میں کوئی معمولی درجہ نہیں محمد قاسم فرشتہ اور رفیع الدین شیرازی اس زمانے کے زبردست مورخ ہیں اور انھوں نے جو کچھ بھی تاریخی خدمات انجام دی ہیں وہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ شاہنواز خاں اس عہد کا ایک وزیر باتدبیر تھا۔ علاوہ اپنی مدبرانہ قابلیتوں کے وہ علوم وفنون کا بڑا مربی تھا چنانچہ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کی تصنیف و تدوین میں اپنی اُس ممنونیت کا اظہار کیا تھا جو اس کو اس شخص سے تھی۔ مزید یہ کہ اس کو تعمیر کاری سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ ابراہیم کے عہد میں نورسپور جو بسایا گیا اور جو حویلیاں اور بڑے بڑے مکانات بنائے گئے وہ اسی شخص کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ تھے[2]۔ ان نامور قابل اور فاضل لوگوں کی اسکے دربار میں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ علم کا بڑا قدرداں تھا اور اس کی فیاضی نے دور دور کے علماء و فضلاء کو اس کے دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی خاموش اور بیش بہا خدمتوں سے بیجاپور کو علمی دولت سے مالا مال کر رہے تھے۔

لہ۔ ظہوری نے اپنی کلیات میں ابراہیم عادل شاہ کی تعریف کے پُل باندھے ہیں۔ جگہ جگہ پر اسکے دیوان میں اس بادشاہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو (کلیات ظہوری)۔

ٹہ۔ شاہنواز خاں ابراہیم ثانی کا باتدبیر وزیر تھا۔ نورسپور کی تعمیر اُسی کے ہاتھوں پر ہوئی تھی اس نے اپنا مکان اس انداز اور اس طرز کا بنایا تھا کہ لوگ دیکھ کر عش عش کرتے تھے جس سے اسکی تعمیر کاری کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو بساتین السلاطین۔

یہاں ان لایق اور فاضل ہستیوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ خود اُن کی موجودگی اس کے کیرکٹر پر ایک نہایت ہی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کی سرپرستی سے اس نے بیجاپور کی بالواسطہ بڑی زبردست خدمت انجام دی۔ اُن کی سرپرستی کرنے کے معنیٰ یہ تھے کہ ملک میں علوم و فنون کی روشنی کو عام کیا جائے اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ملک میں کوئی بادشاہ علم و فن کو یوں پھلنے پھولنے کا موقع دے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علمی معاملات میں نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا۔ جو لوگ اس کے دربار میں تھے وہ یقیناً منتخب اور دنیائے علم و ادب کا ان کو عطر سمجھنا چاہیئے۔

متولیانِ ریاست

باب سوم

کامل خاں دکنی

کامل خاں دکنی | اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب اُمرائے دولت نے افضل خاں کو بادشاہ کی کمسنی تک متولی بنانا چاہا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے ملک میں بیسیوں فتنہ و فساد اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اُن سب کا تدارک اور سدباب کوئی آسان کام نہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر اُس نے مناسب سمجھا کہ معاملات ہی سے کنارہ کش ہو جائے۔ جب افضل خاں نے اس طرح انکار کر دیا تو اس امر کی ضرورت ہوئی کہ کسی دوسرے معتبر اور سربرآوردہ شخص کو متولی سلطنت مقرر کیا جائے لہٰذا سب کی نظریں کامل خاں کی طرف اُٹھنے لگیں۔ اسوقت کامل خاں ملک میں ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے علی عادل شاہ کو تخت نشیں ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ جب شہزادہ علی اپنے باپ کے حکم سے قلعہ مرچ میں بعض شبہات[1] کی بناء پر قید کر دیا گیا تو سکندر خاں قلعدار اور اس کے داماد کامل خاں دکنی کے (جو حقیقۃً طور پر شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے) حُسنِ سلوک نے شہزادے کا دل موہ لیا اور وہ ان دونوں کے اچھے برتاؤ سے بہت خوش رہا حتیٰ کہ جب ابراہیم قریب مرگ ہو گیا تو انھیں کی کوششوں سے

---

[1] ابراہیم (اول) سنی تھا مگر علی عادل شاہ بچپن ہی سے شیعیت کی طرف مائل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بادشاہ ایک مجلس میں یہ کہہ رہا تھا کہ "خدا نے مجھے نیک توفیق عطا کی اور میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کیا اور حنفی مذہب اختیار کر لیا"۔ اتفاق سے شہزادہ علی بھی حاضرین میں تھا نہایت شوخی اور بیباکی سے جواب دیا کہ "اگر از طریقہ پدر و جد گذشتن روش محمود و طریق پسندیدہ است فرور شد کہ فرزندان آنحضرت چنیں کنند"۔ بادشاہ برہم ہوا اور پوچھا "تو چہ مذہب داری" جواب "لا اکنوں مذہب بادشاہ دارم بعد ازیں خدائے سبحانہٗ و تعالیٰ عالم است"۔ فرشتہ ص ۳۴ مقالہ سوم روضۂ دوم ص ۲۷ بساتین السلاطین

اُمراء و اعیان دولت رفتہ رفتہ علی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ ان تمام کارروائیوں اور کوششوں میں کامل خاں پیش پیش تھا جو اس وقت محض ایک تھانہ دار کی حیثیت رکھتا تھا مگر چونکہ سکندر خاں قلعدار مرج کا داماد تھا اسکے اثرات اور اسکی حیثیت کم نہ تھی۔ جب ان وفاداروں کی کوششوں سے علی عادل شاہ اپنے باپ ابراہیم کے انتقال پر خود بادشاہ ہوگیا تو وہ اپنے ان آڑے وقت کے ساتھیوں کو بھولا نہیں بلکہ انکے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔ اس سلسلے میں کامل خاں دکنی کو زمرۂ اُمراء میں داخل کر لیا گیا اور مناصب و جاگیر عطا ہوئے۔[1]

---

[1] قلعہ کلھر اس کو جاگیر میں دیا گیا تھا (بساتین ص ۱۴۳) اسی سلسلے میں مصنف بساتین السلاطین نے بحوالۂ رفیع الدین شیرازی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ایک طرف کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق جو روایتوں میں اختلاف ہے اسکا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ واقعہ حسبہٖ پیش کیا جاتا ہے:۔

"رفیع الدین شیرازی می گوید مشہور چنیں شد کہ قتل علی عادل شاہ بہ اشارۂ کامل خاں بود و سبب آں چنیں بود کہ چوں کامل خاں بر منصب کار ملکی قرار گرفت تجبر و تکبر بسیار بہم رسانید خود رائی را پیشہ کار فرمود سیدی بود از ساکنان قلعہ کلھر کہ بہ جاگیر کامل خاں مقرر گشتہ۔ متعلقانش بنا بر عرض خود آں سید را مصادرہ کردہ در پا زنجیر کشیدہ در حبس داشتند شکایت ایں ظلم مکرر بہ سمع عادل شاہ رسیدہ بود۔ عادل شاہ چہار نوبت بہ کامل خاں فرمود کہ ایذائے سادات جائز نیست او را بگذارید۔ بہ سمع قبول نیاوردہ بر امر سلطانی عمل نہ کرد و بہ تعلل گزرانید۔ تا عادل شاہ روزے بجائے می رفت و کامل خاں نیز ہمراہ بود۔ ناگاہ پدر پیر آں سید محبوس آنجا خود را رسانیدہ فریاد بر آورد کہ عالم پناہا کامل خاں ستم عظیم برپا کردہ فرزند را از مدت مدید در حبس داشتہ۔ عادل شاہ بہ مجرد شنیدن نالہ پیر ضعیف از جا رفت و غضب عظیم جوش آورد یک لکد بزور ی بہ وے حوالہ کرد چناں کہ کامل خاں بر رفیع الدین شیرازی کہ پس پشت او بود بیفتاد۔ باز بادشاہ اگرچہ تدارکات آں بنوازشات متنوعہ نمود و منصب او بحال گذاشت اما وی کہ آں کینہ در دل پر کیں ذخیرہ داشت تا بوقت فرصت باشارہ قتل بادشاہ نمود۔" اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علی عادل شاہ کا حقیقی قاتل کامل خاں ٹھہرتا ہے۔ ابراہیم زبیری تو فرشتہ کے بیان کردہ قصہ (خواجہ سرا والا قصہ) کو غلط سمجھتا ہے اور رفیع الدین کے بیان کو تسلیم کرکے قتل کی اصل وجہ یہی بتلاتا ہے۔ یہاں پر قتل کی مختلف روایتوں پر تفصیلی بحث ممکن نہیں اور نہ ضروری محض کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ چیز بیان کی گئی۔

اس طرح وہ علی عادل شاہ کے زمانے میں برابر ترقی کرتا رہا اور اپنا رسوخ بہت بڑھا لیا حتیٰ کہ بادشاہ کے انتقال کے وقت وہ سلطنت بیجاپور کے اُمرائے کبار میں شمار ہونے لگا۔ اس اعتبار سے یہ طے پایا کہ کامل خاں دکنی ہی کو اب متولیٔ سلطنت مقرر کیا جائے چنانچہ فرشتہ اس کی اس غیر معمولی ترقی کے متعلق یوں رقمطراز ہے "کامل خاں دکنی کہ از اُمرائے کبار آں دولت خانہ بود چناں کہ گذشت در قلعہ مرج نسبت بہ شاہ غفراں پناہ علی عادل شاہ غایت اخلاص ساختہ از محرمان امور سلطنت گردیدہ بود۔ دریں وقت بر مہمات امور ملکی و مالی متولی گشتہ متعلقان معتمد خود را در حوالی و حواشی بادشاہ بہ جہت خدمت محافظت باز داشت[۵]" غرض جوں ہی کامل خاں اس اہم خدمت پر فائز ہوا اپنے آپ کو زیادہ مستحکم و مقتدر بنانے کی فکر میں رہنے لگا اور اس کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر اپنے متعلقین اور معتمدین کو مقرر کیا جائے چنانچہ خاص قلعہ بیجاپور کی قلعداری پر اپنے ایک خاص معتمد کو فائز کر دیا تاکہ وہ براہ راست اس کے ماتحت رہے اور بلا چون و چرا اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے اقتدار کی توسیع کی غرض سے جا و بیجا حرکتیں بھی شروع کر دیں۔ اس پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ خزانہ عامرہ پر بھی قابض ہو گیا متولی ہونے کی حیثیت سے خزانہ اس کے ماتحت تو تھا ہی مگر اس نے یہاں ایسے انتظامات کرنے شروع کر دیئے جس سے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے ارادوں کی نسبت شُبہ پیدا ہونے لگا۔ بیش قیمت زر و جواہرات کو جو خزانے میں بھرے پڑے تھے بعض صندوقوں میں سے نکال کر دوسرے صندوقوں میں رکھوا دیا۔ جب رفیع الدین شیرازی نے (جو اس زمانے میں حوالداری خزانہ کے عہدے پر مامور تھا اور جس کی تاریخ تحفۃ الملوک اس زمانے کی بہترین معصر تاریخ ہے جس سے اس مقالے کے سلسلے میں بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے) ان جواہرات کی فہرست تیار کرنی چاہی تو اسے اس کام سے روک دیا۔ اس سے غالباً اُس کا یہی ارادہ تھا کہ اُن بیش بہا اشیاء پر خود قابض و متصرف ہو جائے پھر اس نے

۵۔ فرشتہ۔ مقالۂ سوم، روضۂ دوم

مزید طرہ یہ ہوا کہ اس نے حرم شاہی کی عورتوں کی تنخواہیں بند کر دیں اور خزانہ دار کو حکم دیا کہ جتنی تنخواہ یاب عورتیں ہیں اُن کی ایک فہرست تیار کیجائے اور اس کے حضور میں پیش ہو کہ اجرائی تنخواہ کی منظوری دے۔ اپنی اس کارروائی کو یہاں تک پھیلایا کہ خود حرم میں جا کر تنخواہیں تقسیم کرتا محل کی بیس عورتوں کو محل سے نکال دیا اور اُن کے رہنے کے لئے دوسری جگہ تجویز کر دی گو یہ حرکتیں بظاہر معمولی تھیں مگر اُن کے اثرات اور اُن کے نتائج اس کے حق میں بہت مضر ثابت ہوئے۔ شاہی محل میں کامل خاں کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا گیا اور ہر ایک کو اس کی جانب سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کامل خاں کی یہ حرکتیں ایسی نہ تھیں کہ جن سے درگذر کیا جاتا یا جن سے اس کی بدنیتی اور فاسد خیالی ظاہر نہ ہوتی ہو۔ ان انتظامات سے غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ سب کو براہ راست اپنے ماتحت کر کے اپنے اقتدار میں اضافہ کرلے۔ اور ملک میں کوئی شخص ایسا نہو جو اسکی مخالفت کرسکے اور خود تمام سیاہ وسفید کا مالک ہو جائے۔ ابراہیم کی طفولیت کی حد تک تو اسکو بحیثیت متولی کے اختیارات کُلی حاصل رہیں گے مگر اس وقت کے لئے پیش بندی ضروری تھی جبکہ ابراہیم معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ اُسے پہلے ہی سے بیدست و پا کر دیا جائے کہ وہ اس کے ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت سے رہے اور خود اس کا اقتدار حسب حال رہے۔ اور معاملات ملکی پر اُس وقت بھی اُسی طرح اس کا قبضہ رہے جیسا کہ بادشاہ کی کمسنی میں اس کو حاصل تھا۔ اس کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک اُن تمام بہی خواہان ریاست سے صاف کر دیا جائے جو اس کے مقابلے میں بادشاہ کی حمایت پر کسی وقت بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ غرض کامل خاں کی ان کارروائیوں پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کا اس کو ایسا چسکا لگا تھا کہ اُس سے جُدا ہونا اُسے سخت ناگوار معلوم ہو رہا تھا اور محض اپنی اس حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اور اس کو مزید استحکام بخشنے کی غرض سے اُس نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا اگرچہ ہم کو کہیں صاف طور پر اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اُس نے تاج و تخت ہی کے ہضم کرنے کا ارادہ کیا ہو مگر پھر بھی اس کی ان کارروائیوں سے شُبہ

ہوتا ہے کہ اس کے ارادے نیک نہ تھے۔ وہ صرف اپنا راستہ صاف کر رہا تھا اور ایسے انتظامات میں مشغول تھا جن سے کہ اس کی طاقت روز افزوں ہونے کی توقع تھی اگر وہ اپنے آپ کو پورے طور پر مقتدر کر لینے میں کامیاب ہو جاتا تو عادل شاہی خاندان کو اس کی جانب سے سخت خطرہ تھا۔

اس زمانے میں مقتدر وزراء و امراء کا تخت و تاج حاصل کر لینا کوئی نئی بات نہ تھی چنانچہ اسمٰعیل عادل شاہ کی کم عمری میں کمال خاں نے اسی قسم کی کوشش کی تھی گو وہ ناکام رہا مگر اس کی مثال تو کامل خاں دکنی کے سامنے موجود تھی پھر کوئی وجہ نہیں کہ کامل خاں رفتہ رفتہ اپنے آپ کو مقتدر کر کے سلطنت کا مالک نہ بن جائے۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ کامل خاں کے ارادے سلطنت دبا لینے کے نہ تھے تو کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں اتنا با اقتدار بنا لینا چاہتا تھا کہ ابراہیم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اسے بآسانی اس کی حاصل کردہ قوت سے علٰحدہ نہ کر سکے کامل خاں کے غالباً بلکہ یقیناً یہی اغراض تھے ورنہ ان انوکھے انتظامات اور کارروائیوں کا کوئی تو نصب العین تھا اور کچھ تو غرض و غایت تھی جس کے لئے یہ کارستانیاں ہو رہی تھیں۔ بہر حال کامل خاں کے خواہ کچھ ہی ارادے کیوں نہوں مگر زیادہ عرصے تک وہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے میں مصروف نہ رہ سکا کیونکہ اس کے غرور اس کی سختیوں اور امراء کے ساتھ اس کے برے سلوک نے بہت جلد ملک میں اسے بدنام کر دیا۔ اکثر امراء و اعیان اس کے خلاف ہو گئے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے اور محض موقع کے متلاشی تھے کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔ یہ موقع بھی بہت جلد انھیں ہاتھ آیا۔ کامل خاں نے اپنی انتہائی ناعاقبت اندیشی سے چاند بی بی کو اپنا دشمن بنا لیا جو اس وقت ملک میں ممتاز ترین حیثیت رکھتی تھی اور غیر معمولی طور پر ہر دلعزیز تھی۔ اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے لگا اور اس کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ کامل خاں "از احتشام شراب استقلال دو روزہ بیخود و مغرور گشتہ بہ نسبت چاند بی بی در مقام بے ادبی شدہ و آں عفیفۂ دوراں و معصومۂ زماں آتش غضب و انتقام برافروختہ در صدد تضیع وے گردید"[1]۔ جب صورت حال یہ پیدا ہو گئی تو کامل خاں کا اور سلطنت پر زیادہ

[1] فرشتہ۔ مقالہ سوم، روضۂ دوم

عرصے تک حاوی رہنا مشکل ہوگیا جوں ہی چاند بی بی نے اُمرا کو اشارہ کیا سب کے سب کامل خاں کے مخالف اور اس کی بربادی کے درپے ہو گئے۔ سب سے پہلے چاند بی بی نے حاجی کشور خاں کو اپنی مدد پر طلب کیا۔[1] یہ شخص کمال خاں کا بیٹا تھا اور ممتاز ترین اُمرا میں شمار ہوتا تھا۔ چاند بی بی نے اُسے خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ "کامل خاں وکیل السلطنت نمکحرامی پر آمادہ ہے اس کی سخت گیریوں اور گستاخیوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس کو اس عہدے سے الگ کر کے تجھے فائز کروں۔ لہٰذا اگر کچھ ہمت مردانہ رکھتا ہے تو کامل خاں کی نمکحرامیوں اور بدعنوانیوں سے ملک کو نجات دے ورنہ بہتر یہ ہے کہ زنانہ لباس پہنکر چرخہ اور پونی لیکر خانہ نشین ہو جا۔"[2]

کشور خاں کو جب یہ پیام پہنچا تو اس کو خوشی بھی ہوئی اور کچھ شرم بھی آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ کامل خاں کو نائب السلطنتی کے عہدے سے برطرف کر دے، چنانچہ اس نے اپنے ارد گرد چند ہمخیال لوگوں کو جمع کر لیا جو ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے اس خفیہ سازش کی خبر کامل خاں کو بھی پہنچ گئی مگر اس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اور اسکی بربادی کے دن قریب آچکے تھے کہ باوجود اطلاع ہونے کے نہ اس نے اس سازش کے تدارک کے لئے ہی کچھ انتظام کیا اور نہ ہی اپنے طرز عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کی۔ اس کا غرور اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ دعویٰ کرنے لگا کہ "سازشی میرا کیا بگاڑ سینگے۔ سلطنت میری ہے اور میں سلطنت کا وارث ہوں وغیرہ۔"[3]

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] بساتین کے اسکے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔ "چاند بی بی لباس زناں وپنبہ وچرخہ پیش حاجی کشور خاں پسر کمال کشور خاں بزرگ فرستاد" ص ۱۵۴

[3] چنانچہ اسکی تفصیل تاریخ میں یوں درج ہے:۔ "باوجودیکہ اخبار بگوش کامل می رسد اصلا در پئے اصلاح نیامد بلکہ بازیچہ خیال کرد و با محرمان خویش گفت ببینید کہ مردم چہ ساں دنبال گرفتہ مرامی ترسانند وخیال کنند کہ من ازیں افسانہا ترساں شوم ودست از کار بردارم ایں چہ معنی دارد کناساں کہ از ارزال اقوام برائے میراث سروجاں فدامی سازند من چہ گونہ ازیں کار درگذرم ومضائقہ نکنم کہ وارث سلطنت منم وایں سلطنت میراث من است ازیں قسم مالیخولیات بسیاری گفت" بساتین السلاطین

کامل خاں ان خرافات میں مبتلا تھا کہ کشور خاں نے اس عرصے میں اپنی تدابیر کو عملی جامہ پہنا کر چار سو مسلح سواروں کے ساتھ قلعہ پر آدھمکا۔ اس وقت کامل خاں کاروبار سلطنت میں مشغول تھا اور سبز محل میں اجلاس کر رہا تھا۔ کشور خاں نے آتے ہی پہلے قلعدار کو گرفتار کیا۔ قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور پھر متوئی سلطنت کی تلاش میں سبز محل کا رُخ کیا۔ اسی اثناء میں کامل خاں کو معلوم ہو گیا کہ کشور خاں اس کی گرفتاری کے لئے چار سو سواروں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس نے فوراً حرم سرا کا رُخ کیا کہ وہاں جا کر پناہ لے اور چاند بی بی سے مدد کی درخواست کرے مگر راستے میں کسی خواجہ سرا نے اُسے آگاہ کیا کہ یہ ساری آگ چاند بی بی کی لگائی ہوئی ہے اور وہ تیرے خون کی پیاسی ہے۔ اسکے پاس جانا موت کے منہ میں جانا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی وہ ہراساں و پریشاں قلعہ کی دیوار پھاند کر خندق میں کود پڑا جو پانی سے لبریز تھی۔ بدقت تمام وہاں سے پیر کر کنارے پر پہنچا۔ ابھی اسکی زندگی کے چند گھنٹے باقی تھے راستے میں کسی نے اُسے پہچانا نہیں وہ چھپتا، چھپاتا شہر کے دروازہ امام تک پہنچ گیا۔ مگر بد قسمتی سے دروازہ بند تھا اب باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ۱۲ گز دیوار کا پھاندنا آسان کام نہیں تھا بڑی مشکلوں سے دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے اپنی دستار کمر بند اور شال سے رسّی کا کام لیکر اس کو دیوار کے ایک کنگرہ سے مضبوط باندھ دیا اور اس کے ذریعے نیچے اُتر پڑا۔ غرض وہ ان مشکلوں سے اپنی جان بچا کر فی الحال کشور خاں کے سپاہیوں کے نرغے سے نکل تو گیا مگر اس کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے گھر پہنچ کر سات آٹھ سپاہیوں کیساتھ احمد نگر کو فرار ہو رہا تھا اور ابھی چار میل طے کرنے نہ پایا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور وہیں اس کو قتل کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے بہادری سے جان دی اس طرح کامل خاں کا زمانۂ حکومت اس کی سخت گیریوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ مشکل سے دو مہینے دس روز اس نے حکومت کی ہوگی کہ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

کامل خاں کا کیرکٹر کامل خاں کے جو حالات اوپر دیئے گئے ہیں اُن کے مطالعے سے اسکے کیرکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے محض ایک تھانہ دار کی حیثیت سے ترقی کی اس کی ذاتی کوششوں اور

اور محنتوں کی مرہون منت ہے۔ علی عادل شاہ کو اُس نے اور اُس کے خُسر نے بادشاہ ہونے میں کیا مدد دی کہ اُن کی قسمت جاگ اُٹھی۔ یوں بھی کامل خاں کا خُسر مرج کا قلعدار ہونے کے اعتبار سے خاصا رسوخ رکھتا تھا اس زمانے میں قلعداری کا عہدہ نہایت اہم تصور کیا جاتا تھا قلعدار کے ماتحت، قلعہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تھوڑی بہت فوج رہتی تھی اور وہ قلعہ کی حفاظت کا ذمہ دار تصور کیا جاتا تھا۔ کامل خاں کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے اُسے ایک ایسا موقع عطا کر دیا کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے ترقی کی یعنی علی عادل شاہ کا زمانۂ شہزادگی میں قید کیا جانا اور وہاں (قلعہ مرج) میں کامل خاں کی موجودگی اس کی اور اس کے خُسر کی کوششوں سے علی عادل شاہ کا بادشاہ ہونا، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ بادشاہ کو اپنے محسن کا بڑا خیال ہو گیا چنانچہ اسی بنا پر اُسے اس قدر جلد ترقی عطا کی گئی اور زمرۂ اُمرا میں شامل کر لیا گیا۔ جاگیریں دی گئیں، مناصب عطا ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ ترقی کرتا گیا اُسی اعتبار سے اُس میں خشونت و رعونت پیدا ہوتی گئی وہ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت سخت اور برا برتاؤ کرتا تھا اور اُس کی خصوصیت یہ تھی کہ کم لوگوں کو خوش کرتا اور زیادہ سے بیر رکھتا اور ان کو اپنا دشمن بنا لیتا تھا۔ یہی خصوصیات دراصل اُس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اپنی جاگیر میں بے وجہ ایک سید زادہ کو محبوس کر دینا اور اس کے خاندان پر ظلم و ستم کرنا (جس کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے) اُس کی بدمزاجی و ستم آرائی کی دلیل ہے اگر رفیع الدین شیرازی کے بیان کردہ واقعہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت کینہ پرور بھی تھا اور اپنے بادشاہ، اپنے آقا اور اپنے محسن کا قاتل ٹھہرتا ہے۔ متولی سلطنت ہو جانے کے بعد سے اسکی بدمزاجیوں اور سخت گیریوں میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ تمام اعیان و ارکان دولت میں وہ ہر دلعزیز نہ تھا اگرچہ اس کے حوصلے بڑے اور ارادے اونچے تھے جن کو عملی جامہ پہنانے میں وہ سخت ناکام رہا۔ اس کی بعض کارروائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سیاست دانی اور تدبر کا مادہ کم تھا معاملہ فہمی اور موقع شناسی کی خصوصیات ایسے شخص میں قطعاً ضروری ہیں جس کے ہاتھ میں

نظم ونسق سلطنت ہو۔ اور یہ خصوصیات کامل خاں میں مفقود تھیں اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ
جس وقت اس کو یہ خبر لگی کہ کشور خاں اُس کے مقابلے کے لئے تیار ہو رہا ہے تو بجائے اسکے کہ
اُس کی سازش اور اُس کی کوشش کا ابتدائی منازل میں خاتمہ کر دیا جاتا اس نے اپنے دشمنوں کو
اتنا موقع دیدیا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم کر لیں۔ علاوہ ازیں کوئی ہشیار اور باتدبیر وزیر اس
ابتدائی زمانے میں جبکہ اس کے پیر اچھی طرح جم نہ سکے ہوں، ایک ہر دلعزیز اور باوقار ملکہ سے
بگاڑ اور دشمنی پیدا نہیں کر لیتا مگر کامل خاں کی یہ سراسر حماقت اور انتہائی نا عاقبت
اندیشی تھی کہ اس نے چاند بی بی جیسی حیثیت والی ملکہ کو اپنا دشمن بنا لیا قبل اس کے کہ
اس کے مقابلے کی تاب اُس میں پیدا ہو جائے۔ غرض بحیثیت مجموعی کامل خاں کے کیرکٹر کے متعلق
یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کا شوقین، دولت کا لالچی، تدبر سے عاری، موقعہ شناسی اور
معاملہ فہمی کے نازک اصولوں سے ناواقف تھا مگر ان کمزوریوں کے مقابلے میں اُس میں بہادری
اور حوصلہ مندی کے جذبات کی کمی نہ تھی۔ گو سخت گیریوں اور نا عاقبت اندیشیوں کی
وجہ سے اس کا کام بگڑ گیا مگر بہادری، حوصلہ مندی اور دیگر ایسی خصوصیات میں وہ اپنے
زمانے کے کسی آدمی سے شاید ہی کم ہوگا۔ دراصل بلند حوصلوں اور ذاتی بہادری نے ہی
اُسے اُس رتبہ تک پہنچایا مگر نا عاقبت اندیشی، خشونت، رعونت اور بد دماغی نے اُسکی
مٹی برباد کی۔

متولیان ریاست

باب چہارم

کشور خاں

کشور خاں کا عروج

حاجی کشور خاں کمال کشور خاں کا بیٹا تھا[1] کمال کشور خاں نے علی عادل شاہ کے زمانے میں بڑے کارہائے نمایاں کئے تھے۔ اسی کے صلہ میں بادشاہ نے اُسے اسد خاں[2] لاری کے منصب اور علم سے سرفراز کیا تھا۔ اور اُس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس طرح سے وہ عالی مرتبت اور بلند پایہ اُمرائے سلطنت میں شمار ہونے لگا تھا مگر علی عادل شاہ کے زمانے میں ہی مرتضیٰ نظام شاہ کے مقابلے میں قلعہ دھارور میں مارا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں اُس کے بیٹے حاجی کشور خاں کو عروج نصیب ہوا۔ کیونکہ چاند بی بی نے کامل خاں کو منصب وکیل السلطنت سے علیٰحدہ کرنے کے لئے اس کو اپنی مدد پر طلب کیا تھا۔ اور وہ کامل خاں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔

منصب وکالت کے مختلف دعویدار

جب کامل خاں قتل ہو گیا تو منصب وکالت کے بارے میں جھگڑے پیدا ہو گئے اسلئے کہ اُس وقت اس منصب کے چار پانچ دعویدار تھے۔ سب سے پہلا دعویدار تو کشور خاں ہی تھا اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اسی کی کوششوں سے کامل خاں دکنی کا خاتمہ ہوا تھا۔ اور خود چاند بی بی نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کامل خاں دکنی کو منصب پیشوائی سے (عموماً بیجاپور میں پیشوائی اور وکیل السلطنت کے عہدے مترادف سمجھے جاتے تھے یا بالفاظ دیگر ایک ہی عہدے کے یہ دو مختلف نام تھے) معزول کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو اُسے خود اس اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جو الفاظ چاند بی بی نے اُسے کہلا بھجوائے تھے وہ یہ تھے "کامل خاں لایق منصب جلیل القدر وکالت نیست و

[1] کشور خاں ابن کمال کشور خاں" بساتین السلاطین۔

[2] یہ وہ اسد خاں لاری ہے جو کہ دکن میں ایک خاص شخصیت تھی اور ابراہیم اول کے دور کا اک بلند پایہ امیر تھا۔

ایں میراث پدر نیست ۔ بتو رجوع نمودم[1] براں متصرف شو۔"

چاند بی بی کے ان وعدوں سے کشور خاں کی ہمتیں بڑھ گئیں تھیں، اور اس نے اسی امید پر سرگرمی دکھائی تھی کہ وہ کامل خاں کے بعد پیشوائے سلطنت مقرر کیا جائیگا مگر جب یکبارگی کامل خاں نکال دیا گیا اور اس کا قتل عمل میں آیا تو اس عہدے کے نئے نئے دعویدار پیدا ہو گئے، اور لطف یہ کہ اُن کے ان دعوں سے اغماض اور لاپروائی اس لئے برتی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ طاقتور اور جلیل القدر اُمرائے دولت عادل شاہیہ سے تھے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں (۱) مرتضیٰ خاں انجو۔ (۲) شاہ قاسم جو مرتضیٰ کا بھائی تھا۔ (۳) غالب خاں سرنوبت۔ (۴) اور معتبر خاں ان چار پانچ دعویداروں میں رات بھر خوب بحثا بحثی رہی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا تمام اُمرا اور اعیان دولت بھی اس مجلس مشاورت میں شریک تھے۔ ان چار پانچ دعویداروں میں ایسی معاصرانہ چشمکیں رقابتیں اور دشمنیاں تھیں کہ کچھ بنائے نہیں بن پڑتا تھا، اور اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کس شخص کو کس عہدے اور کس منصب پر فائز کیا جائے۔ غرض ان کج بحثوں میں چار پانچ روز گزر گئے مگر ہنوز روز اول کا مضمون تھا کوئی اطمینان بخش تصفیہ کی امید ہی نہ تھی حتیٰ ایں کہ ان میں آپس میں کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ افضل خاں جو اک نہایت ہی دانا اور ہشیار آدمی تھا اور ان تمام جھگڑوں سے خود کو علیحدہ رکھا تھا مگر گھر بیٹھے سب کی خبر رکھتا تھا جب کشور خاں نے دیکھا کہ معاملات دن بدن ابتر ہی ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے سلجھاوے کی کوئی امید نہیں تو خفیہ طور پر اک اندھیری رات افضل خاں کے گھر پہنچا اور التماس کیا کہ "میں تربیت یافتہ و لطف پرورده عالیجناب ہوں۔ مجھے آپ کی شاگردی کا بھی فخر حاصل رہا ہے، اور اس وقت میرا بنا بنایا کام بگڑا جا رہا ہے آپ ایسے وقت میں میری مدد فرمائیں، اور کچھ استادانہ شفقت سے کام لیں کیونکہ اس وقت میرے دوست بھی دشمن ہو چلے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آپکے اعزازات اور اثرات ایسے ہیں کہ آپ کی مدد سے میرا کام بن سکتا ہے۔" جب افضل خاں نے ان تمام گزارشات کے

[1] ۔ فرشتہ و بساتین السلاطین ۔ الفاظ بساتین السلاطین کے ہیں۔

باوجود بھی کوئی توجہ نہیں کی تو کشور خاں نے کہا کہ آپ اس ریاست ابد مدت کے نمکخوار قدیم ہیں اور ریاست کے لئے یہ وقت نہایت نازک ہے کئی مارہائے آستین موجود ہیں جو سلطنت کی کشتی ہی الٹ دینا چاہتے ہیں اگر اسوقت بھی کنارہ کشی کی جائے تو انتہائی نمک حرامی ہوگی۔ غرض بڑی دیر سمجھانے کے بعد افضل خاں راضی ہوگیا اور کشور خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب دوسرے دن پھر مجلس مشورت منعقد ہوئی تو غالب خاں نے (جو کشور خاں سے مل گیا تھا) مرتضیٰ خاں انجو اور اس کے بھائی شاہ میر قاسم کو مجلس سے اٹھا کر ایک طرف کو لے گیا جیسے کوئی راز کی بات کہنی ہو۔ دراصل یہ سازش تھی جو کشور خاں نے آپس میں کرلی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مخالفوں کو دھوکہ میں لاکر کسی طرح قید کرلیں اس وقت مخالف فریق کے رہبر مرتضیٰ خاں انجو اور شاہ قاسم تھے اسی غرض سے غالب خاں نے اپنی سکھائی پڑھائی تدبیر پر عمل کر کے عین مجلس میں یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ دونوں خالی الذہن تھے اس کے دھوکہ میں آگئے اٹھ کر ساتھ ہولئے، وہاں تو پہلے ہی سے انتظام تھا جیسے ہی ان دونوں نے اس مقام سے قدم باہر رکھا جہاں پر کہ مجلس مشورت منعقد ہورہی تھی وہ قید کرلئے گئے۔ دو تین دن کے بعد ان کو پابزنجیر کر کے قلعہ روانہ کردیا گیا۔ جب ان دو زبردست دشمنوں پر قابو پالیا گیا تو پھر میدان صاف تھا معتبر خاں اور اس کے بیٹوں کو جلا وطن کردیا گیا۔ یہ جو یہاں سے فرار ہوا ہے تو پھر اکبر بادشاہ کے ہاں پہنچکر ہی اس نے پناہ لی۔ اس طریقے سے اس سازش کی بدولت کشور خاں کے مخالفوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ پیشوائی کے عہدے کو اپنے قبضے میں کر کے معاملات ملکی کی طرف متوجہ ہوا۔ چاند بی بی نے بھی اس کی پیشوائی کو تسلیم کرلیا۔

سازش منصب وکالت کے بارے میں جو بحث طول کھینچی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان امراء کے خیالات میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ مخالف گروہ یہ چاہتا تھا کہ سرے سے نئے انتظامات عمل میں آئیں۔ یہ ایک قسم کی سازش تھی جو کمسن بادشاہ ابراہیم کے خلاف کی جارہی تھی۔ اس خفیہ سازش کا علم کشور خاں کو ہوگیا تھا اور اس سازش کے ممد و معاون وہی لوگ تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا یعنی مرتضیٰ خاں انجو شاہ قاسم معتبر خاں وغیرہ۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ابراہیم اور اس کی والدہ کو مکہ معظمہ روانہ کردیا جائے اور ابراہیم کو معزول کر کے اس کی جگہ پر "میاں علی جو اسمٰعیل عادل خاں کا برادر زادہ" تھا تخت نشین کردیں اور ان ہواخواہان دولت کو

جو ابراہیم کے ساتھ وابستہ ہیں یا تو اُن کو مقید کیا جائے یا قتل کروا دیا جائے۔ چنانچہ اُن کا ارادہ تھا کہ شاہ فتح اللہ[1] کو (جن کی اس زمانے میں ایک غیر معمولی شخصیت تھی) قلعہ میں محبوس کر دیا جائے! افضل خاں کو قتل کروا ڈالیں۔ رفیع الدین شیرازی سے جو حوالداری خزانہ کے عہدے پر مامور تھا خزانہ کے حسابات طلب کریں اور اُس کا مواخذہ کریں۔ اور مرتضیٰ خاں آنجو کو پیشوا مقرر کیا جائے۔ شاہ قاسم اور کشور خاں کو وزیر السلطنت مقرر کیا جائے! اور باقی مناصب باعتبار حیثیت دوسرے اُمرا اور ارکان میں تقسیم کر دئیے جائیں۔ مگر کشور خاں کو یہ انتظام منظور نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب یہ مستحکم ہو جائیں گے تو پھر اُسے اس طرح نکال باہر کریں گے جس طرح کامل خاں نکال دیا گیا اور پھر اُسے یہ بھی منظور نہ تھا کہ اصلی وارث تخت و تاج کیساتھ یوں نمکحرامی کی جائے جو کفران نعمت کے مماثل ہو گی۔ غرض اُن کی یہ کوششیں کامیاب ثابت نہ ہوئیں کیونکہ افضل خاں اور کشور خاں میں بر وقت اتحاد ہو گیا اور غالب خاں نے ایسے نازک موقع پر کشور خاں کا ساتھ دیا کہ مخالفین کی جد و جہد بے سود و بیکار ثابت ہوئی۔ افضل خاں ان اندرونی واقعات سے قطعاً بے خبر تھا لیکن جب کشور خاں افضل خاں کی مدد سے اپنے دشمنوں پر غالب ہو گیا تو اس نے اُسے یہ سارا احوال کہہ سنایا اور بتلایا کہ ہم وفاداران سلطنت کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ یہ بدخواہ اور بدانجام اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے۔

کشور خاں کا منصب وکالت پر فائز ہو کر معاملات ملکی کی طرف توجہ کرنا	جب اس طرح کشور خاں کے دشمنوں کا خاتمہ ہوا تو وہ بلا خوف و بلا کھٹکے منصب وکالت پر فائز ہو گیا اور اس کے بعد ہی وہ معاملات ملکی کے

سنبھالنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت کاروبار کا سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑے اُمرا جن سے ایسے نازک دقتوں میں مدد ملتی ہے اور جن کے محض وجود سے دل کو ڈھارس رہتی ہے ایسی نمکحرامی پر کمر باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اُن کو معاملات سلطنت سے بیدخل

---

[1] تاریخ قطب شاہی کے الفاظ اس شخص کے متعلق یہ ہیں: "شاہ فتح اللہ شیرازی کہ سرآمد دانشوران روزگار بود۔" مصنفہ قادر خاں بیدری۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

کر دیا گیا تھا۔ اب کشور خاں کو نہ صرف اندرون ملک میں دشمنوں اور بد خواہوں کو قابو میں رکھنا تھا بلکہ ہمسایہ ریاستوں کی دست درازیوں کی روک تھام بھی کرنی تھی اور تن تنہا ان تمام امور ہائے سلطنت کی انجام دہی بغیر کسی حامی و مددگار کے سخت مشکل تھی۔ اس وجہ سے پھر کشور خاں نے افضل خاں کو اپنا ہمخیال بنایا اور اُسے مجبور کیا کہ ایسے وقت میں وہ معاملات ملک سے کنارہ کش نہو۔ افضل خاں نے ہر چند بہانہ کیا کہ صحت ٹھیک نہیں ضعف و اضمحلال پیدا ہو چکا ہے۔ دل و دماغ اس قابل نہیں رہے کہ سلطنت کے اہم کاروبار انجام دے سکوں۔ مگر کشور خاں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ اور یہی کہے گیا کہ اس وقت ملک کو آپ جیسے اشخاص کی سخت ضرورت ہے۔ بالآخر اُسے بھی راضی کر لیا۔ افضل خاں نے کشور خاں کا جو یہ بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو اس نے مناسب یہی سمجھا کہ فی الحال اُس سے اتحاد برقرار و قائم رکھے اور بے وجہ ضرورت سے زیادہ انکار کر کے اس کو دشمن نہ بنالیا جائے۔ اور محض اسی مصلحت کی بنا پر اس نے کشور خاں کی بات مان لی اور سلطنت کی اہم اور ذمہ دارانہ مہمات کی انجام دہی کا بیڑا اُٹھایا۔

عادل شاہی سرحد پر نظام شاہی قطب شاہی حملے۔

قاعدے کی بات ہے کہ جب اندرون ملک میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو بیرونی دشمن ایسے موقعوں کو غنیمت سمجھ کر اُس سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جب بیجاپور کی ہمسایہ ریاستوں کو اس کی خبر لگی کہ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ملک میں سخت بد انتظامی اور اُمرائے سلطنت میں نا اتفاقی ہے تو فوراً ہر ایک نے تھوڑی تھوڑی فوج بھیجکر بیجاپور کے سرحدی علاقوں کو اپنے قبضے میں لانے کا عزم کیا۔ سب سے پہلے قطب شاہ[1] نے دست تصرف دراز کیا اس وقت

[1] ان قطب شاہی حملوں کا تاریخ فرشتہ میں ذکر نہیں چونکہ تحفتہ الملوک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حملوں کی ابتدا قطب شاہیوں کی طرف سے ہوئی اس لیے انکی تفصیل تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری (قلمی نسخہ) سے لیگئی۔ فرشتہ نے کشور خاں کے عہد میں جو بیرونی حملے ہوئے اُنکے متعلق لکھا ہے کہ پہلے احمد نگر نے بیجاپور کی سرحد پر چڑھائی کی، مگر ان قطب شاہی کوششوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔

گولکنڈہ میں ابراہیم قلی حکمراں تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ پرگنہ کاکن، ناکاوی، کلورو، کوڑولی کے علاقے جو شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے اور جن پر عادل شاہی حکومت کا قبضہ ہوگیا تھا ازسرنو قطب شاہی عملداری میں داخل کر لئے جائیں اور ان کی تسخیر عمل میں آئے۔ اس غرض سے اُس نے امیر زنبیل کی سپہ سالاری میں اک بڑی بھاری فوج روانہ کی جس میں عالم خاں کشور خاں اور حیدر خاں جیسے بہادر اور مرد میدان موجود تھے۔ اس وقت ان علاقوں پر بیجاپوری حکومت کی جانب سے میاں بدو وضیاد دولت خاں کارفرما تھے۔ قطب شاہی افواج کی آمد کی خبر سنکر انھوں نے لڑائی کی تیاریاں کیں اور کچھ مقابلہ بھی کیا۔ مگر شکست کھاکر بھاگ گئے۔ اور اس علاقے پر امیر زنبیل متصرف ہوگیا۔ مفتوحہ علاقوں میں کچھ سرسری انتظامات سے فراغت پاکر وہ اور آگے کی طرف بڑھا اسی اثنا میں اُسے معلوم ہوا کہ ساگر سے ڈیڑھ سو[۱۵۰] ہاتھی بیجاپور کو لیجائے جا رہے ہیں اُس نے فوراً تاخت کی اور یلغار کر کے وہاں پہنچا کہ ہاتھیوں کو اڑالائے۔ عادل شاہیوں کو اس کی خبر لگ گئی کہ امیر زنبیل ہاتھیوں کی غرض سے بڑھتا چلا آرہا ہے تو انھوں نے بھی ہشیاری کی فوراً ہاتھیوں کو لیکر قلعہ میں محصور ہوگئے۔ سید اشرف نے جو اس قلعہ کا حاکم تھا معہ دو برگی سرداروں اور تین چار ہزار سواروں کے قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ مگر اُس کو شکست ہوئی اور عادل شاہی فوج کو بہت نقصان پہنچا۔ سید اشرف دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگیا قطب شاہیوں نے سید اشرف کو شکست تو دے دی مگر چونکہ ساگر کا قلعہ نہایت مضبوط تھا اُس پر قابض نہو سکے اس ناکامی کا امیر زنبیل نے یوں بدلہ لیا کہ شہر ساگر کو جلاکر خاک کر ڈالا۔ اس کے بعد ملکھیڑ اور اتگیر کی طرف توجہ کی اور ان کو بھی فتح کر لیا۔ اسطرح قطب شاہیوں کا اُن تمام علاقوں پر قبضہ ہوگیا جو شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ان فتوحات کی اطلاع امیر زنبیل نے اپنے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کو دی۔ بادشاہ اُس کی کامیابیوں سے بہت خوش ہوا۔ ادھر امیر زنبیل تو اپنے بادشاہ کی خوشنودی کی غرض سے یہ کامیابیاں حاصل کر رہا تھا ادھر بیجاپور کی حالت ان حملوں کی وجہ سے خطرناک ہوتی جارہی تھی جب کشور خاں نے دیکھا کہ سرحد خطرہ میں ہے اور دشمن ملک کی افراتفری سے فائدہ اُٹھاکر مقبوضات عادل شاہی پر قبضہ جما رہے ہیں تو فوراً اُس نے افضل خاں کی

سرکردگی میں ایک بڑی بھاری فوج روانہ کی کہ ان حملہ آوروں کی سرکوبی کی جائے۔ افضل خاں سب سے[1]
پہلے قطب شاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ فوجیں مقابل میں آکر پڑی ہوئی تھیں چند روز تک کوئی جنگ
نہیں ہوئی! البتہ بعض مقامات پر اتفاقی طور پر جھڑپ ہو جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افضل خاں
قصداً جنگ کو ٹال رہا تھا کیونکہ اُسے امدادی فوج کا انتظار تھا غرض جب تک عین الملک آنکس خاں اور
اُمرائے حبش میں سے اخلاص خاں، حمید خاں اور دلاور خاں نہیں آگئے[2] باقاعدہ طور پر جنگ کا سلسلہ
شروع نہیں ہوا۔ جب یہ لوگ اپنی فوجوں کے ساتھ افضل خاں سے آملے تو عادل شاہی فوج لڑائی کیلئے
تیار ہوگئی! ادھر سے قطب شاہیوں نے بھی پیشقدمی کرنی شروع کی۔ دونوں فوجوں کا خوب زبردست
مقابلہ ہوا افضل خاں کی دانائی و ہشیاری سے میدان بیجاپوریوں کے ہاتھ رہا۔ اور قطب شاہی فوج
ایسی سراسیمگی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگی ہے کہ اُسے اپنے مال و اسباب کی تک فکر نہ رہی۔[3]
یہ سب مال و اسباب بہت سارے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اس لشکر ظفر پیکر کے قبضے میں آ گئے،
جب افضل خاں کو ان قطب شاہیوں سے فرصت ملی تو وہ فوراً دیگر اُمراء و عمائدین کی رائے سے

---

[1] ۔ تحفۃ الملوک۔

[2] ۔ بساتین السلاطین۔ تاریخ فرشتہ میں ان حملوں کے سلسلہ میں افضل خاں کا ذکر نہیں آتا۔

[3] ۔ اس شکست کا حال تاریخ قطب شاہی میں درج نہیں بلکہ اس زمانے میں قطب شاہیوں کی
جانب سے بیجاپور پر جو حملے ہوئے ہیں اُن کی تفصیل کچھ اور طریقے سے ہی دی گئی ہے۔ اس سے واضح
ہوتا ہے کہ امیر زنبیل اپنی اُن کامیابیوں کے بعد جن کا ذکر کیا گیا ابراہیم کے حکم سے اُس فوج سے ملحق
ہوگیا جو اس وقت خاص بیجاپور پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ اس کے مطابق اس وقت بیجاپور کا محاصرہ
کیا جا رہا تھا۔ اور نظام شاہی فوج بھی قطب شاہیوں کی مدد کے لئے موجود تھی لیکن یہ واقعات
بہت بعد کے ہیں جو دراصل اخلاص خاں کے عہد حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ صاحب تاریخ قطب شاہی
نے ان سب کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی ص (۲۷۶-۲۷۵) قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

نظام شاہی فوج کی طرف متوجہ ہوا[1] اس لئے کہ احمد نگر کی جانب سے پندرہ ہزار کی فوج بہزاد الملک کی سرکردگی میں بیجاپور کی طرف آرہی تھی۔ اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمران تھا۔ اس کو ایک نہایت ہی دانا اور قابل وزیر صلابت خاں مل گیا تھا جس کے تدبر اور حسنِ انتظام نے ملک کو بہت فائدہ پہنچایا۔ جب صلابت خاں نے دیکھا کہ بیجاپور اپنی اندرونی الجھنوں میں اس قدر حیران و پریشان ہے کہ اگر اس وقت اس پر کوئی بیرونی آفت نازل ہو تو اس میں مقابلہ کی تاب نہ ہوگی۔ اور نہایت آسانی سے اکثر علاقوں کو اپنے قبضہ میں لایا جا سکتا ہے تو اس نے اپنے بادشاہ کو سمجھایا کہ اس موقعہ کو خدا کی دین سمجھنا چاہیئے اور اپنے قدیم حریف سلطنت سے اگر بدلہ لینے کا کوئی وقت ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اور خاص طور پر یہ بھی یاد دلایا کہ علی عادل شاہ نے احمد نگر کے خلاف علی برید کی مدد کی تھی[2]۔

---

[1] برہان آثر سے واضح ہوتا ہے کہ نظام شاہی اور قطب شاہی حملہ کی ابتدا قریب قریب ایک وقت میں ہی ہوتی ہے۔ اور حملہ آوروں کا ارادہ یہ تھا کہ پہلے دونوں فوجیں ملحق ہو جائیں اس کے بعد جنگ کا آغاز ہو مگر عادلشاہیوں نے قبل اسکے کہ یہ دونوں فوجیں ملحق ہوتیں قطب شاہیوں کا راستہ روک لیا اور انکو شکست دی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد نظام شاہیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

[2] مرتضیٰ نے بیدر کو فتح کرنے کی غرض سے اس چھوٹی سی ریاست پر حملہ کر دیا اور قطب شاہیوں سے مدد بھی لی۔ علی برید نے علی عادل شاہ سے مدد طلب کی۔ عادل شاہ نے علی برید کو مدد تو دی مگر اس شرط پر کہ وہ دو حسین خواجہ سرا جو اس کے پاس موجود ہیں بیجاپور روانہ کر دیئے جائیں۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد بیجاپوری فوج بیدر کا محاصرہ اٹھانے کی غرض سے اس طرف روانہ ہوئی مگر اسی اثناء میں علی عادل شاہ کا قتل عمل میں آیا اور یہ فوج واپس ہو گئی۔ مگر جب بیجاپور کے حالات ٹھیک ہو گئے تو بیدر کی مدد کے لئے پھر بیجاپور سے فوج آئی۔ اس طرح مرتضیٰ نظام شاہ کے بیدر سے جو منصوبے تھے وہ پورے نہ ہو سکے۔ صلابت خاں نے اس وقت یہی چیز یاد دلائی۔ تاریخ قطب شاہی۔

اس کی کمک کی وجہ سے بیدر پر احمد نگری منصوبے کامیاب ہوسکے۔ مرتضٰی نظام شاہ بھلا کب ایسی باتوں سے چوکنے والا تھا اس نے اپنے وزیر کو اجازت دے دی کہ ایک فوج بیجاپور روانہ کر دی جائے[1] چنانچہ بہزاد الملک نے صلابت خاں کے حکم سے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بیجاپور پر چڑھائی کی۔ ادھر سے بیجاپور کی ایک زبردست فوج بھی[2] اس حملے کی مدافعت کے لئے آپہنچی۔ بہزاد الملک ایک نوجوان ناتجربہ کار اور مغرور جنرل تھا اس نے غالباً ایک چرکسی[3] غلام کی حیثیت سے ترقی کی تھی یعنی نظام شاہیوں نے شولاپور کا رُخ کیا۔ اور راستہ میں تاخت وتاراج اور لوٹ گھسوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ جس کی وجہ سے عادل شاہی علاقوں میں سخت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ غرض یہ صورت حال تھی کہ نظام شاہی اور عادل شاہی فوجوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ مگر قبل اس کے کہ اس جنگ کے حالات بیان بیان کئے جائیں، بہزاد الملک کے کیرکٹر اور اس کی پوزیشن پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

صلابت خاں نے اپنی اُس ذاتی دشمنی کی بنا پر جو اُسے سید مرتضٰی امیر الامرائے برار سے تھی (جو اس وقت احمد نگر کا ایک نہایت ہی زبردست جنرل تھا) بہزاد الملک کو اس کی بجائے سپہ سالار فوج بنایا تھا، یہ ایک کم عمر نوجوان تھا اس لئے دوسرے تجربہ کار اور بوڑھے سردار اسکی سرداری کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو صلابت خاں کو اس امر کا احساس

---

[1] ۔ برہان مآثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ حملے سے پہلے مرتضٰی نظام شاہ نے ایک سفیر گولکنڈہ روانہ کیا تاکہ اس ریاست سے اتحاد ہو جائے اور پھر دونوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں سے بیجاپوری علاقوں کی تسخیر عمل میں لائی جائے۔

[2] ۔ برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ کشور خاں نے ۲۰ ہزار سوار افضل خاں کے ماتحت مدافعت کے لئے روانہ کئے اور ان دس ہزار سواروں سے ملحق ہونے کا حکم دیا جو بیدر کا محاصرہ اٹھانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

[3] ۔ فرشتہ۔ مگر برہان مآثر کے مصنف نے اُسے ایک ترک غلام لکھا ہے۔

ہوا کہ بہزاد الملک کی سپہ سالاری میں یہ مہم کامیاب نہ ہوسکے گی اس لئے اُس نے اپنے پہلے احکام کو منسوخ کرکے سید مرتضیٰ کو ہی سپہ سالار بنایا اور متعاقب روانہ کیا۔ ادھر بہزاد الملک کو احکام روانہ کئے گئے کہ سید مرتضیٰ کی آمد کا انتظار کرے[1] لیکن اُس نے ان احکام کی پروا نہ کی! اور بلا سوچے سمجھے جوانی کے نشہ و غرور میں چور ہو کر چاہا کہ بغیر سید مرتضیٰ کی مدد کے ہی دشمنوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور کامیابی کا سہرا اپنے ہی سر رہے۔ لہٰذا اُس نے جنگ چھیڑنے میں نہایت تعجیل کی! اور اُس طرف سید مرتضیٰ بہزاد الملک کے ابتدائً سپہ سالار بنائے جانے پر سخت بد دل ہو چکا تھا۔[2] وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے تحت رہ کر کام کرے۔ غرض اس آپس کی رقابت نے احمد نگری فوج کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا! ایک طرف بہزاد الملک کی عجلت دوسری طرف سید مرتضیٰ کی عمداً تعویق و تاخیر بالآخر احمد نگری افواج کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

سید مرتضیٰ کی تعویق سے عادل شاہیوں کو غیر معمولی فائدہ ہوا وہ یہ کہ وہ فوج جو اس وقت بیدر پر نامزد شدہ تھی نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ نظام شاہیوں کے مقابلہ کے لئے یہاں آملی۔[3] اس سے عادل شاہیوں کے دست و بازو اور بھی مضبوط ہو گئے۔ غرض دونوں فوجوں کا

---

[1] برہان مآثر۔ بہزاد الملک نے اس حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ ایک منزل پیچھے ہٹ گیا اور اس سے زیادہ پیچھے ہٹنا خلاف شان سمجھا۔ اور عین دشمن کے مقابلے میں عیش پرستیوں اور لہو و لعب میں مبتلا ہو گیا۔

[2] فرشتہ یہ نہیں بیان کرتا ہے کہ صلابت خاں نے بعد میں سید مرتضیٰ کو سپہ سالار بنا دیا۔ بلکہ اُسکے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت تک بہزاد الملک ہی سپہ سالار رہا اور اس وجہ سے سید مرتضیٰ سخت ناراض رہا۔ مگر برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ کو بعد میں سپہ سالار بنایا گیا۔ اور بہزاد الملک کی حماقت کی وجہ سے نظام شاہیوں کو شکست ہوئی۔ (ملاحظہ ہو برہان مآثر و تاریخ فرشتہ۔

[3] اس واقعہ کی حد تک برہان مآثر و فرشتہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

مقابلہ حوالی شاہ درگ موضع دار اسن میں ہوا جو نلدرگ اور شولاپور کے درمیان واقع ہے۔ عادل شاہی فوج کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ سید مرتضیٰ بددل ہے اور عمداً تاخیر کر رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے موقع کو غنیمت جان کر یکایک احمد نگری فوج پر حملہ کر دیا۔ نظام شاہی فوج کے پیر اکھڑ گئے اور اس بری طرح شکست ہوئی کہ بہزاد الملک کو اتنی فرصت نہ ہو سکی کہ اسلحہ زیب تن کر سکے۔ اس پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں اپنی جان بچا کر وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا، اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ بہزاد الملک میدان جنگ سے جو بھاگا ہے تو اس نے پھر سید مرتضیٰ کی فوج سے ملحق ہو کر ہی اطمینان کا سانس لیا۔ عادل شاہی امرار کو جو یہ غیر متوقع طور پر کامیابی حاصل ہوئی تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے شکست خوردہ لشکر کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا۔ اور ان کا بہت سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور بکثرت جنگی ہاتھی، گھوڑے اور بہت کچھ سامان حرب ان کے ہاتھ آیا۔ ان لوگوں نے اس کامیابی سے جو فرصت پائی تو بیدر کا رُخ کیا۔ بیدر میں نظام شاہی فوجیں محاصرہ کئے پڑی تھیں، علی برید تنگ ہوا جا رہا تھا۔ اس کی مدد کو تھوڑی سی فوج بیجاپور سے روانہ کی گئی تھی، مگر جب خود بیجاپور پر حملہ کا اندیشہ ہوا تو یہ لوگ افضل خاں اور امرائے حبش سے آملے تھے جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ اس لئے اب اس طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ بیدر کی طرف متوجہ ہوئے کہ نظام شاہیوں کا محاصرہ بیدر پر سے اٹھا دیں۔ جیسے ہی یہ فتحیاب لشکر بیدر کی طرف پلٹا ہے نظام شاہی فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ ان کو اس کی خبر ہو گئی تھی کہ بہزاد الملک کو بیجاپوریوں کے مقابلہ میں شکست فاش اٹھانی پڑی۔ اس سے ان کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں اور انھوں نے اس کو مناسب سمجھا کہ محاصرہ اٹھالیں اور سید مرتضیٰ کے لشکر سے پیوست ہو جائیں۔ اس طرح بیجاپور کی فوج کی آمد سے پہلے ہی بیدر کا محاصرہ اٹھ گیا اور علی برید کو خلاصی نصیب ہوئی۔

اب شکست خوردہ اور منہزم لشکر نظام شاہیہ قلعہ دھارور میں پناہ گزیں ہوا۔ افضل خاں کی خواہش تھی کہ گرما گرمی میں اس بددل و پست ہمت اور تھکی ماندی فوج کا تعاقب کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی آخری شکست دی جائے کہ اس کا بالکل خاتمہ ہی ہو۔ تاکہ بیجاپور کو احمد نگری آفت سے پوری پوری نجات ملے۔

مگر افضل خاں کی اس رائے سے دیگر افسران فوج کو اختلاف تھا، وہ چاہتے تھے کہ اس کاروائی کو یہیں ختم کر دیں اور پہلے گھر کے معاملات کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ دارالسلطنت سے متوحش اور پریشان کن خبریں آرہی تھیں، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پھر افق بیجاپور پر کچھ کالی کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں جو آنیوالے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں۔

لہذا یہ طے پایا کہ فی الحال شاہ درگ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو جائیں جہاں فوجوں کو ستانے کا موقع بھی مل جائیگا اور اُن کی نئی ترتیب و تنظیم بھی عمل میں آسکے گی۔ اس عرصے میں کچھ مزید تازہ دم فوج بھی انکی مدد کیلئے بیجاپور سے آسکتی ہے جس کے لئے درخواست کیگئی تھی اسطرح تازہ دم ہو کر از سرِ نو دشمن کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں مزید فائدہ یہ تھا کہ دارالسلطنت کے متغیر حالات کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اُسکے بعد یہ طے کرنا ممکن ہوگا کہ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ غرض ان مصلحتوں کی بنا پر بیجاپور کی یہ فوج قلعہ شاہ درگ میں پناہ گزیں ہوگئی۔

کشور خاں کا نیا طرزِ عمل عمائدین اور اُمراء کے ساتھ بدسلوکیاں

کشور خاں کو جب پے در پے ان کامیابیوں کی خبریں آئیں تو وہ بہت خوش ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ اُس کی خوشی غرور سے متبدل ہونے لگی۔ اب وہ پوری پوری طرح معاملاتِ ملکی پر حاوی ہو چکا تھا۔ تمام کاروبارِ سلطنت اُس کے ہاتھ میں تھے۔ بادشاہ کمسن تھا، ملک کے بڑے بڑے اُمراء اور سپہ سالار اُس کے حکم سے مشغولِ کار تھے اور ان جنگوں میں انھیں کامیابیاں بھی ہو رہی تھیں۔ ملک میں اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُس کی مخالفت پر کمر باندھ سکتا اس لئے ہر طریقے سے وہ مقتدر و مستحکم ہو چکا تھا۔ قاعدے کی بات ہے جیسے جیسے انسان ترقی کرتا ہے اور اُس کی عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے اُسی قدر اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ قدرت نے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ جس قدر اُس کی امیدیں اور آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں اُسی قدر اُن میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جوں جوں کشور خاں کے اقتدار میں ترقی ہوئی گئی اُسی قدر وہ مزید طاقت حاصل کرنیکا خواہشمند ہوا۔ متولی اور مختارِ سلطنت ہو جانا ہی کوئی معمولی ترقی نہ تھی۔ یہ ایک ایسا عہدہ ہے کہ اسکے بعد ترقی کا اگر کوئی زینہ ہے تو وہ بادشاہت کا ہی ہے۔ کشور خاں پیشوائے سلطنت تو تھا ہی۔ پورے پورے اختیارات اُس کے ہاتھ میں تھے۔ کوئی اُس کا مخالف نہ تھا۔ اب اپنے اقتدار و استحکام میں مزید کوشش کے

دو معنی ہو سکتے ہیں، یا تو یہ کہ اس کے بعد ترقی کا جو زینہ ہے وہ حاصل ہو جائے یا ایسے مستحکم اور مضبوط طریقے سے اُس کے پیر گڑھ جائیں کہ کوئی اُسے اس منصب سے جدا نہ کر سکے خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ کامل خاں نے بھی یہی کیا تھا۔ مگر اُس کو ناکامی ہو چکی تھی۔ اب کشور خاں بھی اُس کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور اُس کی پیروی کر رہا تھا۔ چونکہ دونوں کا مقصد ایک تھا لہٰذا اس مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے دونوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اُس کا بھی ایک ہونا لازمی تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشور خاں نے بھی بڑے بڑے عہدوں اور مناصب جلیلہ پر اپنے آدمی بھرنے شروع کئے۔ بڑی بڑی قلعداریاں اپنے ہوا خواہوں میں تقسیم کر دیں۔ قدیم وفادار اور جان نثاران ریاست آہستہ آہستہ علیحدہ کئے جانے لگے۔ اور اُن کی جگہ پر کشور خاں نے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کو فائز کرنا شروع کیا۔ غرض یہ ایسا طرز عمل تھا جس سے ہر بہی خواہ سلطنت کو تشویش ہونی لازمی تھی۔ اُس نے چاند بی بی جیسی با اقتدار اور با اثر ملکہ کو بھی بے دست و پا کر دیا۔ اور یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ بغیر کشور خاں کے حکم کے چاند بی بی کی ایک نہ چلتی تھی۔ مختصر یہ کہ اُس نے اپنے آپ کو ہر طرح مستحکم کر لیا اور مزید استحکامی تدابیر میں مشغول تھا۔ اس پالیسی کی وجہ سے اکثر امرا و اعیان سلطنت اُس سے ناراض ہو رہے تھے۔ اور اُس کی ان کارروائیوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مبتولی کا یہی وہ طرز عمل تھا جس کی بنا پر سرداران فوج نے اپنی جنگی کارروائیوں کو ملتوی کر دیا تھا اور اس فکر میں تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

کشور خاں کا یہ غلط طرز عمل یہیں تک پہنچکر رُک جاتا تو شاید ایسی زیادہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔ مگر اُس نے کہیں اس سے بھی زیادہ پیر پھیلائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ دو ایسی حرکتیں اُس نے ایسی کیں جو خود اُس کی بربادی کا پیش خیمہ بن گئیں۔

جب نظام شاہی فوج پر بیجاپوریوں کی فتح کی خبر دارالسلطنت آئی تو چاند بی بی کے حکم سے تین روز تک شہر میں شادیانے بجتے رہے اور ہر قسم کی خوشی منائی گئی۔ معزز اُمرا اور ذی وقار ارکان دولت کو اور اُن سرداروں کو جنھوں نے کہ اس جنگ کو کامیاب بنانے میں کوششیں کی تھی کشور خاں نے چاند بی بی کے حکم سے خلعت ہائے فاخرہ سے سرفراز کیا۔ مرصع تلواریں اسپ ہائے تازی معہ زین و لگام بھی عطا کئے گئے۔

غرض ہر طریقے سے تین روز تک تمام شہر میں خوشی کا سامان کیا گیا اور ملک کے ہر طبقہ کو خوش کرنے کی تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ ادھر بظاہر تو یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر اندرونی طور پر سخت اختلافات پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہ مواد پک رہا تھا جو بالآخر کشور خاں کے زوال کا باعث ہوا چاند بی بی اور متولی سلطنت کے سیاسی تعلقات اب خوشگوار نہ رہے تھے اور اندرونی طور پر دونوں میں مخالفتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں کشور خاں یہ چاہتا تھا کہ کسی معاملے میں بھی وہ چاند بی بی سے استصواب رائے کرنے پر مجبور نہ ہو لیکن چاند بی بی کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہر ہر قدم پر اُسے اُس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جو کشور خاں کو سخت ناگوار گزرتی تھی، اور اب وہ کوشش کر رہا تھا کہ جہاں تک ہو سکے چاند بی بی کے اثر سے باہر ہو کر کاروبار حکومت چلائے۔ چنانچہ سب سے پہلی کارروائی جو چاند بی بی کی مشورت کے بغیر انجام پائی وہ چند ہاتھیوں سے متعلق تھی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کشور خاں نے سرداران فوج کو لکھا کہ وہ نظام شاہی ہاتھی جو حالیہ فتح کے سلسلہ میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئے ہیں فوراً دار السلطنت روانہ کر دیئے جائیں۔ اُمرا نے ان کے روانہ کرنے میں تساہل کیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کشور خاں کی یہ حرکت اُمراء و سرداران فوج کے لئے باعث تذلیل و تحقیر ہے۔ لہذا اکثر لوگ اُس کے مخالف ہو گئے اور اُسکے خلاف میں کارروائی کرنے لگے خفیہ طور پر ملکہ چاند بی بی سے یہ درخواست کی گئی کہ کشور خاں کے آثار بُرے ہیں وہ دن بدن زیادہ مغرور و مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کشور خاں کو اس منصب سے علیحدہ کر دیا جائے قبل اس کے کہ وہ کامل خاں دکنی کا پورا پورا رنگ اختیار کرے۔ اور اس کیلئے انھوں نے یہ تدبیر بتائی کہ مصطفےٰ خاں کو بنکاپور سے طلب کیا جائے اور کشور خاں کی جگہ اُسے متولی سلطنت بنایا جائے۔ مصطفےٰ خاں ہر حیثیت سے اس عہدہ کا مستحق بھی ہے اور موزوں بھی ایک قدیم وفادار اور جاں نثار سلطنت ہے اور اُس نے بہت سارے کارہائے نمایاں بھی کئے ہیں اس اعتبار سے اُسے وکیل السلطنت کا عہدہ دینا ملک کی فلاح و بہبودی کا سامان کرنا ہے۔ یہ رائے اپنی حد تک نہایت بہتر اور صائب تو تھی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پورے اُمرا و سردار اس رائے سے متفق نہ تھے۔ ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کا خیال تھا کہ عین اس وقت پر جبکہ بہزاد الملک کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سید مرتضیٰ کی سرکردگی میں ایک زبردست احمد نگری فوج کے آنیکا

اندیشہ ہے دارالسلطنت کے اندرونی انتظامات میں کوئی غیر معمولی تغیر یا تبدیلی نقصان سے خالی نہوگی۔ کیونکہ اگر فوج کو گھر کے معاملات کے درست کرنے میں مشغول ہوجانا پڑے تو باہر کے دشمن کا جواس وقت آدھمکے کون مقابلہ کریگا۔ لہذا جب تک سرحد پر سے دشمن کو نہ نکال دیا جائے اُس وقت تک ان اہم معاملات کی طرف توجہ نہیں کی جانی چاہیئے۔ اور جب یکبارگی نظام شاہیوں کی جانب سے کامل اطمینان ہوجائے تو پھر آسانی سے دارالسلطنت پہنچکر چاند بی بی کی مشورت سے مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے۔

غرض اس نااتفاقی سے فی الحال یہ معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور ادھر کشور خاں کو بھی اس کا علم ہوگیا کہ اُس کے خلاف کیا کیا کاروائیاں ہورہی ہیں۔ اس نے فوراً اپنے بچاؤ کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ اگر پہلے ہی سے اپنی سلامتی کا انتظام نہ کرلیا جائے تو یقیناً یہ تمام اُمراء جو اُس سے بدظن اور بیزار ہوگئے ہیں اُسے قابو میں لاکر پھانس لیں گے۔ اور اُس کی وہی درگت بنائی جائیگی جو اُس نے کامل خاں کی بنائی تھی۔ "قتل الموذی قبل الایذا" کے اصول پر عمل کرکے اُس نے سوچا کہ سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ان لوگوں کا ہی خاتمہ کردیا جائے جو اُس کی نظر میں اُس کے لئے "موذی" ثابت ہوسکتے تھے۔ اس وقت اُسے سب سے زیادہ ڈر مصطفٰے خاں اردستانی سے تھا۔ اس شخص کی عظمت کا سکہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں کشور خاں کا کوئی ساتھ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے خیال کیا کہ جب تک مصطفٰی خاں زندہ ہے اس کا اقتدار مکمل نہوگا۔ اور بالخصوص اس وجہ سے کہ سب کی نظریں اُسی پر پڑ رہی تھیں اور اُمراء و اعیان دولت کی تمام امید اُسی سے وابستہ تھی گویا اگر مصطفٰی خاں کا خاتمہ کردیا جائے تو مخالفین کا اصلی رہبر و رہنما ہی باقی نہیں رہتا۔ اور پھر مصطفٰی خاں کے قتل سے اُس کی ایسی دہشت اور ایسا رُعب لوگوں کے دلوں پر چھا جائیگا کہ کسی کی اتنی ہمت نہوگی کہ اُس کے مقابلے کا خیال بھی دل میں لاسکے۔ اس غرض سے اُس نے ٹھان لی کہ کسی نہ کسی طرح مصطفٰے خاں کو قتل کروادیا جائے۔ یہاں پر مصطفٰی خاں کے قتل کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اُس کے حالات دئے جائیں تاکہ اُس کی باعظمت شخصیت اور اُس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو۔

مصطفٰی خاں کے حالات — مصطفٰی خاں کا اصلی نام سید کمال الدین حسین ہے۔ اردستانی خاندان سادات سے

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مساں

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا غلام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھانستی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

ہیکلِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)

فقہ اسلامی کی ابتدا اور ترقی

تمہید[1] ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہر طرف مغربی قوانین کی عالمگیری ہے اور خود اسلامی ممالک میں تجدد اور اصلاح کے نام سے یا زمانے کا ساتھ دینے کے بہانہ سے اسلامی نظام قانون کا چولا بدلا جا رہا ہے حیدرآباد جیسے مقام میں اسلامی فقہ اور شریعت کا مطالعہ بظاہر وقت اور قوت کے نقصان کے مراوف خیال کیا جائیگا لیکن یہ امر واقعی سارے اسلامی ممالک کے طلبۂ فقہ اسلامی کے لئے گویا ایک تازیانہ ہے کہ اب ان کی متاع گراں مایہ بھی مشرقی مدارس کے رواق سے منتقل ہو ہو کر مغربی جامعات کے طاق و ایوان کی رونق کا باعث ہو رہی ہے۔ یہ موجودہ مغربی نظام قانون ترقی اور وسعت کے خواہ کتنے ہی مدارج کیوں نہ طے کر لے اس ضرورت سے کبھی کوئی استغنا نہیں ہو سکتا کہ پیشرو زمانے کے قانونی نظریات اور خیالات سے استفادہ کیا جائے۔

نواب سر نظامت جنگ بہادر نے اپنے ولولہ انگیز اور عالمانہ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعۂ عثمانیہ میں بیان کیا ہے کہ "مشرقی علوم و آداب کے لازوال سرچشمہ سے سیراب ہونے کے لئے خود حیدرآبادی نوجوانوں کو بھی کمر ہمت چست کر لینی چاہیئے کہ وہ بھی اس

[1] یہ مضمون ۱۳۲۹ف میں حیدرآباد ایجوکشنل کانفرنس کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب سکرٹری کانفرس کی اجازت سے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔

متاع گراں مایہ کے بجا طور سے وارث ہو سکتے ہیں"۔ دراصل حیدر آباد میں با وجود موانعات کے مشرقی علوم و آداب میں تلاش و کاوش سے نئی نئی حقیقتوں کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف ہمت اور شوق دلانے کی ہے۔

بہرحال اس مضمون کا منشاء یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اسلامی قانون کی ابتدا کیسے ہوئی اور یہ کہ اس میں ترقی اور وسعت کس طرح حاصل ہوتی گئی۔

ماخذ مضمون | کوئی شبہ نہیں کہ موضوع نہایت دلچسپ ہے اور اس پر اگر کوئی گہری نظر ڈالی جائے تو خود بخود یہ واضح ہو سکے گا کہ اسلامی نظام قانون کوئی جامد و مطلق نظام نہیں ہے بلکہ اس میں اب بھی یہ قابلیت ہے کہ نئی وسعت اور کشادگی پیدا کیجائے لیکن ایک طالب علم کو اس عنوان پر کچھ لکھنے کے لئے جو وقت پیش آتی ہے وہ یہ کہ عربی کی متداول کتابوں سے اس کے لئے کوئی مواد مہیا نہیں ہو سکتا۔ بلا شبہ اس موضوع پر قدما اور متاخرین نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوگا لیکن اس کا اب آسانی سے فراہم ہونا مشکل ہے۔ طبقات اور تراجم کی جو کتابیں بالعموم ملتی ہیں ان سے موجودہ ضروریات اور مذاق کے لحاظ سے کام لینا نہایت دقت طلب امر ہے۔ سر عبدالرحیم نے اپنی مشہور کتاب "محامڈن جورس پروڈنس" میں نظام فقہ کی تاریخ کے لئے بجائے کسی اسلامی مصنف کی طرف رجوع کرنے کے مسٹر مکڈانلڈ سے رجوع کیا ہے۔ درآنحالیکہ انکی باقی کتاب تمام تر اصلی ماخذوں سے ماخوذ ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ مواد اخذ کرنے میں سر عبدالرحیم کو قدم قدم پر کس طرح احتیاط برتنی پڑی ہے لیکن باوجود اس کے کتاب کا یہ حصہ طالب علم کے دل میں اطمینان پیدا نہیں کرتا۔ سر امیر علی مرحوم نے بھی اپنی کتاب میں جو تاریخی مقدمہ لکھا ہے وہ بھی گویا ایک سرسری بیان ہے۔ ان حالات میں جو طالب علم اصلی ماخذوں کے ذریعہ تاریخ فقہ کا پتہ چلانا چاہتا ہے اس کو مقدمہ ابن خلدون میں ایک مختصر باب مل جاتا ہے۔ کشف الظنون میں بھی ایک نہایت موجز بیان ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے دو رسالے "انصاف فی سبب الاختلاف" اور "عقد الجید فی مسائل الاجتہاد والتقلید" سے ایک متعلم نہایت

مفید اشارے حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں شاہ صاحب کی ہی "حجتہ اللہ البالغہ" میں عنوان زیر تبصرہ کے متعلق نہایت مفید اور بیش بہا نکات مل جاتے ہیں۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے فقۂ اسلامی کے متعلق اپنے حکیمانہ انداز میں جو بھی لکھا ہے اس سے ایک طالب علم، فقۂ اسلامی کی ابتدا اور اس کی ترقی کا بہت معقول اندازہ کر سکتا ہے اور نیز یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ فقۂ اسلامی کا اصلی رجحان کیا رہا ہے۔ فی الوقت اس تحریر کا اصلی ماخذ بھی شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہی تصانیف ہیں جن کے اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں لیکن ان سے استفادہ کے لئے اصلی کتابیں بھی پیش نظر رہنا ناگزیر ہے۔

اردو میں موضوع زیر نظر کے متعلق جو مواد ملتا ہے اس میں قابل ذکر مولوی عبدالسلام ندوی کا "تاریخ فقۂ اسلام" کے نام سے وہ ترجمہ ہے جو انھوں نے شیخ محمد الخضری المصری کی عربی کتاب سے کیا ہے۔ "مفید المفتین" کے نام سے عبدالاول صاحب جونپوری کا ایک رسالہ مذہب حنفی کے علما اور کتابوں کے حالات میں موجود ہے۔ مولانا محمد انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم کی تصنیف "حقیقتہ الفقہ" مولوی سید سلیمان ندوی کی تالیفات "حیات مالک" اور "سیرت عائشہ رضؓ" اور مولانا شبلی مرحوم کی کتاب "سیرت النعمان" وغیرہ، سب سے بالواسطہ کام نکلتا ہے۔

تین اہم اصول | قبل اس کے آگے قلم اٹھایا جائے تین امور کا ذہن نشین کر لینا بہت ضروری ہے:۔

(۱) خوش اعتقاد اور آزاد خیال افراد ہر زمانے اور ہر قوم میں مسلسل ہوتے آئے ہیں اور اختلافات کا منبع بالعموم خوش اعتقادی یا آزاد خیالی رہا ہے۔

(۲) علوم و فنون خاص اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کسی غرض کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر اس علم کے متاخرین اور متقدمین میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ضرورت باقی نہیں رہتی جس کی بنا پر اس فن کے مشاہیر کے کارنامے بروے کار آتے ہیں مثلاً سیبویہ وامثالہ ائمہ نحو و صرف کے بعد پھر اس مرتبہ کے ائمہ فن پیدا نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ کام ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ضرورت علم بلاغت کی ہوئی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اہل علم کی توجہ اس

جانب مائل ہوئی ہے جس کی زمانہ کے لحاظ سے زیادہ ضرورت ہے۔

(۳) متاخرین علم کو دقیق بنادیا کرتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ نئے میدان باقی نہیں رہتے مختصرات اوران کی شرح وتادیل، توجیہ وتفسیر میں پڑکر اصل فن کی تکمیل پر توجہ نہیں کی جاسکتی۔ متقدمین کی تعظیم سے جو ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی وجہ دماغ کی جولانی اور ذہن کی جودت اصلی میدانوں کو چھوڑ کر بھٹک جاتی ہے۔ ارباب علوم اسلامیہ کے آخری طبقہ نے تو علوم کو چیستان بنادینے میں ہی اپنی ساری کوشش صرف کی ہے۔ یہی حال فقہ اسلامی کا بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فقہ کے تعلق سے متاخرین کا اصلی کارنامہ (یہ ضرور ہے کہ انھوں نے فقہ کو استدلالی رنگ میں مرتب کیا اوراس طرح ایک حیثیت سے فلسفۂ فقہ مدون ہو گیا)۔ دقت نظر اور تعمق استدلال سے فقہی کتابیں مالامال کرنا ہے لیکن لفظی موشگافیوں میں ضرورت سے زیادہ منہمک ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی کو حقایق زندگی سے پہلا سا ربط باقی نہ رہا۔ نئی ضرورتوں اور نئے حالات سے مطابقت پیدا ہونا تو کجا معیشت و زندگی سے اور بعد پیدا ہوتا گیا۔

متقدمین سے مرعوب ہو کر خود کو عاجز سمجھنے کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ کہ افراد قوم سے غور وفکر اور استنباط و اجتہاد کی قوت سلب ہو گئی۔ بہر حال فقہ اسلامی میں بھی یہ تینوں اسکول شروع سے کام کرتے رہے ہیں۔

فقہ کا مفہوم | واضح ہو کہ ملا محب اللہ بہاری نے اپنی کتاب مسلم الثبوت کے حاشیہ میں بیان کیا ہے کہ "فقہ" کا مفہوم ابتدائی قرنوں میں سارے علوم شرعیہ پر حاوی تھا عقاید، اخلاق و تصوف بھی اس میں شامل تھے لیکن آگے چلکر عقاید کے مباحث کے لئے ایک الگ علم "علم کلام" کے نام سے مدون ہو گیا۔ تزکیہ باطن اور تہذیب اخلاق کے لئے بھی الگ علوم مدون ہو گئے اور فقہ کا اطلاق صرف احکام ظاہرہ پر ہونے لگا یا دوسرے الفاظ میں انسان کی عملی زندگی سے متعلق جو مسائل ہیں وہ فقہ کا موضوع بنے۔ فقہ کا مفہوم اس قدر تنگ ہو جانے کے باوجود اب بھی موجودہ زمانے کے "قانون" کے مفہوم سے وسیع تر ہے کیونکہ "فقہ" میں ان مسائل سے بھی بحث

یکجائی ہے کہ جن کا تعلق انسان اور اس کے خالق سے ہے۔

فقہ کا بنیادی ماخذ فقہ کا اصلی ماخذ قرآن ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضور رسالت مآبؐ کی عمر مبارک چالیس سال کی ہوئی تو نزول قرآن شروع ہوا اور بتدریج آپ کی زندگی مبارک تک نازل ہوتا رہا۔ نزول قرآن کا زمانہ دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ جو زمانہ ہجرت سے قبل کا ہے اور دوسرا وہ حصہ جو ہجرت کے بعد سے شروع ہوا۔ ہر حصۂ قرآن دوسرے سے ممتاز ہے۔ مکی حصۂ قرآن میں عموماً عقاید اور توحید ذات و صفات باری پر زور دیا گیا ہے مدنی حصہ میں وہ سب امور مذکور ہیں جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر حصہ کو ایک خاص قالب میں ڈھالتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مکی حصۂ قرآن میں احکام فقہی تقریباً پائے نہیں جاتے۔ فقہی احکام کی تفصیل مدنی حصۂ قرآن میں مذکور ہے۔ نیز مکی احکام بالکل مجمل ہیں، برخلاف اس کے مدنی احکام بالخصوص احکام متعلق معاملات تمدنی بہت مفصل ہیں۔

مضامین قرآن مجموعی حیثیت سے مضامین قرآنی کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) تاریخ اقوام قدیم۔

(۲) آثار و نعمات الٰہی کا تذکرہ۔

(۳) امور متعلق دین یعنی وہ امور جو خدا اور بندے کے درمیان ہیں مثلاً عبادات و عقاید۔

(۴) امور متعلق معیشت یا بندوں کا باہمی معاملہ۔

(۵) تذکرۂ موت و مابعد۔

ان میں سے فقہا بعض امور متعلق دین اور امور متعلق معیشت سے بحث کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ قرآن میں جو فقہی احکام مذکور ہیں وہ دفعتہً نہیں صادر ہوئے۔ اسلامی سوسائٹی میں وقتاً فوقتاً حالات اور ضروریات کے لحاظ سے احکام کی احتیاج ہوتی گئی تو احکام آتے گئے۔

دوسرا ماخذ فقہ اسلامی کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ حدیث سے مراد ذات رسالت پناہیؐ کے سارے اقوال و افعال ہیں اور نیز دوسرے افراد کے ایسے افعال جو آپ کے روبرو ہوئے

اور آپ نے ان کو قائم رکھا۔

ذات رسالت پناہیؐ کے افعال و اقوال کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وہ امور جن کو تبلیغ رسالت سے علاقہ ہے۔ ان میں احکام فقہی بھی شامل ہیں۔

(۲) وہ امور کہ جن کو تبلیغ رسالت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس لئے احکام فقہی کو بھی ان سے کوئی تعلق نہیں۔ علاج و طب کے متعلق جو احادیث ہیں وہ اسی میں شامل ہیں اور نیز وہ افعال و اعمال بھی جن کو آپ محض عادتاً عمل میں لایا کرتے تھے یا اتفاقیہ بلا قصد ظاہر ہوتے تھے یا برسبیل تذکرہ آپ جو امور بیان فرمایا کرتے تھے وہ بھی اسی میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اس میں ایسے امور بھی شامل ہیں جو کسی جزوی مصلحت کی بنا پر آپ کے زمانے میں رائج تھے یا آپ نے ان کے لئے حکم صادر فرما رکھا تھا لیکن آگے چلکر ان پر عمل کرنا ساری اُمت کے لئے ضروری نہ رہا۔ بہرحال قرآن شریف کا جو مطلب آپ بیان فرمایا کرتے اس کو تبلیغ رسالت سے تعلق ہے۔ یہ اظہار مطلب کبھی کسی قول کے ذریعہ سے ہوتا اور کبھی کسی فعل کے ذریعہ سے اور کبھی قول و فعل دونوں کے ذریعہ سے۔ اس طرح گویا حدیث شرح قرآن ہے۔ حدیث میں کوئی امر ایسا نہیں ہے کہ جس کے متعلق قرآن میں اجمالاً یا تفصیلاً تذکرہ نہ ہو۔

صحابہؓ کا طریقہ رسالت پناہؐ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کے احکام فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے دو طریقے تھے:۔

(۱) اقوال نبیؐ سے۔ طریقہ یہ تھا کہ علی الاکثر ان اقوال کو حفظ کر لیا جاتا اور بہ وقت عمل ان سے استناد کیا جاتا۔

(۲) افعال و اقوال کی دلالت سے احکام فقہی اخذ کئے جاتے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ نے رسالت پناہؐ کو کوئی امر عمل میں لاتے ہوئے دیکھ لیا تو اس سے کوئی حکم معلوم کر لیا جاتا۔

صحابہ کرامؓ کا وہ گروہ جو اسلامی دنیا کی فقہی رہبری کے لئے تیار رہو رہا تھا ہر وقت حضور رسالت پناہؐ کے ساتھ ساتھ رہ کر اوامر و نہی کے مواقع دیکھ کر اور بوقت ضرورت حضور رسالت پناہؐ

سوالات کرکے اور اگر شرف حضوری نہو تو دوسروں سے تعلیم نبوی کا حال معلوم کرکے اس قابل ہوا کہ آئندہ مشکل سے مشکل مسائل حل کر سکے۔ اس بابرکت ماحول میں صحابہ کرامؓ فقہی مسائل کے حل کیلئے جس انداز سے تیار کئے جا رہے تھے اس کی مثال کے لئے ایک واقعہ کو پیش کرنا بے محل نہ ہوگا

رسالت پناہؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن روانہ فرمایا۔ روانگی کے وقت ان سے دریافت فرمایا کہ "فیصلہ" کے لئے کیا طریقۂ عمل اختیار کروگے۔ عرض کیا کہ "کتاب اللہ" کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلعم نے دریافت فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے تو اس صورت میں کیا طریقۂ عمل اختیار کیا جائے گا۔ عرض کیا کہ رسولؐ اللہ کے احکام پیش نظر رکھ کر کام کیا جائے گا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اگر یہ بھی نہو۔ حضرت معاذؓ نے عرض کی کہ اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا۔ یہ سنکر رسالت پناہؐ نے ارشاد فرمایا کہ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے رسول کو اس کے حسب مرضی توفیق دی"

حضور رسالت مآبؐ کے زمانۂ مبارک میں جن صحابہ کرامؓ نے احکام فقہی کی تعلیم پائی ان میں حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہؓ بن عمر اور نیز حضرت عائشہؓ و حضرت زیدؓ بن ثابت وغیرہ کا خاص پایہ اور درجہ ہے۔ ان کے علم نے ہی آگے چلکر وسعت اختیار کی۔

اس زمانۂ مبارک میں صرف قرآن کو ضبط تحریر میں لانے کا التزام تھا حدیثوں کو لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا لیکن اس سے بالکل تغافل بھی نہیں تھا۔ یہ ثابت ہے کہ جمع و تدوین حدیث کا کام خود زمانۂ نبوت میں شروع ہو چکا تھا۔ احکام فقہ منطقی اور علمی انداز میں ابھی مدون نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت موجودہ فقہیانہ مباحث کا کوئی وجود نہیں تھا ہر حکم کے ارکان و شروط اور آداب میں بھی کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اس زمانے میں چونکہ عملی زندگی بسر کرنیکی تربیت خود بخود ہوتی جاتی تھی اس لئے ان امور کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ رسولؐ کریم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ صحابہ کرامؓ اسی پر عمل پیرا ہوا کرتے۔ رسالت پناہ صلعم یہ تشریح نہیں فرمایا

کرتے تھے کہ یہ امر رکن ہے اور وہ امر شرط ہے۔ صحابۂ کرامؓ اس قسم کے امور بہت کم دریافت کیا کرتے تھے۔ اصل میں بات یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ کی اس طرح تربیت ہوئی تھی کہ وہ اصلی روح اسلام جان گئے تھے۔ قانون اسلام کے دو اساسی امور "عدم حرج" اور قلت تکلیف" کا مفہوم بخوبی ان کے ذہن نشین تھا۔ خواہ مخواہ سوالات کرکے وہ سختیوں کا اضافہ نہیں کرلیا کرتے تھے۔

بہرحال یہی طریقہ جاری رہا۔ ہر ایک صحابی نے بہ حسب امکان خود رسولؐ اللہ کی عبادت۔ فتاوی اور احکام دیکھے اور اُن کو محفوظ کرلیا۔ اور اپنے رجحان طبع اور ضرورت کے لحاظ سے ان پر عمل کیا۔ استدلال اور منطقی طریقوں کی نہ تو ان کو احتیاج تھی اور نہ وہ ان کی زندگی کے عام طریقے کے لحاظ سے اس وقت کارآمد تھے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی تھی کہ اطمینان قلب حاصل ہوجائے۔

الغرض اس دور میں سنّتہ کا دار مدار دو امور پر تھا:۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) قرآن مجید کی وہ توضیح جو رسالت پناہؐ فرمایا کرتے تھے۔

زمانۂ خلافت راشدہ اس کے بعد خلافت راشدہ کا زمانہ آیا اور یہ نظر آتا ہے کہ دس سال کے اندر عراق۔ ایران۔ شام اور مصر میں اسلامی اثر مستحکم ترین بنیادوں پر قائم ہوگیا۔ مساوات اور رواداری، صلاح و فلاح رعایا اور رفاہ عامہ کی ایک نئی دنیا اور ایک نیا آسمان پیدا ہوجاتا ہے۔ اس جدید سیاسی رنگ کے لحاظ سے ضرور تھا کہ فقہ اسلامی بھی حقوق الناس کی حفاظت اور انصاف و عدالت کی خاطر وسعت حاصل کرے اور احکام فقہ کے عام اصول کی توضیح، تشریح اور تعبیر اس طرح ہو کہ وہ یہ ثابت کردے کہ ان جدید پیدا شدہ حالات میں بھی وہ کارآمد ہے۔

اس دور میں سب سے اہم ترین کام قرآن شریف کے مختلف اوراق کا ایک شیرازے میں جمع ہونا ہے۔ ابتدا میں اکابر صحابہ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن "الضرورۃ ام الایجاد"۔ جمہوریت اسلام کے اولین صدر نے بالآخر طے کردیا کہ یہ کام ضروری ہے۔ اس نوبت پر حدیث کی

عام تدوین خود حضرت عمرؓ بھی پسند نہیں فرماتے تھے لیکن آگے چلکر ہر شخص ایک دوسرے سے مختلف فیہ احادیث کی روایت کرنے لگا تو چارہ سوا اس کے نظر نہیں آیا کہ ان کی تدوین بھی عمل میں آئے۔

اختلاف کی بنیاد

بہرحال یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تاسیس حکومت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے صحابہ کرامؓ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ اب چونکہ اسلامی سوسائٹی دن بدن زیادہ بہ زیادہ وسعت اختیار کرتی جاتی تھی اور حکومت وسلطنت کے حدود بھی ہر وقت پھیلتے جاتے تھے لہٰذا ان حالات میں ضرور تھا کہ نئی باتیں پیدا ہوں چنانچہ اس لحاظ سے جدید فقہی ضرورتیں بھی پیش آنے لگیں۔ ہر صحابیؓ نے اپنے حوصلہ اور وسعت علم کے لحاظ سے ان جدید پیش آمدہ صورتوں کے لئے حل تلاش کرنے کی کوشش شروع کی۔ قرآن وحدیث سے جب صورت پیش آمدہ حل نہیں ہوتی تو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا عام طریقہ ہو گیا۔ لیکن اس اجتہاد میں یہ امر پیش نظر رہتا کہ قرآن وحدیث نے جو عام اور ہمہ گیر اصول مقرر کر دیئے ہیں ان سے سرمو انحراف نہ ہو۔ اس حالت میں لامحالہ ضرور تھا کہ اختلاف واقع ہو۔

اس موقع پر یہ امر واضح ہونا چاہیئے کہ صحابہ کرامؓ میں بھی فرق مراتب موجود ہے۔ عالم اور عامۃ الناس کا امتیاز اس وقت بھی نظر آتا ہے۔ سب صحابہ وسعت علم اور تفقہ کے اعتبار سے ایک مرتبہ کے نہیں تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے زہد وتقدس میں کون کلام کر سکتا ہے لیکن باوجود اس کے حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہؓ بن عباس وغیرہ کا پایہ علم وفقاہت میں جو ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اگرچہ کمسن صحابہ میں سے تھے لیکن بلحاظ علم وفضل صحابہ کبارؓ پر فائق تھے بلکہ ان کے معلم بنگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہر صحابیؓ کا رجحان طبع بھی ایک دوسرے سے الگ ہونا لابدی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے۔

بہرحال اختلاف کا واقع ہونا ضروری تھا اور وہ واقع ہوا لیکن وہ اختلاف سراسر

رحمت و ترقی اور سربلندی کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اختلاف کے چند پہلو اس اختلاف کے چند پہلو ہیں:۔

(۱) کسی صحابیؓ کو کسی واقعہ اور حکم کے متعلق کوئی حدیث معلوم ہوئی لیکن دوسرے صحابیؓ کو اس کا علم نہیں ہوا تو لامحالہ اس امر کی ضرورت ہوئی کہ اپنی رائے سے اجتہاد کیا جائے۔ اس اجتہاد کی بھی مختلف صورتیں ہیں:۔

(الف) اول یہ کہ اجتہاد واقعتہً اصل حکم کے بالکل موافق واقع ہو مثلاً ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے روبرو یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ شوہر بلا تقرر مہر فوت ہوگیا، اس صورت میں زوجہ کے کیا حقوق قرار پائیں گے۔ حضرت موصوف نے اولاً اس مسئلہ میں رسالت پناہؐ کے کسی حکم سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر ایک ماہ کے غور و تامل کے بعد قرار دیا کہ زوجہ کو مہر مثل ملنا چاہیئے اس پر عدت ضروری ہے اور یہ کہ اس کو ترکہ ملیگا۔ یہ فیصلہ سنکر حضرت معقلؓ بن یسار کھڑے ہوئے اور کہا کہ رسالت پناہؐ نے ایک وقت اسی طرح فیصلہ فرمایا تھا۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ دو صحابیوں میں بحث و مناظرہ کے بعد ایسی کوئی حدیث معلوم ہوجائے کہ اس پر عمل کرنا ظن غالب کے لحاظ سے درست ہو۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ حدیث کا علم تو ہوجائے لیکن کسی وجہ موجہ سے اس کو قابل تسلیم نہ قرار دیا جائے۔ مثلاً ایک مرتبہ فاطمہ بنت قیس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیان کیا کہ انکے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دی تھیں لیکن رسولؐ اللہ نے نفقہ و سکنی کا حکم صادر نہیں فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ ایک عورت کے کہنے سے کتاب اللہ کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نہیں معلوم اس نے سچ کہا یا غلط۔

(د) چوتھی صورت یہ کہ حدیث کا بالکلیہ علم ہی نہو۔

(۲) اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہوتی تھی کہ صحابۂ کرامؓ رسالت پناہؐ سے کسی فعل یا عمل کا صدور دیکھا کرتے لیکن ہر شخص اپنے خیال و رجحان کے لحاظ سے اس سے کوئی حکم اخذ کرتا۔ بعض اصحاب یہ خیال کرتے کہ

رسالت پناہؐ کا یہ فعل بطور عبادت کے ہے اس لئے اس پر عمل واجب ہے بعض یہ تصور کرتے کہ اس میں اباحت ہے۔

اختلاف کے یہ دو بڑے سبب تھے اس کے علاوہ سہو ونسیاں کی وجہ سے بھی صحابہؓ میں اختلاف ہوتا تھا کبھی خوب انضباط نہ ہونے سے بھی اختلاف پیش آیا کرتا تھا کسی حکم کی علت قرار دینے میں بھی صحابہ اختلاف کرتے تھے بنا براں اس علت کو کسی دوسرے معاملہ میں ثابت کر کے حکم دینے میں بھی اختلاف ہونا ضرور تھا۔ قرآن مجید کے مطالب سمجھنے میں بھی اختلاف ہونا ناگزیر تھا۔ الغرض ان وجوہ کی بنا پر صحابہ کرامؓ کے مذاہب اور آرا میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

"قیاس" اس دور میں مسائل کے حل اور فقہی احکام کی تلاش صرف اسی وقت کی جاتی تھی جبکہ فی الواقع کوئی صورت پیش آتی تھی لیکن تمدن کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ لازمی تھا کہ نئے نئے مسائل بھی صحابہ کرامؓ کے روبرو پیش ہوں۔ قرآن و حدیث میں ہر جزوی مسئلہ کی صراحت نہیں ہو سکتی تھی۔ ان میں تو کلیات اور اصول کا انضباط کیا گیا ہے۔ لا محالہ صحابہؓ کو قیاس کرنا پڑا اسی کو "رائے" کہا جاتا ہے۔ "قیاس" کی یہی ابتدا ہے حضرت عمرؓ نے حضرت شریح کو جب کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ جو کچھ کتاب اللہ سے معلوم ہو سکے اس پر صریحاً عمل کیا جائے۔ اگر اس سے حکم نہ مل سکے تو پھر حدیث پر نظر ڈالی جائے۔ پھر اپنی رائے پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح دوسرے قضات کو بھی انھوں نے اسی طرح کے ہدایات دئے ہیں۔ صرف اس بات پر سختی سے نظر رکھی جاتی تھی کہ رائے اور اجتہاد میں خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کیجائے۔

"شوریٰ" "اجماع" اس کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا یہ بھی مسلک تھا کہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے کے لئے بڑے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا جائے جب اس طرح اجماعی رائے حاصل ہو جاتی تو اس کے مطابق حکم قرار دیا جاتا۔ پھر اس کی کوئی مخالفت نہیں ہوتی تھی۔ اسی طریقہ کا نام "اجماع" تھا چونکہ اس وقت مجتہدین صحابہؓ کی تعداد محدود تھی اس لئے ان سے مشورہ لینا اور ان کی رائے حاصل کر لینا ممکن تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مفتوحہ زمینات کی تقسیم کے متعلق جو طریقہ عمل برتا گیا اس کو یہاں بطور مثال پیش کرنا بے محل نہیں ہے:-

عراق و شام کی فتح کے بعد یہ مسئلہ پیش ہوا کہ زمین کے متعلق کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آیا زمین فوج میں تقسیم کر دی جائے یا وہ سلطنت کی ملک قرار دی جائے۔ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے لحاظ سے اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے تقسیم کر دینے چاہیئے اور ایک حصہ مصالحہ عامہ پر خرچ ہونا چاہیئے۔ اس بناء پر عوام نے حضرت عمرؓ سے تقسیم کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ زمین مع ذمی رعایا کے تقسیم کر دی جائے اور اس میں وراثت کا سلسلہ جاری ہو تو پھر آیندہ نسلوں کا کیا حال ہوگا۔ سرحد کی حفاظت کیسے ہوگی۔ ان ممالک کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوہ عورتوں کو کیا ملیگا۔ بہرحال عام لوگوں نے حضرت عمرؓ سے بڑا مباحثہ کیا۔ بالآخر حضرت موصوف نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا۔ ان میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی رائے تقسیم پر مائل تھی۔ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور خود حضرت عمرؓ کے صاحبزادے نے تقسیم کی مخالفت کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے دس انصار کو طلب فرمایا اور ان کی رائے دریافت کی۔ یہ اصحاب بھی حضرت عمرؓ سے متفق ہو گئے۔ بالآخر فیصلہ کر دیا گیا کہ زمین تقسیم نہ کی جائے۔ زمین اس کے اصلی مالکوں کے پاس رہنے دی گئی اور ان پر خراج مقرر کر دیا گیا۔

بہرحال اس طرح خلفاء راشدینؓ کے زمانے میں کام چلتا رہا تاآنکہ وہ دور ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں فقہ کے ماخذ چار ہو گئے۔ کتاب اللہ اور حدیث یہ دونوں اصلی ماخذ تھے۔ تیسرا ماخذ قیاس یا رائے۔ یہ قرآن و حدیث کی ہی فرع ہے۔ چوتھا ماخذ اجماع اس میں بھی قرآن و حدیث سے ہی استناد کیا جاتا ہے۔

اس دور میں خود خلفاء راشدینؓ۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود حضرت ابو موسیٰؓ اشعری۔ حضرت معاذؓ بن جبل۔ حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت فقاہت کے لئے سند تھے۔ علاوہ براں مدینہ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ۔ مکہ میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ مصر میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص۔ بصرہ میں حضرت انسؓ بن مالک۔ کوفہ میں حضرت ابو موسیٰؓ اشعری اور خود حضرت علیؓ فقہ اسلامی کی تعبیر و تشریح کے لئے سند تھے۔

فقہ کی ترقی میں غلاموں کا حصہ

سب جانتے ہیں کہ اسلام سارے مسلمانوں کے لئے ایک ہی برادری کا پیغام لیکر آیا تھا۔ اسکا مظاہرہ صرف عبادت گاہوں وغیرہ تک محدود نہیں رہا۔ زندگی اور معاشرت کا سارا نظام آقا اور غلام کے اتحاد اور تعاون کے تار و پود پر قائم تھا۔ علوم اسلامیہ کی تاریخ بھی آقا اور غلام

دونوں نے ملکر مرتب کی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں خود صحابہؓ کے غلاموں نے بھی بڑا امتیاز پیدا کیا اور دنیائے اسلام نے ان کی پیشوائی تسلیم کی حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے غلام عکرمہ، حضرت ابن عمرؓ کے غلام نافع۔ حضرت انسؓ بن مالک کے غلام محمد بن سیرین وغیرہ وہ افراد ہیں جن کی عظمت و بزرگی میں کوئی شخص کلام نہیں کرسکتا۔

بے تعصبی غرض اس عہد میں کبار صحابہؓ اور ان کے شاگرد اس نہج سے مصروف عمل تھے۔ کوئی صحابیؓ کسی معین اور خاص طریقے کے لئے مشہور نہیں ہوا۔ ہر شخص جس سے چاہتا فتویٰ مانگتا کوئی تعصب اور تنگ نظری نہیں تھی۔ جزوی اختلافات کے باوجود سب دائرۂ اسلام میں ہی شامل خیال کئے جاتے تھے۔

تابعین کا زمانہ اب صحابہ کرامؓ کے شاگردوں کی جماعتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ تابعین انھیں کو کہتے ہیں۔ تابعین میں سے ہر شخص نے اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے اپنے استادوں سے استفادہ کیا اور یہ قابلیت حاصل کرلی کہ خود اپنے استادوں کے اقوال پر تنقید و تبصرہ کرے۔ خود کبار صحابہؓ میں سے بعض اصحاب کے اقوال کو انھوں نے ضعیف قرار دیا۔ اس کے مقابلے میں صغار صحابہؓ کا مسلک ان کو قوی معلوم ہوا۔ اس طرح ہر تابعی نے اپنے ذاتی خیالات، ذاتی تحقیقات اور ذاتی غور و فکر کی وجہ سے اپنا علیحدہ علیحدہ مسلک قرار دیا۔ ہر شہر میں آئمہ تابعین وجود میں آگئے مثلاً مدینہ میں سعید بن مسیب اور سالم بن عبداللہ بن عمر۔ قاضی یحیٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن۔ مکہ میں عطا بن رباح۔ کوفہ میں ابراہیم نخعی۔ بصرہ میں حسن بصری۔ یمن میں طاوس بن کیسان اور شام میں امام مکحول۔

شاہ صاحب نے بیان کیا ہے کہ سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی اور زہری دوسرے ان کے ہم مرتبہ افراد نے تمام ابواب فقہ کو مرتب کرلیا تھا۔ ہر فرد نے اپنے خاص اصول اور قواعد قرار دے لئے تھے۔ یہ قواعد و اصول انھوں نے اپنے اسلاف سے حاصل کئے تھے۔ بہرحال یہ زمانہ ترتیب و تہذیب فقہ کا زمانہ ہے۔

ضرور تھا کہ جماعت تابعین میں سے ہر فرد پر اس کے استاد اور ماحول کا اثر پڑے۔ دوسرے اپنے استاد اور شیخ کو ترجیح دینا، خواہ دوسرے کیسے ہی سربلند کیوں نہوں، انسان کا طریقہ ہے۔ پھر

رسل و رسایل کے ذرایع کی اس زمانے میں جو حالت تھی اس کے لحاظ سے بھی یہ امر ناگزیر تھا۔
سعید بن سیب اور انکے شاگردوں کا صدر مقام چونکہ مدینہ منورہ تھا اس لئے وہ علمائے حرمین کو فضیلت
دیتے تھے۔ ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور
حضرت عایشہؓ وغیرہ کے آرا پر تھی۔ اس کے برخلاف کوفہ میں ابراہیم نخعی اور ان کے شاگردوں کے
پاس حضرت ابن مسعود، حضرت علیؓ۔ قاضی شریح اور دیگر قضاات کوفہ کے آرا و فتاوی قابل وقعت
تھے۔ غرض تابعین بھی اپنے استادوں کے مسلک پر کام کرتے رہے تا آنکہ ان کا دور بھی ختم ہو گیا اور
اب حاملین علم اور فقہا کا عہد آ گیا۔

فقہا کا دور اب یہ زمانہ ہے جبکہ خلافت بنی امیہ سے منتقل ہو کر بنی عباس میں آئی۔ سلطنت کے
حدود مشرق و مغرب میں پھیل گئے۔ اسلامی تمدن و تہذیب کو عالمگیر وسعت حاصل ہو گئی۔ ہر طرف
اُسی کی برتری تھی۔ علمی حلقے عظمت و ترتیب کے بلند ترین مدارج پر پہنچ گئے۔ بغداد ہو یا قرطبہ۔
قیروان ہو یا قاہرہ۔ دمشق ہو یا کوفہ یا بصرہ۔ مرو ہو یا نیشاپور ہر جگہ علمی اور تمدنی بہار پورے
شباب پر تھی۔ تجارت و صنعت۔ زراعت و حرفت کے نئے نئے میدان کشادہ ہوتے جاتے
تھے۔ یونانی علوم عربی میں منتقل ہونے لگے۔ عالم اسلامی کے تعلقات باقی حصۂ دنیا سے مربوط
ہو گئے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ عالم اسلامی کے فقہی ضروریات وہ نہیں رہی تھیں جو
اب سے پہلے تھیں۔

اس موقع پر یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جس طرح سیاسی تاریخ اسلام صرف ایک
قوم عرب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایرانی۔ ترک اور مغل وغیرہ بھی اس کے جزو لاینفک ہیں اسیطرح اسلامی علوم
کی تاریخ بھی صرف عربوں کے ہی کارناموں سے مرتب نہیں ہوئی ہے۔ غیر عرب قوموں نے بھی اس میں
نہایت عظیم الشان حصہ لیا۔ اس کی مثال میں صرف امام اعظم نعمان بن ثابت کا نام لینا کافی ہے۔

تابعین کے بعد ان کے شاگردوں نے کام کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور نئے حالات کا پوری
کامیابی سے مقابلہ کیا۔ ان بزرگوں نے اب یہ بھی کوشش کی کہ مختلف شہروں کے قاضیوں اور مفتیوں سے

سلسلۂ ربط وضبط بڑھایا جائے اور ان کے آرا و خیالات معلوم کئے جائیں۔ درس و تدریس غور و فکر اور طلب علم کے لئے بدرجۂ نہایت جد وجہد ان کا شغل تھا۔ مسائل کا حل اور مقدمات کا فیصلہ ان کے دن رات کا کام تھا۔ احکام فقہ کے استخراج اور اصول سے فروع نکالنے میں تابعین کا جو مسلک تھا وہی طریقہ ان کے شاگردوں کا بھی رہا۔ گو یہ بات درست ہے کہ بعض امور میں اختلاف رائے بھی واقع ہوتا تھا بریں ہم بحیثیت مجموعی سب ایک ہی راہ کے سالک تھے۔ احادیث سے تمسک کرنے میں بوجہ اختلاف احادیث مشکل پیش آتی تو بالاتفاق اقوال صحابہ سے رجوع کیا جاتا۔ صحابہ میں بھی ہم آہنگی نہیں ہوتی تو لامحالہ ہر شخص اپنے شہر کے علماء پر اعتماد کرتا تھا خود تابعین کا بھی یہی دستور تھا۔

تدوین وتالیف۔ امام مالکؒ۔	اب اس دور میں تدوین وتالیف کی ضرورت داعی ہوئی اور اس کا آغاز ہوا امام مالک نے مدینے میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے مکے میں۔ ثوری نے کوفے میں اور ربیع نے

بصرے میں اس کام کی بنا ڈالی منصور نے امام مالکؒ سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کی کتاب موطا نقل کرا کے سارے ممالک میں پھیلا دی جائے۔ امام مالکؒ نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا اور کہا کہ لوگوں میں مختلف اقوال رواج پا چکے ہیں۔ ان کو احادیث معلوم ہو چکی ہیں۔ روایات کی نقل ہو چکی ہے۔ جو مسائل ان کو معلوم ہوئے ان پر انھوں نے عمل کر لیا اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے جو کچھ انھوں نے اپنے لئے پسند کر لیا ہے وہی ان کے لئے مناسب و مفید ہے۔ منصور کی طرح ہارون الرشید نے بھی امام مالکؒ سے یہی خیالات ظاہر کئے تھے لیکن امام نے کسی طرح رضامندی ظاہر نہیں کی۔

امام مالک چونکہ مدنی تھے اس لئے مدنی علماء کے آرا و افکار کا ان پر بہت اثر تھا امام مالکؒ تدوین حدیث کے امام قرار دئے جا سکتے ہیں۔ فقہ میں تدوین حدیث ان کے قلم سے ہوئی ہے۔ زبانی روایت کا سلسلہ اب اس نوبت پر پہنچ چکا تھا کہ اگر اس کو اسی طرح جاری رہنے دیا جاتا تو صحیح اور غلط میں امتیاز دشوار ہو جاتا۔ امام مالکؒ نے اس کو محسوس کیا اور موطا لکھی جو آج تک حدیث کی کتابوں میں سرتاج خیال کی جاتی ہے۔

امام اعظمؒ | امام مالکؒ کے برخلاف امام اعظمؒ کوفہ کے باشندہ تھے۔ عرب نہیں تھے۔ اس لئے ان پر علمائے کوفہ مثل ابراہیم نخعی کا بہت اثر تھا۔ علمائے کوفہ کا جو مسلک تھا اس سے وہ بہت کم ہٹتے تھے۔ ان کے نامور شاگرد قاضی ابو یوسف اور امام محمد آسمان فقہ کے آفتاب و ماہتاب تھے لیکن یہ بھی امام صاحب کے ساتھ علمائے کوفہ کا مسلک نہیں چھوڑتے تھے۔ قاضی ابو یوسف ہارون الرشید کے زمانہ خلافت میں قاضی القضات کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے اس وقت یہ ثابت کر دیا کہ فقہ اسلامی کو تمدن و مدنیت کے ارتقا کے ساتھ پوری کامیابی سے پیوند دیا جا سکتا ہے۔

امام شافعیؒ | مجدّد قرن ثالث کی حیثیت سے امام شافعیؒ میدان میں آئے تو انھوں نے فقہ میں ایک الگ رنگ اختیار کیا۔ حنفی و مالکی مکاتب اور رائے وسنت میں انھوں نے تطبیق کا بیڑا اُٹھایا۔ اس کی تفصیل کے لئے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کے الفاظ مستعار لئے جاتے ہیں۔

"امام شافعیؒ سے پہلے تک چونکہ عہد نبوت سے زیادہ فصل نہیں ہوا تھا اس لئے لوگوں کے علم کا مدار روایت پر نہیں بلکہ عملی شکل پر تھا۔ اس لئے امام مالکؒ نے یہ اصول قایم کیا تھا کہ اہل مدینہ کا عمل حجت ہے۔ اہل مدینہ کا عمل اس وقت تک نبوت، خلافت راشدہ اور صحابہ کرام کی تعلیمات کا اصلی نقشہ تھا۔ جب امام شافعیؒ میدان عمل میں آئے تو دیکھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ لوگوں کی عملی زندگی متغیر ہو چکی ہے عباسی حکومت کے دور میں قوموں کے اختلاط، علوم کے تراجم اور آزاد خیال افراد کی پیدایش نے آرا، و افکار کے نئے نئے دروازے کھول دئے۔ ان حالات میں صرف عمل پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنا براں انھوں نے حدیث پر تکیہ کرنے کے لئے عمل صحابہ سے بڑھ کر قول رسولؐ کو ترجیح دی اور اس کے لئے اصول وضع کئے اور ان اصول کو مدون کیا۔" (رسالۂ معارف)۔

اصول فقہ میں امام شافعیؒ ہی نے سب سے پہلے کتاب لکھی۔ یہ امر بھی واضح ہونا چاہیئے کہ امام شافعیؒ کے زمانے سے پہلے بعض احادیث عام طور سے بعض علماء کو معلوم نہ تھیں اس لئے ان کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑا لیکن جب امام شافعیؒ کا زمانہ آیا تو مختلف بلاد اسلامیہ میں میل جول بڑھ گیا تھا اس لئے کسی مقام میں جو احادیث روایت کی جاتی تھیں وہ دوسرے بلاد اسلامیہ میں بھی شایع ہونے لگیں لیکن باوجود اس کے

ابتدا میں اس لحاظ سے کہ یہ حدیثیں علمائے شہر کے عمل سے مختلف تھیں لوگوں نے ان پر تکیہ نہیں کیا لیکن جب محدثین نے چھان بین شروع کی تو پتہ چلا کہ سب حدیثیں قابل اعتماد ہیں لا محالہ امام شافعیؒ نے اس صورت میں قرار دیا کہ حدیث، خواہ اس کی روایت بصرہ میں ہو، خواہ مدینہ میں صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا چاہیئے صحیح حدیث کی موجودگی میں کسی تابعی یا مجتہد کا قول نا قابل اعتنا ہے۔

رائے اور روایت

اس موقع پر یہ امر پیش نظر رہنا چاہیئے کہ فقہ کے دو مسلک، رائے، اور روایت قدیم سے ہیں۔ خود عہد صحابہؓ تک اس کا سُراغ لگایا جاتا ہے۔ خود امام مالکؒ کے زمانے میں اور ان کے بعد اور پہلے بھی ایسے علما موجود تھے جو مسائل فقہ میں رائے سے حکم قرار دینے میں احتیاط برتتے تھے۔ نہایت شدید ضرورت کی حالت میں بدرجۂ مجبوری بقدر ضرورت رائے پر عمل کرتے تھے۔ ان کو بڑا اہتمام اس کا تھا کہ حدیث کی روایت کر دیں۔

امام شافعیؒ پر تدوین فقہ کا اصلی دور ختم ہو جاتا ہے گو کچھ اور عرصہ تک مجتہدین پیدا ہوتے رہے۔

امام شافعیؒ کے شاگرد امام احمدؒ

امام شافعیؒ نے جو کام شروع کیا اس کو ان کے شاگرد امام احمد بن حنبلؒ نے کمال پر پہنچا دیا۔ امام المحدثین کی حیثیت سے انھوں نے مہتم بالشان کام انجام دیا۔ بخلاف امام اعظمؒ کے نامور شاگردوں کے امام شافعی کے شاگرد۔ امام احمد، امام داؤد ظاہری اور امام جعفر طبری علٰحدہ علٰحدہ راہ کے سالک بنتے ہیں۔ اسنا د اور شاگردوں کے مذاہب میں کافی بعد ہے۔ امام احمدؒ تو بالکل الگ ہیں۔ امام طبری حنابلہ اور شوافع میں واسطہ ہیں۔ امام ظاہری نے تو دوسری ہی راہ اختیار کی۔ امام احمدؒ اہل حدیث کے امام ہیں اور امام داؤد ظاہر یہ فرقہ کے پیشوا ہیں۔

ارباب حدیث

امام احمد حنبلؒ کا ہی زمانہ دوسرے ارباب حدیث کا بھی زمانہ ہے۔ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاریؒ نے ترتیب و تہذیب حدیث کا جو عظیم الشان کام انجام دیا ہے اس کی ممنونیت سے ساری اسلامی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھی کے معاصر امام مسلمؒ بھی ہیں انھوں نے گویا صحیح بخاری کی ترتیب درست کر دی۔ ترمذی اور ابو داؤد بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے۔ اسلامی سوسائٹی میں ان کے آراء و مباحث کو

خوب فروغ ہوا۔

اس دور کے بعد اصفہان کے امام داود نے اپنا مذہب پھیلانا چاہا۔ ان کا طریق کار صرف یہی نہیں تھا کہ امام شافعی کے مذہب کے لحاظ سے خبر کو اثر پر ترجیح ہے بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ قیاس و رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ تمام آیندہ پیش آنیوالے مسائل کے لئے انھوں نے قرآن وسنت کو کافی سمجھا۔ اگر ایسے مسائل درپیش ہوں کہ جن کے متعلق قرآن وحدیث سے کوئی حکم معلوم نہو تو انھوں نے قرار دیا کہ وہ شرعاً مباح ہوں گے

اہل حدیث واہل الرائے اس جگہ اہل حدیث واہل الرائے کے متعلق مزید توضیح نامناسب نہیں ہے۔ واضح ہو کہ "اہل الرائے" وہ علماء ہیں جو قیاس اور حدیث (خبر واحد) کے باہم متعارض ہونیکی صورت میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طور پر امام اعظمؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اہل حدیث کہلانے کے مستحق ہیں اور امام مالکؒ اہل الرائے۔

غور کیا جائے تو تین اسکول پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ اہل الرائے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ روایت کی کوئی دلیل قطعی ثابت نہ کرسکیں تو قیاس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

۲۔ اہل حدیث یا اہل ظاہر۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ نقل یا روایت کی کسی دلیل کے موجود ہوتے ہوئے قیاس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ اس گروہ کے اکثر افراد قیاس کو دلیل شرعی یا ماخذ قانون ہی قرار نہیں دیتے۔

۳۔ فقہا۔ ان کا مسلک بین بین ہے۔ یہ اصحاب دلیل قطعی (قرآن، سنت مشہورہ، اور اجماع) کو سب امور پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً حالات مابعد الموت وغیرہ۔ ایسے امور جن کا عقل ادراک نہیں کرسکتی ہے ان کے متعلق خبر واحد اور قیاس میں تعارض پیدا ہو جائے تو بعض اصحاب قیاس کو اور بعض اصحاب خبر واحد کو راجح شمار کرتے ہیں۔ اگر کسی مسئلہ میں خبر واحد موجود نہو تو یہ گروہ بالاتفاق قیاس سے استدلال کرتا ہے۔ خبر واحد کے واجب العمل ہونے کے شرائط ان لوگوں کے پاس مختلف ہیں۔ جب تک وہ شرائط نہ پائے جائیں خبر واحد قابل عمل نہیں ہوتی۔

اہل حدیث نے پہلے اور آخری گروہ کو اہل الرائے قرار دیا ہے۔

فقہ منطقی قالب میں

اس دور میں مجتہدین کرام کے تمام مباحث قلمبند کر لئے گئے اور ان کی تدوین عمل میں آئی۔ حکومت نے ان کے آرار کے لحاظ سے فصل خصومات کے آئین مقرر کئے۔ مدارس و جامعات میں ان کی کتابوں کی تدریس شروع ہو گئی۔ اس طرح ان علمائے محترم نے وہ بنیادیں قایم کر دیں کہ ان پر آج تک لوگ چل رہے ہیں۔ اس زمانے میں گویا منطقی نقطۂ نظر سے فقہ کا مطالعہ شروع ہوا۔ فقہی اصطلاحات مقرر ہوئے، طرز استدلال کی داغ بیل پڑنے لگی۔ مناظرہ اور مباحثہ کی بنیادیں پڑیں۔ تحقیق و تفتیش کے نئے نئے آئین جدید نقطۂ نظر سے مدون ہوئے۔ ترتیب بیان اور اظہار مدعا کے جدید اسالیب قایم ہوئے۔ غرض ان سب امور کی بنیاد پڑی جن کی وجہ سے منتشر معلومات علمی قالب میں ڈھالے جاتے ہیں۔

قصہ مختصر، یوں فقہ اسلامی کی ابتدا ہوتی ہے، اور یوں اس کی ترقی۔ اب تدوین فقہ اور تدوین حدیث کا اصلی کام ختم ہو جاتا ہے۔ امام ابن جریر طبری پر گویا مجتہدین کا خاتمہ ہے۔ اسلامی نظام قانون اس کے بعد انھی آئمہ کے اقوال و آرار کی شرح و تفسیر قرار پاجاتا ہے۔ اس پر نظر ڈالنا اس تحریر کے دائرہ سے باہر ہے۔

قربانی و ایثار

اس موقع پر یہ تذکرہ بے محل نہیں کہ فقہ اسلامی کے ان آئمہ کبار کو اپنے خیالات اور آراء کے لئے قربانی و ایثار کے بڑے بڑے امتحان دینے پڑے۔ اسلامی قانون کی تاریخ بھی قید و بند کے تذکرہ سے خالی نہیں ہے۔

امام اعظمؒ نے بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر قضات کے عہدے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر کوفہ کے والی یزید بن ہبیرہ نے کوڑے لگوائے۔ خلیفہ منصور نے بغداد کی بنا ڈالی تو امام صاحبؒ کو بھی کوفہ سے بغداد میں طلب کیا۔ یہاں بھی قضات کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس کو آپ نے یہاں بھی قبول نہیں کیا۔ امام اعظمؒ کو قید کر دیا جاتا ہے اور اسی قید میں

آپ نے اپنی جان عزیز جان آفرین کے سپرد کردی۔

امام احمد حنبلؒ کو بھی مامون الرشید جیسے روشن خیال خلیفہ کے حکم سے کوڑے لگائے گئے۔ تاکہ وہ اپنے عقائد سے پلٹ جائیں۔ امام احمدؒ کی کوئی معمولی ہستی نہیں تھی کہ صرف مار کے ڈر سے اپنے عقاید بدل دیں۔

امام مالک جبری بیعت کے متعلق فتوٰی دیتے ہیں کہ درست نہیں۔ اس بناء پر منصور کے زمانے میں والئ مدینۂ منورہ نے حکم دیا کہ امام کو کوڑے لگائے جائیں تعمیل حکم میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ پشت خون آلود ہوگئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے۔ پھر اونٹ پر سوار کرا کے شہر میں تشہیر الگ کی گئی۔ بعد ازاں وہ اسی طرح خون آلود لباس میں مسجد نبوی میں آئے اور خون صاف کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔

عصر حاضر | اس وقت ساری دنیا میں یہ خیال ہے کہ اسلامی نظام قانون اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے۔ یہ رائے صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ آئندہ ہوگا لیکن اسلامی علوم و آداب کی تاریخ قدم قدم پر یہ ثبوت پیش کرتی ہے کہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اور جدید خیالات کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ علوم کی بھی تدوین ہوتی گئی ہے۔

فتنۂ تاتار و زوال بغداد کے قیامت خیز واقعات نے علوم اسلامی میں انحطاط پیدا کر دیا۔ سیاسی افراتفری کے باعث راضی بہ تقدیر ہو جانے کا غلط مفہوم پیدا ہوگیا۔ حادثۂ تاتار سے سنبھل کر پھر کام شروع ہوا تھا اور خود خانہ بر انداز مغل پھر خانہ سازی پر آمادہ ہو گئے۔ ترکان آلِ عثمان بھی میدان میں آئے لیکن علوم کا انحطاط رو کے نہیں رکا۔ اب علوم کا آفتاب مغرب سے نکلتا ہے اور بہ برکت تصانیف مسلمانان سے مغرب میں ترقی فنون کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ فرنگی سیاست، اسلامی سیاست پر غالب ہو جاتی ہے۔ حادثۂ مغل کے بعد

یہ دوسرا حادثہ رونما ہوتا ہے۔ اسلامی سوسائٹی حاکم سے محکوم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آئمۂ اربعہ نے قانون اسلامی کو اس وقت ڈھالا تھا جبکہ اسلامی حکومت پورے اوج پر تھی۔ ان کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ آیندہ صدیوں میں کیا حالت پیش آئیگی۔

بس ایسی حالت میں جبکہ اسلامی، سیاسی اور علمی تاریخ زمانہ کو بدلتا دیکھ کر اس کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کرتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی ہے تو کوئی تعجب نہیں اگر ایک ادھ اور کروٹ بدلے اور

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

محمد غوث ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ)

سلسلۂ ادبیات اُردو

مدیر عمومی :۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے پی ایچ ڈی
پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں :۔

۱۔ مرقع سخن، دور آصفیہ کے تمام سر برآوردہ شعرائے دکن کا مصور تذکرہ مجلد قیمت صہ

۲۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری، از مولوی میر حسن صاحب ام اے (عثمانیہ) ؍ عہ

۳۔ ٹیگور اور اسکی شاعری، از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے (عثمانیہ) ؍ عہ

۴۔ ہوش کے ناخن، ایک دلچسپ سماجی ڈراما، از مولوی میر حسن صاحب ام اے (عثمانیہ) عہ
مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے (عثمانیہ)

۵۔ یوسف ہند قید فرنگ میں، مرزا غالب کی قید کے واقعات۔ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے (عثمانیہ) ۸؍

مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد سے طلب فرمائیے۔

طیلسانئین سے خطاب

اے مطلعِ عالم کے درخشندہ ستارو
میدانِ عمل میں کبھی ہمت کو نہ ہارو

ہر سعی پہ تم اپنی طبیعت کو ابھارو
جو بگڑے ہوئے کام ہیں کوشش سے سنوارو

ہستی کی ہر اک شاخ پہ چھا جاؤ جوانو
آپ اپنے ہی بل بوتے پہ اتراؤ جوانو

گھبراؤ نہ ہرگز تمھیں آ جائے جو آفت
ہے طاقتِ انساں کی یہ اک جانچ کی صورت

دنیائے عمل میں ہے قیامت سی قیامت
پا جاؤ جو ہمت ہے ان آفات پہ قدرت

سمجھو کہ کھلا بابِ فتوحات عزیزو
ہو گرمِ طلب شوق سے دن رات عزیزو

سرشار کرے جوشِ عمل کا تمھیں بادہ
کیف و کمِ دنیا کی نہ ہو فکر زیادہ

ہر گام پہ اس رہ میں مصمم ہو ارادہ
بڑھ جاتا ہے اسوار سے پرجوش پیادہ

گر زندگیِ سادہ میں اعلیٰ ہوں خیالات
حاصل ہو تمھیں دہر میں معراجِ کمالات

تابع ہے خیالات کے انسان کی ہستی
کرتے رہو واسطے جذبات پرستی

آنے نہ دو بھولے سے خیالات میں پستی
ان مول ہے جو جنس وہ ہو جائے نہ سستی

سمجھو کہ خیالات ہیں اللہ کی سوغات
دکھلاتے ہیں جو وقت پہ تاثیر کرامات

آئینِ جہاں جو ہیں انھیں مانو اٹل تم
ایمائے جہاں ہے رہو سرگرمِ عمل تم

پاؤ گے ضرور اپنے مساعی کا بدل تم
ڈالو نہ کبھی غیر کی راحت میں خلل تم

ہر قوم کی عزت کرو کہلاؤ روادار
انساں کی رہو خیرسگالی کے طلبگار

حرماں کا کبھی بھولے سے احساس نہ آئے — نزدیک جوانوں کے کبھی یاس نہ آئے
فالج ہے دلوں کی یہ کبھی پاس نہ آئے — جب کام پہ اٹھو کوئی وسواس نہ آئے
تعلیم کا مقصد یہ ہے مایوس نہ ہونا — اس بیش بہا عمر کو غفلت میں نہ کھونا

یہ شیوۂ مردانہ ہے بیجا ؤ رجائی — ظاہر بھی ہے جو ہو وہی باطن میں صفائی
ہر اہلِ وطن کی کرو للّٰہ بھلائی — ملحوظ رکھو اپنے بزرگوں کی بڑائی
سب اہلِ وطن کی ہیں لگی تم پہ نگاہیں — بھولو نہ ترقیٔ وطن کی ہیں جو راہیں

بخشا ہے ہر انسان کو اللہ نے جوہر — تم میں بھی جو جوہر ہے کرو اس کو اجاگر
مشہور ہوئے اس کی نمایش سے ہیں اکثر — سیّد ہو کہ شبلی ہو کہ حالی ہو کہ اکبر
اے غافل جوہر ہے یہی حق کی ودیعت — اس باب میں پوچھے گا خدا روزِ قیامت

یہ علم سکھاتا ہے کہ انسان بنو کامل — شہریِ مفید اور بنو دہر کے حاصل
اخلاقِ حمیدہ کے ہوں سب تم میں فضائل — مانند بہائم نہ کتابوں کے ہوں حامل
زخمی نہ کرو دوسرے کو تیغ و سناں سے — تکلیف نہ پہنچاؤ کبھی دست و زباں سے

ہے جنگ بپا، مادہ و روح میں دائم — ملحوظ رکھو شرق کے آداب و مراسم
ہوں روحی ترقی سے روایات جو قایم — پورے ہوں جہاں میں جو تمھارے ہیں عزائم
بھولو نہ خدا کے لیے تم شیوۂ اسلاف — ہر گام پہ ہو پیش نظر اسوۂ اسلاف

اقلیم دکن کے ہو تمھیں آنکھ کے تارے — تم قوم کے دلدار ہو تم ملک کے پیارے
شبانِ دکن برقِ ذہانت کے شرارے — اللہ رکھے حاصلِ قسمت ہیں ہمارے

لکھیں گے مؤرخ جو ذکی ان کی کہانی
کہلائیں گے یہ اک نئی تہذیب کے بانی

محمد عبدالسلام ذکی بی۔ اے (عثمانیہ)

اُردو ادب بیسویں صدی میں

(۱)

عہدِ انقلاب

ہنگامۂ غدر نے یوں تو سیکڑوں گھر نہیں بلکہ بستیاں تباہ کر ڈالیں، مگر قدیم اُردو ادب کا بازار جیسا تباہ ہوا ویسی تباہی سوا لکھنؤ اور دلی کے کہیں نہیں آئی۔ بات یہ ہے کہ اُردو نے ہمیشہ سلطنتوں کی آغوش میں تربیت پائی، بادشاہی درباروں اور شاہی محلوں میں پروان چڑھی، دلی لاکھ اُجڑی سہی پھر بھی ایک قدیم سلطنت کی راجدھانی تھی۔ وہ سلطنت ہزار گئی گذری تھی لیکن ادیبوں کا ماوا و ملجا تھی۔ دلّی کے علاوہ اگر اردو کو راس آئی تو لکھنؤ کی رنگین فضا۔ مانا کہ لکھنؤ کی عیش پرور فضا نے اس کی مٹی خراب کر دی تھی اور اس کا فطری حُسن شائستگی کے ہاتھوں خاک میں مل گیا تھا، پھر بھی اس کے پرستاروں کی روٹیوں کا سہارا یہیں تھا۔

غدر کہنے کو ہندوستان بھر میں ہوا، مگر سچ پوچھو تو دلی اور لکھنؤ پہ جیسی بیتی اور کسی جگہ پہ نہ گذری۔ سلطنتیں تو خیر بگڑی ہی تھیں، اُمراء، شرفاء، یہاں تک کہ سفید پوش تک برباد ہو گئے، اس حال میں شعراء اور اہلِ کمال کے مجمع تتر بتر نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ ایک ہلڑ پڑ گئی، کوئی ٹونک گیا تو کوئی بھوپال، کسی نے الور کا راستہ لیا تو کسی نے جیپور کا۔ غرض کہ مرشد آباد، بھاولپور، حیدرآباد اور رامپور اطراف و جوانب میں جتنی ہندوستانی ریاستیں تھیں سب ان قسمت کے ماروں کی منزلِ مقصود بن گئیں۔

الور کے حکمراں مہاراجہ شیو دھان سنگھ نے ظہیرؔ و تشنہؔ شاگردانِ ذوقؔ اور میر مہدی مجروحؔ و سالکؔ شاگردانِ غالبؔ کی بڑی قدر کی[1]۔ ایسے آڑے وقت میں دلی اور لکھنؤ سے مساوی فاصلہ پہ ہونے کی وجہ سے رامپور جن ہستیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکا وہ اس کے لیے باعثِ صد ہزار نازش ہیں۔ علماء میں

[1] تاریخ ادب اُردو (ترجمہ) صفحہ ۲۰۸۔

غرض کہ داغ کا بانکپن، امیر کی مضمون آفرینی، جلال کا لوچ جو اہل زبان کا طرۂ امتیاز ہے تسلیم کے الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دل آویزی۔ نیر اور محسن کی تشبیہیں اور استعارے اس عہد کی یادگار چیزیں ہیں۔ یوں تو انگریزی تعلیم اس سے کہیں پہلے دوسرے مقامات میں رس بس چکی تھی، لیکن مشرق ومغرب کا پہلا سنگم دلی میں ہوا تھا۔ مگر یہ بہار چند روزہ تھی۔۔۔ یہاں کچھ اور بدی تھی ۱۸۵۷ء کی شورش میں "مشرق و مغرب کا یہ پہلا سنگم" (دلی کالج) بھی لٹا اور بند ہو گیا۔ اس کے بعد حالانکہ یہ پھر کھلا، مگر حالات تبدیل ہو چکے تھے اور ۱۸۷۷ء میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اسی "مرحوم دہلی کالج" کا ایک طالب علم جدید اردو شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔[1] اس کے ساتھ کرنل ہالرائیڈ کی (جو پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے ناظم تھے) سرپرستی نے آزاد کی مساعی کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک جدید قسم کا مشاعرہ لاہور میں منعقد کیا گیا۔ اس میں بجائے مصرعہ طرح، نظم کے لیے موضوع تجویز کیا گیا تھا۔

کرنل ہالرائیڈ کے اثر اور آزاد کی کوششوں سے یہ مشاعرے کامیاب ہونے لگے اور جدید رنگ سے اردو دانوں کی طبیعتیں مانوس ہونے لگیں۔ مگر آزاد کی شہرت بحیثیت شاعر اب ہے نہ اس وقت تھی۔ وہ تب بھی نثار تھے اور آج بھی اسی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس لیے اگر مولانا حالی ان کا ہاتھ نہ بٹاتے تو ان کی کوششوں کا بار آور ہونا یقیناً بعید مشکل تھا۔ حالی پہلے شاعر تھے پھر نثر نگار، بحیثیت شاعر ان کی شہرت مستقل ہو چکی تھی جس کا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کثرت نگاری سے جدید اردو شاعری کو ان گنت فائدے پہنچائے۔ قدیم دیوتاؤں کو معزول کر کے نئے خدائے شاعری کو بجوانے میں انکی تحریروں نے حیرت انگیز کام کیا۔ سب سے زیادہ اثر کرنے والی اور ان کی ان تھک کوششوں کا بڑا مجموعہ "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جو بجا طور پر نئے مذہب کی آسمانی کتاب سے کم نہیں۔

یہاں یہ سمجھنا غلطی ہے کہ حالی کی اصلاحی شاعری آزاد سے متاثر ہوئی، خود مولانا حالی کا قول ہے کہ "میں شیفتہ اور پھر مرزا غالب سے متاثر ہوا ہوں"۔ شیفتہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "وہ مبالغہ کو ناپسند

---

[1] مقدمات جلد دوم صفحہ ۵۰۔

کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا، سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اپنا منتہائے کمال سمجھتے تھے۔[1] یہ درحقیقت خود مولانا کے کلام کی حالت ہے" مقدمات جلد دوم" صفحہ (۵۱) پر یہ عبارت دیکھنے میں آئیگی" چنانچہ ان کا (حالی کا) قدیم کلام بھی ان عیوب سے پاک ہے جو اُردو شاعری کی بدنامی کا باعث ہوئے . . . . ان کے حقیقی دماغی آبا عرب جاہلیت اور ما بعد کے شعراء ہیں۔ ان کی بعد کی شاعری میں شعرائے عرب کا روحانی اثر ہے جو اُن اساتذہ کے کلام کے مطالعہ سے نامعلوم طور پر ارثاً مولانا کو پہنچا"۔

یہ سب کچھ صحیح ہے۔ مگر جدید اُردو ادب کا طالب علم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حالی کو حالی بنانے والے دراصل سرسید تھے۔ انھوں نے حالی کی قابلیت کو پرکھا اور ان سے ایسا کام لیا جو غالباً انھیں سے ممکن تھا۔ دراصل حالی کو غیر فانی بنانے والا ان کا مسدس" مد و جزرِ اسلام" ہے۔ حالی سرسید سے ملے بغیر بھی لکھ سکتے تھے یا نہیں ادب کا یہ مسئلہ بلاشبہ بحث کے لیے ایک دلچسپ موضوع ہے۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ قوم سے" کافر و ملحد" کا خطاب پانے والا شخص ایسی شخصیت رکھتا تھا جس کی کشش سے ایسے ایسے لوگ اس کی طرف کھنچے آتے تھے جو اس کے اثر سے ملک میں روشن ستارے بن کر چمکے۔ حالی بھی ان میں کے ایک تھے۔ خود حالی نے اپنی اس سرگزشت کو نہایت دلکش پیرایہ میں مسدس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔[2] دراصل قدرت نے سرسید کو اصلاح کے اس سرچشمے پر لاکر بٹھادیا تھا کہ وہیں سے اس کی تمام سوتیں بہہ کر نکلتی ہیں۔[3]

جدید اُردو ادب کے بانیوں میں جتنی اہم شخصیتیں ہیں سب اس" امام وقت" سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوئیں۔ ایک آزاد کو اس سے الگ سمجھو۔ شبلی بھی اس سرچشمے کی ایک شاخ تھے۔ شبلی کا تقرر علی گڈھ کالج میں فارسی کی پروفیسری پر ہو گیا تھا۔ ان کو سرسید سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا کہ وہ شہر چھوڑ کر کالج کی فضا میں آرہے، اور سرسید کی کوٹھی سے متصل ایک مکان لیکر فروکش ہو گئے۔ اس زمانے میں حالی کا سب سے زیادہ پرجوش خیر مقدم

---

[1] ۔ مقدمات عبدالحق جلد دوم صفحہ ۵۱۔

[2] ۔ "مقدمات" سے ملخص۔

[3] ۔ جدید اُردو شاعری صفحہ ۸۲۔

کرنے والے ہی تھے اور شعر و سخن کی اصلاح میں بھی حالی کی ہمنوائی کا دم بھرتے تھے۔ مثنوی "صبح امید" (۱۸۸۴ء) پر حالی کا اثر نمایاں ہے اور دوسری نظم "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" بھی جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھی گئی انھیں اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہ صحبتیں اور اصلاحی کوششیں سر سید کی زندگی تک برابر قایم رہیں، یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء میں یہ مجدد اعظم نا قدر شناس قوم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا اور شبلی تھوڑے دنوں بعد حیدرآباد چلے آئے۔ پھر ان کے خیالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے خود ایک نیا تعلیمی ادارہ "ندوۃ العلماء" مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری کے ساتھ مل کر قایم کیا جس کا مقصد جدید طرز تعلیم کی اصلاح تھا۔ اس میں بھی جی نہ لگا تو اعظم گڈھ میں ۱۹۱۳ء میں "دار المصنفین" کا سنگ بنیاد رکھا اور اس اخیر کارنامے کے بعد ۱۹۱۴ء میں علم و ادب کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔

حالی عمر بھر مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ پڑھتے رہے، شبلی بھی سوزخوانی میں ان کے "بازو" تھے لیکن حالی مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کے مادی امور میں پیچھے رہنے کو سمجھتے تھے اور شبلی اس کی وجہ اصول و روایات اسلامی سے انحراف بتلایا کئے۔ آج کل اقبال اور اپنے زمانے میں اکبر الہ آبادی اسی اسکول کے پیرو تھے۔

اکبر کی شاعری کا موضوع وہ حالات ہیں جو مغرب کی تقلید سے ہند میں پیدا ہوئے، جو ان کے خیال میں مشرقی روایات کے بالکل برعکس تھے۔ بات یہ ہے کہ اکبر ایک قسم کے قدامت پرست تھے اور اسلام سے ان کو بیحد ہمدردی تھی۔ نئی روشنی کے ہنگاموں اور یورپ کی اندھی تقلید کو دیکھ کر ان کے دل میں نفرت کے شعلے اٹھے اور ان کا قلم خاکہ اڑانے اور ہجو لکھنے پر اٹھ گیا۔ اسی زمانے میں "اودھ پنچ" جاری ہوا تھا۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک اکبر کے مضامین اس میں برابر شائع ہوتے رہے۔ یہ مزاحیہ نویسی کی مشق اکبر کو کچھ ایسی بھائی کہ وہ مزاحیہ نگار شاعر بن گئے۔ ان کی شاعری کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں یہ پرانے مضمون کا پیوند نئی تحریکوں سے لگاتے ہیں، پھر بھی اکثر ذاتیات پر آجانا ان کے لیے کچھ اچھی بات نہ تھی:-

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے   شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

اس قسم کے اشعار نہ ہوتے تو اچھا ہی تھا۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ چاہے اصلاح ہی کے لیے کیوں نہ لکھا گیا ہو آج تو صرف

ہنسنے ہنسانے کے کام آتا ہے۔ ہاں:۔

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازاوں   جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

ایسے مقام پر وہ اکثر قابل عزت ہستی بن جاتے ہیں۔

طباطبائی کے ترجمے بہت مقبول ہوئے Elegy written in a country church yard کا ترجمہ بہت ہی نفیس اور پاکیزہ ہے، مگر ان سے قبل اسمٰعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے ترجمے شروع کر دیئے تھے، اور وہی اس "بدعت حسنہ" کے بانی ہیں۔

ترجموں سے قطع نظر اسمٰعیل کی شاعری بھی قابل لحاظ ہے۔ خالص نیچرل نظمیں آزاد کی پیروی میں لکھنا ان کا مطمح نظر تھا۔ اس میں اضافہ یہ کیا اور اسلوب ایسا رکھا کہ وہ بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ بن گئیں۔ اس طرح گویا اُردو شاعری میں ایک اور نئے باب کا اضافہ ہوا۔ سادگی ان نظموں کی جان ہے۔ نظیر کی طرح سوقیانہ زبان ان کے ہاں نہیں، اور نہ آزاد کی لفظی نقاشی ہے۔ سادگی بیان اور سادگی خیال[له] ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔ موضوع کا بیش پا افتادہ ہونا بھی ان کی شاعری کی خصوصیت میں داخل ہے۔

له۔ جدید اُردو شاعری صفحہ ۱۵۶۔

(۲)

انقلاب کے اثرات

انقلاب نیچرل نظموں سے شروع ہوا اور اس کی لے قومی نظموں پر ٹوٹی۔ اس جگہ سے پورے عہد انقلاب کی شاعری کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اسمٰعیل کی سادہ نظمیں چاہے وہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہوں یا ان میں دیہاتی منظر پیش کیا گیا ہو، انھیں دونوں عنوانات کے تحت آ گئی ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء تک (جو زمانۂ انقلاب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) انھیں رنگوں میں نظمیں لکھی جاتی رہیں۔ میں نے غزل گو شعراء کو اس میں شامل نہیں کیا، کیونکہ غزل کسی ایک عنوان کے تحت لکھی نہیں جاتی، یہ ممکن ہے کہ اس میں بیان کے تسلسل سے ایک شعر دوسرے سے ملا ہوا ہو۔

۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۹ء تک کے کل شعراء دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ غزل گو، نظم گو۔ نظم گو سے ایسے شعراء مراد ہیں جنھوں نے علاوہ غزل کے دیگر اصناف سخن، مسدس، مثنوی، ترکیب بند وغیرہ کو اپنی فکر کے سانچے بنائے ہیں۔ خاص طور پر مثنوی اس عہد کی مقبول ترین چیز ہے۔ اس میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ زمانۂ قدیم میں مثنوی کے لیے چند بحریں مختص تھیں اور اب یہ قید اٹھا دی گئی۔ زیر نظر دور میں اس صنف کو بہت عروج رہا۔ اس عہد کے مشہور نظم گو شعراء بے نظیر شاہ، سرور جہان آبادی، شوق قدوائی، اقبال، چکبست، صفی لکھنوی، دتاتریا کیفی اور عزیز وغیرہ ہیں، ان کی نظمیں زیادہ تر مثنوی کی شکل میں ملیں گی۔ خاص طور پر شوق قدوائی کی مثنویاں "عالم خیال" اور "حسن" اور "ترانۂ شوق" بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ اور سچے جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

دوسری بات جو بہت زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ان شعراء کا کل کلام بلحاظ موضوع نیچرل ہے۔ عشقیہ جذبات ان لوگوں نے غزل کے ذریعے ظاہر کیے۔ اب یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ نیچرل سے ہماری کیا مراد ہے۔ مولانا حالی نے اس لفظ کی یہ تشریح کی ہے:-

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر بے ضرورت معمولی بول چال اور روزمرہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنیً نیچر کے موافق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہوتی جائیں۔"[1]

مولانا حالی کی اس تفصیل سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا معنیً مطابق فطرت ہونا اور لفظاً ملک کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ہونا اس کو نیچرل بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ مولانا نے بہت سی مثالوں سے اسی مطلب کو واضح کیا ہے اور غزل اور مثنوی وغیرہ کے بہت سے اشعار کو نیچرل ثابت کیا ہے۔

غزل کے علاوہ جن صورتوں میں نیچرل شاعری ظہور پذیر ہوئی وہ حسب ذیل ہے:۔

مناظر قدرت مناظر قدرت کی مصوری مثلاً صبح و شام کی کیفیت، برسات کی بہاریں وغیرہ شاعر پر اثر کریں اور وہ ان مناظر کی تعریف میں کچھ کہے! ور اس طرح کہے کہ اس کے سُننے سے دوسروں کے دل بھی متاثر ہو جائیں۔ یہی اس کا کمال ہے اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس منظر کی سچی تصویر دوسروں کے سامنے پیش نہ کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے تخیل کے ساتھ ساتھ قوت بیان اور مشاہدہ کی کتنی ضرورت ہے۔ اسی قوت بیان اور مشاہدہ کا نام شعری مصوری یا محاکات ہے۔

مناظر قدرت کچھ انقلاب ہی کی وجہ سے اُردو شاعری میں داخل نہیں ہوتے بلکہ اس سے پہلے

---

[1] مقدمۂ شعر و شاعری نسخہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۹۱ و ۹۲۔

نظیر اکبر آبادی، انیس و دبیر اور ان سے بھی پیشتر میر حسن وغیرہ نے اس میں اپنے جوہر دکھائے تھے۔ مگر نظیر کے سوا ہر قدیم شاعر کے کلام میں یہ مناظر ضمنی طور پر بیان کئے گئے ہیں اور ان کو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں۔ دور جدید میں مناظر قدرت خاص طور پر مہمات شاعری بنائے گئے۔ پیشوایان انقلاب آزاد اور حالی کی تقلید میں بیسیوں شعراء نے ان پر خاص طور سے نظمیں لکھیں، اقبال، شوق قدوائی، چکبست، سرور جہاں آبادی، عزیز لکھنوی، بے نظیر شاہ وغیرہ جتنے بھی مشہور شعراء اس دور میں گذرے سبھی نے تو اس پر طبع آزمائی کی۔ پروفیسر الیاس برنی کے مرتب کردہ انتخابات میں تین جلدیں مناظر قدرت کے نام سے موسوم ہیں۔ اس سے کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خالص ہندوستانی مناظر زیادہ تر پیش کئے گئے ہیں۔ قدیم شعراء کے مناظر ایک عام حیثیت رکھتے تھے۔ انیس و دبیر کی صبح نہ ہندوستان کی صبح تھی نہ عرب کی بلکہ وہ صرف معیاری صبح کی مصوری کرتے تھے۔ مگر اس عہد میں یہ بات نہیں رہی چکبست کی "سیر ڈیرا دون"۔ شوق کی "برسات کی شام" اور اقبال کی "کنار راوی" خالص ہندوستانی چیزیں ہیں۔

ہمارے قدیم شعراء چونکہ زیادہ تر معیاری مناظر دکھانے کے عادی تھے اس لیے ان کے بیان میں تخئیل کا اثر زیادہ ہوتا تھا، اور محاکات میں جہاں تخئیل کی فراوانی ہوتی پھر اس کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے کیونکہ مشاہدہ تخئیل سے بالکل دب جاتا ہے۔ اور شاعری صرف فرضی بیان بنکر رہ جاتی ہے۔ جدید شعراء کے ہاں یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی، وہ ایسے موقعوں پر تخئیل صرف تشبیہ اور استعارے میں صرف کرتے ہیں، اسی لیے ان کا بیان مطابق فطرت رہتا ہے۔ اور فرض کی بجائے واقعی معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات دراصل انگریزی اثر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

واقعہ نگاری نیچرل شاعری کا دوسرا رخ ہمارے خیال میں واقعہ نگاری ہے۔ واقعہ نگاری میں صرف موجودات عالم کی حقیقت یا ان کے مخصوص اوصاف بیان کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنوعی چیزیں مثلاً جلوس، دربار اور برات وغیرہ بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ کچھ انقلاب کا تحفہ نہیں ہے، قدیم شعراء کے ہاں اس کے بہ کثرت نمونے ملتے ہیں۔ میر تقی میر اور سودا سے لیکر نظیر شکوہ آبادی

اور محسن کاکوروی تک تقریباً ہر شاعر کے ہاں یہ چیز مل سکتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی "بدر منیر" وبے نظیر ہیں۔ "برات کا سین" میر تقی کی مثنوی جس میں برسات میں اپنے گھر کی حالت بتائی گئی ہے، اور عام طور پر سودا کے قصائد کے بعض حصے اسی قبیل کے ہیں۔ سودا نے پہلے پہل اس میں تخیل کی چاشنی دی اور پھر تو واقعہ نگاری محض دور از کار مبالغوں کی پوٹ بنکر رہ گئی۔

واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ زیر بیان واقعہ کی صحیح معنوں میں تصویر کھنچ جائے۔ دور جدید کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے کیونکہ انھوں نے متاخرین کی بدعت غلو[له] کو بالکل بھلا دیا اور حقیقت نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ استعاروں اور تشبیہوں کے تہ بہ تہ پردے اٹھا دیے اور فطرت سے بیحد قریب ہو گئے۔ پروفیسر الیاس برنی کی مرتب کی ہوئی مناظر قدرت کی تینوں جلدوں میں اس قسم کا کلام بھی بہتات سے ملیگا۔ عزیز لکھنوی کا "فوارہ" اور شوق کے "مورا ور کبوتر" اقبال کا "گل پژمردہ" اس سے بڑھ کر "جگنو" اور "بلاد اسلامیہ" اس قسم کی بہت پاکیزہ چیزیں ہیں۔

۲

انقلاب کا دوسرا تحفہ قومی شاعری ہے، اس کی ابتداء کا سہرا بھی مولانا حالی کے سر ہے۔ سرسید کی فہمائش سے "مدوجزر اسلام" مسدس کی شکل میں لکھا گیا اور اتنا مقبول ہوا کہ شہرت دوام سے سرفراز ہوا۔ اس عہد سے آج تک برابر ہر نام نہاد شاعر نے اس کے موضوع پر طبع آزمائی کی۔ شبلی، نذیر احمد اور مولوی اسمٰعیل نے بھی اس کی تقلید میں نظمیں لکھیں، اس طرح قومی شاعری کی ایک شاخ "مذہبی شاعری" وجود میں آئی۔ اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری کا موضوع بھی مذہبی جذبہ ہے۔ اس مذہبی شاعری کے دو اسکول ہیں۔ ایک اسکول کے پیرو حالی، اور اسمٰعیل ہیں، اور دوسرے کے شبلی اور اکبر الہ آبادی۔ حالی کا اسکول مسلمانوں کی جہالت اور مادی امور میں پیچھے رہنے کو ان کی پستی کا سبب قرار دیتا ہے اور ترقی کا نسخہ جدید علوم کی تحصیل اور جدید تہذیب کی

له۔ مولانا حالی نے یہ لفظ نامطبوع مبالغے کے لیے استعمال کیا ہے، یہاں بھی انھیں معنوں میں لیا گیا ہے۔

تقلید بتاتا ہے۔ شبلی کا اسکول اس کے برعکس ہے۔ وہ مسلمانوں کو مریض تو سمجھتے ہیں مگر تشخیص حالی کے بالکل خلاف کرتے ہیں اور جدید علوم و تہذیب کی روز افزوں ترقی میں قدیم اسلامی تہذیب کا خون ہوتے دیکھ کر صرف اسی کو ان کی پستی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اسی اسکول کا پیرو اور غالباً سب سے زیادہ مقبول شاعر اقبال ہے۔

۱۹۰۵ء تک اقبال اس رنگ میں نہ تھے۔ ان کی شاعری کا موضوع اتحاد وطن تھا اور قومیت کی بنیاد ان کے خیال میں وطن تھا۔ مگر انگلستان سے واپسی کے بعد ۱۹۰۹ء میں ان کے خیالات میں عظیم تبدیلی ہوئی اور وطنی اتحاد ان کی نظر میں ایک مہمل چیز بن گیا۔ ع

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اس طرح مذہبی یکسانیت پر قومیت کی بنیاد پھر پڑی اور اس شد و مد سے کہ مطالعہ کرنے والے اقبال کا یورپ جانے سے پہلے کا کلام دیکھ کر اگر "بانگ درا" حصہ دوم و سوم کا کلام دیکھیں تو متحیر ہو جائیں۔ پہلے ان کا ترانہ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تھا، اور اب ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہو گیا۔ اقبال کی نظموں میں مولانا روم اور فارسی کے دیگر صوفی شعرا کا اثر بہت نمایاں ہے، پھر بھی تعجب ہے کہ وہ عجمیت سے بیحد نالاں ہیں اور اس کو مسلمانوں کے حق میں سم قاتل سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک خط میں تحریر کیا:۔

"زمانہ حال میں عجمیت سے اجتناب لازم ہے۔ اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت خدائے تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے اسلام کی خدمت اور اقوام و ملل اسلامیہ کے احیاء و بیداری میں صرف کرے۔ میری رائے میں عجمیت مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ اس وقت باطل کے ساتھ جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض تھا، عجمیت کا اثر

مذہب، لٹریچر اور تمام زندگی پر غالب ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ عجمیت کے خلاف جہاد کرنا بھی اقبال کا نصب العین ہے۔ یہ وہی عجمیت ہے جس کے بارے میں اکبر نے کہا تھا۔

ہم میں باقی ہے کہاں خالد جاں باز کا رنگ   دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

اس کے علاوہ اقبال کے فلسفۂ زندگی میں عمل کو خاص درجہ حاصل ہے۔ سکون و قرار کو وہ بہت بری نظر سے دیکھتے ہیں:-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس شعر کے علاوہ اور بہت سے اشعار میں اپنے اس نظریہ کو واضح کیا ہے۔ اقبال اس عہد کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز شاعر ہیں، اور ان کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک پہنچ چکی ہے۔ اب تو انھوں نے فارسی میں شعر گوئی شروع کر دی ہے اور اُردو کو بالکل بھلا دیا ہے۔ حالانکہ بقول سر عبدالقادر اُردو کی یہ بڑی بدقسمتی ہے اور گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔

قومی شعرا میں صفی لکھنوی بھی بہت مشہور ہیں، ان کو "لسان القوم" بھی کہا جاتا ہے، جس طرح اقبال مسلمانوں کے ایک طبقے کے خیالات کی ترجمانی اور ان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اسی طرح صفی لکھنوی دوسرے طبقے میں کام کر رہے ہیں۔ صفی نے بھی سیکڑوں ہی نظمیں شیعہ قوم کو مخاطب کر کے لکھیں اور ان کی پستی کا رونا رویا۔ سب سے زیادہ طویل اور مقبول نظم "لخت جگر" ہے۔ تقریباً ۲۷ سال سے برابر اس کا کچھ حصہ شائع ہوتا ہے اور پڑھا بھی جاتا ہے۔ یہ دراصل شیعہ کانفرنس کے اجلاس میں پڑھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اب وہ اجلاس جہاں منعقد ہوتا ضمناً اس کا ذکر آ جاتا ہے۔ شیعہ کانفرنس تقریباً ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی اور صفی لکھنوی نے اس میں نظمیں پڑھنا شروع کیں اس وقت سے برابر "لخت جگر" میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو یہ نظم بہت طویل ہے، مگر اس کو مسلسل نظم کہنا درست نہیں اس کی

---

[1] کلیات اقبال" مطبوعہ عماد پریس ۱۳۴۳ھ صفحہ ۸۷ - ۸۸۔

ادبیت بھی نہایت عمدہ ہے اور اثر بھی اس میں اچھا خاصا ہے۔ اس طرح اس عہد کے دو بڑے شعرا کا تعلق دو کانفرنسوں سے ہے، اقبال کا انجمن حمایت اسلام لاہور اور صفی کا شیعہ کانفرنس لکھنؤ سے مگر اقبال کی سی شہرت صفی کو نہیں ملی۔ اقبال کا خطاب عام مسلمانوں سے ہوتا ہے اور صفی کا صرف ایک فرقے سے۔ کلام کے اثر میں صرف انیس بیس کا فرق ہے۔ صفی بھی قوم میں قوت عمل پیدا کرنا چاہتے ہیں اور تہذیب جدید سے الگ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور اقبال بھی۔ غرض کہ بہت سی باتوں میں یہ دونوں شعرا یکساں ہیں۔ جوش، اثر و ادبیت دونوں کے ہاں ہے۔ ممکن ہے اقبال کے پاس جوش اور اثر زیادہ ہو۔ بین الاقوامی شہرت میں صفی، اقبال کو نہیں پہنچے۔ اقبال کی اعلیٰ علمیت نے بھی ان کو بہت فائدہ پہنچایا۔ صفی کے ہاں اس کی بھی کمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فلسفہ کا جو رنگ اقبال کے پاس ہے وہ صفی کے کلام میں عنقا ہے۔ صفی کا میدان غزل ہے۔ اس میں وہ کافی شہرت کے مالک ہیں اور اقبال اس میدان میں ان کی برابری ہرگز نہیں کر سکتے۔ غزل گو شعرا کے سلسلے میں ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے گا۔

وطنی شاعری ۔ یہاں تک قومی شاعری کی اس شاخ سے بحث کی گئی جس کا تعلق مذہب سے تھا۔ اسی کی ایک شاخ وطنی شاعری بھی ہے جس کا ابتدائی زمانہ بھی انقلاب ہے۔ اس کے بعد سرور، چکبست اور اقبال اس رنگ میں کارہائے نمایاں کر گئے۔ "صبح وطن" مجموعہ کلام چکبست میں بہت سی نظمیں اس عنوان کے تحت آتی ہیں اور "خمکدۂ سرور" میں بھی اس نشے کی کمی نہیں۔ مگر چکبست اور سرور بھی اپنے مذہبی رنگ کو نہ دبا سکے۔ سرور نے خاص ہندووانی چیزوں پر بہت سی نظمیں لکھیں اور چکبست نے رامائن کا ایک سین لکھا۔

سیاسی شاعری اسی سلسلے میں سیاسی شاعری شروع ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں "نہیں بشنت بھی ہم ہوم رول کے بدلے" کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس میدان کے شہسوار حسرت، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں اڈیٹر زمیندار ہیں۔ موخرالذکر دونوں بزرگوں نے خاص طور پر سیاسی خیالات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا مگر واقعہ یہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر سیاسی شاعری کو ہاتھ نہیں آیا۔ اس وجہ سے اردو شاعری میں اس کا میدان صرف غزل کے بعض اشعار تک رہا اور بس۔

۳

غزل گوئی

غزل ابتدا ہی سے اُردو شاعری میں مقبول ترین صنف رہی ہے۔ قدما سے لیکر آج تک برابر شعراء اور اُردو داں طبقے کو اس کی للک رہی ہے۔ غدر تک تو سب سے زیادہ فروغ اسی کو حاصل رہا مگر اسکے بعد عہد انقلاب نے حالی کے قلم سے اس میں حسب ذیل ترمیموں کا مطالبہ کیا۔

۱۔ غزل میں محبت کا بیان لابدی ہے، مگر یہ کچھ ضروری نہیں کہ اس کا تعلق صرف شاہدان بازاری سے ہو۔ محبت عالمگیر جذبہ ہے، اس لیے اس کو محدود نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کا ذکر ایسے جامع الفاظ میں کیا جائے جو دوستی اور محبت کے تمام انواع روحانی و جسمانی پر حاوی ہوں۔ یہاں تک ہوسکے کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے، یعنی کلاہ، چیرہ، دستار، سبزۂ خط، زرگر پسر، مطرب بچہ وغیرہ، یا محرم، کرتی، مہندی، چوڑیاں، موباف، آرسی وغیرہ۔

۲۔ خمریات یا اس کے لوازمات کے ساتھ جو زاہدوں وغیرہ کی مٹی پلید کیجاتی ہے وہ ترک کردینا چاہیئے۔ ایسے مضامین اہل باطن (صوفیائے کرام) نے غزل میں داخل کیے کیونکہ وہ خمریات کے لوازم سے استعارہ کا کام لیتے تھے اور چونکہ اہل ظاہر علما، فقہا، وغیرہ ان پر طرح طرح کی آفتیں ڈھاتے تھے، اس لیے یہ اپنے دل کی بھڑاس ان کی ظاہر داری کے بیان سے نکالتے تھے اور ان کی ریاکاریوں کا پردہ فاش کرتے تھے۔ ہم کو صرف استعاروں میں خمریات کا ذکر کرنا چاہیئے اور فقہاء و زہاد کی ذاتیات سے قطع نظر صرف ان کی ریاکاری کا بیان کرنا چاہیئے۔

۳۔ مذکورہ بالا مضامین کے سوا جس بات کا سچا ولولہ اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، حسرت ہو یا ندامت، غرض، شکر، شکایت، صبر، رضا، قناعت، غصہ، تعجب، حب وطن، قومی ہمدردی، رجوع الی اللہ وغیرہ۔ کچھ بھی ہو اس کو بھی غزل میں بیان کرنا چاہیئے۔

۴۔ غزل کو مسلسل بنا دینا چاہیئے۔[۱]

۵۔ سنگلاخ زمینوں میں غزل نہ کہی جائے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، ردیف کی قید کم کر دی جائے اور قوافی ایسے ہوں جو بکثرت مل سکیں۔[۲]

۶۔ صنائع اور بدائع پر کلام کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ کیونکہ معنوی خوبیوں کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔[۳]

۷۔ پہلے زمانے میں دولت و جاہ کے لیے جو غیر معتدل کوششیں جاری تھیں ان کو دیکھ کر ہمارے قدیم شعرا نے توکل اور قناعت کے مضامین باندھے لیکن اب جد و جہد اور تگ و دو کا زمانہ ہے اس لیے ہم کو غزل میں سعی اور عمل کے خیالات ظاہر کرنے چاہئیں۔[۴]

ان اصلاحی خیالات کے ساتھ مولانا حالی نے جو عاشقانہ جذبات کے ساتھ اس کثرت سے اخلاقی، قومی اور سیاسی خیالات کا اظہار کیا کہ وہ بالکل ایک نئی چیز بن گئی چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی — یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض[۵]

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر — شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اس طرح غزل میں، اخلاق، تصوف، سیاسی خیالات اور قومی جذبات، بلکہ صاحب شعر الہند[۶] کے

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری ۱۸۹۳ء ملخص از صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۲۔

۲۔ مقدمہ دیوان حالی ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۷۶۔

۳و۴۔ ملخص از مقدمہ دیوان حالی۔

۵و۶۔ شعر الہند صفحہ ۳۶۸۔۳۶۲۔

خیال میں" علم کلام تک کے نفیس خیالات داخل ہو گئے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غزل کی لطافت میں اس سے فرق آ گیا۔ اس لیے جن شعراء نے ان اصلاحات کے ساتھ غزل کی اصلی شان کو بھی قایم رکھنا چاہا انھوں نے لکھنؤ کے قدیم رنگ کو چھوڑ کر قدما کی سادہ روش اور دلّی کے متانت آمیز رنگ کو اختیار کیا۔"

میں اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ دربار رامپور میں غدر کے بعد شعراء کا جمگھٹا غزل کے حق میں جہاں نقصان رساں ہوا اس سے کچھ فائدے بھی پہنچے۔ وہ یہ کہ جلالؔ، امیر اللہ تسلیمؔ، امیرؔ مینائی وغیرہ نے اپنا رنگ نہ جمتے دیکھ کر یا روابط و رواسم کی وجہ سے دلّی کی شاعری سے اثر لیا۔ جلالؔ کے کلام میں یہ رنگ صاف جھلکتا ہے اور تسلیمؔ نے خود کہا ہے:۔

میں ہوں اے تسلیمؔ شاگردِ نسیمؔ دہلوی   مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

انھیں تسلیمؔ کے شاگرد مولانا حسرتؔ موہانی ہیں جو "جدید غزل کے احیا کے سبب"[۱] ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے غزل کو تکلف و تصنع سے پاک کر دیا۔ ان کی غزل میں اگرچہ فلسفیانہ خیالات بھی پائے جاتے ہیں مگر غالبؔ کا معنیٰ آفریں انداز حسرتؔ کی غزل سے کم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ حُسن کاری کو زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے میرؔ کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

حسرتؔ کی زبان شستہ و رفتہ، اور ان کا طرزِ بیان شگفتہ اور خوشنما ہے۔ ان کی نرالی ترکیبیں، بولتے ہوئے فقرے، اور بانکے اور اچھوتے ٹکڑے پُرکیف ہیں، اور وجد آور ہیں، اور سُننے والے کے دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں:۔

حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا   کیا کیا میں نے جو اظہارِ تمنا کر دیا

وہ دُور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے بہت   مگر قبول ہمارا سلام ہو جائے

مجھ سے تم چھپنے لگے، اچھا کیا، یونہیں سہی   اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمہیں دیکھا کروں!

---

[۱] جدید اُردو شاعری صفحہ ۳۶۲۔

گرفتارِ مصیبت ہوں اسیرِ دامِ الفت ہوں — میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

عشق سے حاصل ہوئی کیا کیا پشیمانی مجھے — عشق جب دینے لگا تعلیم نادانی مجھے

دراصل اس عہد کے غزل گو دو گروہ میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اول وہ جو انقلاب سے بالکل متاثر نہیں ہوئے مثلاً جلیل، حفیظ جونپوری، ریاض شاگردان امیر مینائی۔ مرزا رسوا، نظم طباطبائی، بزم اکبرآبادی شاگردان تنیر شکوہ آبادی۔ سائل دہلوی، بیخود دہلوی، نوح ناروی، آغا شاعر دہلوی، احسن مارہروی شاگردان داغ۔ یہ سب ایک لکیر پر چل رہے ہیں۔ ان سب کا مطمح نظر داغ کا رنگ ہے۔ زبان کی سلاست اور عاشقانہ جذبات ان کی شاعری کا ماحصل ہیں۔ ان میں ریاض خیرآبادی خمریات کے لیے بہت مشہور ہیں۔ داغ کی شوخی اور بانکپن بھی ان کے ہاں بہت ہے:۔

غلط ہے آپ نہ تھے ہم کلام خلوت میں — عدو سے آپ کی تصویر بولتی ہو گی

کوئی منہ چوم لیگا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

جناب شیخ نے جب پی تو مسکرا کے کہا — مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

رندانہ مضامین کے باندھنے میں استاد اور اس عہد میں فرد ہیں مگر کبھی کبھی اس میں بھی حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں:۔

بانس پر میکدہ میں تجھکو چڑھایا اے شیخ — پھر بھی اونچے تری مسجد کے منارے نکلے

جہاں حد اعتدال میں ہوتے ہیں طبیعت کو پھڑکا دیتے ہیں:۔

کیا جام دیا ہے مجھے کیا جام دیا ہے — ساقی کا بھلا ہو مرے ساقی کا بھلا ہو

صرف الفاظ سے رند سرشار کی خوش مستی کی تصویر کھینچی ہے:۔

پے چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

مئے ریاض آپ بھی پیتے ہیں باایں ریش سفید — ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

جام مئے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اس ڈگر کے جتنے چلنے والے ہیں ان کا اصل مطمح نظر روزمرہ کی خوبی، زبان کی صفائی اور بندش کی چستی ہے۔

دوسرا گروہ اعتدال پسند شعرا کا ہے۔ یہ جدید رجحانات سے متاثر ہوئے۔ ان میں قابل ذکر "حلقۂ معیار" کے لکھنوی شعرا ہیں۔ علی حیدر دل، مہدی حسین ناصری مرحوم، واجد حسین یاس، صفی، عزیز، ثاقب لکھنوی آرزو، جانشین جلال، کاظم حسین محشر، نوبت رائے نظر، حکیم علی محسن آبر اور رضا علی وحشت کلکتوی وغیرہ۔

حلقۂ معیار | یہ ایک ادبی ادارہ تھا، اس کی روح رواں اور بانی حامد علی خاں بیرسٹر تھے۔ درحقیقت جعفر علی خاں اثر کے قول کے مطابق ع بہت ممنون ہے اردو ادب حامد علی خاں کا[1]

اس عہد کے جتنے مشہور لکھنوی شعرا ہیں وہ سب اس میں شریک تھے اور ان کا ادبی نصب العین بھی قریب قریب ایک تھا۔ قدیم شعرا (میر و غالب) کے رنگ کی پیروی اور لکھنؤ کی شاعری کے ارتفاع میں اس سوسائٹی نے بہت کام کیا۔ جب تک حامد علی خاں زندہ رہے یہ بھی کچھ نہ کچھ کام کرتی رہی۔ ان کے مرنے ہی وہ صحبتیں بھی ختم ہوگئیں، کچھ جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے ممبروں میں چل گئی . . . . . .

لکھنؤ کے ان شعرا میں جو رنگ جھلکتا ہے وہ سید تعشق، جلال اور تسلیم کا کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے نہایت سختی سے مسی، چوٹی وغیرہ کے ذکر کو غزل سے دور رکھا۔ یہ عام طور پر میت، نزع، گور غریباں کے مضامین ضرور باندھتے ہیں۔ ممکن ہے یہ لکھنؤ کی اس فضا کا اثر ہو جو انیس اور ان کے پیرو مرثیہ گویوں نے پیدا کر دی تھی یا یہ کہ ان کے خیال میں غزل میں سوز و گداز پیدا کرنے کا یہ ایک آسان طریقہ ہو۔ پھر بھی اس میں بعض شعرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ان کے کلام کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ ان میں عزیز بھی ہیں۔ عزیز کا کلام تمام شعرائے لکھنؤ میں سب سے زیادہ رنگین ہوتا ہے۔ اکثر تصوف کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ بہار کے مضامین بھی خوب کہتے ہیں۔ انکے قصائد بھی بہت ہیں، جن کی تشبیب عام طور سے یا تو غزل سے شروع ہوتی ہے، جس میں فراق کی حالت بیان

---

[1] اثرستان۔ دیوان جعفر علی خاں اثر۔

کیجاتی ہے یا بہار کا سماں باندھا جاتا ہے۔ بہرحال پورے قصیدہ پہ تغزل چھایا رہتا ہے۔ یہ حال اس دور کے اکثر قصیدہ نگاروں کا ہے صرف طباطبائی اس سے بچے ہوئے ہیں۔ مبالغہ البتہ متاخرین سے کم ہوتا ہے۔ صفی اور محشر بھی قصائد کہتے ہیں، اور محشر تو "مداحِ آلِ محمدؐ" کے خطاب سے مشہور ہیں۔ انکے قصائد بھی اسی رنگ کے ہوتے ہیں۔ قوت شاعری میں صفی ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر رنگینی ان کے کلام میں کم ہے سوز و گداز بھی کچھ زیادہ نہیں اک افسردگی البتہ بہت نمایاں ہے۔

مرزا واجد حسین یاس عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے لکھنؤ میں شادی کر کے وہیں مقیم ہو گئے۔ ان کے پہلے دیوان "نشتر یاس" کے شائع ہونے پر ایک طوفان بدتمیزی اٹھا تھا۔ عارف، اوج وغیرہ بھی (جنھوں نے اس پر رائے لکھی تھی اور ان کو لکھنوی زبان میں مہارت کی سند دی تھی) سوالات کی بھرمار سے پریشان کئے گئے، اور "معیار" میں بھی ایک عرصہ تک ہنگامہ رہا۔ لکھنوی شعرا تقریباً سب کے سب ان سے ناراض تھے آخرکار ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا "حلقۂ معیار" کا خاتمہ بھی ہو گیا اور اسی دن سے جتھا بندی شروع ہو گئی۔ ان کا دوسرا دیوان "آیات و جدانی" اور رباعیاں "ترانہ" کے نام سے شائع ہو گئی ہیں۔ آتش کے کلام سے بہت متاثر ہیں۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ع

یہ کون حضرت آتش کا ہم زباں نکلا

اچھا خاصا کہتے ہیں، اور بعض شعر تو خوب ہی ہوتے ہیں:-

نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا — دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا

وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا — بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے

یاد ش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانہ میں — یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانہ میں

مہدی حسین ناصری بڑے قابل لوگوں میں تھے، فارسی، عربی، اور انگریزی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ غزل میں قیدخانہ کے مضامین خوب کہتے تھے۔ آرزو، ڈرامہ بھی لکھتے ہیں اور جلال کے سچے پیرو ہیں۔ بڑی بحروں میں اکثر خوب شعر نکالتے ہیں۔ سوز و گداز ان کے اشعار میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ "فغان آرزو" ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے، کہنہ مشق شاعر ہیں۔

ان کے علاوہ اُس وقت پیارے صاحب رشید، عارف، دولھا صاحب عروج اور اوج لکھنؤ کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان بزرگوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر دراصل یہ مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ کو ترقی دینا تو کجا انیس و دبیر نے جہاں تک اس کو پہنچا دیا تھا وہاں اس کو برقرار بھی نہ رکھ سکے۔ پھر بھی انکی مشاقی میں شُبہ نہیں۔ مرثیہ میں "ساقی نامہ" کا اضافہ انھیں حضرات نے کیا۔ رشید نے مرثیہ میں بہار کے مضامین خوب خوب نظم کئے ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ شاد عظیم آبادی، فانی، حسرت بھی غزل کے استاد ہیں۔ یہ تینوں حضرات محسنین غزل کہے جانے کے مستحق ہیں اور تغزل کا جتنا اچھا معیار ان حضرات نے قائم کر دیا ہے لائق صد ہزار آفریں ہے۔ ان سب پر میر و غالب کا رنگ چھایا ہوا ہے یعنی میر کا سوز و گداز بھی ہے اور غالب کا فلسفیانہ انداز بیان بھی۔ شاد کا ایک مطلع ہے :-

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں	کھلونے دے کے بھلایا گیا ہوں

کلام کے بیشتر حصہ کا یہی حال ہے۔ مگر کثرت نگاری کی وجہ سے اثر ہر جگہ نہیں پایا جاتا۔ کچھ اشعار اس موقع پر لکھے جاتے ہیں :-

میں، حسرت و حیرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر	ہے بحرِ محبت کی یہ صدا، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مُرغانِ قفس کو پھولوں نے، اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے	آنا ہو اگر تو آجاؤ، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم
ستم ہے، آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا	زمیں کا سخت ہو جانا، فلک کا دُور ہو جانا
ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہے پھر بھی اکیلی ہے	ہماری روح بن بوجھی ہوئی اب تک پہیلی ہے
جب اہلِ شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا	سُن سُن کے مسکراتا ہے دیوانہ آپ کا
جلوہ گر بعد کو ہوگا رُخِ نورانیِ عشق	پہلے اک شکل بھیانک سی نظر آئے گی
دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار	جب تک شراب آئے کئی دور ہو چکے

فانی نے اس رنگ میں تصوف کی چاشنی بہت زیادہ کردی۔ ان کے رنگ کو ایک شخص نے "فلسفہ ادبی پیکریں" کہا تھا! اور واقعہ بھی ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو نہایت شگفتہ انداز سے کہتے ہیں۔ سوز و گداز جتنا ان کے

کلام میں ہے کسی کے ہاں نہیں پہلے لکھنؤ کے رنگ میں کہا کرتے تھے چنانچہ "دیوانِ فانی" میں جو بدایون سے ۱۹۱۷ئہ میں شائع ہوا اس رنگ کے بہت سے نمونے ہیں۔

فانیؔ کے کلام میں اب تصوف کا بہت گہرا رنگ آگیا ہے، اور اس کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے جس کی وجہ سے کلام میں اثر پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بڑی سے بڑی حقیقت کو اس سادگی اور پرکاری سے ادا کر جاتے ہیں کہ بسا اوقات اہل نظر بھی اس سے گذر جاتے ہیں۔ جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی اور واقعات و واردات کی نزاکتوں کے ساتھ بہت کم کی جاسکتی ہے لیکن جناب فانیؔ میں یہ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے[1]۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کے سوز و گداز کی وجہ سے انکو "یاسیات کا امام" کہا ہے:-

عطائے لذتِ سوز و گداز کی خاطر — اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے

سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

وفا کیٔ یا جفا، جانے دو اب یہ ذکر ہی کیا ہے — محبت ہی نہیں، تو پاسِ آدابِ محبت کیا

نگاہِ شوق کے دم تک تھیں آنکھیں — اب آنکھیں یادگاریں ہیں نظر کی

دھیان تیرا، بہشتِ شوق سہی — دلِ عاشق ہے ایک دوزخِ راز

حسرت موہانی کا ذکر کیا جا چکا ہے، یہاں مجموعی طور پر ان شعراء کے کلام کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

سوز و گداز جو انقلاب سے پہلے بالکل مفقود ہوگیا تھا، انھوں نے غزل میں داخل کیا۔ ہر قسم کے جذباتی مضامین بھی باندھے۔ سیاسی مضامین کو قفس نشیمن اور صیاد کے پردے میں خوب خوب ادا کیا۔ اس قسم کا ایک شعر ہے:-

---

[1] مقدمہ باقیاتِ فانیؔ صفحہ ۷۶ و ۸۰۔

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا — طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

تصوف کے حقائق و معارف اور اخلاق کے نکات و مسائل کو دلاویزی سے نظم کیا۔ کثرت سے نئی ترکیبیں استعمال کیں جن کی وجہ سے ادائے مطالب میں آسانیاں پیدا ہوگئیں تمنائے خام، آتش سیال، شعلۂ بالیدہ، شوقِ بیتاب، دوزخ رازِ بہشتِ شوق، جنون پردہ درِ جانِ بہانہ جو، جلوۂ صدرنگ وغیرہ۔ ایسی بہت سی ترکیبیں ہیں جو بلا تکلف یہ سب کے سب استعمال کرتے ہیں غزل میں قناعت اور توکل کے مضامین کے علاوہ، عمل، جستجو، طلب اور شوق کے جذبات کو ابھارنے کے خیالات کو بھی موضوع شاعری بنایا ہے۔ رعایت لفظی اور دیگر لفظی و معنوی صنعتوں پر کلام کی بنیاد بہت کم رکھتے ہیں۔ غلو کو ناپسند کرتے ہوئے قوت تخیل کو بے لگام نہیں چھوڑتے۔ فنی حد تک قدیم اصول سے سرِمو تجاوز کرنا گناہ کے برابر سمجھتے ہیں۔ قدما کی غزل کے کم و بیش تمام اوصاف ان میں موجود ہیں۔ عام طور پر میر و غالب اس گروہ کے مطمح نظر ہیں۔ غالب کا اثر بہت زیادہ ہے۔ لکھنوی شعراء کے علاوہ کسی کے ہاں محض لطف زبان کی خاطر شعر نہیں کہے جاتے، مگر سادگی زبان کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورے کی پابندی کا خیال سب کو ہے۔ حسن و عشق ان کی شاعری کے موضوع ہیں۔ لیکن حسن کو مقید نہیں کرتے۔ حسن ان کے ہاں بہت زیادہ جامع معنی رکھتا ہے۔ اور ان کا عشق متاخرین کے ہوس پرستانہ جذبات والا نہیں ہے ان کے خارجی مضامین صرف سیاسی اور قومی ہوتے ہیں، جن کو قفس، نشیمن، صیاد، قاتل وغیرہ کے استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں۔ غرض کہ دراصل غزل کو زندہ کر کے مقبول عوام نہیں بلکہ "خاص پسند" بنانے والے یہی گنتی کے چند لوگ عزیز، صفی، آرزو، حسرت، شاد عظیم آبادی اور فانی بدایونی ہیں۔

یہ لہراتی ہوئی شمعیں اور جھلملاتے ہوئے چراغ پرانی محفلوں کی یادگاریں ہیں۔ شاد مرحوم تو ہم کو غمزدہ کر ہی گئے۔

آخر میں ایک ظریف شاعر کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے، یہ مولانا صفی کے بھائی مقبول حسین ظریف اپنے رنگ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، کہنہ مشق شاعر ہیں، ان کی ظرافت میں ابتذال بالکل

نہیں ہوتا۔ سیاسی نظمیں بھی اسی رنگ میں خوب کہتے ہیں۔ "افیونیوں کا رجز" بہت مشہور چیز ہے۔ اس کے علاوہ ان کا سفرنامہ بھی زعفران زار ہے۔ مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال رکھتے ہیں اور اسی سے ظرافت پیدا کرتے ہیں:-

الفت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے   مجنوں نظر آتی ہے لیلا نظر آتا ہے

"انا لیلیٰ" کا یہ پہلو بھی دیکھئے۔

۱

عہدِ اضطراب

۱۹۱۷ء سے آج تک کا زمانہ اپنے پیشرو عہد سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا کہ عہدِ انقلاب غدر کے زمانے سے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو یا تو ہم بھلا چکے ہیں، یا قصداً ترک کر چکے ہیں۔ معاشی پریشانیاں، سیاسی ہیجانیاں، اور مقتضائے زمانہ سے زندگی کی لاتعداد مصروفیتیں ہمارے دل و دماغ کو بالکل محصور رکھتی ہیں۔ بے راہی اور مسلمہ اصول سے باغی بننا بیسویں صدی کے اس دور میں ایک عام بات ہوگئی ہے۔ مذہب، سیاست، ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سب کے سب اسی ہنگامۂ بغاوت کے شکار یا تو ہو چکے ہیں، یا ہو رہے ہیں۔ یورپ کا نیا آرٹ اور وہاں کی سنگ تراشی کے نئے اصول شاعری کے نئے سانچے، سیاست کے میدان میں نئے فارسوں کی جولانیاں۔ ان سب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک اور صرف ایک نقطہ ایسا ہے جہاں پر ان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ آزادی بے لگام اور غیر محدود آزادی، ہر چیز میں، ہر شے میں، زندگی کے ہر شعبے اور ہر رنگ میں۔ . . . اس کے علاوہ خود ہندوستان میں سیاسی تحریکوں نے ایک تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ہندوستان کے بہترین دماغ سب کچھ چھوڑ چھاڑ سیاست میں پھنس گئے ہیں۔ ان کے علاوہ جو افراد ہیں وہ مذہبیت کے شکار ہیں۔ ان دونوں گروہوں کا متصادم نہ ہونا یقیناً تعجب انگیز ہوتا۔ چنانچہ دونوں میں جھڑپ ہوئی اور اس شد و مد سے ہوئی کہ ہنگامۂ آزادی نے جو کچھ دماغی سکون چھوڑا تھا وہ اس کی نذر ہو گیا۔

ہندی اُردو کا جھگڑا اسی کا شاخسانہ ہے۔ اُردو کو اس سے بہت سخت نقصان پہنچا۔ اول یہ کہ ہندی والے اُردو کے نام سے ناک بھوں چڑھانے لگے۔ دوسرا سب سے بڑا نقصان اُردو کو یہ پہنچا کہ ایک طرف اسلام کے جوش میں اُردو بالکل عربی بنائی جانے لگی اور دوسری طرف ہندی والوں نے اس کو سنسکرت میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ حصۂ نثر میں ہم اس کا تفصیل سے ذکر کریں گے۔ یہاں یہ عرض

کرنا ہے کہ اس زمانۂ آزادی میں ہر طرف اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔

نوجوان نسلوں میں بہت سے شاعروں کا کلام ایسا ملے گا جو مروجہ بحروں کے قیود اور مستقل الفاظ کی وسعت سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ قدیم اساتذہ کے برخلاف موجودہ شاعر کسی ضابطے میں رہنے کی بجائے آزادہ روی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ فطرت کی ظاہری بے ضابطگیوں نے اس کو یہ سبق دیا ہے کہ حسن کا بہترین پہلو انتشار اور بے اصولی ہے۔ ترنم اب ردیف قافیہ اور معین بحروں پر محدود نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہندی اور جدید فارسی بحریں اور الفاظ کا تناسب اس مقصد کو پورا کرتا ہے چنانچہ عظمت اللہ خاں نے ہندی بحروں کو اختیار کیا۔ اوران کے تتبع میں کچھ اور بھی اس رنگ میں آرہے۔

جدید نظریہ آرٹ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آرٹ کے نمونے اخلاقی حیثیت سے ہرگز نہیں دیکھے جاتے۔ اس اسکول کا مشہور مقولہ "آرٹ صرف آرٹ کے لیے ہے"۔ اسکر وائلڈ اسی نظریہ کا پرجوش پیرو تھا۔ عظمت اللہ خاں نے اپنی بعض نظموں میں غالباً اسی پر عمل کیا ہے۔ اور لوگوں نے بھی نظم اور نثر دونوں میں ادبیت پیدا کرنے کے لیے اخلاق کے بار سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ انگریزی کی بہت سی ایسی نظموں کے ترجمے بھی کیے گئے جن میں جسم عریاں پر ذرا سا بھی حجاب نہیں۔ شیکسپیر کی ایک نظم کے ترجمے کے کچھ اشعار دو آتشہ سے نقل کیے جاتے ہیں :۔

چھپا، چھپا پرے سینہ کہ جس پہ یخ بستہ	بروج سنگ ہیں کیا غضب ہے جن کا ابھار
سرے پہ جن کے عیاں ہیں گلاب کی کلیاں	یہ غنچے ہیں کہ جنھیں نذر لائی فصل بہار
یہ ہاکرو، دل مسکیں کو پہلے بندہ نواز	اسیر گنبد یخ بستہ ہے جو لیل و نہار[1]

آج کل کے اکثر نقاد، قدیم اردو شاعری پر عریاں نگاری کا الزام لگاتے ہیں، مگر نگاہِ انصاف کہتی ہے کہ شبابیات کا جو عام جذباتی طوفان آج کل کے شعراء کے یہاں ملتا ہے وہ ان غریبوں کے پاس نہیں ہے جو انیسویں صدی یا اس سے قبل گذر چکے ہیں۔ بڑی بلند آہنگی سے جرات اور امانت

---

[1] شعر الہند صفحہ ۴۴۴۔

وغیرہ پر شرم کو بالائے طاق رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے، مگر ایسا تو نہیں کہ ان کا کل کلام اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔

واسوخت اور بعض مثنویوں کے مخصوص حصوں کے سوا قدیم اُردو ادب میں شبابیات کا یہ جوش ہرگز نہ تھا۔ ہزل وریختی وغیرہ کا شمار ادب عالیہ میں اب تک کیا ہی نہ گیا، مگر اب تو یہ ہوتا ہے کہ ایسی نظمیں خاص طور پر ادب عالیہ میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور جدید فطرت نگار شاعر عُریاں جذبات اور عریاں تصویریں پیش کرنے میں تامل نہیں کرتا۔

۲

ویسے تو ہزاروں بے راہ رو ہیں۔ مگر شبابیات جوشؔ، حفیظؔ اور اخترؔ شیرانی پر اگر ناز کرے تو ہرگز بیجا نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے تھوڑا بہت حجاب ہر جگہ جاتی رکھا ہے۔ نوجوانی کے جذبات کو زبان پر یہ بھی لاتے ہیں، مگر مشرقی شرم ابھی ان کی آنکھوں میں موجود ہے اور اسی بات نے ان کے مرتبے کو عام مغرب زدہ فرقے سے الگ کر دیا ہے۔ ان تینوں میں جوشؔ بہترین صناع ہے۔ پہلے ان کا رنگ صوفیانہ تھا، روح ادب کی نظمیں آج کے جوشؔ کی نظمیں نہیں معلوم ہوتیں۔ آج کا جوش شباب کا ہے۔ جذبات کی فراوانی، ترکیبوں کا حُسن اور موضوعوں کا انتخاب شباب کی چھپی ہوئی آگ کی چغلی کھاتا رہتا ہے۔ شاعر کی راتیں، فنا فی الشباب کی وارداتیں ہیں۔ خود جوشؔ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں ؎ واقعات اپنے بیاں کیجئے کیا کیا اے جوشؔ

حفیظؔ اور اخترؔ شیرانی کے پاس بھی ایسی بہت سی رنگین وارداتیں ملتی ہیں، مگر جس چیز نے جوشؔ کو ان دونوں سے بلند کیا وہ فکر اور بیان کی فلسفیانہ جھلکیاں ہیں۔ جوشؔ کا نظریہ شباب وساغر عمر خیام سے بہت مشابہ ہے اور یہی وجہ اس کے امتیاز کی ہے۔ جوشؔ جب کبھی اپنے اس رنگ سے ہٹتے ہیں تو جوش کھو دیتے ہیں۔ اثر تھوڑا بہت پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں اصلاحی بھی ہیں۔ "ذاکر سے خطاب" اور چند دوسری نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔ اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا صرف دماغی زور ان کی تخلیق کا باعث ہے۔

اسی وجہ سے ان کا اثر بھی صرف دماغ پر پڑتا ہے۔ یہ نہ دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں نہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ ترکیبوں کا رُعب، استعاروں کا زور اور الفاظ کا جادو دماغ کو اپنا بنا لیتا ہے مگر دل خاموشی سے اس کان سُنتا ہے اور اس کان اُڑا دیتا ہے۔

حفیظ اپنی مترنم بحروں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ حفیظ کی نظموں کے مجموعہ "نغمہ زار" میں بہت سی نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں یہ خصوصیت موجود ہے۔[1] حفیظ کی موجودہ شہرت دراصل اقبال کے پیرو کی حیثیت سے ہے۔ ان کا "شاہنامۂ اسلام" بالکل نقشِ اول ہی سہی مگر اسلام سے ان کی ہمدردی کی خبر ضرور دیتا ہے! اور اقبال کے اثر کو صاف نمایاں کرتا ہے۔ اس کی بحر بھی وہ ہے جس کو عام طور پر اقبال کی نظموں سے خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔ اقبال کی "تصویرِ درد" "محبت" "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" "طلوعِ اسلام" وغیرہ اسی بحر میں لکھی گئی ہیں۔

اختر شیرانی کی ابتدا ٹیگور کے متبعین کے طرز پر ہوئی، لیکن مذاقِ سلیم انھیں جلد ہی راہِ راست پر لے آیا۔[2] یہ بھی اکثر نئی زمینوں میں کہتے ہیں۔ پنجاب کی فضا اور پنجاب کا حُسن اکثر ان کا موضوع رہتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس عہد میں شباب کے نغمہ سرا بہت ہیں! اور ساتھ ہی ساتھ نوجوان نسلوں پر ٹیگور کی مخصوص ادبیات کا اثر ہے۔ اس کے علاوہ یورپ کے اثر کی بدولت روح کی لطافت سے زیادہ آج کل کے شعرا جسمانی حُسن، شکل، اور وضع و اظہار پر زیادہ مٹے ہوئے ہیں۔ معنوی خوبیاں بھی یورپ کے اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ نظموں کی بہتات دورِ گذشتہ سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور سوائے اصغر و جگر کے اس عہد کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو نظم میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کرتا ہو۔

شاعرانِ شباب کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان سے ہٹ کر ایک متین طبقہ بھی ہے، ان میں علی اختر، اختر، افسر میرٹھی، نجم آفندی، اچھے کہنے والے ہیں۔ علی اختر کے کلام میں سوچ بچار کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی دل گرفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ بھی اکثر اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان پر جوش کا بھی اثر ظاہر ہوا تھا۔ پھر بھی ان میں اپج کافی موجود ہے۔ یہ شعر کی ظاہری خوبیوں کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی اس کی معنویت کو سنوارنے کی فکر کرتے ہیں۔ اس کوشش میں نئی فارسی ترکیبیں اور استعارے

---

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۳۱۹ و ۳۲۰۔
[2] ؍ ؍ ؍ ۳۴۰۔

بکثرت استعمال کر جاتے ہیں۔ بہر حال ان کا کلام غور و تامل کا خواستگار ضرور ہے۔ افسر میرٹھی عام روش کی طرح بحروں کی روانی، دلکش اسالیب اور نئے موضوعات کے دلدادہ ہیں۔

یہ اکثر مانوس اور روزمرہ کی چیزوں میں تلاش حسن کیا کرتے ہیں۔ سادگی خیال اور سادگی ادا ان کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ غزل اور نظم دونوں میں اس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کی اس روش نے ان کو یقیناً بہت ممتاز کر دیا ہے۔ وطن پرستی کے جذبات بھی ان کے ہاں بکثرت ہیں۔ سر سلیمان "پیام روح" کی تقریب میں لکھتے ہیں.... "کیا عجب ہے کہ افسر کے یہ محبت بھرے نغمے ہمارے ملک کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جائیں"[1]

نجم کا رجحان غالب کی طرف ہے۔ اور یہ بلحاظ موضوع ماقبل دور سے تعلق رکھتے ہیں حسرت اور فانی کی طرح میر و غالب کا تتبع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو شباب کے جذبات ہیں نہ جوانی کا انداز بیان ہے۔ موٹے موٹے الفاظ اور نامانوس ترکیبوں کا خواہ مخواہ استعمال ان کے ہاں نہیں پایا جاتا ایک عرصہ دراز تک قومی شاعری کے دلدادہ رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی غزل میں فلسفہ، تصوف اور محبت کے ساتھ ساتھ سیاسیات بھی ان کا موضوع ہوتا ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں خاص مہارت رکھتے ہیں، مگر ان کا اصلی کمال قصیدہ نگاری میں ظاہر ہوتا ہے۔

نظم طباطبائی اور دیگر شعرائے لکھنؤ کے قصائد دیکھے جائیں تو بعض جگہ قصیدہ غزل معلوم ہوگا اور بعض جگہ عالمانہ زبان میں خشک وعظ۔ یہ حالت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ نجم نے اس سے بالکل الگ رہ کر مخصوص راہ نکالی۔ وہ خود "قصائد نجم" کے صفحۂ تعارف میں لکھتے ہیں "میں نے قصیدے کی صنف میں ایک جدید شاہراہ بنائی ہے"۔ اسی سلسلہ میں یہ جملہ بھی دیکھنے میں آئے گا "میں نے کوشش کی ہے کہ شاعری سے کوئی مفید کام لوں، اور مذہب سے وہ چیزیں چن کر پیش کروں جس سے تعلیم یافتہ طبقہ کو وحشت کی بجائے (مذہب سے) انس پیدا ہو"۔

شروع ہی کے صفحہ پر یہ الفاظ بھی ملتے ہیں "قصائد نجم" رنگین فلسفہ حقیقی، مدح تبلیغی شاعری، تاریخ جواہر سرکار آئمہ معصومین میں در دولت کے شاعر نجم آفندی کی شاعرانہ نذر"۔ اور در حقیقت ان کے اس ۲۷۲ صفحے کے

[1] مقدمۂ پیام روح مجموعۂ کلام افسر

مجموعے کے مطالعہ سے ان کا یہ دعویٰ سچ معلوم ہوتا ہے "قصائد تشبیب اور مدح کا مجموعہ ہوتے ہیں"۔ انھوں نے تشبیب میں ذکر شباب کی بجائے تاریخ اسلام کے منتخب پاروں کا بیان کیا ہے اس سلسلے میں جناب موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ، جناب مریم کا بیت المقدس میں بچپن گذارنا، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا امتحان عظیم اور دشت فاران کا بے آب و گیاہ میدان سے مرجع عالم بن جانا وغیرہ تاریخ اسلام کے اکثر واقعات خوش اسلوبی اور تاریخی خشکی کو دور کر کے لکھے گئے ہیں۔ مدح میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ صرف ممدوح کے کردار کو پیش کیا جائے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ جوش اور روانی بھی ان کے کلام میں اکثر پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں اس شان کی البتہ نہیں ہوتیں حالانکہ وہ بھی اپنے مقام پر بُری نہیں کہی جاسکتیں۔

۳

اس عہد میں بہترین غزل گو اصغر اور جگر مراد آبادی ہیں جگر اکثر مسلسل غزل لکھتے ہیں۔ ان کے ہاں حسن و محبت کے بعض نہایت پاکیزہ مناظر پائے جاتے ہیں تخیل اور محاکات ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس کے علاوہ زبان کا لوچ مروجہ بحروں میں الفاظ کا ترنم اور اسلوب کی عمدگی نے ان کو اس عہد کا مقبول ترین غزل گو بنا دیا ہے۔ ان کا کلام سرشار محبت کی رنگین داستان حیات ہے۔ یہ داغ سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔ جس طرح غالب کے مخصوص طرز کو فانی نے اس کے پیچ و خم کو نکال کر مقبول بنایا اسی طرح جگر کے کلام میں داغ کا رنگ نکھر گیا[۱]۔ نفاست خیال اور رنگینی بھی ان کے ہاں کسی سے کم نہیں بلکہ بہتوں سے زیادہ ہے۔ ان کے اسالیب صاف اور سیدھے ہوتے ہیں اور ان کی شاعری ایک ایسی تصویر ہوتی ہے جو صرف سادہ رنگوں سے بنائی گئی ہے لیکن مصور کا قلم رنگوں کی آمیزش میں بہت چالاک ہے

اصغر، حیات کے خوشگوار و ناگوار دونوں پہلو پیش نظر رکھتے ہیں، لکھنؤ کے انداز تغزل (نزع مینا اور گور غریباں کے مضامین) سے ہمیشہ الگ رہتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں:۔

غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر　　یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

وہ زیادہ تر گہرے اثرات اور فلسفیانہ خیالات کو بیان کرتے ہیں لیکن شعریت کو بہت کم مدد پہنچتا ہے۔

[۱] جدید اردو شاعری صفحہ ۲۰۷

اصغرؔ کی شاعری کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں خیال اور مضمون کی خوبی زیادہ نمایاں ہے یا لطافت اور حسنِ بیان زیادہ نظر کش ہے۔[1]

بعض یہ کہتے ہیں کہ فانیؔ نے غالبؔ کے رباب سے اگر حزینہ ساز چھیڑا تو اصغرؔ نے اس سے رجائی نغمے پیدا کئے۔ اتنا تو میں بھی کہوں گا کہ وہ شاعری کا اصل اصول یہ سمجھتے ہیں کہ نغمہ ہائے مسرت سے پڑھنے والے کے دل و دماغ بھر دئے جائیں۔

شعر میں رنگینیِ جوشِ تخیل چاہیئے ۔۔۔ مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

غزل کے میدان میں اور ہستیاں بھی ہیں جعفر علی خاں اثرؔ اور سیمابؔ کے نام بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اثرؔ امیرؔ کے پیرو ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنوی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

سیمابؔ کے جتنے شاگرد اس وقت اطراف و اکنافِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اتنے شاید ہی کسی کے ہوں۔ غزل میں الفاظ سے کھیلنا ان کے اسکول کی خصوصیت ہے۔ مگر اکثر جہاں کچھ سادگی سے کام لیتے ہیں بہت بلند ہو جاتے ہیں:۔

ہر چیز پہ شباب تھا ہر شے پہ حسن تھا ۔۔۔ دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

اب دل کا حال کچھ نظر آتا ہے اور ہی ۔۔۔ کیا جانے تم نے دیکھ لیا کس نگاہ سے

لکھنؤ میں اس وقت بعض خوشگو نوجوان شعراء موجود ہیں منظرؔ، حکیم آشفتہؔ، سراجؔ وغیرہ سب خاصا کہتے ہیں۔ مگر ان سب کا طرز یکساں ہے۔ تعشقؔ اور تسلیمؔ کی پیروی کرتے ہیں، اکثر صرف زبان کی خاطر شعر کہہ جاتے ہیں۔ محاورات کی کھپت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور سختی کے ساتھ قدیم قیود میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس عہد کا تجزیہ کیا جائے تو عام طور پر اسلوب کے لحاظ سے دو قسم کے شعراء ملیں گے جو جدید رجحانات سے متاثر ہوئے اور بحروں میں تبدیلی کے ساتھ صُراح اور دیگر عربی، فارسی لغات سے اپنے کلام کو بھرنے کے عادی ہو گئے۔ بعض نے صرف ہندی اور جدید فارسی بحروں کو استعمال کیا مگر سادگی اور زبان کے لوچ کا

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۲۷۹۔

خاص طور پر خیال رکھا۔

دوسری طرف اصغر، نجم، جگر، اثر وغیرہ ماقبل دور کے شعراء سے مشابہت رکھتے ہیں۔ آزادی کی رو انمیں بھی ہے، مگر وہ صرف مضامین کی حد تک۔ آج کل کبھی کبھی سانیٹ اور اسٹانزا بھی اُردو لباس میں دکھینے میں آجاتے ہیں، مگر اس کا نہ تو عام طور پر اثر ہوا اور نہ کوئی کارنامہ پیدا ہوسکا، اس لیے اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عہد صرف اسلوب کی رنگا رنگی سے "انقلاب کے اثرات" سے بہتر سمجھا جائے تو سمجھا جائے۔ اچھے شعرا جتنے ماقبل عہد میں گذرے اس زمانے میں نظر نہیں آتے۔ غزل میں اصغر و جگر، نظم میں جوشؔ اور حفیظ یہی اس دور کی کائنات ہیں۔ پھر بھی نہ معلوم موجودہ عہد ابھی کیا کیا موتی ہماری نگاہوں سے پوشیدہ کیے ہوئے ہے! اور ابھی کتنے فانیؔ اور حسرتؔ نشو ونما پا رہے ہیں۔ نوجوان شعرا میں خدا معلوم کتنے جواں بخت اور جواں سال نکلیں کون کہہ سکتا ہے کہ اس عہد کی شعری ترقیاں اب آگے نہ بڑھیں گی! ان شعراء کے سامنے ایک وسیع کائنات ہے اور ان کی ذہنی نشو ونما کے لیے ابھی کافی گنجائش ہے۔

اس عہد کے رسائل کا حصۂ نظم صاف کہتا ہے کہ جذبات نگاری ہی شعر کی جان ہے۔ چاہے کسی منظر کا بیان ہو یا کسی واقعہ کی تصویر۔ کوئی شاعر ایسا نہ ملیگا جو منظر اور واقعہ سے الگ ہو کر ان کی مصوری کرے۔ یہ بات دور گذشتہ کے نظم گویوں میں نہ تھی، وہ صرف تفصیل سے منظر اور واقعہ کا بیان کافی سمجھتے تھے اور آج کل تفصیل کی اتنی اہمیت نہیں جتنی واقعہ یا منظر سے متعلق جذبات کی۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس عہد میں عام طور پر تصویریں بے جان نہیں ہوتیں۔ جذبات اور منظر کے اس میل نے اس عہد کے نظم گو شعراء کو تھوڑا بہت عہد گذشتہ کے باکمالوں سے الگ ضرور کر دیا ہے۔

تنقید و تبصرہ

غالب | مولفۂ مولانا غلام رسول صاحب مہر بی اے، مدیر اخبار انقلاب لاہور، ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مولانا حالی کی مشہور کتاب "یادگار غالب" کے بعد اگرچہ مرزا غالب کے دیوان کی بہت سی شرحیں اور طرح طرح کے ایڈیشن شایع ہوئے لیکن ان کی سیرت اور سوانحمری پر کسی نے تفصیل کے ساتھ کوئی کتاب تالیف نہیں کی تھی اور یہ موضوع ایک عرصے سے ارباب قلم کی توجہ کا محتاج تھا مولانا مہر نے اس پر قلم اٹھاکر ایک وقتیہ ادبی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ انھوں نے غالب کے تمام کلام کا بغور مطالعہ کرکے اس کی زندگی کے ہر پہلو پر خاطر خواہ نظر ڈالی ہے اور اس سلسلے میں جس قدر مواد مل سکتا تھا اس کو بڑی تحقیق اور کوشش سے فراہم کرکے سلیقے سے ایک قابل مطالعہ اور لایق استناد سوانحمری مرتب کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قدر دانان غالب اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے۔

میری کہانی | پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشتہ سوانحمری مجلد و مصور دو حصے قیمت چار روپیہ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

یہ پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشتہ سوانحمری کا اُردو ترجمہ ہے جو کارکنان مکتبہ جامعہ کی متحدہ کوشش سے اس قدر جلد کتابی صورت میں شایع ہوگیا ہے۔ پنڈت نہرو کی اصل انگریزی کتاب کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ اُردو ترجمہ بھی اس سے کچھ کم ہر دلعزیزی کا مستحق نہیں۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے اس کی زبان نہایت صاف اور رواں ہے مصنف کے پُر اثر قلم کی اُردو میں جھلک نظر آتی ہے۔ یہ گویا ہندوستان کی موجودہ سیاسیات اور کشمکش آزادی کی داستان کا ایک دلچسپ باب ہے اور ایسے دلکش پیرایے میں لکھا گیا ہے کہ پڑھنے سے طبیعت نہیں اُکتاتی۔ کتاب ضخامت اور تصاویر وغیرہ کے لحاظ سے بہت ہی سستی ہے اور اُردو میں شاید ہی ایسی سستی کتاب کوئی اور شایع ہوئی ہو۔ جامعہ ملیہ کی یہ کوشش ہر آئینہ قابل ستایش اور لایق قدر ہے۔

فلسفۂ برگساں | مولفۂ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی عثمانیہ قیمت عہ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مولوی میر حسن الدین صاحب نے فلسفے پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ابھی حال میں آپ نے سر اقبال کے مشہور اور ضخیم فلسفیانہ مقالہ کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ برگساں کی تعلیم اور اس کے فلسفیانہ خیالات کی اس مختصر رسالے میں بڑے دلکش انداز میں توضیح کی گئی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے۔

سالانہ رپورٹ انجمن طیلسانئین عثمانیہ

بابتہ ۱۳۴۵ف

انجمن کا وہ پودا جو اخلاص و جذبۂ خدمت گزاری کے ساتھ بویا گیا تھا برابر نشو نما پا رہا ہے، اور یہ کوئی خودستائی نہیں ہے کہ عام قومی اداروں کی صف میں انجمن کے لیے مناسب جگہ حاصل ہوگئی ہے۔

کابینۂ انجمن | ۱۳۴۵ف میں کابینہ کا انتخاب عمل آیا تھا۔

(۱) نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی آنرز بیرسٹرایٹ لا صدر۔ (۲) راجہ رائے گروداس صاحب بی اے ال ال بی جاگیردار نائب صدر۔ (۳) محمد عبدالرحیم صاحب بی اے معتمد۔ (۴) محمد غوث صاحب ام اے ال ال بی نائب معتمد۔ (۵) شنکرجی صاحب بی اے خازن۔ (۶) اور اراکین نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی۔ (۷) محمد مظہر حسین صاحب بی اے۔ (۸) محمد کلیم الدین صاحب انصاری بی اے ال ال بی۔ (۹) غلام محمد خاں صاحب ام اے۔ (۱۰) سید محمد صاحب ام اے۔ (۱۱) عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ (۱۲) قاضی فصیح الدین صاحب صدیقی ام اے ال ال بی کا انتخاب عمل میں آیا تھا مگر ان کے بلدہ میں نہ ہونے کی وجہ سے نواب فخر نواز جنگ بہادر ام اے ال ال بی کا انتخاب عمل میں آیا۔

سرپرست انجمن | سال زیر رپورٹ میں بھی عالیجناب راجہ راجایان مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی و امیر جامعہ عثمانیہ ہی اس انجمن کے سرپرست رہے۔

طیلسانئین عثمانیہ پر خدمت ملک کی نہایت اہم ذمہ داری عائد ہے جس کو بہ احسن الوجوہ پورا کرنا صرف اجتماعی کوششوں پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کا ایک مناسب ذریعہ ہے حسب دفعہ (۵۲) دستور انجمن ہر نئے سال کے اوائل میں طیلسانئین عثمانیہ کی ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ جو سال زیر رپورٹ کے دوران میں بھی بتواریخ ۱۹ و ۲۰ ر آذر ۱۳۴۵ف زیر صدارت ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب ام اے ال ال بی (عثمانیہ) پی اچ ڈی، ای سی یل (آکسفورڈ) پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ بمقام ٹاون ہال باغ عامہ منعقد ہوئی یہ تیسری

سالانہ کانفرنس تھی۔ اس کا افتتاح عالیجناب رائٹ انریبل نواب سرصدرالمہام بہادر فینانس سرکار عالی کے ایک پیام سے ڈاکٹر میکنزی نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ نے فرمایا۔ حاضرین میں طیلسانئین عثمانیہ بلدہ و اضلاع کے علاوہ عہدہ داران سرکار عالی اور پبلک کی خاصی تعداد شریک رہی اور کانفرنس کے چار اجلاس منعقد ہوئے جن میں علمی، ادبی، تاریخی، تحقیقی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل پر متعدد مقالات پڑھے گئے اور تعلیمی اور معاشی امور سے متعلق جدید اور اہم تحریکات بالاتفاق و بہ غلبۂ آراء منظور کی گئیں۔ ان تحریکات کی نسبت منجانب انجمن جو ضروری کارروائی عمل میں لائی گئی اس کے نتائج کو آگے بیان کیا گیا ہے۔

اس موقع پر بھی جمیع فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی کارناموں کی نمایش کی گئی جس کو تمام حاضرین نے نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ نمایش میں تمام علوم و فنون کی تصانیف و تالیفات و تراجم مطبوعہ و غیر مطبوعہ خوش سلیقگی کے ساتھ ترتیب دئے گئے تھے، اس کا حاضرین پر خاصا اچھا اثر پڑا۔ منجانب کانفرنس بزم تمثیل کا تیار کردہ ڈرامہ "زمانہ" مصنفۂ سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی اے (عثمانیہ) بمقام اکسلسیر تھیٹر پیش کیا گیا جس میں دکن کی گذشتہ و موجودہ زندگی کا مرقع کھینچا گیا تھا۔ اس کی سرپرستی عالیجناب نواب سالارجنگ بہادر نے فرمائی اور انجمن کی ضرورتوں کا احساس فرما کر ایک فیاضانہ عطیہ بھی مرحمت فرمایا۔ اس عنایت خاص کیلیے نواب صاحب ممدوح کی خدمت میں پرخلوص ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے

تعلیم اعلیٰ بہ شعبۂ قانون | شعبۂ قانون جامعہ عثمانیہ میں ال ال بی سے مافوق قانونی تعلیم کے انتظام کی تحریک کی گئی تھی جس کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ ارباب جامعہ کی رائے میں ال ال بی کے امتحان کے بعد ال ال یم کی تعلیم کی جماعتیں قائم کرنا قبل از وقت ہوگا، تاہم اس مسئلہ کو مجلس شعبۂ قانون میں پیش کیا جا رہا ہے، اور اس بارے میں مناسب کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

روانگی طلبا بہ ممالک غیر بغرض تعلیم۔ | غیر ممالک کو جس قدر طلبا تعلیم کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کی نسبت اس امر کا اظہار کرتے ہوئے کہ ان کی تعداد ملک کے حالات کے لحاظ سے ناکافی ہے، سرکار عالی سے درخواست کی گئی تھی کہ ان کی تعداد میں اضافہ کرکے فنی اور صنعتی تعلیم کے لیے زیادہ طلبا بھیجے جائیں جس کی بنا پر وظائف کی تعداد بجائے چار کے پانچ کردی گئی ہے منجملہ ان وظائف کے ایک وظیفہ ہر سال فنی تعلیم کے لیے مختص کیا گیا۔

اس تعداد کو اطمینان بخش نہ خیال کر کے اس بارے میں مکرر ارباب متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی گئی جو سرکار عالی کے زیر غور ہے۔

ارتفاع تحدید داخلہ کلیات عثمانیہ۔ اولاً ممالک محروسہ سرکار عالی کلیات عثمانیہ کے سال اول کی جماعتوں میں کل (۳۶۰) نشستوں کی تحدید کی گئی تھی جس کی بنا پر انجمن کے عام جلسہ اور ما بعد سالانہ کانفرنسوں میں ارتفاع تحدید کی نسبت تحریک منظور کی گئی کہ کلیات میں داخلہ کی تحدید ملک اور قوم کی حقیقی علمی ترقی اور دماغی نشوونما میں شدید رکاوٹ ہے اس لیے اس قید کو جلد از جلد اٹھا دیا جانا چاہیئے۔ مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے اپنی نظرثانی میں کالجوں کی جماعتہائے سال اول کی تعداد میں (۳۶۰) ۱۰ ہ تک اضافہ کر دیا۔ مگر گذشتہ سالانہ کانفرنس نے کلیات جامعہ عثمانیہ میں طلباء کے داخلہ پر جو قیود باقی ہیں ان سے اعلیٰ تعلیمی ترقی میں نامناسب رکاوٹ پیدا ہونے کا خوف ظاہر کیا اور مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ سے فیصلہ پر نظرثانی کرنے کی استدعا کی جس کی بنا پر داخلہ طلباء کی تعداد میں مزید دس فیصدی کا اضافہ کرنے کی منظوری دی گئی۔

موجودہ حالات ملک کے لحاظ سے یہ اضافہ بھی ناکافی تصور کیا گیا اور مکرر ہمدردانہ غور کی درخواست کی گئی۔ مجلس اعلیٰ نے بلدہ کی حد تک داخلہ کی تعداد میں بجائے دس فیصدی کے پندرہ فیصدی کا اضافہ فرمایا ہے اضلاع کے کالجوں کے لیے مقررہ تعداد ہی کافی تصور کی گئی ہے کیونکہ بسا اوقات تعداد پوری نہیں ہوتی۔

کابینہ انجمن مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کی توجہ مکرر مبذول کرائی ہے کہ کلیات جامعہ عثمانیہ میں طلباء کے داخلہ پر جو تحدید عائد کی گئی ہے اس کو اٹھا لیا جائے۔

قانون جبری تعلیم "انجمن طیلسانیین عثمانیہ کو ابتدائی جبری تعلیم کے اصول سے پورا اتفاق ہے۔ انجمن ابتدائی جبری تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور سرکار عالی سے درخواست کرتی ہے کہ اہل ملک کی بہبودی کی خاطر اسکو قانوناً نافذ فرمایا جائے۔"

مجلس علمیہ طیلسانیین عثمانیہ کانفرنس ۱۳۴۳ف میں ایک تحریک منظور کی گئی تھی کہ یہ کانفرنس انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی کابینہ سے توقع کرتی ہے کہ وہ ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرنے اور اعلیٰ علمی تحقیقات کی ہمت افزائی کے لیے

دوسرے اداروں کے تعاون سے اگر وہ حاصل ہوسکتا ہو، ورنہ بطور خود ایک مناسب لائحہ عمل مرتب کرکے علمی کام شروع کرے گی۔

کابینہ نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ذیلی مجلس مقرر کی جس نے کافی غور وخوص کے بعد اپنے کاروبار کو مجلس علمیہ طیلسانیئن عثمانیہ کی صورت میں شروع کیا ہے جس کے صدر ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور معتمد سید محمد صاحب ہیں۔

مجلس علمیہ نے ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے استفسار پر اصلاح و ترمیم تعلیم کے سلسلہ میں ملک کے مجوزہ نظام تعلیم کے بارے میں ایک طویل رپورٹ مرتب کی اور اس کی طرف سے علاوہ صدر مجلس کے نواب فخر نواز جنگ بہادر کو بھی زبانی شہادت کے لیے سرکاری کمیشن کے آگے پیش کیا گیا۔ یہ رپورٹ ترمیم نظام تعلیم کے متعدد حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھی گئی۔

سہ ماہی رسالہ کی اجرائی ملک میں اعلیٰ علمی ذوق پیدا کرنے اور اعلیٰ علمی تحقیقات کی نشر و اشاعت کے لیے مجلس علمیہ طیلسانیئن عثمانیہ نے فی الحال ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا جائے جس میں طیلسانیئن عثمانیہ کے ام اے، اور ام ایس سی کے مقالات، چیدہ مضامین نظم و نثر اور مختلف علوم و فنون پر طیلسانیئن عثمانیہ کے قلم سے بسیط اور محققانہ تبصرے شایع ہوں گے۔ چونکہ انجمن کے پاس نہ تو کوئی سرمایہ تھا کہ وہ مصنفین و مولفین کو امداد دے سکتی اور نہ ملک میں ایسے ادارے ہیں جو طیلسانیئں عثمانیہ کی کتابوں کو اپنی طرف سے شایع کرکے ان کی خدمات علمی کا پرچار کریں، اس لیے خود اعانتی کی یہ مفید تجویز سوچی گئی۔ اس تجویز سے طیلسانیئں عثمانیہ کے ام اے اور ام ایس سی کے مقالے جو بجائے خود محققانہ علمی رسالے ہوتے ہیں اور جن کو نہ تو جامعہ شایع کرتی ہے اور نہ طیلسانیئن اپنی کم استطاعتی کی وجہ سے طبع کراسکتے ہیں، بہت جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائیں گے مضامین نظم و نثر کی اشاعت سے طیلسانیئین میں مضمون نگاری اور شعر گوئی کے ذوق کی حوصلہ افزائی مقصود ہے مختلف علوم و فنون کی مطبوعات پر تبصروں کے ذریعہ طیلسانیئین کے علمی مرتبہ اور فنی وقار کا اظہار ہوگا۔

اس رسالے میں جو مقالات شایع ہوں گے ان کو کتابی صورت میں الگ کرکے چند نسخے مولف کو بھی دئے جائیں گے اور تقریباً (۷۵) نسخے مختلف جامعات اور علمی اداروں کو تحفتہً بھیجے جائیں گے جس سے طیلسانیئن عثمانیہ کے

علمی کارناموں کا بہت آسانی اور کم صرفہ سے خاصا چرچا ہو جائے گا اور کئی ایک طیلسانیئن مولف کی حیثیت سے پبلک میں روشناس ہو جائیں گے۔

یہ مفید تجویز جو اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر اختیار کی گئی ہے، توی امید ہے کہ طیلسانیئن عثمانیہ میں ضرور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائے گی اور وہ اس کا پُرجوش استقبال کریں گے۔

دو سال کی کوشش کے بعد سرکار عالی نے اجرائی مجلہ طیلسانیئن کی منظوری مرحمت فرمائی ہے۔

مجلس علمیہ ان کرم فرما اور ہمدرد طیلسانیئن کی اعانت کی مشکور ہے جنھوں نے بر وقت اپنی مالی امداد سے اس پودے کو سینچا جن میں نواب میر اکبر علی صاحب بیرسٹر، نواب میر احمد علی صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور مولوی غلام دستگیر صاحب رشید قابل ذکر ہیں۔

اجرائی اجازت نامجات بقرض دہندگان۔ گذشتہ کانفرنس میں بہ اظہار رائے یہ تحریک منظور کی گئی تھی کہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ قرض دہندگان کو سرکاری اجازت نامہ حاصل کیے بغیر زرعی قرضی کاروبار انجام دینے کی اجازت نہ دی جائے۔

اس خصوص میں منجانب انجمن دفاتر متعلقہ سے ضروری کارروائی کرنے کے بعد انجمن کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اس خصوص میں اخبارات کے ذریعہ رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے، سرکار عالی کی جانب سے بھی اس بارے میں سعی کی جائے گی۔

قیام عثمانیہ جوبلی بنک سرکار عالی سے یہ استدعا کی گئی تھی کہ اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ کے جشن سیمیں کی مستقل یادگار عثمانیہ جوبلی بنک قائم کیا جائے، معتمد صاحب فینانس نے مطلع فرمایا ہے کہ سرکاری بنک کے افتتاح کا مسئلہ سرکار عالی کے زیر غور ہے۔

قیام کمیشن برائے تجاویز ترقی صنعت وحرفت کانفرنس کی ایک تحریک میں اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ ریاست حیدرآباد میں صنعت پارچہ بافی کی ترقی کے لیے غور کر کے تجاویز پیش کرنے کے لیے ایک کمیشن کے قیام کی ضرورت ہے، محکمۂ صنعت وحرفت سرکار عالی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی جس کے متعلق وہ رقمطراز ہے کہ سررشتہ کی جانب سے مختلف گھریلو صنعتوں کی عموماً اور صنعت پارچہ بافی کی خصوصاً فروغ اور ترقی کے لیے ہر قسم کی ممکنہ کوشش کی جارہی ہے

۱۳۳۹ف میں ایک تجربہ کار قابل ماہر فن کی خدمات حاصل کی جا کر صنعت پارچہ بافی و رنگ سازی کی ممالک محروسہ میں تفصیلی مساحت کی گئی اور حسب ذیل اسکیمیں جن کی محکمۂ سرکار عالی سے منظوری صادر ہوئی ہے خاطر خواہ طور پر چلائی جا رہی ہیں:۔

(۱) شہر حیدر آباد میں ایک فنی مدرسہ کھولا گیا ہے جس میں پارچہ بافی، رنگ سازی، طباعت، گلکاری اور سوزن کاری وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ (۲) اضلاع میں قابل ماہرین فن کی قیادت میں منظم طریقہ پر دورہ کر کے پارچہ باف و رنگ سازان کے مکانات پر فن کے ترقی یافتہ اصول کا مظاہرہ کیا جاتا ہے (۳) فروخت گاہ مصنوعات کا قیام عمل میں آیا ہے جو نہ صرف گھریلو صنعتوں کی پیداوار کی نکاسی کی سبیل نکالتا ہے بلکہ اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ان اسباب کی تشہیر و اشاعت کا کام انجام دیتا ہے۔ (۴) پٹن کے بہترین کاریگروں کو برطانوی علاقہ جات میں منتقل ہونے سے روکنے کی خاطر جو مشہور عالم صنعت ہائے ساری و پگری بافی کی زوال پذیری کی وجہ سے اپنے وطن کو ترک کر رہے تھے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا جہاں نقادی کے اصول پر کام کرتے ہوئے بہت سے خاندان مصروف بکار ہو گئے ہیں۔ (۵) ورنگل میں قالین بافی کے کارخانے کے قیام سے اس صنعت کا احیا کیا گیا اور حیدر آباد اور لندن کے مابین قالینوں کی باقاعدہ تجارت کا آغاز کیا گیا ہے۔ نظام محل دہلی کے لیے بھی یہیں سے قالین سربراہ ہوئے ہیں اور یہاں کے قالین اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اگر اعلیٰ نہیں تو دنیا میں کسی جگہ کی قالینوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان تمام میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے وظائف بھی دئے جاتے ہیں تاکہ ان فنون میں تعلیم پا کر طلبا رمہارت حاصل کریں۔

ان وجوہات کی بنا پر سررشتہ صنعت و حرفت کم از کم موجودہ صورت میں کسی کمیشن کے تقرر کے لیے قوی وجوہ نہیں پاتا، البتہ وہ ان صنعتوں کی ترقی کی مفید تجاویز پر اپنی توجہ مبذول کرنے آمادہ ہے۔

اس بارے میں توقع ہے کہ ہمارے جانشین مزید غور کر کے مناسب صورتیں اختیار کریں گے۔

قیام بیمہ کمپنی در حیدر آباد کانفرنس میں اس امر کا اظہار کیا گیا کہ حیدر آباد میں وسیع پیمانہ پر کاروبار کرنے کے لیے ایک کمپنی کے قیام کی ضرورت ہے جس کا آغاز اور سرپرستی سرکار کو کرنی چاہیئے۔ محکمۂ تجارت و حرفت سے اس خصوص میں جواب وصول ہوا کہ حسب ذیل بیمہ کی تین کمپنیاں منجانب سرکار عالی یا بہ سرپرستی سرکار عالی

قائم ہیں :-

(۱) حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس۔

(۲) ایسٹرن فیڈرل یونین کمپنی۔

(۳) دی حیدرآباد کوآپریٹو انشورنس سوسائٹی۔

اور یہ تحریر کیا کہ ان کی موجودگی میں مزید بیمہ کمپنی کے قیام کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس بارے میں مزید کمپنی کے قیام کی واجبیت پر غور کیا جارہا ہے تاہم حکومت سرکار عالی کو منجانب انجمن توجہ دلائی جائے گی۔

تقرر تجارتی کمشنر | پیوستہ کانفرنس میں اس امر کی شدید ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ممالک خارجہ میں مفید ملکی پیداواروں کی مناسب قیمت پر فروخت کے لیے ٹریڈ کمشنروں کا تقرر عمل میں آئے محکمۂ صنعت وحرفت نے انجمن کو مطلع کیا ہے کہ ریاست ابدمدت کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے عارضی طور پر ایک تجارتی ایجنٹ بمبئی میں کام کر رہا ہے اور یہ کہ اگر اس کے نتائج تشفی بخش ثابت ہوں تو اس انتظام کو مستقل بنایا جائے گا۔ نیز اس امر کی وضاحت کی کہ انگلستان یا دیگر یورپی ممالک میں مستقل آدمی کی ماموری کے کافی امکانات موجود نہیں ہیں۔ تاہم دیسی مصنوعات کی وہاں نکاسی کے لیے کوشش کی جارہی ہے اس سلسلہ میں انجمن سے حسب ذیل امور کی نسبت محکمۂ صنعت وحرفت سے وضاحت چاہی گئی :-

(۱) تجارتی اور کمیشن ایجنٹ کتنے عرصہ سے کام کر رہے ہیں۔ (۲) ان کے کیا فرائض ہیں۔ (۳) کونسی مصنوعات اور اشیاء یہاں سے بھیجی جاتی ہیں۔ (۴) اب تک اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

جواب وصول ہوا کہ قمر طیب جی کا بحیثیت تجارتی ایجنٹ یکم بہمن ۱۳۴۲ف سے تین سال کے لیے تقرر عمل میں آیا جو تیار اور خام اشیاء اور گھریلو صنعت کی چیزوں کی فروخت کی نسبت جدوجہد کرتے ہیں ۱۳۴۳ف ۱۳۴۲ف میں ورنگل کے قالین، اورنگ آباد کی ہمرو، بیدری سامان، سنگاریڈی وسدی پیٹ کے ریشم، کنگھیاں، جوتے، فرنیچر، نمدے، رنگ سازی وگلکاری کی مختلف چیزیں اور دیگر تیار شدہ اشیائے کارخانہ صنعتی سرکار عالی روانہ کی گئی تھیں۔ صاحب موصوف ہمہ وقتی فروخت اشیاء کی ایجنسی نہیں رکھتے بلکہ زیادہ تر باخذ کمیشن ایجنسی کا کام انجام دیا کرتے ہیں۔

محکمۂ صنعت وحرفت سے مزید کارروائی کرنے کی بجائے کابینہ نے یہ طے کیا کہ ریاست میسور و ٹراونکور سے معلومات حاصل کی جائیں کہ وہاں کی پیداوار و اشیا کی نکاسی اور تجارتی ترقی کی نسبت کونسے ذرایع اختیار کئے گئے ہیں۔

ریاست ٹراونکور سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ ریاست میسور کے محکمۂ صنعت وحرفت سے جو جواب وصول ہوا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

خانگی تجار اپنی اشیا کی نکاسی وغیرہ کے لیے خود ہی مناسب انتظام کرلیا کرتے ہیں۔ حکومت سے متعلقہ ادارہ جات کی تیار شدہ مصنوعات کی نکاسی ان ایجنٹوں کے ذریعہ عمل میں آیا کرتی ہے جو اس غرض کیلیے بعض علاقہ جات میں مامور کئے گئے ہیں، اور جو ضروری خام اشیا بذریعہ سکریٹری اسٹور پرچیزکمیٹی میسور اور ٹریڈکمشنر میسور متعینہ لندن سے خرید کرتے ہیں۔ جو ٹریڈکمشنر لندن میں متعین ہے وہ بیرون ہند تمام ممالک میں مصنوعات کی اشتہار بازی وخرید وفروخت وغیرہ کی خدمات انجام دیتا ہے اور وہ خانگی ادارہ جات کی بھی جب کبھی ضرورت ہو امداد و معاونت کرتا ہے۔ اسی طرح عمل پیرائی کے لیے محکمۂ صنعت وحرفت کی توجہ مبذول کرانے پر جواب وصول ہوا ہے کہ بحالت موجودہ اخراجات کی زیادتی ٹریڈکمشنروں کے تقرر میں مانع ہے، اس لیے تقرر ٹریڈکمشنران کا ارادہ نہیں ہے اور تحریر کیا گیا کہ گھریلو صنعتیں طول وعرض ملک میں کافی مقبولیت حاصل کررہی ہیں اُن کی نکاسی غیر ممالک میں کرنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ اراکین انجمن خود بطور رواج ملکی اشیا استعمال کریں تو کم تعلیم یافتہ افراد ملک کے لیے نظیر ہوگی اور اس طرح سے ملکی مصنوعات کو کافی فائدہ پہنچے گا۔

بہرحال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر تفصیلی غور وفکر کی ضرورت ہے اور ٹریڈکمشنروں کا تقرر ناگزیر۔ امید ہے کہ آئندہ یہ کام بحسن وخوبی انجام پائے گا۔

قیام مجلس فراہمی روزگار حاجتمند طیلسانئین کو عند الضرورت مشورت و امداد کی غرض سے ایک منتخب کمیٹی "مجلس فراہمی روزگار" کے قیام کے سلسلہ میں مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے طے کیا تھا کہ فنی کالجوں میڈیکل، انجنیرنگ اور ٹریننگ کے لیے اس قسم کی مجلس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ متعلقہ سررشتہ جات کے

افسران اعلیٰ کو ان کالجوں سے گہرا تعلق ہے۔

کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی نسبت آئندہ سے ایسے طیلسانئین کی فہرستیں جو درجۂ اول یا دوم میں کامیاب ہوں جملہ معتمدین سرکار عالی کے پاس روانہ کی جائیں مجلس اعلیٰ کے فیصلہ پر کابینۂ انجمن نے نظر ثانی کی ضرورت سمجھی اور گذشتہ کانفرنس میں اس خصوص میں ایک تحریک منظور کی گئی اور ارباب مقتدر کی توجہ مسلسل مبذول کرائی جاتی رہی اور ایک وفد بھی عالیجناب نواب امیر جامعہ بہادر کی خدمت میں باریاب ہوا، نواب صاحب نے بیان فرمایا کہ وہ بوقت تقررات طیلسانئین جامعہ عثمانیہ اور دوسرے ملکی تعلیم یافتہ اصحاب کو ترجیح دیا کرتے ہیں لیکن سروس کمیشن کا قیام بھی عمل میں آرہا ہے جس کے فرائض میں وفد کی خواہش کے مطابق اس کو بھی شریک کرنے کی کوشش کیجائیگی کہ تعلیم یافتہ افراد کو کسب معاش کے دوسرے وسائل اور ذرائع کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائے جائیں اور ان کی ممکنہ مدد کی جائے۔

معاشی کمیٹی طیلسانئین کو حصول معاش میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اور بعد تکمیل تعلیم وہ جو مشاغل اختیار کرتے ہیں ان کی تحقیقات کے بعد کابینہ نے ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی جو معاشی کمیٹی کے نام سے تین سال کے لیے حسب ذیل مقاصد کے ساتھ کام کر رہی ہے:۔

(ا) ملک کی معاشی ترقی کی جد وجہد کی جائے۔

(ب) ملک کی معاشی ترقی کے لیے دوسرے اداروں سے تعاون کیا جائے۔

(ج) حصول معاش میں طیلسانئین عثمانیہ کا ہاتھ بٹایا جائے۔

اس کمیٹی کے صدر میر محمود علی صاحب ام اے (عثمانیہ) اور معتمد محمد غوث صاحب ام اے ال ال بی جیسے پُرجوش کارکن ہیں۔ توقع ہے کہ اس کمیٹی کے ذریعہ آئندہ اچھے نتائج ظاہر ہوں گے۔

انجمن کے جلسۂ عام اور سالانہ کانفرنس میں ایک تحریک منظور ہوئی تھی جس میں سرکار عالی کے جملہ محکمہ جات سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ ہمیشہ تقررات کے وقت طلبائے جامعہ عثمانیہ کو ترجیح دیا کریں۔ عہدہ داران سرکار عالی نے اس تحریک سے ہمدردی کا اظہار فرمایا اور اطمینان دلایا کہ آئندہ کے لیے

جامعہ عثمانیہ کے طلباء کے حقوق مرجح ہوں گے۔ دوران سال میں بعض دفاتر کو حسب طلب خواہشمندان ملازمت کی نشاندہی بھی کی گئی۔

کلیۂ انجنیری کے طیلسانئین کو حصول معاش میں جو دقتیں ہیں ان کے ارتفاع کے لیے جو مناسب کوشش عمل میں لائی جا رہی ہے اس کی نسبت تاحال کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی، مزید کوشش جاری ہے۔

دوران سال میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ کو ایسے طیلسانئین کی فہرست ارسال کی گئی جو مختلف مضامین کے ترجمہ و تالیف کے کام میں شریک ہونا چاہتے تھے اور جو اس کام کی کافی مہارت بھی رکھتے تھے تاکہ بوقت انتخاب مترجمین و مولفین ان کا بھی مناسب لحاظ کیا جائے۔

سال زیر رپورٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ نظام ساگر کے تحت اراضی پر کاشتکاری کے لیے مناسب ذرائع اور سہولتیں بہم پہنچانے کا منجانب انجمن ضروری انتظام کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جو طیلسانئین زراعت و کاشتکاری کا میلان رکھتے اور امداد و معاونت کے خواہاں ہوں وہ انجمن کو مطلع کریں۔ اب حال ہی میں دفتر معتمد صاحب جامعہ عثمانیہ سے ایک اعلان شایع ہوا ہے جس میں تحریر کیا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو جو پیشۂ زراعت اختیار کرنا چاہیں اراضی دے کر مناسب امداد دینے کی ایک اسکیم سررشتۂ مالگذاری کے زیر غور ہے اس لیے جو اشخاص پیشۂ زراعت اختیار کرنا چاہیں وہ اپنا نام درج رجسٹر کرائیں۔

اس اسکیم کے اہم خد و خال کیا ہیں اور مراعات و امدادی وسائل کی تفصیلات کیا ہوں گی جو ان کے لیے مہیا کی جائیں گی۔ ارباب متعلقہ سے منجانب انجمن استفسار کیا گیا ہے جس کے جواب کا ہنوز انتظار ہے۔

بلدی خدمات | گذشتہ سال کی رپورٹ میں یہ بتایا گیا تھا کہ رقبۂ حدود بلدیہ کے بہبود کی ہر جہتی کوشش کرنے کے لیے عثمانیہ بلدی جماعت کا باضابطہ قیام عمل میں آیا ہے، اس ادارہ کے قیام سے حیدرآباد کی پُرسکون فضا میں ایک لہر سی پیدا ہو گئی، دوران سال میں حدود بلدیہ کے چار حلقوں میں جماعت کی باضابطہ شاخیں قائم ہوئیں جن میں حلقۂ دوم اندرون کی شاخ کی جد و جہد قابل تحسین ہے۔ اس حلقہ کی مجلس عاملہ ہر جمعہ کو اپنے حلقہ کے کسی ایک حصہ کا دورہ کر کے عینی مشاہدات کی بنا پر رپورٹ مرتب

کرتی ہے اور صفائی و حفظان صحت وغیرہ سے جو امور اصلاح طلب نظر آتے ہیں ان کی طرف محکمہ جات متعلقہ کی توجہ منعطف کراتی ہے اور جو امور خود پبلک سے متعلق ہیں ان کی طرف پبلک کو توجہ دلاتی ہے۔

شہر حیدرآباد کے اکثر حلقہ جات کی آبادی ریاست حیدرآباد کے بعض مستقر ہائے اضلاع کے برابر ہے ایسی صورت میں بلدی معاملات کی انجام دہی کے لیے جب تک ذیلی جماعتیں قائم نہ ہوں آسانی کے ساتھ کام انجام نہیں پاسکتا۔ اس لیے اب اس جماعت کے پیش نظر حلقوں میں مزید ذیلی حصہ واری جماعتیں قائم کرنے کی اسکیم ہے جن سے حلقہ کی جماعت کے کاموں میں بہت بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔

مجلس وضع قوانین میں طیلسانئین کی رکنیت

مجلس وضع قوانین سرکار عالی میں طیلسانئین کے لیے دو نشستیں مقرر کرنے کے متعلق انجمن کی تحریک پر جناب مولوی میر اکبر علی خاں صاحب صدر انجمن نے دوران سال میں جو رکن مجلس قوانین بھی ہیں ایک مسودہ ترمیمی پیش فرمادیا ہے۔

سلور جوبلی بندگان عالی

یہ امر طے پایا کہ اعلیحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہٗ العالی کی سلور جوبلی کے مبارک و مسعود اور میمنت آمود موقع پر اپنی ایک ذاتی عمارت کی بھی داغ بیل ڈالے جس کے لیے زمین کے حصول کی کارروائی جاری ہے

حصول اراضی کے سلسلہ میں مولوی مہر علی فاضل صاحب ناظم آرائش بلدہ نے انجمن کے ساتھ دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اور وعدہ کیا ہے بلدہ میں تعمیر عمارت کے لیے موزوں قطعہ زمین دلانے میں ضروری امداد دی جائے گی۔ ہمیں قوی توقع ہے کہ موصوف اپنے وظیفہ پر سبکدوشی سے قبل موزوں قطعۂ اراضی انجمن کے لیے مہیا فرمادیں گے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ جامعہ کے امتحانات جشن سیمیں کے مقرر کیے جانے سے طلبائے جامعہ عثمانیہ میں اضطراب پھیلا ہوا تھا کہ وہ امتحانات کی تیاری کی مصروفیت کے باعث جشن سیمیں کے موقع پر وفادارانہ و عقیدتمندانہ جذبات کا مظاہرہ نہ کرسکیں گے اس لیے ان کی درخواست تھی کہ امتحان کی تاریخیں بڑھادی جائیں۔

ارباب جامعہ نے بعض انتظامی دقتوں کے مدنظر تبدیلی تواریخ میں مجبوری کا اظہار کیا جس کے باعث تمام طلبائے جامعہ میں بےچینی پیدا ہوگئی اور طے کیا کہ جب تک تواریخ امتحانات میں تبدیلی کا اعلان نہ ہوگا جامعہ میں قدم نہ رکھیں گے۔

ایسے نازک موقع پر انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی کابینہ نے ایک غیر معمولی جلسہ کیا اور صورت حال سے واقف ہونے کے لیے فی الفور اقامت خانۂ جامعہ عثمانیہ سے چند طلباء کو مدعو کرکے ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ نواب میر اکبر علی خاں صاحب صدر انجمن اس خصوص میں اشتراک عمل کریں۔ صاحب موصوف نے ڈاکٹر میکنزی سے ملاقات کی اور جامعہ کے مقاطعہ کنندگان کے تقریباً ایک ہزار کے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اثر آفریں تقریر کی ان کے ساتھ موجودہ طلبائے جامعہ اور مولوی الیاس برنی صاحب ناظم تالیف و ترجمہ نے بھی تقاریر کیں جن کا اچھا اثر ہوا اور مجمع جلوس کے ساتھ اپنی اپنی جماعتوں میں داخل ہوگیا اور نائب معین امیر جامعہ نے تبدیلی تواریخ امتحان کا اعلان کیا۔

اس کشیدگی کی خوش انجامی کے سلسلہ میں ڈاکٹر میکنزی آنجہانی نائب معین امیر جامعہ طلبائے جامعہ اور انجمن کا اشتراک عمل قابل یادگار رہے گا۔

انجمن کی شاخیں گذشتہ دفعہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ ننگنڈہ، گلبرگہ اور بیدر میں انجمن کی شاخیں قائم ہوچکی ہیں، دوران سال میں ضلع محبوب نگر میں بھی ایک شاخ کا قیام عمل میں آیا مگر ان شاخوں کی رہنمائی کے لیے تدوین دستور کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ دائرۂ عمل معین ہو اور کاروبار بحسن و خوبی انجام پائیں، یہ مسئلہ ترمیم دستور کا ہے اور ترمیم دستور پر غور کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔

اس سلسلہ میں شاخہائے انجمن کا مقامی حالات و اسباب کے پیش نظر فوری امداد و رہبری کے لیے تعاون عمل کرنا ناگزیر ہے، توقع کی جاتی ہے کہ ترمیم دستور کا کام جلد انجام پائے گا اور انجمن کے کاروبار میں نئی سرگرمی پیدا ہوگی۔

اراکین اراکین کی تعداد ۱۳۴۴ف کی اختتام پر ۳۵۳ تھی اور یہ تعداد ۱۳۴۵ف کے اختتام پر ۳۷۲ رہی یعنی بمقابلۂ سال گذشتہ ارکان کی تعداد میں ۱۹ کا اضافہ ہوا۔ یہ امر مخفی نہیں جیساکہ سال گذشتہ بتایا گیا ہے کہ انجمن کی سرگرمی مزید وسعت کی متقاضی ہے۔ انجمن کی جدوجہد سے اچھے نتائج حاصل کرنا طیلسانی برادری کی زیادہ سے زیادہ توجہ پر منحصر ہے۔ انجمن کی سرگرمی کی وسعت کے مدنظر طیلسانئین اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرح مبذول کرسکتے ہیں کہ اولاً وہ اپنے اس فرض کو محسوس کریں جو بحیثیت ایک اعلی التعلیم یافتہ ہونے کے ان پر عائد ہے، اور دوسرے یہ کہ اگر وہ اب تک انجمن کے رکن نہیں ہوئے ہیں تو رکن بن جائیں، اور رکن ہوچکے ہیں تو وقتاً پر

چندہ ادا کریں، اور وقتاً فوقتاً اپنے مفید مشوروں اور تحریکات سے انجمن کی جد وجہد کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہیں۔

آمد وخرچ | سال زیر رپورٹ میں انجمن کی آمد وخرچ حسب تفصیل ذیل رہی:-

	روپیے	آنے	پائی
آمدنی ۔۔۔	۹۴۴	۱۴	۸
خرچ ۔۔۔	۵۹۵	۲	۵
سلک ۔۔۔	۳۴۹	۱۲	۳

بشمول آمدنی سلور جوبلی (۱۷۲) روپیہ ۱۱ آنے ۴ پائی۔

اختتامیہ | مقاصد انجمن کو آگے بڑھانے اور انجمن کی کارگزاریوں کو پبلک تک پہنچانے میں جن نیوز ایجنسیوں اور اخبارات نے حصہ لیا، ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے اس کے بعد جناب میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے عثمانیہ کا شکریہ لازم ہے جنھوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے گذشتہ کانفرنس کو نہایت کامیاب بنایا۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب کو بھی ہرگز نہیں بھلایا جاسکتا جن کو انجمن کی ہر تحریک سے دلچسپی ہے اور جن کا ایثار وخلوص لائق ہزار آفریں ہے۔ ناقدر شناسی ہوگی اگر نواب میر اکبر علی صاحب بیرسٹر کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جو بحیثیت صدر انجمن اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انہماک اور دلچسپی کے ساتھ انجمن کے کاروبار میں دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ہم ان تمام اصحاب کے بھی ممنون ہیں جنھوں انجمن کے دفتر اور جلسوں کے انعقاد کے لیے مکان اور ہال کی اجازت عطا فرمائی۔ بالآخر ان تمام اصحاب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا جاتا ہے جن کا انجمن کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں نمایاں اور بڑا حصہ رہا۔

انعقاد کانفرنس کے لیے خدام اعلیحضرت بندگان عالی متعالی نے ٹاؤن ہال کی اجازت مرحمت فرمائی اس کی نسبت ہم بارگاہ جہاں پناہی میں نہایت ادب سے اپنا ناچیز نذرانۂ تشکر پیش کرتے ہیں، اور عقیدتمندانہ طور پر اپنی غیر متزلزل اور کامل وفاشعاری کا اظہار کرتے ہوئے اس دعا پر رپورٹ ختم کرتے ہیں کہ خداوند کریم ہمارے شفیق، ہمدرد اور ترقی پسند بادشاہ کا سایۂ گرامی اقبال مندی اور فرخندگی کے ساتھ عرصۂ دراز تک ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھے آمین ثم آمین۔

محمد عبد الرحیم معتمد انجمن طیلسانئین عثمانیہ

سالانہ رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت

بابتہ ۱۳۴۵ف

انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہر آئینہ لایق ستایش ہے کہ اُس کی منظم جد و جہد کے باعث حیدرآباد کی پُرسکون فضا میں زندگی کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ انجمن کی مختلف تحریکات میں سے تحریک بلدی خدمات ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ بلدی خدمات میں کئی سال سے نمایاں حصہ لے رہی تھی لیکن یکم شہریور ۱۳۴۴ف کو تاریخ انجمن میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ بلدی خدمات کو منظم طریقہ پر چلانے کے لیے عثمانیہ بلدی جماعتوں کی باضابطہ تشکیل ہوئی اور اس کے مستقل قواعد وضوابط مدون کئے گئے۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار دیے گئے۔

(الف) جو رقبہ حدود بلدیہ حیدرآباد میں شامل ہے اس کے بہبود کی ہر جہتی کوشش کرنا۔

(ب) حفظان صحت کے لیے ہر قسم کی ممکنہ جد و جہد کرنا۔

(ج) اس امر کی کوشش کرنا کہ بلدیہ کا مالیہ مستحکم ہو اور غیر ضروری محاصل عائد نہ ہوں۔

(د) حتی الامکان صفائی، روشنی، آبرسانی، ڈرینج، محلوں، سڑکوں کی ترتیب و تنظیم۔ نیز اسی قسم کے دوسرے بلدی معاملات میں حیدرآباد کو اعلیٰ ترین معیار پر لانے کی کوشش کرنا۔

(ہ) حیدرآباد کے شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کرنا۔

(و) بلدی انتخابات میں حصہ لینا۔

قواعد مذکور کی مطابقت میں جماعت ہذا نے ابتدائے ۱۳۴۵ف سے اپنے کام کا آغاز کیا اور بحمد اللہ پہلی سالانہ رپورٹ ایک سال کے اختتام پر انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور پبلک کی آگاہی کے لیے پیش کر رہی ہے۔ سال زیر رپورٹ میں مولوی ابوالحسن سید علی صاحب وکیل ہائیکورٹ و رکن بلدیہ جیسے ہمدرد ملک نے صدارتی فرائض انجام دیئے۔ صاحب موصوف نے نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ جماعت ہذا کی رہنمائی فرمائی جس کے لیے ہم ان کے تہ دل سے سپاس گذار ہیں۔

مولوی محمد نذیر الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) معتمد اور راقم الحروف شریک معتمد منتخب ہوئے۔ مولوی صاحب نے آٹھ ماہ نہایت سرگرمی و تندہی کے ساتھ کام کیا مگر مستقر بلدہ کے باہر چلے جانے کی وجہ سے بقیہ مدت کے لیے فرائض معتمدی راقم الحروف نے انجام دیے مجلس عاملہ میں مندرجہ ذیل ارکین مجلس بلدیہ شریک تھے (۱) مولوی محمد شاہ عالم خاں صاحب (۲) جناب گنڈے راؤ صاحب ہرڈ الکر بی اے ال ال بی (عثمانیہ) (۳) جناب بی رام کشن راؤ صاحب بی اے ال ال بی (۴) نواب فخر نواز جنگ بہادر نیز دوران سال میں نواب بہادر یار جنگ بہادر مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے۔

سال زیر رپورٹ میں جماعت ہذا کے ارکان کی تعداد (۱۲۰) رہی جو عثمانیہ بلدی جماعت کی اہمیت و وسعت اور اس کے اغراض و مقاصد کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے قطعاً ناکافی اور غیر تشفی بخش ہے۔ اس موقع پر ابنائے شہر سے عموماً اور تعلیم یافتہ طبقہ سے خصوصاً یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ وہ اس جماعت میں شریک ہو کر بلدی خدمات کی تحریک کو تقویت پہنچائیں تاکہ ایک کثیر تعداد کے تعاون اور امداد سے وہ اپنے عظیم الشان مقاصد کو حاصل کرنے کے قابل ہوسکے۔ اگر ہمدردی اور ملک کی خدمت گذاری کا احساس رکھنے والے افراد استعانت کریں تو سال آئندہ ہم اہل ملک کی توقعات سے کہیں زیادہ بہتر نتائج پیش کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔

اس سال مجلس عاملہ کے آٹھ اجلاس منعقد ہوئے جس میں جماعت ہذا اور حلقہ واری شاخوں کے ضروری انتظامی امور طے کئے گئے، اس کے دو کاروباری عام جلسے منعقد ہوئے۔

حلقہ واری شاخیں | چار حلقوں میں جماعت کی باضابطہ شاخیں قائم ہوئیں جن کے صدر اور معتمد حسب ذیل اصحاب ہیں۔

حلقۂ دوم اندرون۔ صدر مولوی میر احمد علی خاں صاحب صوبہ دار میدک

معتمد۔ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ سوم اندرون۔ صدر۔ نواب فیاض الدین خاں صاحب جاگیردار

معتمد۔ مولوی محمد علی صاحب ام اے (عثمانیہ)

حلقۂ چہارم اندرون۔ صدر۔ مولوی محمد شاہ عالم خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ و رکن بلدیہ

معتمد۔ مولوی محمد فاروق حسین صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ اول بیرون ۔ صدر ۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر جاگیردار و رکن بلدیہ

معتمد ۔ مولوی محمد کرم علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ)

حلقۂ دوم اندرون کی مجلس عاملہ نے چند ماہ سے نہایت سرگرمی اور انہماک سے عملی کام کا آغاز کر دیا ہے جو مولوی میر احمد علی خاں صاحب صوبہ دار میدک کی غیر معمولی دلچسپی اور قیادت کا نتیجہ ہے جس کے لیے ہم موصوف کے بیحد ممنون ہیں۔ اس حلقہ کی مجلس عاملہ ہر جمعہ کو حلقہ کے کسی ایک حصہ کا دورہ کر کے عینی مشاہدات کی بنا پر رپورٹ مرتب کرتی ہے اور صفائی، حفظان صحت وغیرہ سے متعلق جو امور اصلاح طلب نظر آتے ہیں ان کی طرف محکمہ جات متعلقہ کی توجہ منعطف کراتی ہے، نیز جو امور پبلک سے متعلق ہوتے ہیں پبلک کو توجہ دلاتی ہے چنانچہ اب تک مغلپورہ، کوچہ لکھن لال، بازار جہاندار جاہ، کٹہ تالاب میر جملہ، احاطۂ مبارز الدولہ، دریچۂ رنگ علی شاہ، کوچہ مسجد جعفری، کوچہ اندھیری باؤلی، کوٹلہ عالیجاہ، بی بی بازار، احاطۂ میر بادشاہ، چوک میدان خاں، پنج محلہ، کوچہ رفعت الملک، کوچہ حسن صالح اور شاہ علی بنڈہ کا دورہ ختم ہو چکا ہے۔ ارباب پولس اور صفائی نے ہمدردی و خلوص سے ہماری تحریکات پر غور کیا اور ان کو درخور پذیرائی سمجھا جس کے لیے ہم بدل ان کے شکر گذار ہیں۔

یہ جماعت باشندگان حلقہ کی بھی سپاس گذار ہے جن کی اعانت و اشتراک کے بغیر ہماری جدوجہد شرمندۂ کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔

جماعت ہذا کے پیش نظر مزید چار ذیلی شاخیں قائم کرنے کی اسکیم ہے۔ امید ہے کہ ان حصہ واری جماعتوں کی وجہ سے جماعت کے کاموں میں مزید سہولت پیدا ہو جائے گی یعنی یہ کہ اکثر حلقہ جات بہ لحاظ آبادی مستقر ہائے اضلاع کے برابر ہیں، ایسی صورت میں بلدی معاملات کی انجام دہی کے لیے جب تک ذیلی جماعتیں قائم نہ ہوں سہولت سے کام انجام نہیں پا سکتا۔ توقع ہے کہ حلقۂ دوم اندرون کی یہ عملی کارروائیاں دوسرے حلقوں کے کارکنوں کے لیے باعث تقلید ہوں گی۔

حلقۂ دوم اندرون کے علاوہ حلقۂ اول بیرون کے صدر نواب بہادر یار جنگ بہادر اور معتمد مولوی محمد کرم علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) نے بھی سرگرمی اور دلچسپی سے اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کی ہے، اس حلقہ کی مجلس عاملہ کے ارکان اپنے حلقہ کے مختلف محلہ جات کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ناقدر شناسی ہوگی اگر ان کی کارروائیوں کو بنظر استحسان نہ دیکھا جائے۔

حلقۂ سوم اندرون کی مجلس عاملہ کے ارکان نے گو ابھی تک اپنے حلقہ کے دورے شروع نہیں کئے تاہم صفائی وغیرہ سے متعلق انفرادی شکایتوں کو رفع کروانے کی کوشش برابر کر رہے ہیں۔ حلقۂ مذکور کی مجلس عاملہ کارکنان بلدیہ کی شکر گذار ہے جسب تحریک مختلف محلہ جات کی موریوں وغیرہ کی درستی کے متعلق فوری توجہ کی گئی۔ بالخصوص مولوی سید محمد محی الدین صاحب مدیر رہبر دکن ورکن بلدیہ کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو معتمد حلقہ کی استدعا پر معائنہ موقع کے لیے ایک مقام پر تشریف لائے اور جماعت کی امداد فرمائی۔ ہم ریلوے بورڈ کے بھی ممنون ہیں کہ بر بنائے تحریک محلہ جات چوک کسارٹہ حسینی علم وغیرہ کی طرف ریلوے بس سروس جاری کی گئی۔

حلقۂ چہارم اندرون کی حالیہ تشکیل شدہ مجلس عاملہ سے توقع ہے کہ بہت جلد عملی کام کا آغاز کر دے گی۔ بقیہ حلقہ جات میں بھی ذیلی شاخوں کے باضابطہ قیام کی کارروائی جاری ہے۔ انشاءاللہ سال آئندہ کی رپورٹ میں جملہ حلقہ جات کی جماعتوں کی کارگذاریوں کا اظہار کیا جا سکے گا۔

مالیہ | تفصیلات موازنہ سال رواں حسب ذیل ہیں:-

انجمن طیلسانیٔن عثمانیہ .... لعہ

عطیہ از مولوی ابوالحسن سید علی صاحب صدر جماعت للعہ

ر مولوی نذیر الدین صاحب بی اے ... ہے ۲ر۸ر
ال ال بی (عثمانیہ)

چندہ سالانہ ارکان جماعت ... لعہ

جملہ .... مالہ عہ ۶ر۸ر

اور خرچ سال دوران کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

صادر .... سیہ ۵ر۲ر

خریدی صندوق وغیرہ .... للعہ ۴ر۶ر

خریدی نقشہ جات بلدیہ ..... عیہ

امداد حلقۂ دوم اندرون ...... ہے

امداد حلقۂ اول بیرون ...... عہ ۴ر

الاؤنس ملازم دفتر ...... عہ

اجرت طباعت قواعد مرمہ ... لعہ ۶ر

جملہ .... ماعہ ۳ر۸ر

باقی .... لہ صہ ۳ر

معتمد میر وزیر علی بی اے (عثمانیہ)

مجلۂ طیلسانئین

۱۔ یہ مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شایع ہوگا۔

۲۔ اس رسالے میں طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شایع ہوں گے جو جامعہ عثمانیہ کی ام اے اور ام یس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کئے گئے ہیں نیز انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی عملی سرگرمیوں کی روئداد بھی پیش کی جائے گی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابل اشاعت متصور نہ ہونگی

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی ۷ روپیے سکۂ عثمانیہ علاوہ محصول ڈاک۔

۶۔ زرِ چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلئے منتظم اعزازی سے مراسلت کیجائے۔

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد دکن

مجلس ادارت

صدر

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو ادبیات جامعہ عثمانیہ

۲۔ عبدالمجید صدیقی ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ — رکن

۳۔ غلام دستگیر رشید ام، اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج — ؍؍

۴۔ سید محمد ام، اے (عثمانیہ) لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج — معتمد

۷۸۶
۹۲

جلد اول — نمبر ۲

مارچ ۱۹۳۷ء — اردی بہشت ۱۳۴۶ ف

مجلس علمیہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ کا علمی و ادبی رسالہ

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ

گھانسی بازار

حیدرآباد دکن

مجلسِ ادارت

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام اے (عثمانیہ) پی اچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعۂ عثمانیہ — صدر

۲۔ عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعۂ عثمانیہ — رکن

۳۔ غلام دستگیر رشیدؔ ام اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج .... رکن

۴۔ سید محمد ام اے (عثمانیہ) لکچرار اُردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج .... معتمد

۶۰۷

مجلۂ طیلسانئین

فہرست مضامین

نمبر ۲	مارچ ۱۹۳۷ء م اردی بہشت ۱۳۴۶ف	جلد دوم

سید مہدی حسین (عثمانیہ) منتظم اعزازی

نے

زندہ طلسمات فائن آرٹ پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر مجلہ طیلسانئین بازار گھانسی حیدرآباد دکن سے

شایع کیا

اداریہ

مجلۂ طیلسانئین کا یہ دوسرا شمارہ ہے اور اس میں ہمارے ایک طیلسانی مولوی علی حسنین صاحب زیبا ام اے کے مقالہ "اردو ادب بیسویں صدی میں" کی تکمیل ہوگئی ہے جو قریب میں کتابی صورت میں بھی شایع ہو جائے گا۔ دوسرا مقالہ مولوی علی محسن صاحب ام اے کا ہے، یہ ذرا طویل ہے اس لیے آیندہ شمارے میں تکمیل کو پہنچے گا اور ساتھ ہی کتابی صورت میں بھی شایع کر دیا جائیگا۔ آیندہ شمارے سے ایک دوسرے مقالے کو بھی بالاقساط شروع کیا جائیگا۔ کوشش کی جارہی ہے کہ مقالوں کے علاوہ اچھے افسانے اور نظمیں نیز دیگر تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شایع کیے جائیں تاکہ مجلہ علمی و فنی معلومات کے ساتھ ساتھ ادبی دلچسپیوں سے بھی محروم نہ رہے۔ ہمارے طیلسانی بھائیوں میں اچھے سے اچھے انشا پرداز اور شاعر موجود ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ اس مجلہ کے ذریعہ سے اُن کے افکار عالیہ منظر عام پر آسکیں گے۔

طیلسانئین عثمانیہ سے ملک کی بڑی توقعات وابستہ ہیں اور خدا کا فضل شامل حال ہے کہ رفتہ رفتہ وہ جامعہ کے شایان شان سپوت اور ملک و مالک کے سچے خدمتگذار ثابت ہو رہے ہیں۔ علمی و ادبی میدان میں گامزنی کے علاوہ معاشرتی و بلدی فضا میں بھی ان کی سرگرمیاں سرعت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہیں۔ حیدرآباد میں بلدی خدمات کے سلسلہ میں گذشتہ موقع پر طیلسانئین عثمانیہ نے خاطرخواہ کامیابی حاصل کی تھی، اور یقین ہے کہ اس سال بھی انتخابات بلدیہ کے سلسلے میں اُن کا بااصول طرزعمل اور مخلص مساعی انھیں سرخرو رکھیں گی۔ یہ کام اصل میں ہمارے مستقبل کے بڑے بڑے کاموں کا پیش خیمہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر بڑے کام کی ابتدا چھوٹے ہی کام سے ہوتی ہے۔

انجمن طیلسانئین کی شاخیں اضلاع میں بھی قائم ہوتی جارہی ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ بلدہ کے کارکنوں کی طرح اضلاع کے ارکین بھی اسی جوش و خلوص کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور یقین ہے کہ وہ بھی اپنے اپنے حالات اور مقامات کے

مناسب اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرتے جائیں گے اور باہمی اتحاد و تعاون کے ذریعہ سے یہ علمی برادری تمام ممالک محروسہ میں جملہ سرگرمیوں اور خدمتگذاریوں کا سرچشمہ بن جائیگی۔ جن اضلاع میں ابھی تک انجمن طیلسانئین کی شاخیں قائم نہیں ہوئی ہیں وہاں کے عثمانی بھائیوں سے توقع ہے کہ وہ جلد ایک مرکز پر متحد ہو جائیں گے اور آپس کے اختلافات اور شک و شبہات کو دور کر کے اپنی انجمن کے ذریعہ سے اپنی ایک متحدہ آواز پیدا کریں گے۔ اُن سب کی مصروفیتوں اور کارگذاریوں کی روئیداد ہم شوق سے اس مجلہ میں شایع کریں گے۔ ان انجمنوں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے جو بھی فیض یافتہ اضلاع اور دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں اُن سب کی علمی و ادبی یا سماجی خدمات کے تذکرہ کو اس مجلہ کے اوراق میں خوشی کے ساتھ جگہ دی جائیگی۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری برادری کے اصحاب بلا روک ٹوک اپنے افکار و خیالات "مجلہ طیلسانئین" میں اشاعت کے لیے روانہ کریں گے۔

صرف ایک شمارہ کی اشاعت کے بعد ہی ہم کو "مجلہ طیلسانئین" کے جتنے خریدار حاصل ہوگئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہی رفتار جاری رہی تو ہمارا مجلہ مستقبل قریب میں خاص اہمیت حاصل کرے گا۔ خریداروں کے علاوہ متعدد اصحاب نے رقمی عطیوں سے بھی مجلہ کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہ سب آثار و علایم بتاتے ہیں کہ طیلسانئین عثمانیہ میں وہ زندگی اور زندہ دلی موجود ہے جس کے بغیر کوئی قوم شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہوسکتی۔ اس امر کی البتہ ضرورت ہے کہ مجلہ طیلسانئین کو اضلاع اور دیہات تک پہنچایا جائے جس کیلیے مجلس ادارت کوشاں ہے اور دیگر طیلسانی بھائیوں سے متوقع ہے کہ اس بارے میں اس کا خاص طور سے ہاتھ بٹائیں گے۔ ہمارے اکثر کام صرف شہروں تک محدود رہتے ہیں، اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم ان چار دیواریوں سے نکل کر دور ماندہ بھائیوں کو بھی اپنی علمی و ادبی اور سماجی تحریکات سے واقف رکھیں اور اُن کا تعاون حاصل کریں۔

اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے جشن سیمیں کی تقریب میں جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتوں نے بھی اپنے آقائے ولی نعمت کے ساتھ اپنے جذبۂ عقیدت و وفاداری کا کئی طرح سے اظہار کیا۔ انجمن طیلسانئین نے خاص طور سے ایک جلسۂ عام منعقد کیا جس میں متعدد اراکین نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا۔ اور مبارک عہد عثمانی نیز دور آصفی کے مختلف پہلوؤں پر مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے نائب صدر انجمن، بی این چوبے صاحب معتمد انجمن اور مولوی محمد فاروقؔ صاحب سبولین نے بلند پایہ تقریریں کیں اور ختم جلسہ پر

ایک پُر تکلف عصرانہ بھی ہوا۔

انجمن طیلسانئین کے کتب خانہ میں جتنی کتابیں عثمانئین کی لکھی ہوئی تھیں ان کو باغ عامہ کی نمائش سلور جوبلی میں رکھنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ ان کتابوں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں فرزندان جامعہ کی مطبوعات کا جو شعبہ قائم کیا گیا ہے وہاں کی کتابیں بھی اس نمائش میں شریک تھیں۔ ان دونوں جگہوں کی کتابوں کو جمع کرنا اور ان کی فہرستیں مرتب کرنے کا کام بھی اسی مجلہ کی مجلس انتظامی کے بعض اراکین نے انجام دیا اور وہ سررشتۂ دارالترجمہ اور خاصکر اس کے ناظم مولوی الیاس برنی صاحب کے شکرگذار ہیں کہ انھوں نے دارالترجمہ کی مطبوعات کے ساتھ تھوڑی سی جگہ ان کے لیے بھی مخصوص کر دی تھی اور دوران نمائش میں ان کی حفاظت اور نگرانی کا انتظام رکھا۔ ان کتابوں کی مضمون وار فہرست اس اداریہ کے ساتھ شایع کی جا رہی ہے۔ اس نمائش کے علاوہ "مجلہ عثمانیہ" کی جانب سے ایک خاص جشن سیمیں نمبر شایع کیا گیا جس کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا ہر ایک نے اعتراف کیا۔ اس رسالے میں جملہ مضامین عہد عثمانی اور ممالک محروسہ سے متعلق تھے اور اسکی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہز ہائنس والاشان اعظم جاہ بہادر شہزادہ برار ولیعہد سلطنت آصفیہ کا ایک خاص پیام شامل تھا جو مجلہ ہی کو سرفراز کیا گیا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی چیز تھی کیونکہ اس سے قبل حضرت ولیعہد بہادر کا کوئی ایسا پیام یا اہم تحریر شایع نہیں ہوئی تھی۔ یہ پیام نوجوانان ملک کے نام تھا اور اس نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ ملک کے جملہ اخباروں اور رسائل نے "مجلہ عثمانیہ" سے اس کو نقل کیا۔

"مجلہ عثمانیہ" کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی بزم تاریخ نے بھی اپنا ایک خاص جوبلی نمبر "خزینۂ تاریخ" شایع کیا تھا۔ ان دو رسالوں نیز مجلہ تحقیقات علمیہ کے علاوہ جامعہ کے دیگر سپوتوں کی بعض تصنیفات مثلاً عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، حیدرآباد کی تعلیمی ترقی اور مرقع سخن وغیرہ کو عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ نے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا۔

طیلسانئین جامعہ عثمانیہ کی علمی و ادبی جد و جہد روز افزوں ترقی پر ہے، دو ماہ قبل سٹی کالج بلدہ کیجانب سے جشن یادگار ولی کی جو عالیشان تقریب منائی گئی اس کے سرگرم کارکن اسی علمی برادری کے افراد تھے۔ اس کی کامیابی کا سہرا اس کے بانی مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے۔ بی ایس سی صدر سٹی کالج اور ان کے

رفقائے کار کے سر ہے۔ تاریخ ادب اُردو ان اصحاب کی ہمیشہ ممنون رہے گی۔ اس تقریب نے ملک میں علم وعمل اور خدمت زبان کی ایک نئی روح پھونک دی اور کیا تعجب ہے کہ دکن کی ادبی تاریخ میں یوم ولی ایک بڑا اثر آفریں دن ثابت ہو۔ اس تقریب میں قدیم اُردو کتابوں اور شعرا و سلاطین کی قدیم تصاویر کی جو عالیشان نمائش کی گئی تھی اس کی نظیر تاریخ ادب اُردو تو کجا ایشیا کی کوئی اور تاریخ نہیں پیش کرسکتی۔ ایک ہی زبان کے اتنے قدیم عظیم الشان اور اہم قلمی نسخوں کا ایک جگہ جمع ہونا آسان کام نہ تھا، اس بعض نسخے اور تصاویر ایسی نادر اور بیش بہا تھیں کہ عوام تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی تھی، اور پہلی دفعہ ہزاروں اصحاب نے ان گرانبہا قدیم اُردو کتابوں کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔

یوم ولی کے بعد سے قدیم اُردو کتابوں کی چھان بین، اُن کو جمع کرنے اور اُن پر مضامین لکھنے کا شوق ملک کے علمی طبقہ میں روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ خود ولی اورنگ آبادی کے کلام کے متعدد نسخوں کے متعلق معلومات حاصل ہوتی جارہی ہیں نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں اس استاد الشعرا کی شخصیت اور کلام نے سرگرمیٔ عمل کی ایک نئی روح پھونکدی ہے۔ اہل ملک میں اپنے قدیم علمی و ادبی خزانوں کی حفاظت اور اُن کی اشاعت کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔

اس تقریب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے حیدرآباد کے ایک قابل فخر خاندان کے اہل ذوق چشم وچراغ نواب سالار جنگ بہادر کو دکنی ادبیات کی اشاعت و ترتیب کی طرف متوجہ کردیا، توقع ہے کہ بہت جلد یہ کتابیں شایع ہوکر منظر عام پر آجائیں گی۔ قدیم کتابوں کو مرتب کرنا تو ان کا پڑھنا بھی مشکل ہے۔ بہت سے الفاظ ان میں جو آج متروک ہیں اور جن کی اصل اور ماخذ کا پتہ نہیں چلتا۔ بہت سی کتابوں کے صرف ایک ایک ہی نسخے اس وقت دنیا میں موجود ہیں اور قدیم ہونے کی وجہ سے بعض کرم خوردہ بھی ہوگئے ہیں۔ پھر ان کتابوں کے مصنفین اور مولفین کے حالات اور اُن کے علمی و ادبی ماحول کی نسبت تحقیق کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن طیلسانیین عثمانیہ کے لیے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان قدیم دکنی نسخوں کو مرتب کرنے والے ہماری برادری ہی کے ارکان ہیں اور اُن کی ان تھک محنت اور مخلص خدمت علم سے یقین ہے کہ وہ انھیں

اس ہفت خواں سے بھی کامیاب نکال لائے گی۔

قدیم اُردو کتابوں کی اشاعت سے جہاں اہل اُردو کو ان الفاظ اور ترکیبوں کا ایک قیمتی ذخیرہ حاصل ہو جائے گا۔ اُردو کے مخالفین کو بھی معلوم ہوگا کہ یہ زبان کتنی قدیم اور ہمہ گیر ہے۔

طیلسانئین عثمانیہ کی منظم علمی خدمتگذاریوں میں سلسلۂ ادبیات اُردو کی سرگرمیوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے اس سلسلے نے پانچ سال کے عرصہ میں طلباء کی جماعت میں سے اُردو کے ایسے مخلص خدمتگذار پیدا کردیئے ہیں جن سے آیندہ بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ نوجوانوں کی طبیعت کے رجحانات اور علمی و ادبی ذوق کی مناسبت کو ملحوظ رکھ کر اُن سے کام لیا جائے تو اُن کی کارکردگی اور عملی قوتوں میں کئی گونہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک اس سلسلے نے جو کتابیں شایع کیں اُن کی علمی حلقوں میں کافی قدر کی گئی اور اُردو کے اکثر رسائل اور بلند پایہ ادیبوں نے ان پر ہمت افزا تبصرے لکھے لیکن یہ مطبوعات پیش خیمہ ہیں اُن اہم اور مفید کتابوں کا جو مستقبل قریب میں اس سلسلے کی طرف سے شایع کی جائیں گی۔ سلسلۂ ادبیات اُردو مرقع سخن کی دوسری جلد کے علاوہ اہم کتابیں یعنی تاریخ ادبیات انگریزی اور تاریخ ادبیات عربی، مرقع مشاہیر دکن شایع کر رہا ہے۔ اُردو زبان میں دوسری زبانوں کی ادبیات اور مصنفین و مؤلفین کے متعلق کوئی مستند معلومات موجود نہیں ہیں سلسلۂ ادبیات نے تہیہ کیا ہے کہ قلیل عرصہ میں عربی اور انگریزی کے علاوہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی، فارسی، ترکی، نیز جاپانی اور چینی، لاطینی، یونانی اور سنسکرت ادبیات کی مختصر تاریخیں اُردو زبان میں لکھوائی جائیں۔ اس طرح سے دنیا کی اہم ترین ایک درجن زبانوں کی تاریخیں اگر ہماری زبان میں مہیا ہو جائیں تو معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ حاصل ہو جائے گا جو اُردو بولنے والوں کی ذہنیتوں میں ایک انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔

دوسری زبانوں کی تاریخوں کے ساتھ ساتھ سلسلۂ ادبیات اپنی زبان یعنی اُردو کی تاریخ نگاری سے بھی غافل نہیں رہے گا اور ضرورت ہے کہ اُردو میں ایک شایان شان تاریخ ادب اُردو شایع کی جائے۔

دنیا کی مختلف زبانوں اور ادبیات کی تاریخ نگاری کے علاوہ سلسلۂ ادبیات اُردو کے پیش نظر ایک اور اہم کام ہے یہ دکن کی گذشتہ سلطنتوں کی تاریخ نگاری سے متعلق ہے تعجب ہے کہ خود حیدرآباد کی کوئی مستند اور اعلیٰ پایہ تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ اسی طرح گولکنڈہ اور قطب شاہی سلاطین نیز سلاطین بہمنیہ اور ماقبل بہمنی دور کی

تاریخوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ آیندہ پانچ سال کے عرصے میں یہ سلسلہ اس قسم کی متعدد مفید اور مستند کتابیں شایع کر سکے گا۔

جامعہ عثمانیہ کے قدیم و جدید طلبہ کی علمی و ادبی مطبوعات کی فہرست
جو
سلور جوبلی نمایش محکمہ جات باغ عامہ میں پیش کی گئیں

۱۔ فلسفہ

۱۔ ابطال مادیت۔ ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ . . . ۱۳۵۴ھ

۲۔ مقدمہ مابعد الطبیعیات . . . ۱۳۵۵ھ

۳۔ قنوطیت یعنی فلسفہ یاس . . ” ”

۴۔ مبادی فلسفہ۔ میر حسن الدین بی اے ال ال بی ۱۹۲۸ء

۵۔ فلسفہ عجم ” ” ۱۳۵۵ھ

۲۔ تاریخ و جغرافیہ

۶۔ محمود گاواں۔ محمد ظہیر الدین . . . ۱۳۴۰ھ

۷۔ حسن گنگو بہمنی۔ محمد احمد انصاری بی اے . . .

۸۔ احمد شاہ ولی بہمنی۔ محمد ظہیر الدین . . ۱۳۲۷ف

۹۔ تاریخ دکن اور اس کی اہمیت۔ عبد المجید صدیقی منشی فاضل ام اے ال ال بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

۱۰۔ شہادت نامہ۔ عبد السلام ذکی بی اے ۱۳۵۳ھ

۱۱۔ کتبات بیدر۔ خواجہ محمد احمد . . . . . .

۱۲۔ خزینۂ تاریخ جلد اول۔ ” ” . . . . . .

۱۳۔ ” جلد دوم ” ” . . . . .

۱۴۔ ” جلد سوم ” ” . . . . .

۱۵۔ ملک عنبر۔ شیخ چاند ام اے . . ۱۳۵۰ھ

۱۶۔ جغرافیہ سلطنت آصفیہ۔ مخدوم علی ۔ ۱۳۴۲ف

۱۷۔ عثمانیہ جغرافیۂ عالم ” . . . .

۱۸۔ جغرافیہ کی تعلیم ۱۳۴۰ف

۱۹۔ جغرافیہ ریاست حیدرآباد۔ غلام قادر بی اے ۱۳۳۵ف

۳۔ تاریخ اور تذکرے

۲۰۔ رائے تیج رائے۔ راجہ گرو داس بی اے . . .

۲۱۔ ٹیگور اور انکی شاعری۔ مخدوم محی الدین بی اے ۱۹۳۵ء

۲۲۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری۔ میر حسن ام اے ۱۹۳۲ء

تاریخوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ آیندہ پانچ سال کے عرصے میں یہ سلسلہ اس قسم کی متعدد مفید اور مستند کتابیں شایع کر سکے گا۔

جامعہ عثمانیہ کے قدیم و جدید طلبہ کی علمی و ادبی مطبوعات کی فہرست
جو
سلور جوبلی نمایش محکمہ جات باغ عامہ میں پیش کی گئیں

۱۔ فلسفہ

۱۔ ابطال مادیت۔ ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر اٹ لا پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ . . . سنہ ۱۳۵۴ھ

۲۔ مقدمۂ ما بعد الطبیعیات . . . سنہ ۱۳۵۵ھ

۳۔ قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس . . 〃 〃

۴۔ مبادی فلسفہ۔ میر حسن الدین بی اے ال ال بی سنہ ۱۹۲۸ء

۵۔ فلسفۂ عجم 〃 〃 سنہ ۱۳۵۵ھ

۲۔ تاریخ و جغرافیہ

۶۔ محمود گاواں۔ محمد ظہیر الدین . . . سنہ ۱۳۴۰ھ

۷۔ حسن گنگو بہمنی۔ محمد احمد انصاری بی اے . . .

۸۔ احمد شاہ ولی بہمنی۔ محمد ظہیر الدین . . سنہ ۱۳۲۷ف

۹۔ تاریخ دکن اور اس کی اہمیت۔ عبد المجید صدیقی منشی فاضل ام اے ال ال بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

۱۰۔ شہادت نامہ۔ عبد السلام ذکی بی اے سنہ ۱۳۵۳ھ

۱۱۔ کتبات بیدر۔ خواجہ محمد احمد . . . . . .

۱۲۔ خزینۂ تاریخ جلد اول۔ 〃 〃 . . . . . .

۱۳۔ 〃 〃 جلد دوم 〃 〃 . . . . .

۱۴۔ 〃 〃 جلد سوم 〃 〃 . . . . .

۱۵۔ ملک عنبر۔ شیخ چاند ام اے . . سنہ ۱۳۵۰ھ

۱۶۔ جغرافیہ سلطنت آصفیہ۔ مخدوم علی . سنہ ۱۳۴۲ف

۱۷۔ عثمانیہ جغرافیۂ عالم 〃 . . . . .

۱۸۔ جغرافیہ کی تعلیم . . . . سنہ ۱۳۴۰ف

۱۹۔ جغرافیہ ریاست حیدرآباد۔ غلام قادر بی اے سنہ ۱۳۴۵ف

۳۔ تاریخ اور تذکرے

۲۰۔ رائے تیج رائے۔ راجہ گرو داس بی اے . . .

۲۱۔ ٹیگور اور انکی شاعری۔ مخدوم محی الدین بی اے سنہ ۱۹۳۵ء

۲۲۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری۔ میر حسن ام اے سنہ ۱۹۳۲ء

۲۳۔سلیم محمد امیر بی اے ۱۳۴۷ھ

۲۴۔داغ۔ نور اللہ نوری ۱۳۵۵ھ

۲۵۔گارسان دتاسی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو
جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۱ء

۲۶۔تین شاعر ۔ ″ ″ ۱۹۲۶ء

۲۷۔غالب۔ معین الدین قریشی۔ ام اے .. ۱۹۳۲ء

۲۸۔مرقع سخن سلسلہ ادبیات اردو .. ۱۹۳۵ء

۲۹۔گلشن گفتار۔ سید محمد ام اے ۱۳۲۹ف

۳۰۔اردو شہ پارے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ .. ۱۹۲۹ء

۳۱۔یوسف ہندی قید فرنگ میں محسن بن شبیہ ۱۳۵۱ھ

۳۲۔جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات۔
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور .. ۱۳۴۳ف

۳۳۔شاہ ظہور الدین حاتم۔ ″ ″ ۱۹۳۳ء

۳۴۔جواہر سخن۔ ″ ″ ″ ″ ......

۳۵۔سیرت طیبہ۔ غازی الدین احمد۔ ۱۹۳۳ء

۳۶۔اسوۂ حسنہ۔ احمد عبد اللہ سدوسی بی اے ال ال ..

۳۷۔سید الانبیا۔ اعظم خاں ....

۳۸۔ابن سعود۔ فیض محمد صدیقی بی اے۔ ڈپ ات ۱۹۳۶ء

۳۹۔مصلحان تعلیم۔ ″ ۱۹۳۴ء

۴۰۔ایجناتھ۔ شیخ چاند ام اے ۱۹۳۴ء

۴۔ادبی تحقیق، تنقید و تاریخ ادب

۴۱۔جدید اردو شاعری۔ عبد القادر سروری ام اے
ال ال بی پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۲ء

۴۲۔تنقیدی مقالات۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۷ء

۴۳۔کردار اور افسانہ۔ عبد القادر سروری ۱۹۳۹ء

۴۴۔روح تنقید۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۱۹۳۱ء

۴۵۔اردو کے اسالیب بیان ″ ″ ۱۹۳۲ء

۴۶۔دنیائے افسانہ۔ عبد القادر سروری .. ۱۹۳۵ء

۴۷۔ہندوستانی لسانیات۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۱۹۲۷ء

۴۸۔ہندوستانی صوتیات۔ (انگریزی) ″ ″ ۱۹۳۰ء

۴۹۔عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ ″ ″ ۱۹۳۴ء

۵۰۔سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ″ ″ ۱۹۲۸ء

۵۔افسانے، ڈرامے اور ناول

۵۱۔مصنوعی بیوی۔ عباس حسین لطفی ۱۹۲۷ء

۵۲۔التدبیر۔ عبد الشکور ۱۳۴۳ھ

۵۳۔معاشقۂ نپولین۔ عبد المنعم سعیدی بی اے۔
ال ال بی ۱۳۵۲ھ

۵۴۔ہوش کے ناخن۔ میر حسن و مخدوم محی الدین ۱۹۳۴ء

۵۵۔کالج کے دن۔ عزیز احمد ....

۵۶۔ رفتار خیال۔ ج نقوی بی اے ۱۳۴۵ف

۵۷۔ فصص خوب ترنگ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۶ء

۵۸۔ فرانسیسی افسانے۔ عزیز احمد . . . ۱۹۳۲ء

۵۹۔ قدیم افسانے۔ عبدالقادر سروری
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۰ء

۶۰۔ محشرستان۔ محشر عابدی بی اے ۱۹۳۳ء

۶۱۔ سیر گولکنڈہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۶ء

۶۲۔ راز۔ علی احمد بی اے . . . .

۶۳۔ طلسم تقدیر۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ . ۱۹۲۶ء

۶۔ شعر و سخن کے مجموعے اور انتخابات

۶۴۔ حسیات۔ نبی الحسن شمیم بی اے . . . . . .

۶۵۔ من کی بانسری۔ محمد امیر بی اے۔ بی ٹی ۱۳۴۵ف

۶۶۔ چمن زار حکایات۔ عبدالسلام ذکی بی اے ۱۳۵۴ف

۶۷۔ گلزار اطفال " " . . . . . .

۶۸۔ جذبات عالیہ " " ۱۳۵۲ف

۶۹۔ شمیم سخن۔ نبی الحسن شمیم بی اے . . . . . .

۷۰۔ شیب و شباب۔ محمد امیر بی اے۔ بی ٹی ۱۳۔۔ف

۷۱۔ کیف سخن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور . . . .

۷۲۔ بادۂ سخن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ . ۱۳۵۵ف

۷۳۔ انتخاب دیوان غالب۔ نور اللہ محمد نوری ۱۹۳۲ء

۷۴۔ متاع سخن۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ . . . . .

۷۵۔ منتخبات کلام ہندی۔ ڈاکٹر جعفر حسن ۱۹۳۲ء

۷۶۔ پیام حق۔ عبدالسلام ذکی ۱۳۵۲ف

۷۷۔ مثنویات میر۔ سید محمد ام اے ۱۹۳۳ء

۷۸۔ بندہ سے خطاب۔ رشید ترابی بی اے ۱۳۵۲ف

۷۹۔ سراج سخن۔ عبدالقادر سروری
پروفیسر جامعہ ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ ۱۳۵۵ف

۷۔ تدریسیات اور مختلف موضوعوں کی ابتدائی کتب

۸۰۔ اسباق الاشیاء دوسری جماعت کے لیے۔
عبدالجبار سبحانی بی اے . . . . . .

۸۱۔ اسباق الاشیاء حصۂ اول۔ فصیح الدین احمد
بی اے۔ ال ال بی ۱۳۴۴ف

۸۲۔ اسباق الاشیاء پہلی جماعت کے لیے عبدالجبار سبحانی
بی اے۔ بی ٹی . . . .

۸۳۔ مطالعۂ قدرت حصۂ سوم محشر عابدی بی اے ۱۳۴۱ف

۸۴۔ " حصۂ پنجم " "

۸۵۔ " حصۂ ششم " "

۸۶۔ گلشن اخلاق۔ عبدالسلام ذکی بی اے سنہ ۱۳۵۳ھ

۸۷۔ حفظ صحت۔ فیض محمد صدیقی۔ بی اے۔
ڈپ ایڈ .... سنہ ۱۳۵۳ھ

۸۸۔ جغرافیہ ریاضی و طبعی انوار حسین بی اے سنہ ۱۳۳۹ف

۸۹۔ شرح نصاب اردو حصۂ اول عبدالسلام ذکی
بی اے .... سنہ ۱۳۴۱ف

۹۰۔ " " " حصۂ دوم ... سنہ ۱۳۵۴ھ

۹۱۔ ابتدائی قواعد فارسی۔ سید محمد ام اے
لکچرار اردو و فارسی سٹی کالج ... سنہ ۱۳۵۰ھ

۹۲۔ حفظان صحت۔ مخدوم علی .... سنہ ۱۳۴۰ھ

۹۳۔ بچوں کی کہانیاں پہلی جماعت کے لیے۔
مخدوم علی .. .. سنہ ۱۳۴۸ھ

۹۴۔ " " " دوسری " " "

۹۵۔ اسباق الاشیاء تیسری جماعت کے لیے۔
عبدالمجید تجانی۔ بی۔ اے۔ بی ٹی

۹۶۔ " " " چوتھی " "

۹۷۔ اسباق الاشیاء حصہ دوم۔
قاضی فصیح الدین .. سنہ ۱۳۴۴ف

۹۸۔ " " " حصۂ سوم "

۹۹۔ " " " حصۂ چہارم "

۱۰۰۔ اسباق الاشیاء برائے جماعت سوم۔
غوث الدین علی .... سنہ ۱۳۵۲ھ

۱۰۱۔ رفیق مدرسین۔ مخدوم علی ..... سنہ ۱۳۴۲ف

۱۰۲۔ اسباق الاشیاء جماعت چہارم کے لیے۔
غوث الدین علی .... سنہ ۱۳۵۲ھ

عام معلومات

جن میں معاشیات۔ دینیات۔ قانون
اور دیگر مقبول اور عام پسند موضوع پر
کتابیں شامل ہیں

۱۰۳۔ لاسلکی نشر۔ حبیب احمد فاروقی بی اے۔
ڈپ ایڈ .... سنہ ۱۳۴۴ف

۱۰۴۔ جدید معلومات۔ سید عبدالرحمن ہاشمی سنہ ۱۹۳۱ء

۱۰۵۔ رہنمائے صحت۔ محمد اعظم خاں ام اے۔ سنہ ۱۹۳۰ء

۱۰۶۔ نیلگری۔ ڈاکٹر حمید اللہ .... سنہ ۱۳۴۸

۱۰۷۔ سیرت و کردار۔ عبدالرحمن .... سنہ ۱۳۵۳ھ

۱۰۸۔ حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی۔ عبدالقادر سروری
پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ .. سنہ ۱۳۵۳ھ

۱۰۹۔ فن انشا پردازی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ .. سنہ ۱۳۵۳ھ

۱۱۰۔ ہندو مسلم زندگی۔ بنکٹ پرشاد
بی اے .... سنہ ۱۳۴۴ف

۱۱۱۔ معلومات عامہ۔ مخدوم علی ..... سنہ ۱۳۴۱ف

۱۱۲ - رموز خانہ داری - ن نقوی بی اے۔

۱۱۳ - تعلیمی تفریح - مرزا سرفراز علی بی اے

۱۱۴ - رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی۔

ڈاکٹر حمید اللہ ۱۳۴۸ھ

۱۱۵ - آبادی۔ " " ....

۱۱۶ - لیلۃ القدر - لیاقت حسین ام اے ......

۱۱۷ - مقصد حیات - " " ....

۱۱۸ - تحفۂ رمضان - عبد السلام ذکی ....

۱۱۹ - سراج الترتیب - ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی ۱۳۴۷ھ

۱۲۰ - وطن کی پکار - محمد منیر الدین ۱۳۵۵ھ

۱۲۱ - زرعی افلاس ہند - ڈاکٹر جعفر حسن ۱۳۴۸ف

۱۲۲ - معاشی عمرانی مقالہ " " ... ۱۹۳۱ء

۱۲۳ - وفاقی اور ریاستیں - حسن الدین

بی اے ال ال بی ۱۹۳۶ء

عام سائنس

۱۲۴ - مبادیات سائنس حصۂ اول - عبد الحفیظ

بی اے بی ٹی .. ۱۳۳۹ف

۱۲۵ " " حصہ دوم " ۱۳۴۲ف

۱۲۶ - میٹرکیولیشن کے پرچہ جات سائنس ظہیر احمد ۱۳۴۵ف

طبیعیات

۱۲۷ - تجربی طبیعیات حصۂ اول محمد احمد عثمانی ام ایس سی ۱۳۵۴ف

۱۲۸ - علم طبیعیات حصۂ اول - سدرشن راج ام ایس سی

.... ۱۳۵۱ھ

۱۲۹ - " " " حصۂ دوم ....

۱۳۰ - " " حصۂ سوم ....

۱۳۱ - " " حصۂ چہارم ....

۱۳۲ - طبیعیات نظری - سرِیراج پرشاد

ام اس سی ۱۳۴۵ف

۱۳۳ - نوکارتمی اور طبیعی جدول محمد احمد عثمانی

ام اس سی ۱۳۴۰ف

۱۳۴ - مبادیات طبیعیات حصۂ اول " " ۱۳۴۱ف

۱۳۵ - طبیعیات عملی ...... " " ۱۳۴۴ف

۱۳۶ - جدید نصاب طبیعیات حصۂ اول

سردار خاں بی اے بی ٹی و فیض محمد صدیقی

بی اے ڈپ ایڈ

۱۳۷ - " " " " " " حصۂ دوم

کیمیا

۱۳۸ - خلاصۂ کیمیا - فیض محمد صدیقی بی اے۔

ڈپ ایڈ ۱۳۴۴ف

۱۳۹ - رفیق معمل کیمیا - احمد بن عبد اللہ

بی اے ۱۳۴۲ف

۱۴۰ - جدید نصاب کیمیا - سردار خاں و

فیض محمد صدیقی . . . . سنہ ۱۳۴۴ف

۱۴۱ اسباق کیمیا حصۂ اول۔ خلیل الرحمٰن۔

" ام یس سی . . . . . . سنہ ۱۳۴۲ف

۱۴۲۔ " " " حصۂ دوم . . "

۱۴۳۔ عملی کیمیا۔ برائے انٹرمیڈیٹ

احمد بن عبداللہ بی اے . . . سنہ ۱۳۴۵ف

ریاضی

۱۴۴۔ جدید ابتدائی ریاضی حصۂ اول

رتن لال بی اے و راد ھیکا پرشاد سنہ ۱۳۴۴ف

۱۴۵۔ " " " حصۂ دوم

۱۴۶۔ جلد اول ریاضیہ۔ عبدالوہاب

بی اے . . . . سنہ ۱۳۳۹ف

۱۴۷۔ حل پرچہ جات ریاضی ابتدائی و اعلیٰ

منیر الدین بی اے . . . . . سنہ ۱۳۳۹ف

۱۴۸۔ حل پرچہ جات ریاضی ابتدائی و اعلیٰ

منیر الدین و حبیب احمد . . . .

۱۴۹۔ تفرقی احصا۔ وی ین پٹواری

ام اے . . . . سنہ ۱۳۴۴ف

۱۵۰۔ ذہنی حساب۔ مخدوم علی سنہ ۱۳۳۹ف

جبر و مقابلہ و ہندسہ

۱۵۱۔ جبر و مقابلہ۔ انوار حسین بی۔ اے۔

۱۵۲ اعلم مثلث۔ وی ین۔ پٹواری۔ سنہ ۱۳۴۴ف

۱۵۳۔ ہندسہ تحلیلی " " " "

۱۵۴۔ مکمل ہندسی مخروطات " " "

۱۵۵۔ مکمل ہندسہ عملی۔ محمد منیر الدین

بی اے

معیاری رسائل

۱۵۶۔ پیش نامہ انجمن طیلسانئین مرتبہ

عبدالقادر سروری پروفیسر ادبیات اُردو

جامعہ عثمانیہ . . . . . سنہ ۱۳۴۲ف

۱۵۷۔ سالنامہ انجمن طیلسانئین

غلام دستگیر رشید ام اے . . . سنہ ۱۳۴۳ف

۱۵۸۔ مجلۂ طیلسانئین مرتبہ مجلس علمیہ سنہ ۱۳۴۶ف

۱۵۹۔ سالنامہ بزم اُردو۔ سعادت علی رضوی

ام اے . . . . سنہ ۱۳۴۳ف

۱۶۰۔ سالنامہ انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج

مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ سنہ ۱۳۴۳ف

۱۶۱۔ الکشافہ۔ ڈاکٹر حمید اللہ . . سنہ ۱۳۴۲ف

۱۶۲۔ مقنن۔ عبدالرحمٰن حسن الدین،

محمد احسن وغیرہ۔

۱۶۳ مجلۂ عثمانیہ جلد ا شمارہ (۱) سنہ ۱۳۴۶ف۔
ڈاکٹر زور و سید معین الدین قریشی ام اے۔

۱۶۴ مجلۂ عثمانیہ جلد ۹ شمارہ (۳ و ۴) سنہ ۱۳۴۶ف
سکندر علی وجد و صاحبزادہ میکش۔

اس کا تعلق تھا اعلیٰ تعلیم و تربیت کے حاصل کرنے کے بعد وہ تلاش معاش میں ہندوستان چلا آیا سب سے پہلے وہ گولکنڈہ میں قطب شاہ کے پاس ملازم ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی غیر معمولی قابلیت دیکھی تو اسے بہت جلد ترقی دی۔ رفتہ رفتہ وہ وکیل السلطنت کے عہدے تک پہنچ گیا تھوڑے ہی عرصے میں اسے مصطفیٰ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا مصطفیٰ خاں نے اس خوبی سے ملک و مملکت کا انتظام کیا کہ تمام ملک میں خوشحالی ہو گئی سپہ گیری کا انتظام ٹھیک ہوا۔ فوج کی از سر نو ترتیب و تنظیم عمل میں آئی رعایا کے آرام و آسائش کے سامان مہیا کئے گئے۔ غرض ہر طریقہ سے سلطنت گولکنڈہ اس کے حسن انتظام سے سنبھلنے اور سدھرنے لگی ابتداً تو قطب شاہ کو اپنے اس لائق وزیر پر کامل اعتماد تھا اور اس نے تمام کار و بار سلطنت اس کے ہاتھ میں رکھ چھوڑے تھے۔ مگر بعد میں قطب شاہ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ پورے پورے اختیارات ایک وزیر کے ہاتھ میں دیدئے جائیں لہذا اب وہ خود بہ نفس نفیس انتظامات مملکت میں مشغول ہونے لگا۔ اور بہت سارے اختیارات جو مصطفیٰ خاں کو دیئے تھے ان میں کمی کر دی مصطفیٰ خاں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اس وجہ سے کہ اس سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ بادشاہ کو اب اپنے وزیر پر پہلا سا اعتماد نہیں ہے۔ وہ اس سے بدگمان ہو گیا ہے یا کسی قسم کا اندیشہ رکھتا ہے مصطفیٰ خاں اک نہایت ہی دیانتدار اور راستباز آدمی تھا جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ کی نظروں میں اس کی وہ پہلی سی وقعت ہے اور نہ وہ اعتبار، تو اس کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ کوئی موقع نکال کر اس عہدے سے ہی مستعفی ہو جائے اور اپنے کو قطب شاہی عملداری سے الگ کر لے۔

اسی اثنا میں رام راج کی سرکوبی کا مسئلہ چھڑا قطب شاہ نے مصطفیٰ خاں کو سفیر بنا کر عادل شاہی اور نظام شاہی دربار کو روانہ کیا کہ وہ اتحاد کی بابت ان سلاطین سے گفت و شنید کرے مصطفیٰ خاں اپنی اس سفارت پر روانہ تو ہو گیا مگر چلتے وقت بادشاہ سے اس کا وعدہ لے لیا کہ اسے اس خدمت کے صلے میں حرمین شریفین جانیکی اجازت دیدی جائے گی قطب شاہ بیچارہ ناچار راضی ہو گیا اور مصطفیٰ خاں اپنی سفارت پر روانہ ہوا جب مصطفیٰ خاں کی کوششوں سے احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور کے درمیان اتحاد قائم ہو گیا اور متحدین کی کوششوں سے رام راج کا خاتمہ ہو گیا تو مصطفیٰ خاں نے قطب شاہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا اور اور رخصت کی اجازت چاہی، مگر قطب شاہ مصطفیٰ خاں کو اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا اور مختلف طریقوں سے

اُسے ٹالنا چاہا جب اُس نے یہ رنگ دیکھا بہت پریشان ہوا اور اپنی خلاصی کے لئے کشور خاں پیشوائے عادل شاہ اور مولانا عنایت اللہ پیشوائے نظام شاہ کے ذریعہ قطب شاہ پر اثرات ڈالے[1] لیکن قطب شاہ کی مرضی یہ تھی کہ مصطفیٰ خاں کو گولکنڈہ لیجا کر اس کی خوب اچھی طرح تادیب کرے[2] مصطفیٰ خاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا اور گولکنڈہ جانے میں اپنی جان کی خیر نہ دیکھتا تھا۔ لہذا اس نے کشور خاں اور عنایت اللہ پیشوایان ریاست ہائے نظام شاہ و عادل شاہ کو اپنا کر لیا تھا اور اُن کے ذریعہ قطب شاہ پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اُس کو روانگی کی اجازت دیدے جب قطب شاہ نے دیکھا کہ کشور خاں اور عنایت اللہ کسی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں تو بالآخر اُس کو روانگی کی اجازت دی مگر مشکل یہ تھی کہ مصطفیٰ خاں کے اہل وعیال اور اس کا مال و اسباب گولکنڈہ میں تھا اور اندیشہ تھا کہ قطب شاہ اپنی اس ناراضی اور غصہ میں کہیں ان پر مظالم نہ کر بیٹھے پھر اس کے حضور میں درخواست پیش کی گئی کہ اُس کے اہل وعیال کو بھی بلا ضرر اس کے ساتھ روانگی کی اجازت دے دیجائے۔ قطب شاہ ان پیشواؤں کی پے در پے کوششوں سے بالآخر اس امر پر مجبور ہو گیا کہ مصطفیٰ خاں اور اس کے اہل وعیال کو روانگی کی اجازت دیدے۔ مصطفیٰ خاں وجیانگر سے اجازت لیکر جو نکلا ہے تو پھر کلبرگہ ہی آکر دم لیا اور بیوی بچوں کے آنے تک وہیں قیام پذیر رہا۔

مصطفیٰ خاں نے قطب شاہ کی ملازمت کے زمانے میں بہت کچھ دولت حاصل کر لی تھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ بیس لاکھ ہون سے زیادہ قیمت کی جنس و نفائس علاوہ زر نقد کے اس کے پاس موجود تھے۔ اور اس کا یہ سب کثیر مال و اسباب گولکنڈہ سے کلبرگہ کو آٹھ ہزار بیلوں اور بارہ ہزار آدمیوں پر لد کر آیا تھا۔ اور اس کا مطبخ اتنا وسیع اور ایسا پر شکوہ تھا کہ بادشاہوں کے مطبخ بھی شاید ہی ایسے ہونگے۔

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۳۴۴۔

[2] قطب شاہ مصطفیٰ خاں سے اس واسطے ناراض ہو گیا تھا کہ مصطفیٰ خاں نے بغیر بادشاہ کی اجازت کے مدگل اور رائچور کے فتح شدہ قلعوں کی کنجیاں عادل شاہ کے حوالے کر دیں اس پر بادشاہ بہت برہم ہوا اور اسی بنا پر چاہتا تھا کہ اُسے گولکنڈہ لیجا کر اچھی طرح سزا دے۔ تاریخ قطب شاہی۔ (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ۔

مصطفیٰ خاں کا اس قدر کثیر مال و دولت کے ساتھ یوں ہاتھ سے نکل جانا قطب شاہ کو بہت شاق گزرا۔ اور
اس نے غصہ و برہمی میں اس کا گھر کھُدوا دینے کا حکم دیدیا۔

جب مصطفیٰ خاں کو اس طرح نجات مل گئی تو اس نے عادل شاہ کی ملازمت اختیار کر لی علی عادل شاہ
نے بخوشی ایسے باتدبیر شخص کو زمرۂ اُمرا میں داخل کر لیا اور بائیس ہزار سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ اس کے
بعد سے مصطفیٰ خاں برابر ترقی کرتا رہا اور دن بدن علی عادل شاہ کا اعتماد اس پر بڑھتا جاتا تھا اور اپنے
حُسنِ خدمت سے اپنے آقا کو اس نے ایسا گرویدہ کر لیا کہ ترقی کی سب راہیں اس کے لیے کھُل گئیں۔ یوں بھی
وہ لائق شخص تھا جس طرح مجلس مشورت میں وہ ایک بہترین وزیر باتدبیر کا کام دے سکتا تھا اسی طرح
میدان رزم میں اپنے زمانے کا ایک کامیاب سپہ سالار بھی تھا چنانچہ قلعہ بنکاپور کی فتح جو علی عادل شاہ کے
عہد کا اک زرین کارنامہ ہے اسی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ غرض یہ کہ ہر حیثیت سے مصطفیٰ خاں ترقی کے قابل تھا۔
اور اسے ترقی ملی۔ رفتہ رفتہ کشور خاں کے قتل کے بعد علی عادل شاہ کے عہد میں وکیل السلطنت یا عہدۂ پیشوائی پر
وہ فائز ہو چکا تھا اس زمانے میں اس کا اقتدار و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ علی عادل شاہ نے اسے اپنی
مُہرِ خاص دے رکھی تھی جس کو کبھی وہ اپنے سے جدا نہ کرتا تھا مگر مصطفیٰ خاں پر اس کو اتنا غیر معمولی اعتبار تھا کہ
وہ بلا کھٹکے شاہی مُہر اس کے حوالے کر دی اور اس کو اجازت تھی کہ بغیر استمزاج شاہی کے بھی اس مُہر کو استعمال
کرے۔ یوں تو وزارت کے عہدے پر اکثر لوگ مامور ہوا کیے ہیں مگر جو غیر معمولی اثر و رسوخ مصطفیٰ خاں نے
حاصل کر لیا تھا شاید ہی وہ کسی کو نصیب ہوا ہو۔ عادل شاہ کی ملازمت میں اس نے اس سے بھی کہیں زیادہ
دولت حاصل کر لی جو قطب شاہی ملازمت کے دوران میں اسے حاصل ہوئی تھی۔ اس کی دولت کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً اس کے ایک سو اسی[180] (یکصد و ہشتاد) جہاز دریائے گجرات سے لیکر دریائے بنگالہ تک
تجارت کرتے تھے۔ مال و دولت کے اعتبار سے وہ اپنے ہمعصر بادشاہوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ بیرونی ممالک کے
بادشاہوں سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور یہ ہمیشہ ان کے پاس بیش قیمت تحائف
بھیجا کرتا تھا اور ادھر سے خلعت ہائے فاخرہ اور دیگر نفائس عطا کیے جاتے تھے۔ بالخصوص سلطان سلیمان روم
شاہ طہماسپ ایران اور اکبر بادشاہ ہند سے اس کی اسی طرح خط و کتابت ہوا کرتی تھی جیسے ہمعصر اور

ہم رتبہ لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔

جنگ نالیکوٹ کے بعد جو سلسلۂ فتوحات علاقہ کرناٹک میں عادل شاہی افواج کا شروع ہوا وہ زیادہ تر مصطفٰی خاں کی سپہ سالاری میں تکمیل پایا۔ اور اس زمانے میں اس نے بہت سارے قلعوں اور مختلف علاقوں کو جو اب تک دشمنوں کے قبضے میں تھے فتح کر لیا۔ اور اس فتح شدہ کرناٹک کے وسیع حصہ ہائے ملک کو قلمرو عادل شاہیہ میں داخل کر دیا۔ اور پھر فتوحات کے بعد اس علاقے کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ کسی باغی یا متمرد راجہ کو اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُس کے خلاف سر اُٹھائے۔ چونکہ علی عادل شاہ نے اس تمام فتح شدہ ملک کو معہ علاقہ بنکاپور مصطفٰی خاں کی جاگیر میں دے رکھا تھا اسلئے اُس نے یہاں کا انتظام عمدہ طریقے پر کیا۔ اور اس وسیع علاقے سے اُسے اتنا کثیر خراج وصول ہوتا تھا کہ اُس کی اپنی یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو نیا علاقہ فتح کرتا تھا اُس کو وہاں کے راجہ پر اُسی صورت میں بحال رکھتا کہ وہ سالانہ پیشکش بخوشی ادا کرے۔ اس طریقے سے کئی جاگیرداروں زمینداروں اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے گروہ کے گروہ اُس کی ماتحتی میں تھے۔ غرض یہ سب اُس کی کاردانی اور صائب تدبیری تھی، جس نے اُسے ترقی کے اس زینہ پر پہنچایا۔ حالانکہ جب اُس نے ابتداءً ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے تو بالکل بے یار و مددگار اور بے خانماں تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اب اُس درجہ پر پہنچ چکا تھا کہ بادشاہوں کا بھی مقابلہ کر سکتا تھا۔ حقیقت میں مصطفٰی خاں کی طاقت و قوت اور اُس کا اثر اتنا زبردست تھا کہ بجائے ایک کشور خاں کے دس کشور خاں بھی اُس کے مخالف ہو جاتے تو اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے کیونکہ وہ اپنی جاگیر ہی سے بے حد مستحکم اور طاقتور ہو چکا تھا اور بڑی زبردست قوت حاصل کر لی تھی۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ اُس کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ وہ شطرنج کی کس چال کا شکار ہونیوالا ہے، اور محض دھوکہ میں آ کر مارا گیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دینا ضروری ہوگا کہ باوجود اتنی طاقت اور ایسی کثیر دولت کے کبھی اپنے بادشاہ یا ملک کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ نمک حرامی اُس کی سرشت میں ہی نہ تھی، ورنہ

لہ۔ بساتین السلاطین۔

ایک ایسے ذرائع اور اثرات والے شخص کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ذاتی فائدے کے لئے ابراہیم کی کمسنی میں جبکہ دارالسلطنت میں اُمراء کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو چلے تھے، ملک میں اک شورش یا ہنگامہ برپا کردے۔ وہ ہمیشہ ملک کی فلاح و بہبود کا ہی خواہاں رہا کرتا تھا اور اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے اس نے اپنی جان سے تک دریغ نہ کیا۔ غرض مصطفیٰ خاں مختلف خوبیوں کا حامل تھا۔ اور حقیقت میں مصطفیٰ خاں کو برسرکار آنیکا موقعہ ملتا تو وہ ملک کا ایسا ٹھیک انتظام کرتا کہ وہ سارے جھگڑے اور نااتفاقیاں جو اس دوران میں مختلف متولیان ریاست کے درمیان پیدا ہو چلی تھیں وجود میں نہ آسکتیں۔ اور ملک اس کی دیرینہ کاری اور تجربہ کاری سے بہت کچھ فائدہ حاصل کرتا۔

جہاں مصطفیٰ خاں کی ان تمام خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے اُس کی چند کمزوریوں کا ذکر کر دینا بھی لازمی ہے۔ کمزوریاں بشریت کا جُزو لاینفک ہیں۔ کیونکہ انسان صرف خوبیوں کا ہی حامل نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہستی جو خطاء و قصور سے بالکل مُعرّا ہو وہ انسانی ہستی نہیں کہلائی جائے گی بلکہ اس کو مافوق الانسان ہستی کہنا مناسب ہوگا۔ غرض اُس کی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لینے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مصطفیٰ خاں اک انسان تھا کوئی فرشتہ نہ تھا۔ اس کی ان کمزوریوں میں زیادہ تر قابل ذکر اُس کی تُند خوئی اور سخت گیری ہے۔ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کرتا تھا اور اُن کے معمولی سے معمولی قصور سے درگزر نہ کرتا تھا۔ گو فراخ حوصلہ تھا اور سلوک کے معاملے میں پیچھے نہ ہٹتا تھا، مگر اُس کی سختی اور تُندخوئی نے اُسے بہت بدنام کر رکھا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کا اک حکیم مثقال مومیائی کہیں رکھ کر بھول گیا، چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ فراشوں اور نوکروں نے اُس مومیائی کو پاکر آپس میں تقسیم کر لیا ہے اور چٹ کر گئے ہیں۔ اس کی تحقیق کی گئی تو بائیس آدمیوں پر جُرم ثابت ہوا۔ مصطفیٰ خاں بہت برہم ہوا اور حکم دیا کہ ان سبھوں کو خوب اچھی طرح سزا دی جائے۔ اُن کو اتنی زدوکوب کی گئی کہ وہ تاب نہ لاکر مر گئے۔ اُس کے ماتحتین کو اُس کا اتنا خوف تھا کہ کوئی کام اُس کے خلاف مرضی نہ کر سکتے تھے۔ بساتین کے مصنف کا بیان ہے کہ تقریباً ساٹھ سال وہ دکن میں مقیم رہا اور اس طویل عرصے میں اُس کے مطبخ کا ایک چینی کا برتن ٹوٹنے یا ضایع ہونے نہ پایا۔ اور اگر سوئے اتفاق سے کوئی برتن ضایع بھی ہو جاتا تو جس کسی کے ہاتھ یہ نقصان ہوتا وہ اپنے پاس سے اُس کی قیمت ادا کر دیتا تھا یا ویسا ہی

برتن مول دیتا۔ اُس کی تندخوئی اور سخت گیری سے بڑھ کر اُس کا غرور و تکبر تھا۔ اپنے اس تکبر و غرور کی بنا پر ہی اُسے قطب شاہی عملداری سے نکلنا پڑا۔ قطب شاہ کی ناراضی کے وجوہات میں سے اک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت زیادہ مغرور و متکبر ہو گیا تھا۔ غرض اُس کی سیرت کی یہ دو کمزوریاں اُس کے دامن شہرت و کمال پر ایک بدنما دھبہ ہیں مصطفیٰ خاں کو اصلی خد و خال میں پیش کرنے اور اُس کی پچھلی خدمات و انتظامات کے اعادہ اور اعتراف کے بعد اُس کے قتل کے واقعہ کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اُس کی پچھلی تاریخ سے واقف ہونے اور اُسکی سیرت کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کے بعد اُس کے قتل کی اہمیت اور اُس کے اثرات کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسی غرض سے یہ تفصیلی حالات دئے گئے ہیں۔

مصطفیٰ خاں کا قتل جب کشور خاں کی کارروائیوں سے ہر شخص بدظن و خائف ہونے لگا تو کشور خاں کو بھی اپنی جان کی پڑی۔ کسی نہ کسی طرح اُس کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ اُمرا اور اعیان سلطنت میں سے اکثر کی رائے ہے کہ کشور خاں کو معزول کر کے مصطفیٰ خاں کو اُس کی جگہ پیشوا اور متولی بنایا جائے۔ اور اس قسم کی اک درخواست بھی ملکہ چاند سلطانہ کے پاس گزرانی گئی ہے کشور خاں نے جب یہ کن سن سنی تو اُس نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر نکالی کہ مصطفیٰ خاں کو ہی قتل کر دیا جائے تاکہ معزولی کا کھٹکا ہی باقی نہ رہے۔ اس غرض سے اُس نے مصطفیٰ خاں کے خلاف اک زبردست سازش کی اور اس میں کامیاب رہا۔ اُس کی تفصیل یہ ہے:-

کشور خاں نے محمد امین نامی شخص کو جو ایک غریب زادہ تھا، نور الدین محمد کے پاس ایک فرمان کے ساتھ روانہ کیا جس پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی چونکہ متولی سلطنت ہونے کے اعتبار سے ہمیشہ کشور خاں کے پاس رہتی تھی لہذا اُس نے آسانی ایک فرمان مصطفیٰ خاں کے قتل کی بابت لکھا اور ملکہ چاند بی بی کی اطلاع کے بغیر اُس پر شاہی مہر لگا دی اور اس فرمان کو شخص مذکور یعنی نور الدین کے پاس روانہ کیا۔ نور الدین اتفاق سے ایسی سرشت کا آدمی تھا کہ نمک حرامی اُس پر ختم معلوم ہوتی ہے۔ یہ شخص مشہد کا رہنے والا تھا اور سید بھی تھا۔ مصطفیٰ خاں نے اس کی بڑی مدد کی تھی حوالی بنکاپور میں اُسے جاگیر دے رکھی تھی۔ غرض مصطفیٰ خاں کے اس شخص پر بہت احسانات تھے۔ وہ اپنی ساری ترقی کے لئے

اگر کسی کا ممنون تھا تو وہ مصطفیٰ خاں تھا۔ مگر دنیا کے لالچ کے آگے اس بدنفس شخص نے اپنے محسن کے تمام احسانات بھلا دیئے، اور مصطفیٰ خاں کے قتل کیے معاملہ میں وہ کشور خاں کا ہمخیال ہو گیا محض اس امید پر کہ اس کام کے صلے میں اُسے بہت سی جاگیرات وغیرہ ملجائیں گی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مصطفیٰ خاں کی تمام جاگیرات اُس پر بحال کیئے جانیکا وعدہ کیا گیا ہے تو اُس کے منھ میں پانی بھر آیا، اور اُس نے نمکحرامی پر کمر باندھ لی بغرض وہ محمد امین کو ہر طرح مدد دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ فوراً وہاں کے زمینداروں اور نائکوں کو ملانے لگا۔ طرح طرح کے جھوٹے افسانے مصطفیٰ خاں کے خلاف گھڑ کر اُن کو برانگیختہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی جتلایا کہ اگر پہلے سے ہی تم لوگ اُس کا خاتمہ نہ کردیں تو وہ تم سب کو تہ تیغ کردیگا۔ غرض اسی قسم کا جھوٹ سچ بک کر اُس نے اہل قلعہ اور اطراف و اکناف کے نائکوں کو اُس کا سخت مخالف بنا دیا اور اپنا راستہ ہموار کر لیا۔ ساتھ ہی اُن سے انعامات کے وعدے کیئے گئے۔ اس طریقے سے جب اُس کا راستہ صاف ہو گیا تو محمد امین کو اُس نے قلعہ کے اندر بھیجدیا جہاں مصطفیٰ خاں رہتا تھا۔ محمد امین سرشام قلعہ پہنچا اور مصطفیٰ خاں کو پیام دیا کہ وہ اُس کے نام اک شاہی فرمان لایا ہے مصطفیٰ خاں نے یہ سنکر اُس کا خیر مقدم کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ شب بسری کے لئے مناسب انتظام کر دیا۔ محمد امین نے مصطفیٰ خاں سے کہہ دیا تھا کہ اب رات زیادہ ہو گئی ہے اس لئے صبح ہی کو وہ فرمان اُس کے حوالہ کر دیا جائیگا۔ مصطفیٰ خاں بالکل خالی الذہن تھا، اس لئے اُس کو کچھ شبہ نہ گزرا۔

جب رات کو سب سو رہے تو محمد امین کو موقع ملا کہ قلعہ کے چند اور نائکوں کو ہموار کرے۔ اُن کو ہزار مکر و حیلہ مصطفیٰ خاں کے قتل پر راضی کر لیا۔ علی الصباح مصطفیٰ خاں نماز فجر کی ادائی میں مشغول تھا کہ یہ موذی چپکے سے وہاں جانکلا۔ اور اسی بے خبری کے عالم میں مصطفیٰ خاں پر حملہ کر کے اُس کا وہیں کام تمام کر دیا۔ مصطفیٰ خاں نے تڑپ تڑپ کر جان دی، اس طرح وہ ان مفسدین کی مکاریوں اور حیلہ بازیوں کا شکار ہوا۔[1]

مصطفیٰ خاں کے قتل کی نسبت فرشتہ نے جو قصہ بیان کیا ہے اُسے اوپر قلمبند کیا گیا۔ مگر بساتین کے مصنف نے اس واقعہ کو بالکل دوسرے طور پر بیان کیا ہے۔ بظاہر اس اختلاف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی

---

[1] فرشتہ۔

کیونکہ عموماً بساتین کا مصنف فرشتہ کے بیانات کی تصدیق و توثیق کرتا ہے چونکہ یہ ایک اہم اختلاف ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو بھی درج کر دیا جائے کشور خاں نے مصطفیٰ خاں کے قتل کے لئے اپنے ہمخیال پانچ چھ امیروں کو ایک فوج دے کر ضلع ملیبار روانہ کیا کہ وہ مصطفیٰ خاں کے استیصال کی فکر کریں اور اُسے قتل کر ڈالیں۔

جب مصطفیٰ خاں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا مصطفیٰ خاں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گیا۔ اتفاق سے ایک قلعہ کے پاس پہنچا جس پر کوئی ہندو زمیندار قابض و متصرف تھا۔ مصطفیٰ خاں اس قلعہ میں پناہ لینا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے اس ہندو زمیندار سے درخواست کی کہ کچھ مدد کرے۔ یہ زمیندار مصطفیٰ خاں کی مدد کے لئے تیار تو تھا مگر چونکہ کشور خاں کی فوج بہت قریب تھی اس لئے قلعہ کا دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں مصطفیٰ خاں کے ساتھ وہ فوج بھی اندر گھس آئے۔ لہٰذا قلعہ کی فصیل سے ایک رسی چھوڑی گئی جس کی مدد سے مصطفیٰ خاں کو اُوپر لینا منظور تھا۔ مصطفیٰ خاں رسی کی مدد سے آدھی دیوار تک چڑھ گیا تھا کہ کشور خاں کے فوجی آپہنچے اور انھوں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر مصطفیٰ خاں کو اُس کا ایک پاؤں پکڑ کر کھینچ لیا۔ مصطفیٰ خاں نہایت بُری طرح نیچے آرہا۔ اُس کو گرفتار کر لیا گیا۔ فی الحال اُسے قلعہ بنکا پور میں محبوس کر دیا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد کشور خاں کے اشارے سے مصطفیٰ خاں کا اسی قلعہ میں خاتمہ کر دیا گیا۔ اس طرح اس نیک نفس، شریف اور خوش سیرت انسان کا نہایت بیدردی کے ساتھ اُن ظالموں کے ہاتھوں قتل عمل میں آیا۔[1]

علاوہ اسکی سیرت کی خوبیوں کے وہ ایسے پایہ کا امیر تھا کہ اُس کے قتل سے پوری ریاست میں ایک بے چینی اور ناراضی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عمارت سلطنت کا سب سے زبردست سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ستون تھا۔ ایسے ستون کا منہدم کرنا گویا عمارت کے انہدام کی ابتدا کرنا تھا بسطرح مصطفیٰ خاں کا قتل محض اک شخصی واقعہ ہی نہیں رہا بلکہ انتہا درجہ کی اُس کو سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی اور خصوصاً شخص

---

[1] بساتین السلاطین۔

مصطفیٰ خاں کے قتل کا باعث ہوا تھا وہ محض مصطفیٰ خاں کا دشمن نہیں بلکہ پورے ملک اور پوری ریاست کا دشمن سمجھا گیا کیونکہ کوئی حقیقی بہی خواہ سلطنت، وفاداران ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا بہی خواہان ریاست اور ہوا خواہان دولت عادل شاہیہ کی بربادی کا درپے ہونا صاف اس امر کی دلیل تھی کہ سلطنت بیجاپور کی بربادی کا بیڑا اٹھایا جا رہا ہے۔ غرض مصطفیٰ خاں کے قتل کی خبر جب مشہور ہوئی تو تمام ملک میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ کیا امیر اور کیا غریب سب یہ محسوس کرنے لگے کہ کشور خاں کے طور ٹھیک نہیں اور اس کے انداز بتا رہے ہیں کہ وہ ریاست کا دشمن ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب بُرے سے بُرے آدمی پر بھی بُرا وقت آتا ہے تو دنیا اُس کی بُرائیاں بھول جاتی ہے۔ اور عوام کی ہمدردیاں اُس سے وابستہ ہو جاتی ہیں قتل کیا جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ موت اور خصوصاً حسرتناک موت انسان کو بھی پس مردن بڑی حد تک ہردلعزیز کر دیتی ہے۔ اور لوگ ایسے شخص کو مظلوم، شہید اور بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں اس کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ اک نہایت دلچسپ مثال تاریخ انگلستان میں ملتی ہے۔ چارلس اول جب تک زندہ رہا اک ملعون اور غیر ہردل عزیز بادشاہ تھا جب یکبارگی اُسے ناانصافی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تو پورے ملک میں اک کہرام سا مچ گیا اور تمام قوم کے جذبات اُس کی موافقت میں ایسے اُبھرے کہ وہ اُسے شہید اور بزرگ تصور کرنے لگی چنانچہ جب وہ قتل ہوا ہے تو اُس کے خون میں اکثر لوگوں نے بطور اظہار سعادت اپنی دستیاں اور کپڑے رنگ لئے۔ غرض یہ دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بُرا آدمی بھی اگر بیدردی سے قتل کیا جائے تو اکثر لوگوں کی ہمدردی اُس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ مصطفیٰ خاں اسکے برخلاف اپنے زمانے کا بہترین آدمی تھا۔ اور باوجود اپنی دو چار کمزوریوں کے وہ ملک میں بہت عزت اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، اور ملک کا قدیمی خیر خواہ اور محسن تصور کیا جاتا تھا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ محمود گاواں کو بیدر میں اور چنگیز خاں کو احمد نگر میں جو ہردلعزیزی حاصل تھی اگر اُس سے زیادہ نہیں تو تقریباً اتنی ہی اُسے اپنی ریاست میں حاصل تھی۔ خاندان شاہی کو اُس پر بڑا اعتماد تھا، اور اسے ایک ایسا شخص تصور کرتے تھے جس سے آڑے وقت ہر طرح کی مدد طلب کی جا سکتی ہے۔ اس طریقے سے مصطفیٰ خاں سیاسی طور پر، ذاتی طور پر اور شخصی خوبیوں کی بنا پر ملک میں اک باوقار شخص تھا۔ اور پھر وہ سادات سے بھی تھا عموماً سادات کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا

جاتا ہے اور ان کی تعظیم و توقیر کی جاتی ہے۔ اُن کا خون بہانا ایک فعل شنیع خیال کیا جاتا ہے۔ یہ پرانے احساسات خیالات ازمنۂ وسطیٰ کی زندگی میں ایک زندہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس طریقے سے عوام کی نظروں میں جن کی نظر سے اس قتل کی سیاسی اہمیت پوشیدہ تھی یہ فعل اس نقطۂ نظر سے بہت زیادہ قابل نفرت اور لایق ملامت تھا سید کا خون بہانے والے کو وہ یزید اور یزید زادہ سمجھتے تھے اور جو مقتول سید سے ذاتی طور پر واقف تھے وہ اُس کی خوبیوں کو یاد کر کر کے روتے تھے۔ ایسے نیک نفس آدمی کا قتل اُن کے نزدیک صرف اسی سے ہو سکتا تھا جو شیطان بصورت انسان ہو یا جس میں ابلیسیت سرایت کر گئی ہو۔

اُمرا، اور اعیان دولت سب سے زیادہ اس حرکت سے خائف ہوئے۔ کیونکہ جو شخص مصطفیٰ خاں جیسے شخص کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنے سے نہ چوکا ہو جو وفاداروں اور بہی خواہوں کا اس طرح دشمن ہو گیا ہو اُس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ سوائے اس کے کہ آہستہ آہستہ وہ باقیماندہ اُمراء و اعیان پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کرے، جو اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہوں۔

غرض ملک کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس فعل سے سخت ناراض نہوا ہو۔ شاہی خاندان سے لیکر طبقۂ عوام تک، ہر شخص اس ماتم میں شریک ہوا، اور اس قتل کا بانی پورے ملک کا مطعون و معتوب ہوا۔ حقیقت میں کشور خاں نے یہ حرکت ایسی کی تھی جو اصول تدبر سے بہت بعید تھی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میں سیاست دانی اور زمانہ فہمی کی قابلیت قطعاً نہیں تھی جس طرح محمود گاواں کے قتل پر تمام اُمرا اور عوام محمد شاہ سے بیزار اور ناراض ہو گئے اور جس طرح محمود گاواں کا قتل اس کے قاتل یعنی بادشاہ اور اُس کے خاندان کی حکومت کے لئے مہلک ثابت ہوا اسی طرح مصطفیٰ خاں کے قتل سے تمام ملک کشور خاں سے ناراض ہو گیا۔ اور اُس کا یہ فعل خود اس کی بربادی کا موجب ہوا۔

چاند بی بی کا محبوس کیا جانا اس کا پہلے ہی ذکر کر دیا گیا ہے کہ مصطفیٰ خاں کے قتل کا فرمان چاند بی بی کے استمزاج کے بغیر نکالا گیا تھا، اس لئے اندرونی کارروائی سے چاند بی بی قطعاً بے خبر تھیں، جب یہ خبر عام ہوئی کہ مصطفیٰ خاں اس بیدردی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا ہے تو چاند بی بی کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اُس نے کشور خاں کو اس کے اس طرز عمل پر بہت برا بھلا کہا اور سختی سے پیش آئی۔ اس کا اثر

تو چاند بی بی کے حق میں بہت مضر ہوا۔ کیونکہ کشور خاں نے اب چاند بی بی کے خلاف کارروائی شروع کردی۔
کشور خاں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ چاند بی بی ایک تو مصطفیٰ خان کے قتل کی وجہ سے اُس سے سخت ناراض ہو گئی ہے اور اُس کو سخت سُست کلمات سُنا چکی ہے اور دوسری طرف اُمرا بھی برہم تھے۔
اب ایسے وقت میں کام ادھورا چھوڑنا دشمن کو نیم جان کر کے ہاتھ کھینچ لینا ہے۔ سوئے ہوئے فتنوں کو جگا کر اُنھیں پوری طرح فنا نہ کرنا انتہا درجہ کی حماقت ہے۔ یا تو اس کارروائی کی طرف قدم اُٹھایا ہی نہ جاتا یا اب تو پہلے زینہ پر قدم رکھدیا گیا ہے تو اُس کو مکمل کر کے چھوڑنے ہی میں خیریت ہے۔ ورنہ مصطفیٰ خاں کے قتل سے ہی پورا ملک اتنا بگڑا بیٹھا ہے کہ اگر ذرا سی غفلت کی جائے اور اُمراء کو چاند بی بی سے ایک اتحاد کرنے کی مہلت دی جائے تو پھر جان کی خیر نہیں اس لئے اب جو مصطفیٰ خاں کو قتل کر دیا گیا تو ساتھ ہی چاند بی بی کو بھی مُقید کر کے دشمن کو بے دست و پا کر دینا چاہیئے تاکہ بادشاہ بالکل اختیار میں آجائے اور اُمراء کو چاند بی بی کی طرف سے کسی قسم کی ہمت نہ رہے۔ اس انتظام کے بعد بھی جو اُمرا سر اُٹھائیں گے اُن سے سمجھ لیا جائے گا کشور خاں کے غالباً یہی خیالات تھے اسی بنا پر اُس نے تہیہ کر لیا کہ فی الحال چاند بی بی کو قید کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ چاند بی بی کی طبیعت سے بھی خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چاند بی بی اک مردانہ ہمت رکھنے والی عورت ہے اُس کو حکومت کرنے کا چسکہ لگ گیا ہے۔ وہ حکومت میں کسی کو اپنا شریک نہیں رکھنا چاہتی بہت ممکن ہے کہ اُس کی یہ مرضی ہو کہ ابراہیم کے پردے میں خود حکومت کرے اور متولیانِ ریاست محض اُس کے احکام کی تعمیل کے لئے اس خدمت پر فائز رہیں۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا کہ اس وقت احمد نگر میں یہی صورت حال تھی۔ خونزہ ہمایوں سلطان اپنے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ کی کمسنی سے فائدہ اُٹھا کر خود حکومت کر رہی تھی۔ اور اُس کا یہ مقصد تھا کہ نام تو مرتضیٰ کا رہے لیکن حقیقی حکومت کرنیوالی وہی ہو۔ کشور خاں ڈر رہا تھا کہ کہیں چاند بی بی اسی سرشت کی عورت نہو۔ اگر صورت حال ایسی پیدا ہو جائے تو حکومت کے دو دعویدار ہو جاتے ہیں ایک تو خود کشور خاں جس کے ہاتھ میں اس وقت اقتدار تھا، دوسرے چاند بی بی۔ جہاں قوت و طاقت کے دو دعویدار ہوں اختلافات کا پیدا ہونا لازمی ہے اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ تو واقعات کے رنگ ڈھنگ کی بنا اور کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے چاند بی بی اور کشور خاں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔

ان اختلافات اور ان اندیشوں کی بنا پر کشور خاں نے یہ ٹھان لیا کہ قبل اس کے کہ چاند بی بی دوسرے اُمرا سے مل کر اُسے نکالنے کی تدبیر کرے (جیسے کہ اُس نے کامل خاں کو خود اُس کے ہاتھوں نکلوایا تھا) اُس کا زور توڑ دینا چاہیئے۔ اور اُس زور کے توڑنے کی نہایت آسان ترکیب یہی تھی کہ کچھ عرصے کے لئے اُسے حکومت سے بے دخل کر کے نظر بند یا محبوس کر دیا جائے۔ اس طرح اُس کا رہا سہا دشمن جو اُس کے لئے مارِ آستین ہے وہ بھی بیدست و پا ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ یکبارگی چاند بی بی پر قابو پائے تو ملک اور ملک والوں کی کیا مجال کہ اُس کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر یہاں کشور خاں نے پھر غلطی کی جس طرح اُس کا خیال تھا کہ مصطفیٰ خاں کے قتل سے اُس کے نام کی دہشت لوگوں کے دلوں پر ایسی بیٹھ جائے گی کہ کسی کو اُس کے مقابلے کی تاب نہ رہے گی اِسی طرح اب وہ سمجھتا تھا کہ چاند بی بی کو قید کرنے سے وہ اپنی تدبیر کی کڑیوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ حرکت ایسی تھی جو اہل ملک کے صبر کے پیالہ کو لبریز کر دینے والی ثابت ہوئی۔ کشور خاں گو اپنے نزدیک سمجھ رہا تھا کہ اس کارروائی سے وہ اپنے آپ کو مستحکم کر رہا ہے لیکن حقیقت میں اُس کے اقتدار کی جڑیں اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں اور خود یہ حرکتیں اُس کے زوال کا باعث ہونے والی تھیں۔

غرض مصطفیٰ خاں کے قتل کے بعد کشور خاں کا دوسرا اہم کام چاند بی بی کا قید کرنا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی اس غلط پالیسی میں (جس کو وہ اپنی استحکامی پالیسی سمجھا ہوا تھا) اتنی دور نکل چکا تھا کہ اُس کو بدلنا یا اُس میں تبدیلی کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ یہ چیز خود اُس کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اگر کشور خاں یہ سمجھتا بھی کہ اُسکی اختیار کردہ پالیسی کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے سے خود اس کا نقصان ہوگا تو ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر لیتا کہ اُس کا اس پالیسی کو اس زینہ پر ترک کر دینا بھی باعث ہلاکت ہوگا۔ کیونکہ مصطفیٰ خاں کے قتل اور اُس کی عام پالیسی سے ملک اس قدر ناراض ہے کہ یہی اسباب اُس کی بربادی کے لئے بہت کافی ثابت ہوں گے۔ اگر چاند بی بی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو اس سے کشور خاں کے حق میں کچھ اچھے نتائج برآمد ہوتے۔ اور وہ اپنی گزشتہ کارروائیوں کی سزا بھگتے بغیر نہ رہتا۔ بلکہ اُلٹے اُس کی بربادی بہت جلد عمل میں آتی۔ اُمرا اور چاند بی بی متحد ہو جاتے اور اُس کی ان سب غلط کارروائیوں کا مواخذہ کرتے۔ اسلئے اس لئے اُس کے نزدیک یہ بھی بیوقوفی تھی کہ یہاں تک پہنچکر اب عین وقت پر دشمنوں کو موقع دیدیا جائے کہ

اُس کے خلاف جو چاہیں کریں! اس خیال کی حد تک کشور خاں کا اندازہ ٹھیک تھا چاند بی بی کو اگر کشور خاں قید نہ کرتا تو خود چاند بی بی اُس کو اس طرح نکلوا دیتی جیسے کہ کامل خاں کو اُس نے نکلوایا تھا۔ اُمرا تو محض اُس کے اشارے کے منتظر ہی تھے! اگر ذرا اشارہ پاتے تو وہ کشور خاں پر بھوکے شیروں کی مانند ٹوٹ پڑتے۔ لہذا کشور خاں نے چاند بی بی کو جو قید کیا وہ ایک طریقے سے اپنی حفاظت کے لئے تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فی الحال دشمن کو قابو میں تو کر لیا جائے اُس کے بعد جو کچھ اُلٹ پڑے اُس کا تصفیہ کر لیا جائے گا۔ غرض چاند بی بی کا قید کیا جانا کشور خاں کی اختیار کردہ پالیسی کے لازمی نتائج میں سے تھا۔ وہ اگر اُس کو ٹالنا بھی چاہتا تو اُس وقت تک نہ ٹال سکتا جب تک کہ اُس کی مرضی یہ ہو کہ خود اپنے ہاتھوں وہ اپنے مخالفین کے پنجہ میں پھنس جائے۔

اب چاند بی بی کے قید کرنے کے لئے کسی بہانہ کی ضرورت تھی مثل مشہور ہے کہ "حیلہ جو را بہانہ بسیار" اس نے چاند بی بی کے سر یہ اتہام لگایا کہ وہ اپنے بھائی نظام شاہ سے خفیہ مراسلت کرتی ہے اور بیجا پور کے حالات سے اُسے آگاہ رکھتی ہے۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ بیجا پور کی سلطنت نظام شاہیوں کے زیر اثر آ جائے۔ غرض اس طرح جھوٹی باتیں مشہور کر کے اس امر کی کوشش کی گئی کہ چاند سلطانہ کو غدار اور ملک فروش ثابت کیا جائے۔ یہ محض عوام کے جذبات کو بھڑکانے کی ترکیب تھی اور غایت یہ تھی کہ ملک چاند سلطانہ کا مخالف بن جائے، اور اُس کے قید کئے جانے کو اک حق بجانب فعل تصور کرے۔ مگر ملک کشور خاں سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی ان دھوکہ بازیوں کے سُننے کے لئے تیار نہ تھا جب کشور خاں نے چاند بی بی پر یہ اتہام لگایا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ اُس کو قید کر کے تعلقہ ستارہ بھیجدیا جائے تو پورے ملک میں اک کہرام سا مچ گیا۔ کیونکہ یہ حرکت بالکل ایسی تھی کہ جس کی مثال عادل شاہی خاندان کی تاریخ میں ملنی مشکل تھی۔ کمال خاں نے یقیناً بغاوت کی ٹھانی تھی۔ اسمٰعیل (عادل شاہ) اور اُس کی والدہ بوبوجی خانم کو عملی طور پر تھوڑے عرصے کے لئے ایک حد تک نظر بند کر رکھا تھا۔ مگر اُس کی غداری محض اُس کے خیال تک رہی مکمل عملی جامہ پہننے نہ پائی تھی کہ اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح کامل خاں نے چاند بی بی کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کی تھی مگر اب تک کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ خاندان شاہی کے کسی بچہ کی بھی یوں عزت ریزی کرے اور اُس کے ساتھ ایسا ذلیل سلوک کرے۔ حرم شاہی کے لونڈیوں کی بھی عزت کی جاتی تھی۔ یہ تو ملکہ ہوئی، اور ملکہ بھی ایسی باعظمت و باوقار

کہ اُس کی سطوت و شوکت کا سکہ نہ صرف اہل دکن کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا بلکہ اُس کی شہرت کے آوازے شمالی ہند میں اکبر کے دربار تک پہنچ چکے تھے۔ علاوہ بریں اُس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وفادار اور جاں نثاران سلطنت جہاں اُس کا پسینہ ٹپکے لہو بہانے کے لیے تیار تھے اُس کی یہ ہر دلعزیزی کچھ بے معنی بھی نہ تھی اُس نے اپنی پوری زندگی کو اپنے ملک اور اپنی سلطنت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اُسکے ان گنت احسانات ملک اور اہل ملک پر تھے اُسی کے سایۂ عاطفت میں اس ریاست کا اک ہونہار بادشاہ پرورش پا رہا تھا۔ غرض یہ وہ عورت تھی جس کی شجاعت، فراست، تدبیر اور دانائی نے پورے ملک کے دل کو موہ لیا تھا اور جو حقیقت میں ریاست بیجاپور کی اک بڑی محسن تھی کشور خاں نے اپنی انتہائی بیوقوفی کا ثبوت دیا کہ اک ایسی باعظمت اور ہر دلعزیز ملکہ کی گرفتاری اور حبس کا حکم دیا یہ دوسری کلہاڑی تھی غالباً پہلے سے تیز تر جو اُس نے اپنے پیر پر مار لی۔

جب محل کے خواجہ سراؤں کو حکم ملا کہ چاند سلطانہ کو محل میں گرفتار کر کے ستارہ روانہ کیا جائے تو بھلا خواجہ سراؤں اور ادنیٰ ملازموں کی کیا ہمت کہ ایسی ملکہ کو گرفتار کر سکتے۔

جب کشور خاں نے دیکھا کہ کام یوں آسانی سے نکلتا نظر نہیں آتا تو اُس نے اپنے خاص ملازمین روانہ کیے کہ محل سے چاند سلطانہ کو نکال کر باہر لائیں۔ یہ مظلوم ملکہ کو کشاں کشاں بصد ذلّت و رسوائی حرم شاہی کے دروازے تک لائے اور یہاں سے وہ کشور خاں کے حکم سے ستارہ روانہ کر دی گئی[1]۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ ہوا۔ اُس نے حرم سرا کی کنیزوں اور لونڈیوں کو بھی نکال دیا اور یہ عورتیں ملکہ چاند بی بی کی پالکی کے ساتھ برہنہ سر و برہنہ پا بہ حال تباہ

لہ۔ فرشتہ اس واقعہ کی بابت یوں رقمطراز ہے کہ "درحق چاند سلطانہ تہمتی و افترائی اندیشیدہ گفت ہمیشہ اخبار این طرف را بہ برادر خود نظام شاہ نوشتہ بر تسخیر ممالک عدالت پناہ تحریص و ترغیب می نماید صواب آنست کہ اورا چندگاہ در قلعہ ستارہ نگاہ داریم و بعد از فراغ از مہم مرتضیٰ نظام شاہ باز بہ شہر آوریم۔ و چوں چاند سلطانہ در بیروں آمدن از حرم سرا استکاہل ورزید کشور خاں خواجہ سرایان و عورات خاصہ خود را بدروں فرستادہ کشاں کشاں آں مہد علیہ را بیروں آوردند و در پالکی نشانیدہ روانہ قلعہ ستارہ گردانیدند"

تاریخ فرشتہ ص ۱۵۔

گریہ وزاری کرتی اور کشور خاں کو برا بھلا کہتی جاتی تھیں۔ دن کے وقت شہر کے گلی کوچوں میں نازنینان حرم کو اس طرح نکال باہر کرنا اور انھیں محبوس کرنے کے لیئے ستارہ روانہ کرنا یہ ایک ایسی حرکت تھی جس سے شہر والوں کے دل ہل گئے۔ ان عورتوں کی بیکسی اور بے بسی کا یہ ایک ایسا عبرتناک منظر تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہوگا۔ سنگدل سے سنگدل شخص بھی ان عورتوں کی گریہ وزاری کے ساتھ اپنی آنکھوں کو تر کیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عورتیں نہیں رو رہی تھیں بلکہ ان کے ساتھ پورا ملک رو رہا تھا۔ مگر چونکہ طاقت اُن کے ہاتھ میں نہ تھی لہذا خون کے گھونٹ پی کر خاموش تھے اور محض موقع کے متلاشی تھے کہ ان ستمرانیوں کا بدلہ لیا جائے۔ صاحب بساتین نے سچ کہا ہے کہ "آں روز در شہر مصیبتی بود کہ از مصیبت روز علی عادل شاہ بدتر"[1]۔ پورا ملک اک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشور خاں ملک میں سخت بدنام ہوگیا اور لوگ اُس سے نفرت کرنے لگے۔ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا ہی کسی ایک شخص کو جو ان افعال کا باعث ہوا ہو غیر ہردلعزیز بنانے کے لیئے بہت کافی تھا۔ مگر کشور خاں نے ان بیہودگیوں کو یہیں ختم نہیں کیا بلکہ اپنی بعد کی بعض حرکات سے اپنے کو اور بھی زیادہ قابل نفرت ثابت کر دیا۔

چاند بی بی کے نکالے جانے کے بعد اُس نے یہ حکم صادر کیا کہ محل [illegible] جو علی عادل شاہ کے زمانے میں بغرض عیاشی جمع کی گئی تھیں) اُن کے عقد ثانی کر دیئے جائیں۔ حرم شاہی کی بعض کنیزوں اور خدمتگاروں کو اپنے متعلقین کے سپرد کر دیا۔ فی الواقع اگر دیکھا جائے تو یہ فعل اُس کا اتنا بُرا نہ تھا بلکہ ایک حد تک جائز اور شرعی۔ انصاف کا خون کیئے بغیر یہ ناممکن ہے کہ کشور خاں کے اس فعل پر کسی قسم کا اعتراض کیا جائے یا اُس کی اس حرکت پر اُسے مجرم قرار دیا جا سکے خواہ اخلاقی اور اصولی نقطۂ نظر سے کشور خاں کی یہ حرکت کتنی ہی حق بجانب کیوں نہ ہو لیکن اُس کے لیئے یہ بھی مضر ثابت ہوئی۔ فی نفسہٖ بعض افعال نہایت اچھے ہوتے ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے اُن کے نتائج مضر مترتب ہوتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ کشور خاں کی اس حرکت کو اہل ملک نے اس پر محمول کیا کہ خاندان شاہی کو وہ ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ عوام الناس کے نزدیک یہ ایک

[1] بساتین السلاطین بستان پنجم۔

ایسا فعل تھا کہ جس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ انھوں نے اپنے بادشاہ کے خاندان کی اس میں تحقیر دیکھی کہ شاہی حرم کی معزز عورتیں معمولی عورتوں کی طرح یوں غیروں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ یوں بھی کشور خاں بدنام ہو چکا تھا اس کا یہ فعل اس کی بدنامی کے لئے سونے پر سہاگہ ہو گیا انھی واقعات کے ضمن میں کشور خاں سے وہ حرکت بھی[1] سرزد ہوئی جس کا باب دوم میں تفصیلاً تذکرہ کیا گیا جواہرات والا قصہ بھی اپنے اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس واقعہ سے بھی لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا کہ کشور خاں کو ادب شاہی کچھ ملحوظ نہیں رہا ہے۔ غرض یہ چھوٹی چھوٹی حرکتیں جو بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اُن واقعات کے ساتھ ملکر جن سے ملک سخت ناراض ہو چکا تھا کشور خاں کی بدنامی اور اس کی بربادی کا باعث ہوئیں۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے کہ ملک کو کشور خاں سے اس وقت کس درجہ نفرت تھی یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ جب شہر میں کشور خاں بادشاہ کے ہمراہ نکلتا تو عورتیں اس کو سربازار کوستی، گالیاں دیتیں اور لعنت و ملامت کرتی تھیں، اور یہ علانیہ کہتی تھیں کہ یہ وہی موذی، ظالم اور یزید ہے جس نے کہ شاہی خاندان پر ایسے مظالم توڑے۔ چاند بی بی جیسی خیر خواہ سلطنت عورت کو جھوٹا الزام لگا کر قید کیا اور مصطفٰی خاں جیسے بزرگ اور نیک نفس سید کو قتل کیا اور اب ملک کی بربادی کا درپے ہے۔ غرض کشور خاں کے ظالمانہ طرز عمل کی بنا پر ملک کا ہر شخص اس کا مخالف ہو گیا تھا۔

فوج کو قابو میں لانے کی تدابیر ملک میں غیر ہر دلعزیزی کا تو یہ عالم تھا لیکن کشور خاں اپنی دانست میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ وہ اپنی استحکامی کارروائیوں میں مصروف ہے اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا رہا ہے کیونکہ جن جن لوگوں کی جانب سے اسے خطرہ تھا اُن سے میدان صاف ہو گیا تھا۔ اب پورا اقتدار اس کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی ہستی ایسی نہ تھی جس کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ ہو۔ مصطفٰی خاں اور چاند بی بی دو بڑے دشمن تھے۔ ان میں ایک کو تو گوشۂ لحد میں سلا دیا گیا، دوسرے کو جیل خانہ کی

---

[1] ملاحظہ ہو باب دوم مقالۂ ہذا۔ کشور خاں کا والدۂ ابراہیم کے پاس معمولی جواہرت کا بھیجنا اور اُن کی خفگی۔

ہوا کھلائی گئی۔ اب رہ گئے امرا، اور وہ سرداران فوج جو اس وقت شاہ درگ میں اپنی فوجیں لئے ہوئے پڑے تھے اور دارالسلطنت کے ان واقعات کا خاموشی کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ محض اس فکر میں تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور کشور خاں کی یہ نیرنگیاں بالآخر کیا رنگ لاتی ہیں۔

اب اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ان امرا کو راضی کر لیا جائے۔ کیوں کہ جب فوج قبضہ میں آ جائے گی تو پھر کشور خاں کا ہی راج ملک میں رہے گا۔ بادشاہ تو کمسن ہے جن امرا سے مخالفت کا اندیشہ ہے انھیں قتل کر دیا جا سکتا ہے اور جو ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اُن کی مزید تالیف قلوب کی جائیگی اور اُن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جا سکتا ہے، پھر تو کشور خاں من مانے حکومت کر سکتا ہے اور اپنا راج منا سکتا ہے۔ کونسی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس کے لئے وہ بے چین و بیقرار رہے۔ کشور خاں کی یہ پالیسی تھی، چونکہ اب اُسے محض فوج کی جانب سے کھٹکا تھا وہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ یہ اُمرا اور سردار پہلے سے ہی بگڑے بیٹھے ہیں۔ اور انھی میں سے بعضوں نے چاند سلطانہ کو یہ صلاح دی تھی کہ مصطفیٰ خاں کو طلب کر کے کشور خاں کی جگہ اُسے فائز کر دیا جائے۔ اب انھیں لوگوں سے سابقہ تھا جو اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ فوج کو قابو میں لانے کی جو تدابیر اُس نے اختیار کیں وہ یقیناً شاطرانہ نقطۂ نظر سے دانشمندانہ تھیں۔ مگر کشور خاں کی یہ بدنصیبی تھی کہ اُس کا تیر نشانہ پر نہ لگا۔

اس کا تو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ کشور خاں کے اقتدار کے ابتدائی زمانے میں بیجاپور کی سرحد پر نظام شاہی اور قطب شاہی حملے ہو رہے تھے۔ ان کی روک تھام کے لئے ایک فوج روانہ کی گئی جس میں افضل خاں، عین الملک آنکس خاں، اخلاص خاں، حمید خاں، اور دلاور خاں جیسے پایہ کے اُمرا موجود تھے۔ ان لوگوں نے غنیم کا مقابلہ کیا اور شکست بھی دی۔ اور شاہ درگ کے قلعہ میں سستانے کی غرض سے فوجیں لئے پڑے تھے۔ اور ساتھ ہی پایۂ تخت میں کشور خاں نے جو اودھم مچا رکھی تھی اُس کا بھی بغور مطالعہ کر رہے تھے اور اس پس و پیش میں تھے کہ کیا کیا جائے آیا پہلے بیجاپور کی طرف متوجہ ہو کر کشور خاں کے اختیارات سلب کر لئے جائیں اور اُسے معزول کر دیا جائے یا پہلے پورے طور پر غنیم کو آخری شکست دیکر پایۂ تخت کی طرف توجہ کریں۔ اگر اُن کو سید مرتضیٰ سر لشکر برار کے حملے کا اندیشہ نہ ہوتا تو غالباً پہلے وہ بیجاپور کی طرف توجہ کرتے۔ مگر بار بار ان کو خبریں پہنچ چکی تھیں کہ ایک زبردست فوج کے ساتھ بہزاد الملک کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سید مرتضیٰ بیجاپور کی طرف قدم اُٹھانے والا ہے۔ اسی فوج کی آمد کی

انتظار میں وہ شاہ درگ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اسی عرصہ میں دارالسلطنت بیجاپور میں وہ تغیرات اور تبدیلیاں ہو رہی تھیں جن کا پچھلے صفحوں میں ذکر کیا گیا۔ ان متوحش خبروں کو سُنکر یہ اُمرا اور بھی پریشان اور سراسیمہ ہو رہے تھے۔ اُنکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ عین اُس وقت پر جبکہ غنیم کے اک زبردست حملے کا اندیشہ ہو سرحد کو غیر محفوظ چھوڑ کر پایہ تخت کے حالات درست کرنے کی غرض سے چل کھڑے ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اُن کو کشور خاں سے باقاعدہ مقابلہ کرنا پڑتا اور یہ بھی یقینی ہے کہ بغیر تلوار آزمائی کئے کشور خاں کبھی ہار نہ مانتا۔ اس طرح اک خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی۔ اگر اس خانہ جنگی کے وقت نظام شاہی فوج بیجاپور میں آدھمکے تو اندرونی فساد اور بیرونی حملے سے ریاست کی جو گت بنتی اُس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اور پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو کشور خاں چاروں طرف سے مایوس ہو کر ممکن ہے خود سید مرتضیٰ سے مل جائے۔ اگر کشور خاں حملہ آور دشمن سے مل گیا تو کیا کیا آفتیں ملک پر نازل ہوں، مثل مشہور ہے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" اس طرح یہ دونوں دشمن مل کر بیجاپوری افواج کا چند گھنٹوں میں اگر خاتمہ کر دیں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں۔ غرض ان اندیشوں کی بنا پر اُمرا اور سرداران فوج نے مناسب نہ سمجھا کہ شاہ درگ سے باہر قدم رکھیں۔ حالانکہ متوحش سے متوحش خبریں پایہ تخت سے چلی آرہی تھیں مصطفیٰ خاں کے قتل کی خبر انھوں نے سُنی، چاند بی بی کے قید کئے جانے کا حال معلوم کیا، کنیزان حرم کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اُس کی بھی کیفیت انھیں مل گئی غرض دارالخلافہ کی رتی رتی کی خبر سے وہ آگاہ تھے لیکن پھر بھی کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی کوئی ایسا موقع ہاتھ نہ آتا تھا کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر اس بگڑی ہوئی صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیں۔ بالآخر اُن کو یہ موقع مل گیا کیونکہ کشور خاں کو چاند بی بی سے فراغت حاصل ہو گئی تو اُس نے فوج کی طرف اپنی توجہ منعطف کی۔ اُس کی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح فوج کو اپنے قابو میں کر لے۔ اور آسانی سے قابو پانا ممکن نہ تھا اس لئے اُس نے اک شاطرانہ چال اختیار کی کہ اُن سرداران فوج کو گرفتار کر لے جو اس وقت اُس کے مخالف ہو چکے تھے۔

کشور خاں کی شاطرانہ چال کشور خاں نے اپنے اک ہوا خواہ امیر کو جس کا نام میاں بدو دکنی تھا سپہ سالار فوج بنا کر شاہ درگ روانہ کیا۔ افسر فوج کو بدلنے کا مقصد یہ تھا کہ جو سردار اور اُمرا اُس کے خلاف ہو گئے ہیں یا بغاوت پر

آمادہ ہیں نئے سپہ سالار کی ماتحتی میں اپنا رنگ اور اپنا طرز بدل ڈالیں جب سرلشکر یا سپہ سالار ایسے شخص کو مقرر کر دیا جائے کہ جس کی وفاداری پر اُسے کامل اطمینان ہو تو پھر دوسرے سرداروں کی اتنی ہمت نہ ہو گی کہ اپنے افسر کے احکام کے خلاف اُس سے مخالفت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جو سرداران فوج اُس کے مخالف ہو گئے ہیں، بھلا اُس کے مقرر کردہ سرلشکر کو تسلیم ہی کیوں کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی کہ فوج اُس کی اور مخالف ہو جائے۔ چنانچہ جب میاں بدو ایک بڑی فوج کے ساتھ اس سرحدی فوج کو قابو میں لانے کے لئے چل کھڑا ہوا تو ادھر وہ سرداران لشکر بھی ہشیار ہو گئے جو شاہ درگ میں تھے۔ بظاہر میاں بدو کی روانگی اس غرض سے تھی کہ سرحدی فوج کو مدد پہنچائی جائے لیکن اُس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مختلف طریقوں سے وہاں کے سرداروں کو ہمنوا اور ہمخیال بنا لیا جائے۔ اور انھیں کشور خاں کی حکومت سے راضی کر لے۔ جو اُمرا اور سردار بالکل مخالفت پر کمربستہ نظر آئیں انھیں کسی نہ کسی حیلے قید کر لیا جائے۔ میاں بدو کو کشور خاں کی طرف سے یہ سخت تاکید تھی کہ حبشی اُمرا[1] کو قابو میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے، کیونکہ اس وقت ان کی جانب سے اُس کو سخت خطرہ تھا، اور وہ آمادۂ فساد معلوم ہوتے تھے۔ ان کا اس وقت فوج پر اثر و رسوخ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

غرض جب میاں بدو اپنی فوج اور اپنی سرلشکری کے فرمان کے ساتھ شاہ درگ پہنچا تو سرداروں نے اُس کا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ بہت ممکن ہے اُس وقت تک ان سرداروں کو میاں بدو کے روانہ کئے جانے کی اصلی غرض و غایت سے واقفیت نہ ہوا اور وہ یہی سمجھتے ہوں کہ یہ فوج امداد کو یہاں آئی ہے۔ اب رہا میاں بدو کا سرلشکر مقرر کیا جانا سو مرکزی حکومت کو اختیار کامل ہے کہ جس کو چاہے سپہ سالار اور سرلشکر مقرر کر دے عموماً جنگ کے زمانے میں ایسے انتظامات غیر معمولی نہیں سمجھے جاتے، یا اگر ان سرداران لشکر کو میاں بدو کی جانب سے کچھ شبہ بھی ہوتا تو یہ بات دانائی اور عقلمندی سے دور تھی کہ بجائے اس کے استقبال کے اُس کی مخالفت پر وہیں کمربستہ ہو جائیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ غنیم کچھ دور نہ ہو۔ ان وجوہات کی بنا پر میاں بدو کی

[1] اخلاص خاں، حمید خاں، دلاور خاں جو بعد میں "اتحاد ثلاثہ" قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

فی الحال کچھ مخالفت نہ کی گئی بلکہ اُس کی خوب آو بھگت کی گئی۔

میاں بدو نے شاہ درگ پہنچ کر اپنی اصلی کارروائی شروع کردی اور مختلف سرداروں کو کشور خاں کے موافق بنانے لگا جو اُس کے مخالف ہو گئے تھے۔ بڑی حد تک اُس کو ان کوششوں میں کامیابی بھی ہوئی عین الملک اور آنکس خاں بالکل اُس کے ہمخیال ہو گئے اور اُس کی مدد پر بھی آمادہ تھے۔ اُمرائے حبش اب باقی رہ گئے تھے۔ ان کو اپنا موافق کرنا یا قابو میں لا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میاں بدو کو توقع نہ تھی کہ اُس کا ساتھ دینے پر وہ تیار ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں کشور خاں نے ایک شاہی فرمان میاں بدو کے نام روانہ کیا کہ حبشی اُمرا کو کسی نہ کسی بہانہ گرفتار کر کے شاہ درگ میں محبوس کر دیا جائے کیونکہ یہ لوگ شاہی فرامین کی تعمیل سے انکار کر رہے ہیں اور احکام کے مطابق نظام شاہی فوج پر حملہ کرنے میں تساہل کر رہے ہیں جب یہ مزید احکام میاں بدو کے پاس پہنچے تو وہ اور سرگرمیوں کے ساتھ اپنی کارروائی میں مشغول ہو گیا اور اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح ان حبشیوں کو گرفتار کرے۔ خبر کے پھیلتے دیر نہیں لگتی اُمرائے حبش کو بھی اس کا علم ہو گیا کہ میاں بدو انھیں قید کر کے کشور خاں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس نیت سے آگاہ ہوتے ہی حبشی اُمرا نے ایک ایسی چال چلی کہ جس سے شکاری خود شکار ہو گیا، اور اُلٹے میاں بدو اُن کے قبضہ میں آگیا۔

اُمرائے حبش کی تدابیر اور میاں بدو کا قید ہونا۔

اخلاص خاں حبشی نے یہ بات مشہور کروادی کہ بیجاپور سے اُسے خبر آئی ہے کہ اُسے اک لڑکا پیدا ہوا ہے، اس خوشی میں اُس نے اک جشن ترتیب دیا جس میں تمام افسران فوج کو دعوت دی گئی تھی۔

میاں بدو کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ اس نے نہایت سادہ لوحی اور سادگی کے ساتھ اخلاص خاں کی دعوت قبول کرلی اور حبشیوں کے دھوکے میں آگیا اور شریک مجلس ہوا۔ یہ محفل عیش کاہے کو تھی اچھی خاصی سازش تھی۔ پہلے سے ہی پورے انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ صرف چند ساتھیوں اور مقربوں کے ساتھ جب میاں بدو اخلاص خاں کے ڈیرے میں پہنچے تو اُس نے نہایت آسانی سے اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو وہیں گرفتار کر لیا، اور پھر اُن کو شاہ درگ میں قید کر دیا۔ جب اسل مُہرہ اس طرح اُن کے قبضے میں آگیا تو پھر شطرنج کی پوری پوری بازی اُن کے ہاتھ تھی۔ میاں بدو سے فراغت حاصل کر کے حبشی اُمرا نے اُن سرداروں کیطرف توجہ کی جو کشور خاں کے عزیز یا موافق تھے۔ چنانچہ کشور خاں کے بیٹے کمال خاں سر نوبت، اور مغل خاں

برادر کشور خاں کو جو سرخیلی کے عہدہ پہ مامور تھا قید کر دیا گیا۔اس کے بعد اخلاص خاں مع اپنے ساتھیوں اور فوج کے بیجاپور کی طرف روانہ ہوا۔

میاں بدو کے قید ہو جانے اور مغل خاں اور کمال خاں کی گرفتاری کے معنی یہ تھے کہ کشور خاں کے عروج کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور اُس کا اقتدار اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔اب اس اقتدار کا محور و مرکز وہ شخص ہو گیا جس کے ہاتھ میں فوج تھی۔اسی وقت سے حبشیوں کا عروج شروع ہوتا ہے۔چونکہ اخلاص خاں اس وقت ان حبشی اُمراء میں زیادہ سربرآوردہ اور ذی اقتدار تھا اسی لئے وہ کشور خاں کو بالآخر معزول کر کے حکومت کے سب سے بڑے عہدہ پر قابض ہو جانے میں کامیاب ہوا۔غرض اخلاص خاں نے اب یہاں سے کوچ کر دیا اور منزل بہ منزل نہایت سرعت کے ساتھ عازم بیجاپور ہوا۔جب یہ فوج کوچ کر کے بیجاپور کی طرف چلی تو وہ اُمراء جو میاں بدو کی سازشوں سے کشور خاں کے موافق ہو گئے تھے جن میں عین الملک اور آنکس خاں قابل ذکر ہیں چپکے سے اصلی فوجوں سے علٰحدہ ہو کر اپنی اپنی جاگیروں کو چل دئے۔

ادھر تو یہ کارروائی ہوئی اور اُس طرف کشور خاں کو ان حالات کا علم ہو گیا۔اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس نے فوج کو قابو میں لانے کی جو تدبیر کی تھی وہ ناکام ثابت ہوئی۔اور وہ اُمراء جن کی طرف سے اُسے ابتداء سے ہی خوف تھا بالآخر اُس کے مقابلے میں کامیاب نکلے ہیں اور اب اک بڑی فوج کے ساتھ اُسے معزول کرنے کے لئے بیجاپور آ رہے ہیں۔ یہ خبر بھی اُس کے لئے کچھ کم متوحش نہ تھی کہ اُس کا بیٹا اور بھائی دشمنوں کے پنجے میں پھنس گئے ہیں اور اُن کی جان کی کچھ خیر نہیں۔ان حالات سے پریشان ہو کر وہ مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن یہ جانتا تھا کہ ایسے حالات میں جبکہ پورا شہر بلکہ کہنا چاہیئے کہ پورا ملک اُس کے خلاف ہو رہا ہے بھلا اخلاص خاں اور حبشی اُمراء کا وہ کیا مقابلہ کر سکے گا۔جب اور کچھ بن نہ پڑی تو اُس نے اپنے مقربین اور ہوا خواہوں کی ایک مشورتی مجلس طلب کی۔اور یہ رائے لی کہ ایسی صورت میں کیا کارروائی کرنی چاہیئے اور کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ اس بلائے ناگہانی سے نجات ملے۔اُس کے مشیروں میں سے بعض لوگوں نے رائے دی کہ یہ تمام کارروائی جو شاہ درگ میں اُس کے خلاف کی گئی ہے افضل خاں کی مرضی کے بغیر نہیں کی گئی۔اور یقیناً افضل خاں کا بھی اس میں بہت کچھ ہاتھ ہے۔

ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور فرار ہوگیا۔ چلتے چلتے کشور خاں نے بہت کچھ مال و دولت بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ بے شمار ہیرے جواہر اور مختلف قیمتی اشیا اُس نے اپنے ہاتھ کر لیے اور صرف ایک تسبیح ایسی لی جو مروارید کی تھی جس کی قیمت کم از کم دو لاکھ ہُن بتائی جاتی ہے۔ یہ تسبیح دراصل کامل خاں دکنی سابق متولی سلطنت کی ملک تھی لیکن جب کامل خاں کشور خاں کے ہاتھوں تباہ و تاراج ہوا تو اُس کی ساری پونجی اس کے ہاتھ لگی۔ اسی طرح مصطفیٰ خاں اردستانی کے مارے جانے کے بعد اُس کی بے شمار ملک و جائداد اور قیمتی جواہرات کشور خاں کے ہاتھ لگے۔ اب جبکہ وہ فرار ہوا ہے اُس نے یہ سارا مال اور ساری دولت اپنے ساتھ لے لی۔ صرف دو تین صندوق اُس کے ساتھ ایسے تھے جو محض قیمتی جواہرات سے پُر تھے۔ اس سے اُس دولت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو چلتے وقت اُس کے پاس تھی۔

کشور خاں کی فراری کے واقعات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی اپنے فرار ہونے کا پورا انتظام کر چکا تھا۔

جب وہ بادشاہ کو لیکر شکار کے بہانہ سے نکلا تو اُسی وقت بلکہ اُس سے پہلے سے ہی اُس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ موقع ملتے ہی فرار ہو جائے۔ کیونکہ اُس نے ہیرے اور جواہرات کے صندوق اپنے ساتھ پہلے سے ہی رکھ لیے تھے جن کی شکار میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ اور چار سو سواروں کو بھی پہلے سے ہی مقرر کر رکھا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ بادشاہ کو وہ تھوڑی دور تک اپنے ہمراہ کیوں لے گیا؟ غالباً پہلے اُس کا خیال تھا کہ جب تک ہو سکے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں رکھا جائے اگر بادشاہ قبضہ میں رہے اور کوئی اچانک اور نئی آفت سر پر بھی آئے یا دشمن موقع پا کر اُس پر فتح بھی پالیں تو اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ بادشاہ کو قبضے میں رکھ کر وہ منھ بولے شرایط پر صلح کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تدبیر (اگر کوئی ایسی تدبیر اُس کے ذہن میں تھی) بالکل بے معنی اور بے سود تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ خود کشور خاں نے بھی اس کو بعد میں محسوس کر لیا اور اسی بنا پر اُس نے بادشاہ کو روانہ کر دیا۔

یا دوسری قرین قیاس وجہ کشور خاں کی اس حرکت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرار ہونے کے فعل کو بالکل پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ اُس کی فراری اک امر یقینی ہو جائے اور کوئی شخص مخل نہ ہو سکے۔ اہل شہر کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے اُس نے یہ تدبیر نکالی تھی اور شکار کا بہانہ بنایا تھا۔ اگر وہ تنہا شکار کے بہانہ سے نکلتا تو اندیشہ تھا کہ لوگ اُس کے اصلی مقصد کو تاڑ کر اُس کے فرار ہونے میں رکاوٹ پیدا کرتے۔ اس لیے اُس نے اپنے ساتھ

بادشاہ کو بھی لے لیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ فی الواقع کشور خاں بادشاہ کے ساتھ شکار کو جا رہا ہے جب وہ یکبارگی اُن حدود سے باہر ہو گیا جہاں تک اُسے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا تو فوراً بادشاہ کو واپس ہونے کی رائے دے کر خود فرار ہو گیا۔

کشور خاں نے بیجاپور سے فرار ہو کر سیدھے احمد نگر کا رُخ کیا لیکن احمد نگر کی فضا اُس نے اپنے موافق نہ دیکھی، اس لیے اُلٹے پاؤں گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ وہ احمد نگر میں کسی حال پناہ گزیں نہ ہو سکتا تھا۔ کیا احمد نگر والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کی ہر دلعزیز شہزادی چاند سلطانہ کے ساتھ اُس نے کیا سلوک کیا اور اُس کو کس طرح بیدردی کے ساتھ محل سے نکلوا کر قید کرا دیا تھا۔ چاند سلطانہ مرتضیٰ نظام شاہ کی بہن ہی تو تھی۔ مرتضیٰ نظام شاہ بھلا کس طرح گوارا کرتا کہ ایک ایسا شخص اُس کے ملک میں پناہ گزیں ہو جس نے اُسکی حقیقی بہن پر ایسے مظالم توڑے ہوں۔ غرض وہ احمد نگر میں ٹھہرنا مناسب نہ جان کر سیدھے گولکنڈہ کی طرف چلدیا[۱]۔
وہ گولکنڈہ پہنچ تو گیا مگر ہنوز اُسے بادشاہ یا حکومت کی جانب سے کوئی امان نہ ملی تھی کہ اُس کی آمد کی خبر شہر میں مشہور ہو گئی۔ وہاں پر کسی اردستانی نے جو غالباً مصطفیٰ خاں اردستانی کا کوئی عزیز یا ہواخواہ تھا اُس سے مصطفیٰ خاں کے خون کا بدلہ اپنے خنجر آبدار سے لیا۔ اس طرح کشور خاں کا خاتمہ غریب الوطنی کے عالم میں نہایت بے بسی و بیکسی کی حالت میں ہوا۔

---

[۱] لیکن برہان مآثر نے لکھا ہے کہ کشور خاں بیجاپور سے فرار ہو کر احمد نگر آیا اور اُسے یہاں پناہ ملی۔ نہ صرف پناہ ملی بلکہ وہ مرتضیٰ نظام شاہ کا اک مقرب مشیر ہو گیا اور اُس کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ اس کے بعد اک فوج کا افسر بنا کر اُسے بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے بھی بھیجا گیا (جس کا ذکر آئندہ باب میں آئیگا) لیکن یہ بیان قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ فرشتہ اور بساتین اور تحفۃ الملوک کے بیانات ٹھیک معلوم ہوتے ہیں جن کی تفصیل اوپر دی گئی یعنی وہ احمد نگر میں پناہ گزیں نہیں ہوا بلکہ گولکنڈہ چلا گیا بلاحظہ ہو برہان مآثر۔ تاریخ فرشتہ۔ بساتین السلاطین تحفۃ الملوک۔

کشور خانی دور پر ایک اجمالی نظر اور کشور خاں کا کیرکٹر۔

کشور خاں کی حکومت اُسی وقت سے ختم ہو جاتی ہے جبکہ وہ بیجاپور سے فرار ہوا۔ تقریباً چار مہینے بارہ روز تک بیجاپور پر اس شخص کی حکومت رہی۔ اس قلیل مدت میں اُس نے ملک میں وہ اودھم مچائی کہ الامان والحفیظ۔ کامل خاں کا طرز عمل جب ناقابل برداشت ہو گیا تھا تو حکومت نے کشور خاں کو اس اُمید پر طلب کیا کہ شاید وفاداری اور نمک حلالی سے ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو درست کرے گا۔ مگر جب یکبارگی اس کے ہاتھ میں قوت آگئی تو اُس نے کامل خاں سے بھی زیادہ پیر پھیلانا شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی انتظامات اُس نے ایسے کیے جن سے یہی مترشح ہوتا تھا کہ وہ حقیقت میں ملک کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر کام کر رہا ہے۔ اور خصوصاً کامل خاں کے نکالے جانے کے بعد اُمرائے سلطنت میں پیشوائی کی نسبت جو جھگڑا پیدا ہوا اور جو اختلاف خیال اور چہ میگوئیاں ہوئیں اور جن سے سلطنت کی ناؤ کے ہی اُلٹ جانے کا اندیشہ اسوقت کشور خاں نے نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت کی۔ اُن لوگوں کو نکال باہر کیا جو ابراہیم کو معزول کرنے کے در پے تھے۔ غرض کامل خاں کی طرح اس نے بھی ابتداءً ملک کے لیے مفید کام کیے اور اس سے یہ توقع رکھی جا سکتی تھی کہ آئندہ اس کا وجود بیجاپور کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مگر دولت و حکومت کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے۔ انسان کی عظمت کا سچا اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ ترقی کے اعلیٰ زینوں پر پہنچ جائے اور پھر بھی اپنے ہوش و حواس کو قایم رکھے۔ بیخود و سرشار نہ ہو جائے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ ع چوں بدولت برسی، مست نہ گردی مردی۔ اور اس معیار کے مدنظر کشور خاں نے اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا۔ اقتدار کے ہاتھ میں آنے اور حکومت کی لذت سے واقف ہونے کے بعد اُس کے لیے یہ امر بالکل ناگوار ہو گیا کہ اس اقتدار اور حکومت میں اُس کا کوئی شریک بھی ہو۔ چاند بی بی کا معاملات ملکی سے علاحدہ کیا جانا اور اُس کو قید کر دینا اسی غرض سے تھا کہ وہ من مانے حکومت کرے اور کوئی اُس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی قسم کی کمی نہ کرنے پائے۔ چاند بی بی کی موجودگی اُسے اک خار کی طرح کھٹک رہی تھی کیونکہ جب تک وہ معاملات سلطنت میں حصہ لیتی رہی اُس کا اثر کشور خاں کی ساری اہمیت کو زائل کیے دے رہا تھا۔ اور بالعموم ایسا ہوتا تھا کہ آخری فیصلہ کشور خاں کا نہیں بلکہ چاند بی بی کا ہوتا۔ جب یہ صورت حال ہو تو تصادم لازمی تھا۔ جب یکبارگی یہ تصادم ہو گیا تو کشور خاں اس امر پر مجبور ہو گیا کہ سخت سے سخت طرز عمل اختیار کرے کیونکہ ادھوری سختی مکمل سختی سے کہیں زیادہ نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔ غرض کشور خاں کو

جب چاند بی بی سے خطرہ پیدا ہو گیا تو پہلے اُن لوگوں پر ہاتھ ڈالا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے اقتدار کو منوا سکتی تھی ان میں سے مصطفیٰ خاں سب سے زیادہ اہم تھا۔ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا دراصل ایک ہی پالیسی کی تکمیل کے دو مختلف زینے ہیں۔ اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ کشور خاں کی یہ پالیسی حفاظت خود اختیاری پر مبنی تھی تو پھر بھی اس کی یہ دو کاروائیاں اُس کے دامن شہرت پر دو زبردست داغ ہیں کہ جن کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا ملک کی اک سیاسی ضرورت تھی اور اُن کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک یہ طرزِ عمل ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی اس سے مفید نتائج برآمد ہو سکتے تھے اور بالآخر ملک اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا تو یقیناً کشور خاں کو ان حرکتوں کے لیے نہ صرف معاف کیا جا سکتا ہے بلکہ اُس کی تعریف بھی کی جا سکتی ہے۔ ہماری ہمدردی اُس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اس نیک اور بہتر طرزِ عمل کو پورا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دستِ اجل نے اُسے جھپٹ لیا۔ مگر جب حقیقت میں نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ایسی باعظمت اور ملک کی جاں نثار شخصیتوں کے ساتھ ایسا سلوک کسی طرح ملک کے لیے مفید نہ تھا بلکہ نہایت درجہ نقصان رساں۔ اگر بہی خواہان ریاست کا قید کیا جانا اور قتل کیا جانا ملکی اور سیاسی ضرورت ہے تو پھر ملک اور قوم کی ترقی معلوم۔ جب یہ واضح ہو جائے کہ کسی طرح اس طرزِ عمل سے ملک فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا تو پھر اُس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اپنے اقتدار کی حفاظت کی شکل پیدا کی جائے۔ اس طرح اُس کا یہ طرزِ عمل غرض آلود اور ذاتی منفعت پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو شخص محض ذاتی منفعت کی خاطر ایسے حرکات کرے جس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو وہ یقیناً اس قابل نہیں کہ تاریخ میں اُس کا نام روشن ہو۔ بلکہ وہ ہر زمانے میں ایک مطعون حیثیت رکھے گا۔ اگر کشور خاں کی نیت نیک تھی تو جب وہ ملک کو اپنے خلاف دیکھنے لگا تھا اور جب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ رائے عامہ اُس کے خلاف ہے، اُمراء اور سرداران فوج اُس سے بیزار ہیں اور وہ انصاف و وفاداری کا خون کیے بغیر عمدگی سے حکومت نہیں کر سکتا ہے تو اُسے چاہیئے تھا کہ اُسی وقت اپنے عہدۂ جلیلہ سے مستعفی ہو جاتا۔ لیکن چونکہ اُس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اُس کی ساری کارروائیاں حرص و آز کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُس کی سیاسیات کا مرکزی نقطہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا اقتدار قایم رہے خواہ اُس کے قایم رکھنے میں ملک اور قوم کا کتنا ہی زبردست نقصان کیوں نہ ہو۔ جس شخص کا یہ نقطۂ نظر ہو وہ کسی طرح تعریف کا مستحق نہیں اور کسی حال اُس کو اُس کے ان افعال پر معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کشور خاں میں متذکرۂ بالا کمزوریاں نہ ہوتیں تو ملک کو اُس سے بہت کچھ فائدہ پہنچتا کیونکہ کیا باعتبار بہادری اور کیا باعتبار حسن انتظام وہ

اپنے زمانے کا بہترین آدمی تھا جس وقت ملک کے انتظامات اُس کے ہاتھ میں آئے ہیں ملک بیرونی حملوں اور اندرونی پریشانیوں سے سخت الجھن میں تھا لیکن کشور خاں نے بیرونی حملوں کی مدافعت کا نہایت خوبی سے انتظام کیا اور ایک جرار فوج بہادر اور کاردان سپہ سالاروں کے ماتحت ان حملوں کی روک تھام کے لیے روانہ کی اور اُس کی یہ کوششیں نہایت کامیاب رہیں کہ دشمنوں کو اُس کے دور کی حد تک زیادہ دست درازیوں کا موقع نہیں ملا۔

خوبیٔ انتظام کے لیے کشور خاں کو جتنا سراہا جائے بجا ہے مگر بعد کی کارروائیوں سے اُمرا اُس سے بالکل بدظن ہو گئے اور بالآخر وہی لوگ اُس کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوئے۔

متولیانِ ریاست

باب پنجم

اخلاص خاں

اخلاص خاں کا منصب وکالت پر فائز ہونا۔

جب کشور خاں کی فراری کی خبر اخلاص خاں اور دیگر حبشیوں کو ہوئی تو وہ نہایت خاطرجمعی کے ساتھ شہر بیجاپور میں داخل ہوئے اور بادشاہ کے حضور میں بغرض سلام حاضر ہوئے اور اُن میں سے ہر ایک خلعت فاخرہ اور مناصب عالیہ سے سرفراز کیا گیا۔ اخلاص خاں قدرتی طور پر منصب وکالت پر فائز ہو گیا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ کشور خاں کے زمانے میں اُس کے عزیز، متعلقین اور اُس کے خاص لوگ جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے تھے انھیں اب دائرۂ ملازمت سے خارج کر دینا چاہیئے تاکہ نظم و نسق حکومت کی بُرائی دور ہو جائے۔ بادشاہ نے باوجود اپنی کم عمری کے یہ جواب دیا کہ جو کچھ کرنا ہو رفیع الدین شیرازی کی رائے سے کیا جائے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے اس مقرب پر کتنا زبردست اعتماد تھا) اور ہمیشہ مصلحت وقت کو پیش نظر رکھا جائے۔ اُسی روز ایک فرمان شاہی کے ذریعے چاند بی بی کو قلعہ ستارہ سے بصد شان و شوکت دوبارہ بیجاپور کو بُلا لیا گیا۔ جب چاند بی بی بیجاپور آئیں تو حسب سابق اخلاص خاں نے بادشاہ کی محافظت اور تربیت کا کام اُن کے سپرد کر دیا۔ اس طرح ان ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر اخلاص خاں نے عام ملکی انتظام کی طرف توجہ کی۔

شاہی مُہر

عموماً جو ریجنٹ یا وکیل السلطنت ہوتا اُس کے پاس شاہی مُہر رہا کرتی تھی اس لحاظ سے کہ وہ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار اور بادشاہ کا نائب ہوتا ہے۔ یہی شاہی مُہر دراصل اُس کے اقتدار کی جان ہوا کرتی تھی جب کشور خاں بیجاپور سے بھاگا ہے تو اُس نے اپنے ساتھ وہ شاہی مُہر بھی رکھ لی تھی جو کہ اُس کے اقتدار کے زمانے میں اسے بادشاہ کی جانب سے سپرد کی گئی تھی۔ اب بغیر شاہی مُہر کے کاروبار سلطنت انجام پانے دشوار تھے۔ اخلاص خاں کو اس کی بڑی تشویش تھی کہ کیا کیا جائے۔ رفیع الدین شیرازی سے رائے لی گئی۔ رفیع الدین نے ایک دوسری مُہر پیش کی جو علی عادل شاہ کے ہمیشہ زیب انگشت رہا کرتی تھی۔ اور جس سے کبھی کبھی بادشاہ کاروبار سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں کام لیتا تھا۔ یہ مُہر نہایت قیمتی تھی جو عقیق یمنی سے بنائی

گئی تھی اس پر "اسد اللہ الغالب ابن ابی طالب" کندہ تھا علی عادل شاہ کے قتل کے وقت یہ اُس کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد سے یہ بحفاظت تمام خزانۂ عامرہ میں رکھدی گئی تھی۔ اب جبکہ اصلی مُہر غائب تھی تو کام چلانے کی غرض سے رفیع الدین نے اس کو پیش کر دیا اور اس مُہر سے اُس وقت تک کام لیا گیا جب تک کہ اصلی مُہر کشور خاں کے گولکنڈہ میں مارے جانے کے بعد بیجاپور نہ آگئی (جب کشور خاں مارا گیا تو اُس کا ایک خاص غلام اس مُہر کو لیکر بیجاپور چلا آیا)۔

اخلاص خاں کی کشور خاں کے اہل و عیال کے ساتھ بدسلوکیاں

ان انتظامات کے بعد اخلاص خاں روزانہ حضور شاہی میں آتا اور معاملات ریاست کو انجام دیتا تھا پُرانے عہدہ داروں کو جو کشور خاں کے ماموره تھے عہدوں اور خدمات سے ہٹا دیا گیا اور اُن کی جگہ پر اپنے معتمدین کو فائز کرنے لگا حبشی غلاموں، اپنے ہواخواہوں اور اپنے ساتھیوں میں تمام مناصب عالیہ تقسیم کر دیئے۔ اور اپنے آپ کو روز بروز طاقتور کرنے لگا بقول بساتین السلاطین کے چونکہ یہ شخص "فطرتاً مرد غیور امتند مزاج و بدخو و بدنفس بود شروع در آزار متعلقان کشور خاں نمود" اُس نے اب دست ستم ایسا دراز کیا کہ جس کو بھی ذرا کچھ تعلق کشور خاں سے رہا ہو وہ گویا اُس کی ستم آرائیوں کے لیے وقف ہو گیا تھا چنانچہ یاقوت نامی کشور خاں کا ایک حبشی غلام تھا جس کو اُس نے بہت کچھ ترقی دی تھی اور بادشاہ کے حضور میں تک اُسے پہنچا دیا تھا اخلاص خاں کے حکم سے اس کو قتل کر دیا گیا اور وہ بھی اس بُرے طریقے سے کہ اُس کو پارہ پارہ کیا گیا اور ہر ایک پارے کو شہر کے مختلف دروازوں پر لٹکانے کا حکم دیا گیا۔ یاقوت کا قصور محض یہ تھا کہ وہ کشور خاں کا غلام تھا اگر اس کی طرف سے اخلاص خاں کو کچھ خوف یا اندیشہ تھا تو اُسے اُس کے عہدے سے معزول کر دینا یا زیادہ سے زیادہ اُسے نظربند کر دینا بہت کافی تھا مگر اس طرح اُسے بیدردی سے قتل کرنا اور جانوروں کی طرح اسے ذبح کرکے پارہ پارہ کرنا اخلاص خاں کی خونخواری اور اُس کی بربریت پر دال ہے اُس کا دست ظلم و ستم یہیں تک دراز ہو کر نہیں رہ گیا۔ غلام کا قتل کیا جانا تو ایک معمولی بات تھی، اس سے بڑھ کر اس نے یہ کیا کہ کشور خاں کی عورتوں، بچوں اور عزیزوں پر ظلم و ستم توڑنے شروع کیے، اور ظلم بھی ایسا کہ جس کے سُننے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں کشور خاں نے بھی بُرائیاں کی تھیں، مگر اس نے اپنے عہد حکومت میں جو کچھ کیا اسے محض سیاسی نقطۂ نظر سے بُرا کہا جا سکتا ہے اور اُس بُرائی کی اُس نے سزا بھی پائی، کہ بالآخر بیجاپور چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوا اگر کسی طرح اُس نے بادشاہ اور مملکت کا قصور کیا تھا تو اُس کی اُس نے کافی سزا بھی بھگت لی تھی۔ ایک سیاسی مجرم کو اُس کے جُرم کی پاداش میں یقیناً سزا دی جا سکتی ہے اور دیجانی چاہیئے، مگر اُس کے سیاسی جرائم کی بنا پر اُس کے بیگناہ معصوم بچوں اور عورتوں کو سزا دینا اور اُن پر مظالم ڈھانا

انصاف سے بعید ہے۔ کوئی دنیا کا قانون ایسا نہیں جو ایک ایسے قابل نفریں فعل کی اجازت دے۔ اب اخلاص نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ نرالا تھا۔ اُس کے ان ظالمانہ افعال سے کشور خاں کے ساتھ ذاتی مخاصمت کی بُو آتی ہے۔ اور اُس کی ان بیدردیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس نے تہیّہ کرلیا کہ کشور خاں کے اہل و عیال کو یا تو قتل کر ڈالے یا اُن کو انتہائی عزت ریزی کے ساتھ کناسوں اور چرم دوزوں کے حوالے کردے۔ بھلا ان گھر کی بیٹھنے والی شریف بیبیوں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ مگر وہ کشور خاں پر اتنا جلا بیٹھا تھا کہ غصّے میں اُسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا اور مصمم ارادہ کرچکا تھا کہ کشور خاں کے خاندان کی اس طرح عزت ریزی کی جائے! اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اُس نے یہ احکامات بھی صادر کردیئے تھے کہ کناسوں اور چرم دوزوں کو حاضر کیا جائے اور کشور خاں کے اہل و عیال بھی اُس کے حضور میں پیش ہوں۔

رفیع الدین کی کوششیں اس وقت اخلاص خاں کی قوت اور اُس کا اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے مقابل میں چوں چرا بھی کرسکے۔

اخلاص خاں کے ہاتھ میں اس وقت قوت و اقتدار نہ تھا بلکہ ایک ظالم و خونخوار کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار تھی آدمی کم ظرف معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کا دماغ پھر گیا اور اچھے بُرے کی تمیز مطلق نہ رہی۔ دولت و حشمت، طاقت و قوت کا نشہ اُسے ایسا چڑھا کہ وہ بالکل بدمست ہوگیا اور اسی بدمستی کے عالم میں وہ مظالم پر اُتر آیا۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس بھوکے شیر اور اُس کے بیگناہ شکار کے درمیان حائل ہو۔ یوں تو کہنے کو اس وقت بھی بڑے بڑے اُمرا اور ذی مرتبت سردار موجود تھے مگر کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اخلاص خاں کو اس مذموم فعل سے باز رکھتا۔ یہ یقیناً رفیع الدین شیرازی کی عدیم المثال شخصیت اور اُس کے غیر معمولی اثرات پر دال ہے کہ اُس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس امر کی حتی الامکان کوشش کی کہ کشور خاں کے اہل و عیال کو اس ظلم ناروا سے محفوظ رکھے۔ اور پھر یہ اس وجہ سے نہیں کہ کشور خاں اور رفیع الدین شیرازی میں کوئی بہت گاڑھی دوستی تھی، بلکہ اس کے برخلاف سیاسی نقطۂ نظر سے دونوں اپنے زمانے میں ایک دوسرے کے مدمقابل اور حریف رہے جس وقت اخلاص خاں کے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا اور باقی تمام اُمرا مُہر بہ لب تھے، رفیع الدین نے ان بیکس اور بے یار و مددگار عورتوں اور بچوں کی حمایت میں اپنا مُنہ کھولا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر کسی طرح گنہگار و قصوروار تھا تو وہ کشور خاں، اسکے اہل و عیال تو بالکل بے گناہ ہیں۔ اور شریفوں کو اس طرح ذلیل و رسُوا کرنا ناروا و نازیبا ہے۔ اس کے جواب میں اخلاص خاں نے

کہا کہ کشور خاں حرام خوار اور غدار تھا اور اُس کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کرنا چاہیئے۔ غرض اپنی کج بحثی سے اسی پہ اڑا رہا کہ کشور خاں کے اہل و عیال کی بے حرمتی کی جائے۔ رفیع الدین شیرازی نے بھتیرا سمجھایا، منایا اور غیرت دلائی، طعن و تشنیع کیئے مگر وہ بھلا کیا ماننے والا تھا۔ برابر اپنی ہٹ پہ قایم رہا، اور خفیہ طور پر احکام دیئے کہ دوسرے دن علی الصباح کشور خاں کے اہل و عیال کو حاضر کیا جائے اور کناسوں اور چماروں کو بھی۔ تاکہ اُن کو ان رذیلوں کے حوالے کر دیا جائے اور کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکے۔

مگر رفیع الدین شیرازی تو اس کی جستجو ہی میں تھا، اُس کو خبر لگ گئی کہ اخلاص خاں نے ایسے احکام دیئے ہیں۔ یہ سُننا ہی تھا کہ دوسرے دن خود اخلاص خاں سے بھی پہلے دربار میں آکر جم گیا۔ اس طرح اخلاص خاں کی خفیہ کارروائی میں کھنڈت ڈال دی۔ اخلاص خاں یہ دیکھ کر بہت بگڑا، چیں بجبیں ہوا لیکن کہہ کیا سکتا تھا خاموش رہا۔ پھر رفیع الدین نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کی کہ کسی صورت اخلاص خاں کو اپنا ہمخیال بنا لیا جائے۔ بالآخر اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی نوبت نہ آسکی کہ اس ذلت کے ساتھ ان پردہ نشین عورتوں کی رُسوائی کی جائے اور معصوم بچوں کو چماروں اور کناسوں کے حوالے کیا جائے۔ عزت و توقیر کے ساتھ یہ عورتیں اپنے گھر روانہ کر دی گئیں البتہ چند کنیزوں اور لونڈیوں کو بڑی بی صاحبہ کی (والدہ ابراہیم عادل شاہ) خدمت کے لیئے بھیجدیا گیا۔ اس طرح محض رفیع الدین شیرازی کی کوششوں سے کشور خاں کا خاندان تباہی و بربادی اور رُسوائی سے محفوظ رہا۔ ورنہ اس خونخوار کے ہاتھ میں پھنسنے کے بعد ان کی کوئی خیر نہ تھی۔

جس طرح رفیع الدین شیرازی نے ان بےکس عورتوں اور بچوں کی حمایت کی تھی اسی طرح اُسی کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ بہجن خاں (جو کشور خاں کا بیٹا تھا) اندھا نہ کیا جائے، اور اخلاص خاں کے احکام منسوخ کرا دیئے گئے جو اُس کے اندھے کیئے جانے کی بابت جاری کیئے گئے تھے۔

یہ واقعہ اگر ایک طرف اخلاص خاں کی بدطینتی، خونخواری، وحشیانہ پن اور بربریت کی دلیل ہے تو دوسری طرف رفیع الدین شیرازی کی اعلیٰ شخصیت کو ظاہر کرتا ہے کہ ایسے پُرآشوب زمانے میں بھی جبکہ خود غرضی، احسان فراموشی اور دوست کُشی اک معمولی اور ادنیٰ چیز ہو، ایسے اعلیٰ اور نیک طبیعت والے لوگ بھی موجود تھے! اور ساتھ ہی اسی سلسلے میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیئے کہ دراصل ان ظالمانہ افعال سے اخلاص خاں اپنی قوت و اقتدار کی جڑوں پر خود اپنے ہاتھوں

کاری ضرب لگا رہا تھا۔

امین خاں کا خط اسی زمانے میں امین خاں کے پاس سے ایک خط بنام کشور خاں آیا جس میں یہ درج تھا کہ "میں نے بنکاپور کی کارروائی تو ختم کر دی ہے اس کے بعد بلگاؤں اور پناله کی طرف توجہ کی جائے گی"۔ یہ امین خاں وہی شخص ہے جس کا اصلی نام عبدالمومن مغل زادہ تھا اور جسے کشور خاں نے امین خاں کا خطاب دیا تھا اور جاگیریں عطا کی تھیں اور اس طرح سرفراز کرنے کے بعد حکم دیا تھا کہ وہ مصطفیٰ خاں کے قتل کے لیے بنکاپور روانہ ہو (اس کا تفصیلی ذکر کشور خاں کے عہد حکومت کے سلسلے میں کر دیا گیا ہے) امین خاں اپنی کارروائیوں میں اتنا مشغول اور ایسا منہمک رہا کہ اسے بیجاپور کی حالت کی اصلا خبر نہ تھی اُس کو یہ معلوم ہی نہیں کہ بیجاپور کے زمین و آسمان ہی بدل گئے ہیں اسی خیال سے کہ ابتک وہاں کشور خاں ہی برسر اقتدار ہے اُس نے یہ خط اُس کے نام روانہ کیا تھا مگر وہ پہنچا اخلاص خاں کو۔ خط کے پڑھنے سے تو کچھ بھی اخلاص خاں کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ یہ ساری کارروائی راز کی تھی امین خاں اور کشور خاں کے سوائے اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ رفیع الدین شیرازی نے بالآخر قیاساً اخلاص خاں کو یہ سمجھایا کہ بنکاپور کی کارروائی سے مراد غالباً مصطفیٰ خاں کا قتل ہے اُس کے بعد بلگاؤں جانے کا بظاہر مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالحسن پسر شاہ طاہر اور اُن کے بھائی رفیع الدین حسین کو قتل کرے جو اُس وقت بلگاؤں یا مصطفیٰ آباد میں مقیم تھے اُس کے بعد پناله پہنچ کر مرتضیٰ خاں اور اُس کے بھائی شاہ قاسم کو ختم کر دے۔ یہ لوگ جیسا کہ یاد ہوگا کشور خاں کے اقتدار کے زمانے میں جلاوطن کر دیئے گئے تھے اور انھوں نے یہاں آکر پناہ لی تھی۔ چونکہ کشور خاں کی پالیسی یہ تھی کہ اپنے استحکام کے لیے اپنے فریق مخالف کے تمام سرگروہوں کو قتل کر ڈالے اس لیے اُس نے امین خاں کو روانہ کیا تھا کہ وہ اُس کے دشمنوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کر دے مگر دشمنوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ختم ہو چکا تھا اور ادھر امین خاں نے مصطفیٰ خاں کے قتل کے بعد یہ خط کشور خاں کو بغرض اطلاع روانہ کیا تھا کہ ایک زبردست حریف کا تو خاتمہ ہو چکا ہے اور اب بقیہ بھی قریب میں ہی ختم کر دیئے جائیں گے۔ اخلاص خاں جب ان حالات سے آگاہ ہوا تو اُسے فکر ہوئی کہ کسی طرح ان بے گناہ امیروں کو امین خاں کے چنگل سے بچانا چاہیئے ابھی وہ ان انتظامات میں مشغول ہی تھا کہ متعاقب ایک اور خبر آئی جس سے معلوم ہوا کہ امین خاں خداوند خاں کے ہاتھوں بلگاؤں اور پناله کی راہ میں قتل کر دیا گیا۔ خداوند خاں بیجاپوری فوج کا ایک سردار تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ امین خاں نے دھوکے سے مصطفیٰ خاں کو قتل کر دیا ہے تو اُس نے وہیں اس موذی احسان فراموش

بدبخت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد اخلاص خاں نے ان جلاوطن امیروں کی واپسی کے احکام صادر کر دیے اور انھیں بیجاپور طلب کر لیا۔ ابوالحسن رفیع الدین حسین بلگاؤں سے شاہ قاسم اور مرتضیٰ خاں آنجو پنالہ سے بیجاپور واپس آ گئے۔

افضل خاں کا قتل اور رفیع الدین شیرازی کا محبوس ہونا

اخلاص خاں اپنے ذاتی استحکام کے لیے بڑے سے بڑے آدمی کی قربانی کو ایک معمولی چیز سمجھتا تھا۔ جتنے اب تک وکیل السلطنت ہوئے ہیں اُن کا یہ اصول رہا کہ جن بڑے بڑے اُمراء کی جانب سے انھیں خطرہ یا اندیشہ ہوا کرتا تھا وہ انھیں برابر صاف کرتے چلے آ رہے تھے چنانچہ کشور خاں نے مصطفیٰ خاں کو جو قتل کروایا اور چاند بی بی کو جو مقید کیا وہ اسی اصول پر مبنی تھا کہ کوئی دوسرا شخص اُس کی طاقت اور اقتدار کو گزند نہ پہنچا سکے! اور کوئی مخالف نہ ہو۔ اگر حکومت میں کوئی مخالف رہے تو کسی نہ کسی روز اُس کی طرف سے خدشہ لگا رہتا ہے۔ لہٰذا اُس کی سب سے آسان تدبیر یہی ہے کہ کسی مخالف کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اب اخلاص خاں بھی اسی اصول پر کاربند تھا جب ابتدائی انتظامات سے اُسے فرصت ملی تو وہ اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جن کی جانب سے اُسے خطرہ تھا۔ سب سے پہلے افضل خاں کی طرف وہ متوجہ ہوا۔ یہ شخص کوئی معمولی شخصیت کا آدمی نہ تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے کہ علی عادل شاہ کے زمانے میں وزارت کی تھی اور بادشاہ کا چہیتا رہا تھا! اور پھر فوج پر بھی اُس کا کافی اقتدار تھا اُس نے کشور خاں کے زمانے میں سرلشکر کی حیثیت سے قطب شاہی اور نظام شاہی حملوں کی کامیابی کے ساتھ روک تھام کی تھی اور پھر ملک میں ہر دلعزیز بھی تھا۔ بادشاہ کا خاص معتمد علیہ تھا اور چاند بی بی کی بھی نظر عنایت اُس کی طرف مبذول رہتی تھی اور اُسے وہ ایک وفادار اور جاں نثار خادم تصور کرتی تھی۔ اخلاص خاں چاند بی بی کی جانب سے بھی کھٹکا ہوا تھا اور اُسکی طرف سے غیر ملکی فریق کی طرفداری اُسے بہت بری معلوم ہوتی تھی اور اس وقت غیر ملکی فریق کا سب سے بڑا رہبر اور لیڈر یہی افضل خاں تھا۔ لہٰذا جیسے کشور خاں کے اقتدار کے زمانے میں مصطفیٰ خاں کا وجود اُس کے لیے سخت تکلیف دہ اور خطرناک تھا اسی طرح اخلاص خاں کو افضل خاں سے اندیشہ تھا۔ اخلاص خاں اب اس فکر میں ہوا کہ کسی طرح اس شخص کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُسکو یہ چیز خطرے سے خالی نہ معلوم ہوتی تھی کہ افضل خاں جیسی شخصیت کا آدمی حکومت میں شریک ہو جس وقت اخلاص خاں وکیل السلطنت ہوا تھا تو چاند بی بی کی رائے سے افضل خاں کو پیشوا بنا یا گیا تھا اور ایک برہمن راسو پنڈت نامی شخص کو جو افضل خاں کا بڑا دوست تھا اور سلطنت کا ایک معتبر آدمی تھا مستوفی الممالک کی خدمت دی گئی تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر افضل خاں کی شخصیت اخلاص خاں کے لیے بڑی خطرناک تھی۔ اس بنا پر اُس نے تہیہ کر لیا کہ افضل خاں کو

کسی طرح ختم کر دے۔ جب ایکبارگی اس نے قتل کی ٹھان لی تو پھر اس کے لیے یہ کام کچھ مشکل نہ تھا۔ وکیل السلطنت تو تھا ہی کسی نہ کسی بہانے اس نے بادشاہ کی دستخط افضل خاں کے قتل کے فرمان پر لے لی۔ ایک دو روز کی قید کے بعد افضل خاں بحکم اخلاص خاں قتل کر دیا گیا۔ چونکہ رفیع الدین شیرازی اس کا چچازاد بھائی تھا اور دربار کے بڑے مقربین میں سے بھی تھا اس لیے اس کے قتل کی بھی تدبیر کی گئی مگر چونکہ یہ کوئی صاحب فوج نہ تھا اور نہ اہل سیف بلکہ محض اہل قلم اور درباری تھا اس کے قتل کو ایسی زیادہ اہمیت نہ دی گئی، اور فی الحال اسے محض قید کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ بعض سربرآوردہ اُمراء کی سفارش سے غنیمت ہوا کہ اس غریب کے گلے پر بھی افضل خاں کی طرح چھری نہ پھیری گئی! اور یہ آئی ہوئی بلا محض چند روزہ قید پر ٹل گئی۔ رفیع الدین پر تو خیر گزری مگر راسو پنڈت جو مستوفی الممالک کے عہدے پر فائز تھا افضل خاں کی دوستی کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔

افضل خاں کی موت جیسی بیکسی کی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ برابر ایک رات اور ایک دن تک اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی! اس بے سروسامانی کی موت کی وجہ یہ تھی کہ یہ سیاسی وجوہات کی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔ جب کسی بڑے آدمی پر آفت آتی ہے تو قدرتی طور پر اس کے ساتھ اس کے عزیز و اقارب اور متعلقین بھی پس جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ افضل خاں مارا گیا، رفیع الدین قید رہا۔ بساتین کے الفاظ کے مطابق "خویشاں و اقارب بعضے در حبس بودند و بعضے مختفی"[1] جب ہر شخص منہ چھپائے بیٹھا ہو بھلا افضل خاں کی لاش کون دفناتا! ایک روز کے بعد فتح اللہ شیرازی نے مع اپنے شاگردوں کے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ جس شخص کی موت اس بے سروسامانی سے ہوئی ہو اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ اس کا حال جاننا چاہیئے۔ چونکہ افضل خاں بیجاپور کے بڑے لوگوں میں سے گزرا ہے اس لیے اس مقام پر اس کے حالات کا دیا جانا کچھ غیر مناسب نہ ہوگا۔

افضل خاں کے حالات اور کیرکٹر | جس طرح کشور خاں کے زمانے میں مصطفیٰ خاں کا قتل اک اہم سیاسی واقعہ ہے اسی طرح اخلاص خاں کے دور میں افضل خاں کا قتل وہی حیثیت اور وہی اہمیت رکھتا ہے۔ افضل خاں ایرانی النسل تھا، اس کے باپ کا انتقال اس وقت ہوا جبکہ اس کی عمر آٹھ سال تھی، اچھے معزز گھرانے سے اس کا تعلق تھا اس لیے باپ کے انتقال کے

[1] بساتین السلاطین۔

کسی اپنے آدمی کو مقرر کیا جائے۔ تاکہ اقتدار قطعی طور پر اُن کے ہاتھ میں رہے۔ مگر اس وقت دوسرے اُمراء بھی موجود تھے جو چاہتے تھے کہ ان کے فریق کا آدمی پیشوا ہو۔ چنانچہ شاہ ابوالحسن و مرتضیٰ خاں آنجو ایک طرف اس عہدے کے دعویدار تھے تو دوسری طرف دکنی فریق کی کوشش تھی کہ عین الملک کو یہ عہدہ دیا جائے۔

غرض اس طریقے سے یہ ایک نئی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ خدمت ایک تھی اور دعویدار تین۔ (۱) ایک تو خود حبشی غلام (۲) عین الملک اور اُس کا فریق (۳) ابوالحسن و مرتضیٰ خاں آنجو کا فریق (یہ وہی لوگ ہیں جنھیں اخلاص خاں نے شاہی فرمان کے ذریعے بلا لیا تھا) حبشیوں اور تیسرے فریق کی نسبت تو ہم کچھ نہ کچھ جانتے ہیں، مگر عین الملک کے متعلق بھی دو چار لفظ لکھ دینے چاہئیں۔ یہ وہی شخص ہے جس کا اس سے پہلے اُس مہم کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے جو کشور خاں نے بغرض مدافعت نلدرگ بھیجی تھی کہ نظام شاہی اور قطب شاہی حملے روکے جس میں افضل خاں بھی موجود تھا اور وہ اُمرائے حبش جن کے ہاتھ میں اس وقت حکومت کی باگ تھی کشور خاں کی طرف سے جب ایسے افعال کا ظہور ہوا جن سے اُس کی بدنیتی اور بددیانتی ظاہر ہو رہی تھی، ان سبھوں نے اتفاق کرکے اُس کی مخالفت کی ٹھانی تھی یہاں تک تو عین الملک نے باقی سب سرداران فوج کا ساتھ دیا تھا، مگر جب فوجیں بیجاپور کی راہ اختیار کیں اس غرض سے کہ کشور خاں کو معزول کریں، عین الملک نے ان سے جدائی اختیار کی اور اپنی فوجوں سمیت اپنی جاگیر چلدیا۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ دارالسلطنت کی اُلجھنوں میں پھنس کر خود بھی پریشان ہو، اس کے بعد سے برابر وہ اپنی جاگیر میں ہی مقیم رہا لیکن یہاں بیٹھے ہوئے برابر وہ اُن حالات کا معائنہ و مشاہدہ کر رہا تھا جو اس عرصے میں رونما ہو رہے تھے، چونکہ یہ بڑے اُمراء میں سے تھا اس لیے اُس کی کافی اہمیت تھی اس کے پاس کافی فوج تھی، اس لیے حبشی اُس سے کچھ گھبراتے تھے ایسی صورت میں جبکہ اور کچھ بن نہ پڑے وہ اس کے لیے تیار تھے کہ اُس سے اتحاد کرلیں اور پیشوائی کا عہدہ اُس کے سپرد کر دیں تاکہ دکنی فریق کو خوش کرنے کا موقع مل جائے۔ بساتین السلاطین اور برہان مآثر[1] کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تمام اُمراء میں زیادہ سربرآوردہ اور طاقتور تھا عین الملک چونکہ اس وقت غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اُس کی اہمیت کو حبشی نظرانداز کر سکتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُسکے پاس

---

[1] ملاحظہ ہو بساتین السلاطین و برہان مآثر۔

فوج تھی، روپیہ تھا اور طاقت تھی۔ یہ زمانہ تو ایسا تھا کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اس لیے عین الملک سے حبشیوں کو خدشہ تھا۔ مگر اس خدشہ کو دوستی اور محبت کے پیرایہ میں چھپا رکھا تھا۔ جب اُن کی کچھ اور نہ چل سکی تو انھوں نے عین الملک کو فرمان شاہی کے ذریعے اس کی جاگیر سے طلب کیا کہ اُسے پیشوائی کا عہدہ دیں۔ عین الملک بڑے کروفر، جاہ وحشم اور فوج اور سپاہیوں کے ساتھ بیجاپور آیا۔ اس کے استقبال کی غرض سے یہ تینوں حبشی اُمراء شہر سے باہر گئے۔ چونکہ محض استقبال کی غرض سے گئے تھے اس لیے اُن کے ساتھ کوئی فوج وغیرہ نہ تھی۔ عین الملک نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے اُن کو تنہا دیکھ کر فوراً گرفتار کرکے پابزنجیر کرلیا۔ چونکہ عین الملک نے اچانک یہ کارروائی اختیار کی تھی۔ حبشی نہایت بےبسی کے ساتھ اُس کے ہاتھ میں پھنس گئے۔ اس طرح عین الملک کی یہ کارروائی بالکل کامیاب رہی۔ اخلاص خاں، حمید خاں، دلاور خاں (سہراب خاں ترکی)[1] قید کرلیے گئے۔

پہلی نظر میں عین الملک کے اس فعل پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ جن لوگوں نے پیشوائی دینے کے لیے اُسے طلب کیا تھا اور پھر اُس کے استقبال کو گئے تھے اُلٹے اس نے انھی کو قید کرلیا۔ لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے تو یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ دراصل حبشیوں اور عین الملک میں کچھ دوستی اور اتحاد نہ تھا۔ بلکہ حبشیوں نے بظاہر دوستی پر جو کمر باندھی تھی وہ محض سیاسی اور مصلحتی دوستی تھی۔ چونکہ حبشیوں کو عین الملک کی غیر معمولی طاقت سے اندیشہ تھا اس لیے اُن کی خواہش یہ تھی کہ فی الحال کسی طرح اس طاقتور امیر کو راضی رکھا جائے اور اُس وقت تک اُسے غافل رکھیں جب تک کہ اُس کے مقابلے کی تاب اُن میں نہ پیدا ہو جائے اور جب یکبارگی اُن میں طاقت پیدا ہو جاتی اُس وقت وہ عین الملک کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو کہ اُس نے اُس وقت اُن کے ساتھ کیا۔ عین الملک گُرگ باراں دیدہ تھا بھلا ان حبشیوں کی اس پالیسی کو وہ نہ سمجھتا؟ وہ اُن کا اصلی مطلب تاڑ گیا۔ اب موقع اُس کے ہاتھ آگیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر اُس نے ان کو قید کرلیا۔ اس طرح اُس کی خواہش تھی کہ ان حبشیوں کو نکال باہر کرکے خود وکیل السلطنت کے عہدے پر قابض ہو جائے اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے اپنے لوگوں میں تقسیم کردے۔ اس پالیسی پر عمل کرکے اُس نے یہ حرکت کی تھی۔ جو حفاظت خود اختیاری پر مبنی تھی۔

[1] بساتین السلاطین۔

عین الملک کی بزدلی اور اُمرائے حبش کا نجات پانا

عین الملک نے اتنا کچھ کر لیا تھا کہ اگر اور تھوڑی ہمت کر لیتا تو گوہر مقصود اُس کے ہاتھ آ جاتا۔ اُس کی بعد کی حرکات سے اس نے خود کو سخت نا اہل، نالائق اور بزدل ثابت کر دیا۔ سب سے پہلی غلطی تو اُس نے یہی کی کہ اپنی کارروائی کو تیزی کے ساتھ ختم نہیں کیا۔ اُن حبشی اُمرا کے گرفتار ہونے کے بعد اُسے چاہیئے تھا کہ فوراً قلعے میں داخل ہو کر صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیتا۔ بخلاف اس کے اُس نے دو تین روز یونہی گزار دیئے۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد اُسے یہ یاد سوجھی کہ قلعے میں داخل ہونا چاہیئے۔ یہاں تک بھی ٹھیک ہی تھا۔ چنانچہ قیدیوں کو لیکر اپنی فوج کے ساتھ وہ قلعے میں داخل ہونے کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی اثنا میں جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوا کہ قلعہ دار نے جو ... سے ساز باز کر بیٹھا تھا، بعض حبشی غلاموں نے (جو اندرون قلعہ موجود تھے اور حبشی اُمرا کے قدرتی طور پر طرفدار تھے) قید کر لیا ہے اور قلعے کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ اس طرح عین الملک کا راستہ رک گیا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حبشی آمادۂ جنگ ہیں۔ عین الملک اس کے لیے تیار نہ تھا اور اُس کے ہوش و حواس اس خبر کے سنتے ہی گم ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ جم کر ان غلاموں کا مقابلہ کرتا، وہیں اپنے قیدیوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اسی اثنا میں ایک اور حبشی غلام مقصود خاں نامی یہاں آن پہنچا۔ جب دیکھا کہ عین الملک نے بدحواسی کے ساتھ فرار اختیار کی ہے اور اُس کے قیدی اُس سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن کی محافظت کا کوئی سامان نہیں تو فوراً

لہ حبشیوں کی گرفتاری اور اُن کی رہائی کے واقعات میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ اوپر کا بیان فرشتہ سے لیا گیا ہے۔ مگر برہان مآثر کے مصنف نے اس واقعے کو جدا طور پر قلمبند کیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ عین الملک نے حبشی امیروں کو دعوت دی اور دھوکے سے قید کر لیا۔ دوسرے دن وہ اسی فکر میں تھا کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر ابراہیم (بادشاہ) کو اپنے قبضے میں کر لے اور ملک السلاطین کا عہدہ پا لے اور ان حبشی امیروں کو کسی قلعے میں قید کر دے۔ چنانچہ وہ روانہ ہوا مگر راستے میں اسے خبر ملی کہ بادشاہ کے خلاف ... فوج اور کوتوال ... سے ساز باز کر لی ہے کہ جونہی عین الملک اپنے قیدیوں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو ... حبشی اُمرا کو چھڑا لیں اور عین الملک کو گرفتار کر لیں۔ اس جھوٹی خبر کے سنتے ہی وہ ایسا بدحواس ہوا کہ عین بازار میں اپنے قیدیوں کو چھوڑ کر اپنی جاگیر کو بھاگ گیا (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ، برہان مآثر، تحفۃ الملوک، بساتین السلاطین)۔

اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر انھیں چھڑا لیا۔ مقصود خاں کی وقت پر امداد کی بدولت محض اتفاقی طور پر ان حبشیوں کو عین الملک کے پنجے سے رہائی ملی اور اُنکی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ اُن کو حاصل ہو گئی۔

یہ پوری کارروائی عین الملک کی بیوقوفی، بزدلی اور اُس کی نااہلی پر دال ہے۔ ورنہ وہ اگر ذرا سمجھ سے کام لیتا تو پورے ملک کا اقتدار اُس کے ہاتھ میں آگیا ہوتا۔ عین الملک یہاں سے جو بھاگا تو پھر اُس نے اپنی جاگیر میں پہنچ کر پناہ لی ہے۔

اس طرح جو کارروائی کہ محض پیشوائی کے لیے شروع ہوئی تھی اُس کا یہ انجام ہوا۔ اسی کارروائی کی بدولت حبشیوں نے دراصل ہاتھ میں اپنا سارا اقتدار کھو دیا تھا مگر قدرت نے اُن کی ایسی مدد کی کہ وہ اپنے اس بڑے دشمن کے پنجے سے چھوٹ گئے۔ اس غیر متوقع نجات کے ملتے ہی پھر اُن کا اقتدار اُن کے ہاتھ میں آگیا۔ اور کہنا چاہیے کہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا کیونکہ اب اُن کا کوئی مخالف نہ رہا تھا۔ افضل خاں لوارک گھاٹ اتار دیا گیا۔ عین الملک جان بچا کر بھاگ گیا اور بقیہ رقیب مرتضیٰ خاں انجو اور شاہ قاسم جلا وطن کر دیا گیا۔ ان انتظامات کی وجہ سے حبشیوں کے اقتدار میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ ملک میں کوئی اُن کا مد مقابل نہ تھا۔ اور تمام سیاہ و سفید کے وہ مالک ہو چکے تھے۔ اخلاص خاں حسب سابق سب سے زیادہ تجربہ کار ہونے کے اعتبار سے وکیل السلطنت کے عہدے پر فائز رہا اور اُس کے دونوں ساتھی حمید خاں اور دلاور خاں حکومت میں اُس کے شریک رہے۔

خارجی مشکلات۔ بیرونی حملے۔ یہ کئی اور جگہ واضح کر دیا گیا ہے کہ گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور کی ریاستوں کے درمیان شروع ہی سے ایسی رقابتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ جہاں کسی ریاست کے اندرونی حالات میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ ان ریاستوں کے کان کھڑے ہوئے، اور موقعہ پاتے ہی اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پے در پے حملے کرنا شروع کر دیتے تھے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ متولیان ریاست کے جھگڑوں، نمکحرامیوں اور اُمراء کی کشمکش نے ریاست کو اندرونی طور پر پریشان کر رکھا تھا۔ ان حالات کا علم ہوتے ہی چاروں طرف سے بیجاپور پر حملے ہونے لگے جس کا ایک دلچسپ مظاہرہ ہم نے کشور خاں کے عہد اقتدار میں دیکھ لیا ہے۔ کشور خاں کا اندرونی طرز عمل خواہ کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو مگر اُس نے ان بیرونی حملوں کی روک تھام کا نہایت اچھا انتظام کیا تھا

ایک بڑی زبردست اور جرار فوج افضل خاں کی سپہ سالاری میں غنیم سے مقابلے کے لیے روانہ کی گئی۔ اس فوج نے ان حملوں کی بڑی اچھی روک تھام کی اور دشمن کو شکستیں بھی دی گئیں۔ افضل خاں تو چاہتا تھا کہ اور آگے بڑھ کر ان دشمنوں کا پوری پوری طرح خاتمہ کر دے مگر بیجاپور کے حالات سے باخبر ہو کر سرداران فوج نے دوسری تدابیر اختیار کیں یعنی بیجاپور واپس آ گئے۔ اس کے بعد کی تمام تفصیلات پچھلے صفحات میں بیان کر دی گئیں۔ کشور خاں فرار ہو گیا حبشی برسر اقتدار ہو گئے۔ اس کے بعد بھی کشمکشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ غرض ان اندرونی الجھنوں کی بنا پر بیرونی حالات سے قطعاً روگردانی کر لی گئی تھی۔ احمد نگر اور گولکنڈہ کی ریاستیں بھی کچھ تو اس فکر میں تھیں کہ دیکھیے بیجاپور کی حالت کیا رنگ لاتی ہے اور کچھ اپنی فوجوں کو ستا کر پھر سے حملے کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ اتنے عرصے میں غنیم کو تازہ دم ہونے کا کافی موقع مل گیا تھا اور ادھر بیجاپور کی حالت میں اور خرابی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر بیرونی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔[1]

شاہ درگ کا محاصرہ اور محمد آغا ترکمان کی وفاداری

پچھلے باب میں اس کا ذکر دیا گیا ہے کہ بیجاپوری فوج نے بہزاد الملک کو ایسی زبردست شکست دی کہ وہ سید مرتضیٰ امیر الامراء کی فوج سے ملحق ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اسی سلسلے میں نظام شاہیوں کو بیدر پر بھی ناکامی ہوئی۔ اب احمد نگریوں کو اس کی فکر تھی کہ اس دوہری شکست کا بیجاپوریوں سے بدلہ لے۔ اس غرض سے ایک زبردست فوج سید مرتضیٰ کی سرکردگی میں

[1] کشور خاں اور اخلاص خاں کے عہد حکومت میں جو بیرونی حملے ہوئے ہیں اُن کے متعلق اور خصوصیت کے ساتھ اُن کی ترتیب اور تفصیل میں مورخین نے بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ برہان مآثر، تاریخ قطب شاہی اور تاریخ فرشتہ میں اگر ان حالات کو پڑھا جائے تو انسان اختلافات کی زیادتی اور واقعات کی گنجلک کی بنا پر کھو جاتا ہے۔ فرشتے نے ان حملوں کی جو ترتیب و تفصیل دی ہے وہ ان تاریخوں سے ملتی نہیں۔ لیکن فرشتے کے بیان میں تسلسل اور صفائی ہے اس لیے اس کا بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ باقی دو تاریخوں میں (جن کا ذکر کیا گیا) بعض ایسے حملوں کی تفصیل اور واقعات دیئے گئے ہیں جن کا فرشتے میں پتہ نہیں۔ چونکہ ان اختلافات کو پوری پوری تفصیل کے ساتھ دینا ممکن نہیں، اور مضمون کو غیر ضروری طور پر طویل بنانا ہے

روانہ کی گئی۔ اس حملے کا اُس وقت سے اندیشہ تھا جبکہ بیجاپور پر کشور خاں حاوی تھا! وراسی لیے عادلشاہی فوج کشور خاں کو معزول کرنے کے لیے دارالسلطنت بیجاپور جانے سے پیچھے ہٹ رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین اسی اندرونی الجھن کے وقت سید مرتضیٰ بیجاپور پر حملہ کر دے (اس اندیشہ کو پچھلے باب میں ظاہر کر دیا گیا ہے) مگر غنیمت یہ ہوا کہ نظام شاہیوں نے تیزی سے کام نہیں لیا' اور اُس وقت بیجاپور پر حملہ آور ہوئے جبکہ اخلاص خاں اور دیگر حبشی اُمرا کشور خاں کو معزول کر کے برسرِ اقتدار آ چکے تھے۔ غرض سید مرتضیٰ ایک بڑے بھاری لشکر کے ساتھ بیجاپور کی طرف متوجہ ہوا' ادھر گولکنڈہ سے خود محمد قلی قطب شاہ مع فوجوں کے آن پہنچا کہ احمد نگری فوجوں سے ملحق ہو کر بیجاپور کے خلاف متحدہ کارروائی کرے۔ محمد قلی قطب شاہ کے خود بہ نفسِ نفیس آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ احمد نگر سے دوستی اور اتحاد کی جڑوں کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ دونوں فوجیں ملحق ہو گئیں تو یہ طے پایا کہ پہلے شولاپور اور شاہ درگ کو فتح کر کے مرتضیٰ نظام شاہ کے قبضے میں دیا جائے! ور اُس کے بعد گلبرگہ فتح کر کے محمد قلی قطب شاہ اپنے قبضے میں کر لے چنانچہ یہ دونوں فوجیں شاہ درگ پہنچیں اور اُس کا محاصرہ کر لیا گیا۔

(بسلسلۂ گزشتہ) اس لیے محض اہم اختلافات کی بابت فٹ نوٹ میں اشارہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ برہان مآثر سے واضح ہوتا ہے کہ ہزاد الملک کی شکست کے بعد عادل شاہی فوج نلدرگ میں قیام گزیں ہو گئی۔ ادھر سید مرتضیٰ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے نکلا' نلدرگ پر حملہ آور ہوا۔ اسی اثنا میں گولکنڈہ سے میر شاہ میر دس ہزار فوج کے ساتھ احمد نگری فوج کی امداد کی غرض سے نلدرگ آ گیا۔ نلدرگ پر متحدہ حملہ ہوا' عادل شاہیوں کو شکست ہوئی۔ مگر بعد میں حلیفوں نے یہ طے کیا کہ نلدرگ کو چھوڑ کر بیجاپور پر حملہ کر دیں۔ غرض بیجاپور کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس وقت حبشی اُمرا برسرِ اقتدار تھے۔ انھوں نے مدافعت کا سامان کیا۔ مگر جنگ میں اکثر بیجاپوریوں کو شکست ہوئی۔ اس محاصرے کے سلسلے میں کئی جنگیں ہوئیں (جن کا تاریخ فرشتہ میں ذکر نہیں ہے) اسی اثنا میں امیر زمبیل استر آبادی! ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے پہلے ان حلیفوں کی مدد کے لیے آن پہنچا۔ گو اس کا راستہ روکنے کے لیے حبشیوں نے مرزا نورالدین کو بھیجا مگر اس کا شبخون ناکام رہا۔ اس کو شکست ہوئی اور امیر زمبیل سید مرتضیٰ اور میر شاہ میر سے ملحق ہو گیا۔ اسی اثنا میں کشور خاں (سابق متولی بیجاپور) یہاں سے بھاگا تھا' احمد نگر میں پناہ گزیں ہو کر بادشاہ کا منظورِ نظر ہو گیا اور بادشاہ (مرتضیٰ نظام شاہ) نے اُسے بھی ایک فوج دی کہ وہ امیر الامرا سید مرتضیٰ کی مدد کو جائے چنانچہ

اس وقت یہاں پر آغا نرکمان ایک "غریب" قلعدار تھا۔ اگرچہ اس وقت پایۂ تخت کی حالت اتنی خراب تھی مگر باوجود اس کے اس شخص نے ایسی شجاعت اور مردانگی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے حق نمک ادا کر دیا۔ ایسی بہادری اور دلیری سے محاصرین کا مقابلہ کیا کہ غنیم کے بھی دانت کھٹے ہو گئے اور کسی طرح وہ زیر ہوتا ہی نظر نہ آتا تھا۔ ہر چند کوشش کی گئی، توپیں اڑائی گئیں، ضربزن اور منجنیقوں سے کام لیا گیا، حملے کیے گئے، دھاوے بولے گئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آغا نرکمان ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ آخر محاصرین بھی تنگ آ گئے۔ انھوں نے شاہ درگ حاصل کرنے کی ایک آسان ترکیب یہ نکالی کہ اُسے رشوت دے دلا کر کسی طرح راضی کر لیں۔ مگر اُس وفادار و جاں نثار نے اُن کی ان کوششوں اور پیشکشوں کو ٹھکرا دیا، اور فرشتہ کے الفاظ میں اُس نے جواب دیا کہ "صاحب ولی نعمت من اعتماد کردہ چنیں قلعہ سرحدی را بمن سپردہ است، اگر من خیانت ورزم در چنیں وقت ایں قلعہ را بہ شما بسپارم نزد خدا و خلق شرمندہ و مواخذ خواہم بود۔" اور اگر آج میں نے اپنے ولی نعمت سے بیوفائی کی تو کل کے روز سب سے پہلے آپ ہی لوگ مجھے طعنہ دیں گے، اور نفرت کرنے لگیں گے اس لیے یہ توقع نہ رکھیے کہ کسی حال میں اس قلعے کو آپ کے حوالے کر دوں گا خواہ اُس کی مدافعت میں مجھے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا کیوں نہ پڑے۔" (فرشتہ)۔

(بسلسلۂ گزشتہ) وہ بھی آیا (تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد قلعہ گولکنڈہ میں مارا گیا اور اُس وقت مر چکا تھا) غرض حلیفوں کی قوت بڑھ گئی اور بیجاپوریوں کی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ عین الملک جو اس وقت حبشی اُمرا سے ناراض ہو کر حلیفوں سے مل گیا تھا انھی حبشیوں کی درخواست پر اور یہ دیکھ کر کہ بیجاپور کی حالت نازک ہے پھر بیجاپوری فوج میں شامل ہو گیا (حالانکہ عین الملک اُس وقت بیجاپوری افواج سے ملحق ہوا ہے جبکہ ابوالحسن برسر اقتدار ہوا اور وہ بھی سید مرتضٰی کی کوششوں سے (فرشتہ) غرض اس صورت حال میں مقابلے ہوتے رہے جس میں اکثر عادل شاہیوں کو شکست ہوتی تھی۔ اس پر بیجاپوریوں نے ایک چال چلی اور سید مرتضٰی کو دھوکہ دیا کہ ہم ابوالحسن کو وکیل السلطنت بناتے ہیں، بشرطیکہ محاصرہ اٹھا دیا جائے اور ابراہیم قطب شاہ سے پیچھا چھڑایا جائے (ابراہیم قطب شاہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا اور وہ بیجاپور کے محاصرے کے وقت نہیں تھا) سید مرتضٰی راضی ہو گیا۔ مگر بعد میں قطب شاہیوں کے سپہ سالار میر شاہ میر کو اس اندرونی اتحاد کی خبر لگ گئی۔ اُس نے سید مرتضٰی کو

مختصر یہ کہ اس شخص نے بڑی مردانگی اور وفاداری کا ثبوت دیا کہ ایسی خود غرضی اور بیوفائی کے زمانے میں نمک کی لاج رکھی۔ جب کسی طرح شاہ درگ فتح ہوتا نظر نہ آیا تو محاصرہ کرنے والی فوجوں کی ہمتیں پست ہوگئیں محاصرہ کیئے ہوئے کوئی چار ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا، بہت سارے لوگ بڑے بڑے افسر اور سپاہی مارے گئے تھے اور پھر نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ محمد قلی قطب شاہ بیزار آچکا تھا اور شاہ میرزا (میر شاہ میر) اصفہانی کو بہت کچھ برا بھلا کہا کہ وہ زبردستی فتح کی امید دلا کر اسے وہاں کھینچ لایا۔

بیجاپور کی طرف روانگی اور بیجاپور کا محاصرہ۔

آخر کار احمد نگر اور گولکنڈہ کے جنرلوں نے بالاتفاق یہ تصفیہ کیا کہ ایک معمولی قلعے کے پیچھے اتنی سر کھپی کرنا حماقت ہے اس میں محنت بھی صرف ہو رہی ہے بے وجہ وقت ضائع ہو رہا ہے، اور کوئی حسب دلخواہ نتیجے کی توقع بھی نہیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بیجاپور میں جہاں مدافعت کرنے والا کوئی نہیں ہے اُمراء میں سخت اختلاف ہے اور باہمی فسادات کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسی صورت میں بیجاپور میں کامیابی بہت سہل اور آسان ہوگی۔ جب پایۂ تخت قبضے میں آجائے تو پھر دوسرے

(بسلسلۂ گزشتہ) لعنت ملامت کی اور پھر گولکنڈہ اور احمد نگری فوجوں کے درمیان اتحاد ہوگیا۔ ادھر بیجاپوری اُمراء نے جب دیکھا کہ ابوالحسن کو پیشوا بنانے سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو اُسے انھوں نے پھر قید کر دیا (حالانکہ یہ غلط ہے، وہ بیجاپور کے محاصرے تک برابر پیشوا رہا) حلیفوں نے بیجاپور کے محاصرے کو جاری رکھا اس وقت بیجاپور کی امداد کے لیے کچھ برگی (مرہٹے) فوجیں آگئیں جنھوں نے دشمن کو پریشان کرنا شروع کیا۔ جب یہ حالت ہوئی تو حلیفوں نے محاصرہ اٹھا دیا اور تمام ملک کو تاراج کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دوبارہ نلدرگ کی راہ لی۔ اس وقت ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو (۹۸۹ھ م ۱۵۸۱ء) (یہ سنہ غلط ہے ابراہیم کی قبر پر اُس کی وفات کا سنہ ۱۵۸۰ کندہ ہے اور فرشتے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے) نلدرگ کے اس محاصرے کے وقت محمد قلی قطب شاہ میر شاہ میر کے مشورے سے بہ نفس نفیس موقعۂ جنگ کی طرف توجہ کرتا ہے اس محاصرے کے وقت برہان مآثر کا مصنف وہی تفصیلات دیتا ہے جو فرشتے سے لیکر اوپر درج کیئے گئے جس میں آقا ترجمان (یا برہان مآثر کے مطابق وزیر الممالک) کی وفاداری اور مردانگی کا حال درج ہے۔ یہاں جب کچھ پیش نہ گئی تو پھر یہ طے پایا کہ بیجاپور کی طرف توجہ کرکے اُس کا محاصرہ

علاقوں کا ہاتھ آنا کون بڑی بات ہے۔ درخت کی جب پیڑ ہی کاٹ دی جائے تو شاخیں خود بخود نیچے آ رہیں گی۔
یہ تدبیر سب کو پسند آئی اس لیے ان فوجوں نے شاہ درگ کا محاصرہ اٹھا دیا اور بیجاپور کی راہ لی۔
اس وقت حلیفوں کے پاس تقریباً چالیس[1] ہزار کی زبردست فوج تھی۔ بیجاپور پہنچکر انھوں نے پایۂ تخت کا محاصرہ
کر لیا۔ بیجاپور کی اس وقت جو حالت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ اکثر اُمراء و سردار بد دل اور غلاموں کی حکومت سے

(بسلسلۂ گزشتہ) کر لینا چاہیئے۔ لہٰذا دونوں فوجیں روانہ ہوگئیں۔ دریائے بھیما تک آگے بڑھتے ہوئے چلے گئے اور یہاں پہنچکر قیام کیا' اور بیس روز تک پڑے رہے۔ آخر کار محمد قلی قطب شاہ اس جنگ سے بیزار ہو کر بیجاپور کے محاصرے کا ارادہ فسخ کر کے اپنے دار الخلافہ کو روانہ ہوگیا۔ محمد قلی کا جانا تھا کہ سید مرتضیٰ بھی اپنی فوجوں کو لیکر احمد نگر کی طرف چلدیا۔ اس طرح بیجاپور کا دوسرا محاصرہ نہ ہوا۔ البتہ چلتے وقت قطب شاہ نے اپنی تھوڑی فوج امیر زبیل استرآبادی کے تحت اور سید مرتضیٰ نے اپنی تھوڑی سی فوج بعض سرداروں کے تحت چھوڑ دی تھی کہ وہ سرحدی علاقوں کو فتح کریں۔ اس طریقے سے برہان مآثر کے مصنف نے فرشتے سے بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ سب سے بڑا اختلاف تو یہی کہ اس نے نلدرگ کے دو محاصروں کی تفصیل دی ہے۔ دوسرے محاصرے کا ذکر جو اُس نے کیا ہے اُس کی تصدیق فرشتے سے ہوتی ہے۔ مگر وہ فرشتے کے اعتبار سے پہلا محاصرہ ہے (جو اُمرائے حبش کے زمانے میں ہوا) اور ان دو محاصروں کے درمیان بیجاپور کے محاصرے کا حال دیا گیا ہے۔ حالانکہ بیجاپور کا محاصرہ باعتبار فرشتہ نلدرگ کے اس محاصرے کے بعد ہے جس میں کہ آغا ترکمان نے ایسی مردانگی اور جواں مردی دکھلائی لیکن برہان مآثر کا مصنف آغا ترکمان والے محاصرے کو بیجاپور کے محاصرے سے موخر بتاتا ہے' اور فرشتے کے اعتبار سے پہلے یہ محاصرہ ہوتا ہے اُس کے بعد بیجاپور کا۔ پھر اُس نے لکھا ہے کہ بیجاپور کے محاصرے کے وقت ابراہیم قطب شاہ زندہ تھا اور فوجوں کے ساتھ۔ حالانکہ اس محاصرے سے ایک سال پہلے ہی اس کا انتقال ہوچکا تھا' اور اُس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ بیجاپور کے حملے کے وقت اپنی فوجوں کے ساتھ تھا۔ جب بیجاپور سے محاصرہ اٹھ گیا تو پھر نلدرگ کی طرف حلیفوں نے توجہ نہیں کی لیکن سید علی ماثر ندرانی نے لکھا ہے کہ پھر نلدرگ کا محاصرہ ہوا جو غلط ہے۔ اس طریقے سے برہان مآثر کے بیانات میں گنجلک ہے' اسی لیے وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کے علاوہ ان حملوں' لڑائیوں کے سلسلے میں اور تفصیلات دی ہوئی ہیں جن کو بخوف طوالت نظرانداز کیا گیا (ان اختلافات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی' برہان مآثر' تاریخ فرشتہ' تحفۃ الملوک' بساتین السلاطین)۔ [1] تاریخ فرشتہ۔

ناراض، بادشاہ کم عمر و کمسن، حبشی برسرِ اقتدار، فوج پریشان ومنتشر، باہمی کشمکش وفساد کی بنا پر ایک امیر کو دوسرے پر اعتبار نہیں جو کچھ فوج قلعے کے اندر تھی وہ بالکل ناکافی۔ ان نازک وناگفتہ بہ حالات کے اندر احمد نگر اور گولکنڈہ کی فوجیں بیجاپور کا محاصرہ کر لیتی ہیں حبشیوں کو سوائے اس کے چارہ نہیں رہا کہ محصور ہو جائیں۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اُن کے پاس اس وقت دو تین ہزار فوج تھی۔[1] اتنی تو ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ مجبوراً قلعے کے اندر ہی رہ کر جنگ کی کچھ تیاریاں کرنے لگے۔ بہر حال مقابلے کے لیے کچھ انتظام کرنا ضروری تھا، لہٰذا انھوں نے آنکس خاں اور عین الملک کو بغرض امداد فرمان شاہی کے ذریعے طلب کیا۔ یہ لوگ آنے کو تو آ گئے مگر حبشیوں سے سخت مخالفت تھی اور اُن کے اقتدار کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی اُن پر ان لوگوں کو کوئی اعتماد و اعتبار بھی نہ تھا۔ اور پھر عین الملک سے حبشیوں کے جو تعلقات رہے ہیں اُن کو بیان کر دیا گیا ہے اور وہ مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ بھلا ایسی صورت میں ان دو فریقوں کے درمیان کیا اتحادِ عمل ہو سکتا تھا؟ ان وجوہات کی بنا پر آنکس خاں اور عین الملک نے اپنی فوجوں سمیت قلعۂ بیجاپور سے باہر ہی اپنا پڑاؤ ڈال دیا اور قلعے میں داخل ہونے سے احتراز کر رہے تھے۔ ان امیروں کے ساتھ تقریباً کوئی سات آٹھ ہزار فوج تھی۔[2] انھوں نے اپنا کیمپ اللہ پور کے دروازے کی جانب ڈال رکھا تھا۔ اسی اثنا میں حلیف افواج اور عادل شاہی فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اسی جنگ کے سلسلے میں عین الملک اور آنکس خاں کی فوجوں سے بھی دشمن کی جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ اس طریقے سے سلسلۂ جنگ عرصے تک جاری رہا۔ عموماً عادل شاہی فوج کو شکست کا منھ دیکھنا پڑتا تھا اور یہ ایک بالکل قدرتی امر بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف باہمی رنج و فساد، دشمنی اور رقابت کی وجہ سے اتحاد و اتفاق بالکل مفقود، دوسری طرف دو زبردست فوجیں اور وہ بھی متحد و متفق۔ جب صورت حال یہ ہو تو عادل شاہیوں کا شکست کھانا تعجب خیز امر ہوگا۔ اس پر مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ موسم بارش کا تھا جس کی وجہ سے عین محاصرے کے زمانے میں قلعے کی بیس گز دیوار گر گئی۔ محصورین کے دل بیٹھ گئے اور ادھر حملہ آوروں کو یقین ہو گیا کہ اب بیجاپور پر اُن کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] ۔ تاریخ فرشتہ۔

[2] ۔ حدیقۃ العالم۔

قبضہ ہونے میں کوئی بات باقی نہ تھی۔ عین الملک اور انکس خاں جو اب تک محض قلعے کے باہر پڑے ہوئے تھے بجائے اس کے کہ ایسے نازک وقت میں اپنے ملک اور بادشاہ کی خدمت کرنے کو اپنا فرض سمجھتے اُلٹے دشمنوں سے جاملے۔ اور انھوں نے اپنی اس حرکت سے انتہائی کوتاہی، غداری اور ملک فروشی کا ثبوت دیا۔ محض ذاتی مخاصمتوں کی بناء پر انھوں نے ملکی مفاد کو ٹھکرا دیا۔ جہاں یہ چیز ذاتی طور پر ان لوگوں کے کیرکٹر کی سخت کمزوری کو ظاہر کرتی ہے وہیں اس سے اس زمانے کی عام ذہنیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس میں کس قدر گندگی اور ناپاکی کے اثرات سرایت کر چکے تھے۔ ان بیجاپوری اُمراء کی اس غدارانہ حرکت سے بیجاپور کے دشمنوں کا اور بھی پلّہ بھاری ہوگیا اور اُسی نسبت سے بیجاپور کی طاقت میں انحطاط ہوا۔ غرض تھوڑے ہی عرصے میں حالات نے نہایت خطرناک صورت اختیار کرلی اور اب وہ دن دور نظر نہ آتا تھا کہ بیجاپور پر اُس کے دشمنوں کا قبضہ ہوجائے۔ احمدنگر کے جرنیلوں اور محمد قلی قطب شاہ نے اب تہیہ کرلیا کہ دوسرے روز صبح کو حملہ کرکے بیجاپور پر قبضہ کرلیں مگر اس کے بعد ہی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ تمام صورت حال بدل گئی۔

حبشیوں کی معزولی اور شاہ ابوالحسن کا برسراقتدار آنا

اگر حملہ کرنے کی تدبیر پر فوراً عمل کیا جاتا تو یقیناً وقت واحد میں ان حلیفوں کو کامیابی ہو جاتی۔ مگر اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے میں تساہل کیا گیا اور تساہل کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ یہ کہ احمدنگر کے فوجی سرداروں کے درمیان اتحاد نہ تھا۔ نظام شاہ نے یا زیادہ صحیح طور پر اُس کے پیشوا نے یہ بڑی غلطی کی تھی کہ دو ایسے سرداروں کو اس مہم پر روانہ کیا تھا جن میں سخت چشمک تھی۔ چونکہ دونوں پلّے کے لوگ تھے ان میں بنتی نہ تھی خصوصاً سید مرتضیٰ امیر الامرائے برار اس کو پسند نہ کرتا تھا کہ بہزاد الملک جیسے کم عمر، ناتجربہ کار نوجوان کو اُس پر فوقیت دی جائے، اور وہ سپہ سالار رہے[1]۔ اسی نااتفاقی کی بدولت کشور خاں کے زمانے میں بہزاد الملک کو ایسی فاش شکست ہوئی تھی۔ اب بھی یہی صورت حال پیدا ہوگئی۔ سید مرتضیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ حملہ کامیاب ہو[2] اور بہزاد الملک کی ناموری ہو۔ اس لیے اُس نے عین اُس وقت میں جبکہ بیجاپور

---

[1] تاریخ فرشتہ

[2] ؍؍ ؍؍

دشمنوں کا ایک لقمۂ تر بنا ہوا تھا حملہ کرنے میں تساہل کیا۔ بیجاپور کی حالت اس وقت ایسی نازک تھی اور مدافعتی انتظام اس قدر کمزور تھا کہ اگر معمولی حملہ بھی ہو جاتا تو شاید بیجاپوری مقابلے کی تاب نہ لاسکتے۔ مگر سید مرتضیٰ باوجود یہ جاننے کہ وہ ایک زرین اور نایاب موقع کھو رہا ہے اس معاملہ کو لیت ولعل میں ڈال دیا۔ اتنی فرصت تو محصورین کو ملنی ہی تھی انھوں نے فوراً اپنی مدافعت کا انتظام ٹھیک کرلیا۔ اس عرصے میں اُس دیوار کی بھی مرمت ہوگئی جو لوٹ گئی تھی اور کہیں نہ کہیں سے کچھ سپاہی اور کچھ فوج بھی فراہم کرلی گئی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوگئے کہ ان حملہ آوروں کا ترکی بہ ترکی جواب دیں۔

ادھر حملہ آور فوجوں نے تھوڑا سا تساہل کرکے موقع کو ہاتھ سے کھودیا اور اُس طرف حبشی اُمراء کو بھی کچھ عقل آگئی اور حالات کی نزاکت کا احساس پیدا ہوا۔ اور اُن کا جذبۂ وطن پرستی یکبارگی مشتعل ہوگیا۔ حبشیوں میں ہزار نقص اور ہزار برائیاں سہی مگر وہ ملک و مالک کے بڑے وفادار تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے شہر اور ریاست میں ایک ادھم مچادیتے تھے مگر فی الواقع وہ دشمن ریاست و بادشاہ نہ تھے۔ یوں آپس میں لڑنے کو کون نہیں لڑتا مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ملک فروشی پر آمادہ تھے یا حقیقی معنی میں سلطنت کی بربادی کے درپے تھے۔ بلکہ اس کے خلاف وہ وفاداری اور نمک حلالی کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے ہٹ پر اڑے رہنے سے اندیشہ ہے کہ بیجاپور قطب شاہیوں اور نظام شاہیوں کے قبضے میں چلا جائے اور خود ریاست خطرہ میں ہے تو اس فکر میں ہوئے کہ کسی طرح اس بلا کو ٹال دیا جائے خواہ اُس میں تھوڑا سا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سارا فساد اس لیے ہے کہ حکومت کی باگ اُن کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اکثر بڑے بڑے اُمرا جن کی اس وقت مدد ایک غیر معمولی چیز ثابت ہوگی محض اس لیے مدد کرنے سے جی چرا رہے ہیں کہ اُن کو حبشیوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ اگر وہ حکومت سے دست بردار ہو جائیں یا کم از کم کسی دوسرے شخص کو سب سے اعلیٰ عہدہ (وکیل السلطنت) پر فائز کردیں تو بہت سارے اُمرا اور سرداران فوج جو اس وقت دست کشیدہ بیٹھے ہیں بیجاپور کی مدد کو آپہنچیں گے۔ اس لیے ان حبشیوں نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ کم از کم تھوڑے عرصے کے لیے حکومتی معاملات سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس لیے وہ چاند بی بی کے حضور میں گئے اور یہ ظاہر کیا کہ ان کی حکومت کے کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ بیجاپور دشمنوں کا لقمۂ تر بنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ حکومت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ چاند بی بی جس کسی کو مناسب سمجھے ملک کے انتظام کے لیے مقرر کردے۔[1]

[1] تاریخ فرشتہ

چاند بی بی بھی ان کے جذبۂ وفاداری سے متاثر ہوئی، اور اُن کے اس ایثار کو بہ نظر استحسان دیکھا، اُن کی خطائیں معاف کر کے شاہ ابوالحسن کو جو شاہ طاہر کا بیٹا تھا انھی حبشیوں کی صلاح سے منصب امیر جملگی[1] پر سرفراز کیا۔ بادشاہ نے بھی رسم زمانہ کے مطابق ابوالحسن کو خلعت فاخرہ عطا کیا، اس طرح وزارت یا حکومت وقت میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اب حکومتی معاملات حبشیوں کی بجائے ابوالحسن کے ہاتھ میں آگئے۔ اگرچہ فرشتے نے یہ ظاہر کیا ہے کہ امیر جملگی کا عہدہ ابوالحسن کو دیا گیا مگر بعد کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محاصرے کے زمانے تک یہ بیجاپور میں مختار کُل تھا اور باقی سب عہدہ دار اس کے ماتحت تھے۔

حکومت میں تبدیلی ہونا ہی تھی کہ آن کی آن میں بیجاپور کی حالت بدل گئی جس سے ایک طرف ابوالحسن کی لیاقت اور اس کی ہردلعزیزی ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف حبشیوں سے ملک کی عام ناراضی۔ وہ تمام اُمرا اشراف و اعیان جو اب تک بد دل و ناراض ہو کر اپنے اپنے گھر بیٹھ چکے تھے فوراً ابوالحسن کی طلب پر اپنے وطن کی خدمت کے لیے حاضر ہوگئے۔ اور ساری نا اتفاقیاں اور دشمنیاں غائب ہوگئیں۔ اس طرح بیجاپور کی سیاسی حالت میں عظیم الشان فرق پیدا ہوگیا۔ کافی فوج جمع ہوگئی مزید کمک کی توقع تھی۔ عہدہ داران سلطنت اور اُمرائے عظام میں یکدلی اور یکجہتی پیدا ہوگئی۔ اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اب دشمن کو حوالی بیجاپور سے مار نکالیں گے شہر میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ گویا مُردہ جسم میں از سرنو جان آگئی۔ ابوالحسن نے سب سے پہلے اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اُس نے برکی اُمرا کو اپنی مدد کے لیے طلب کیا اور کرناٹک کو اپنے کارندے روانہ کیے کہ وہاں سے برکی فوج کو مہیا کر کے جلد کمک روانہ کریں۔

سید مرتضیٰ سے گفت و شنید بیجاپور کے محاصرے کا اٹھ جانا	ابوالحسن کا دوسرا اہم کام یہ تھا کہ اُس نے سید مرتضیٰ امیر الاُمرائے برار سے گفت و شنید شروع کی جو اس وقت احمد نگری فوج میں اک پایہ کا جنرل تھا۔ سید مرتضیٰ اور ابوالحسن کے

[1] یہاں پر فرشتے نے برہان مآثر سے جو اختلاف کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ سید علی لکھتا ہے کہ یہ محض حبشیوں کی چال تھی جو اُسے قید سے نکال کر اس عہدے پر فائز کیا۔ لیکن بعد میں نتائج حسب دلخواہ برآمد نہ ہونے کی وجہ سے پھر قید کر دیا۔ فرشتے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برابر محاصرے کے ختم ہونے تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اُمرائے برکی کو طلب کرنا فوج کی فراہمی فرشتے کے مطابق ابوالحسن کے کارنامے ہیں جو برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی میں اُمرائے حبش سے منسوب کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی و برہان مآثر۔

نہایت اچھے اور خوشگوار تعلقات تھے۔ سید مرتضیٰ کو شاہ ابوالحسن سے عزیزداری بھی تھی[1] اور چونکہ شاہ طاہر اُس کو بڑی عقیدت تھی اس لیے ابوالحسن کی بھی وہ عزت اور احترام کرتا تھا ان وجوہات کی بنا پر ان دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی اسی دوستی کی بنا پر شاہ ابوالحسن نے سید مرتضیٰ سے نامہ و پیام شروع کیا اُس سے درخواست کی کہ کسی طرح کوشش کر کے قطب شاہ کو راضی کرلے اور بیجاپور کا محاصرہ اٹھادے۔ سید مرتضیٰ ایک تو اُس دوستی اور عقیدت کی بنا پر جو اسے ابوالحسن سے تھی اور نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ اس مہم کی کامیابی کو دل سے نہ چاہتا تھا اس فکر میں ہوا کہ کسی طرح بیجاپور کا محاصرہ اٹھادیا جائے۔ ابوالحسن نے اُسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر محاصرہ نہ اٹھایا جائے گا تو تھوڑے ہی عرصے میں اُمرائے برکی کی ایک زبردست فوج مدد کے لیے آجائے گی اور اُس وقت حلیفوں کا نہ صرف یہاں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا بلکہ واپسی بھی پُرخطر ہو جائے گی۔ اور جب تک اپنی اپنی سرحد کو نہ پہنچ جائیں گے اِن کی اور اُن کی فوجوں کی سلامتی مشکل ہے۔ اِس دھمکی کا تو شاید ہی اثر ہوا ہوگا مگر اصلی وجہ وہی بہزادالملک سے دشمنی اور رقابت تھی جس کی بنا پر سید مرتضیٰ بیجاپور کے محاصرے کے اٹھانے کی فکر کرنے لگا۔ سب سے پہلے اُس نے بیجاپوری اُمراء آنکس خاں اور عین الملک کو طلب کیا انھیں نصیحت کی اور سمجھایا کہ ایسے وقت میں جبکہ بیرونی حملے ہو رہے ہوں اپنے بادشاہ سے غداری کرنا اور اُس کے دشمنوں سے ملحق ہو جانا انتہائی کورنمکی اور نمک حرامی کی دلیل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی حرکت قبیح اور مذموم نہیں ہوسکتی مناسب یہ ہے کہ ابھی اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر وطن کی خدمت پر کمربستہ ہو جائیں۔ اِن اُمراء پر ابوالحسن کی اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اور چونکہ اب حکومت وقت میں تبدیلی بھی پیدا ہو چکی تھی، اُمرائے حبش کے اقتدار کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور ان کی بجائے شاہ ابوالحسن بیجاپور پر کارزما تھا لہٰذا ان باغی اُمراء کو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ قطب شاہی اور احمدنگری فوجوں سے علٰحدہ ہو کر بیجاپور میں داخل ہو گئے[2] اور بادشاہ کی آستان بوسی کا شرف حاصل کیا۔ ان کی آمد کی خبر سنکر

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی۔

[2] ۔ برہان مآثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ عین الملک اُمرائے حبش کے اقتدار کے زمانے ہی میں اُن کی درخواست پر دشمنوں سے علٰحدہ ہو کر بیجاپور میں داخل ہو گیا۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حبشیوں سے اُس کی سخت مخالفت تھی۔

بہت سارے اُمرا اور اعیان دولت بھی اپنی فوجیں لیکر آگئے۔ یہ گویا اک زبردست اخلاقی اثر تھا جو اُن کی آمد کی وجہ سے پیدا ہوا اس طریقے سے شاہ ابوالحسن کی کوششوں سے تھوڑے ہی عرصے میں بیس ہزار[1] کی ایک جرار فوج بیجاپوری جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی۔ کچھ برگی مرہٹے بھی بغرض امداد آن پہنچے اور یہ صرف ایک مہینے کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

برگی افواج نے حملہ آوروں کو ایسا پریشان کیا کہ اُن کے ہوش وحواس قایم نہ رہے۔ یکایک ٹوٹ پڑنا، چھاپے مارنا، اچانک حملے کرنا، شبخون مارنا، رسد روکنا، غلہ و اذوقہ کا سامان بند کردینا، مال واسباب لوٹ لینا، بے دردی سے قتل وغارت کرنا یہ اُن کی معمولی خصوصیات تھیں۔ ایسے پریشان کن دشمن سے خدا ہی پناہ میں رکھے کوئی سامنے ڈٹ کر لڑے تو اُسکا مقابلہ بھی کیا جائے۔ جو غفلت کا متلاشی ہو اور عین اُسی وقت حملہ کیا کرے جبکہ فوجیں بے خبر ہوں اُس کا کیا بگاڑا جاسکتا ہے۔ ان برگیوں نے اب یہ کارروائی شروع کردی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہی اور نظام شاہی فوج پریشان ہوگئی۔ ان کے ہاں ابتری پھیلنے لگی غلہ ختم ہوگیا مزید رسد کے راستے مسدود ہوگئے اس طرح قحط نے اپنا بھیانک منھ دکھانا شروع کیا۔ محاصرہ طول کھینچ چکا تھا۔ تقریباً ۲ مہینے[2] گذر چکے تھے۔ کچھ حسب دلخواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ فوج کے سپاہی بددل اور بیزار ہورہے تھے۔ غرض ہر طریقے سے ہر شخص کا دل اس مہم سے بیزار آگیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کو کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی۔ اور اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح اس الجھن سے نجات پالے۔ اسی اثنا میں بعض قطب شاہی امیروں نے جن کو شاہ میرزا اصفہانی سے کچھ کدورت تھی بادشاہ کو سمجھایا کہ مرزا نے بادشاہ کو موقعۂ جنگ پر طلب کرکے نہ صرف اُسے بے وجہ تکلیف دی ہے بلکہ اُس کی تحقیر و تذلیل کا باعث ہوا ہے کیونکہ سلاطین دکن کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ اُسی وقت ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کی مدد کے لیے بنفس نفیس موقعۂ جنگ پر جاتا ہے کہ جبکہ دوسرا

(بسلسلۂ گزشتہ بد اصلی رہ ابوالحسن کے زمانے میں سید مرتضیٰ کی کوششوں سے اپنی ملکی فوج سے ملحق ہوگیا جیسا کہ فرشتے نے ظاہر کیا ہے اور یہ ایک قرین قیاس امر بھی ہے۔ سید علی مازندرانی لکھتا ہے کہ وہ آٹھ روز تک دشمنوں کے کیمپ میں رہا اور جب وہ چپکے سے علحدہ ہوتا چاہا تو سلیفوں کی فوج نے اس کا تعاقب کیا اُس کے بہت سارے لوگ مارے گئے اور بہت کچھ مال واسباب لوٹا گیا۔ (ملاحظہ ہو برہان مآثر و تاریخ قطب شاہی)۔

[1] تاریخ قطب شاہی۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

بادشاہ بھی وہاں موجود ہوتا ہے اگر وہ خود موجود نہ ہوا اور پھر بھی مدد طلب کرے تو شاہان سلف کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے کسی سردار کے تحت ایک فوج بھیج دیتے تھے مگر اب یہاں مرتضٰی نظام شاہ تو آیا ہی نہیں اور قلی قطب شاہ محض شاہ میرزا کے کہنے پر احمد نگری افواج کی مدد کے لیے آن پہنچا اس میں بادشاہ کی سخت ذلت ہے۔[1] محمد قلی قطب شاہ کے ذہن میں یہ بات آگئی۔ وہ شاہ میرزا پر بہت بگڑا اور وہاں سے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا کر چلدینے کی فکر میں تھا۔ ادھر فوج بھی سخت بیزار تھی۔ کامیابی تو کجا الٹے پریشانیاں گلے کا ہار تھیں۔ اب اس پر بھی محاصرے کا جاری رکھنا دانشمندی سے بعید تھا۔ احمد نگر کے سرداروں میں سے سید مرتضٰی تو ابتدا ہی سے اس کوشش میں تھا کہ محاصرہ اٹھ جائے، اور اب قطب شاہ بھی اُس کا ہمخیال ہو گیا تھا۔ چنانچہ معاملات پر غور کرنے کے لیے اک مشورت کی مجلس طلب کی گئی۔ اس میں یہ طے پایا کہ بیجاپور کا محاصرہ اٹھا دینا چاہیئے احمد نگر کی فوج پھر سے شاہ درگ کا محاصرہ کر لے۔ بہزاد الملک اور سید مرتضٰی اُس طرف روانہ ہوں۔ قطب شاہ گلبرگہ کا محاصرہ کر کے اُسے فتح کر لے۔[2] ان تدابیر پر عمل کرنے کے لیے احمد نگری اور قطب شاہی فوجوں نے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا کر اپنا اپنا راستہ اختیار کیا۔

بیجاپور کے محاصرے نے بہت طول کھینچا۔ فرشتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۲ مہینے تک محاصرہ جاری رہا اور اس وقت بیجاپور کی اندرونی حالت جیسی کچھ بھی تھی ظاہر کر دی گئی۔ اتنی ابتری کے باوجود ابو الحسن کے وزیر ہونے سے صورت حال کا بدل جانا، آن کی آن میں پانسہ کا پلٹ جانا، حملہ آوروں کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہونا درحقیقت ابو الحسن کی ہر دلعزیزی اور اُس کی غیر معمولی قابلیتوں کی دلیل ہے۔ اس کی انتظامی قابلیت، اس کا تدبر، اس کی فراست نے بیجاپور کی ڈوبتی کشتی کو بچا لیا۔ اگر ابو الحسن اس وقت برسر کار نہ آتا تو تھوڑے ہی عرصے میں حلیف بیجاپور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے! اور غالباً اس ریاست کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ یا کم از کم بیجاپور اس بری طرح اُجڑتا کہ شاید سالہا سال میں یہ سلطنت پھر نہ سنبھل سکتی۔ اس موقع پر اُمرائے حبش کی تعریف کیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ گو اُن کے پچھلے اور بعد کے افعال بہت کم تعریف کے مستحق ہیں، مگر عین وقت پر موقع کی اہمیت کو جان کر خوشی خوشی سے ایک دوسرے شخص کو با اقتدار

---

[1] حدیقۃ العالم و فرشتہ۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

بنانے میں مدد دینا واقعی حب وطن کی ایک بہترین مثال ہے اس وقت کہنا چاہیئے کہ ابوالحسن کی لیاقت اور امرائے حبش کے تھوڑے بہت ایثار نے بیجاپور کے بگڑے کام کو بنا دیا۔ فرشتہ بجا طور پر لکھتا ہے کہ "ہیچ ذی عقل تصور این معنی نہ کند کہ چہل ہزار سوار کارگزار بپای قلعۂ بیجاپور رسند و آں کہ دراں وقت زیادہ از دو سہ ہزار کس در قلعہ نبودہ باشد و بعد از یکسالہ محاصرہ خاشاکے ازاں بلدہ متصرف نشدہ خائب و خاسر بممالک خود شتافتند۔ فیلاں واثاثہ سلطنت ہر دو بادشاہ بحوزہ دیوان صاحبقران درآمد"[1] اور بعد میں اس غیر معمولی کامیابی کو بادشاہ کی اقبالمندی اور تائید غیبی پر محمول کرتا ہے لیکن خدا کی امداد اور ابراہیم کے اقبال کے ساتھ ساتھ یقیناً ابوالحسن کی بھی کچھ قابلیتوں نے اس موقع پر بیجاپور کی مدد کی۔

جب حملہ آور فوجوں نے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا لیا تو انھوں نے تدبیر تو خوب ظاہر کی تھی کہ بہزاد الملک اور سید مرتضیٰ شاہ درگ کے قلعے کا محاصرہ کرلیں اور اسے فتح کرکے احمد نگر کی ریاست میں داخل کرلیں محمد قلی قطب شاہ حسن آباد گلبرگہ کو فتح کرلے۔ مگر ان تدابیر پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد نہ ہوا اس وقت مرتضیٰ نظام شاہ کی نیم دیوانگی کی وجہ سے خود اندرونی حالات اُس ریاست کے خراب ہو رہے تھے اور اُمراء میں سخت نااتفاقیاں پیدا ہو رہی تھیں اس لیے احمد نگر کی فوج بجائے شاہ درگ کا محاصرہ کرنے کے سیدھے احمد نگر کی راہ اختیار کی۔ مگر جاتے ہوئے اتنا ضرور کیا کہ عادل شاہی علاقہ جات کو جو راہ میں پڑے تھے خوب تباہ و تاراج کیا۔ گلبرگہ اور مرج کے علاقے خصوصیت کے ساتھ بُری طرح تباہ کیئے گئے[2]۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی سیدھے اپنے ملک کی راہ لی! البتہ اتنا ضرور کیا کہ اپنے ایک بہترین

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] برہان مآثر میں ان علاقوں کی تباہی و بربادی کی بہت تفصیل دی گئی ہے گلبرگہ کے متعلق سید علی لکھتا ہے کہ یہ دکن کا اس زمانے میں ایک بارونق شہر تھا۔ تاریخ قطب شاہی میں اُن مقامات کے نام دیئے گئے ہیں جو تباہ و تاراج کیئے گئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

گلبرگہ، مرج، رائے باغ، ہوکیری، پنالہ اور ستارہ وغیرہ۔ اس لوٹ مار کے بعد فرشتہ لکھتا ہے کہ قطب شاہی اور نظام شاہی فوجوں نے اپنے اپنے ملک کی راہ لی مگر برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے کہ اس کے بعد نلدرگ کا

جنرل کو (جس کا نام امیر زنبیل استرآبادی تھا اور جسے حال میں مصطفیٰ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا) گلبرگہ کی مہم پر نامزد کیا گیا! اور اُس کے ساتھ ایک زبردست جرار فوج بھی بھیجدی کہ اس علاقے کو فتح کر کے قطب شاہی عملداری میں داخل کر دے۔ اس طرح قطب شاہیوں سے جنگ کا سلسلہ کچھ اور دن جاری رہا! ب مصطفیٰ خاں کے حملوں کو روکنے اور گلبرگہ کی مدافعت کے لیے بیجاپوری حکومت نے دلاور خاں حبشی کو ایک فوج کے ساتھ روانہ کیا مگر دلاور خاں کی معرکہ آرائی کے واقعات قلمبند کرنے سے پہلے بیجاپور کی اندرونی حالت اور نئے انتظامات کے متعلق اک دو چار سطریں لکھدینی چاہئیں جو دشمنوں سے نجات پانے اور محاصرے کے اٹھنے کے بعد عمل میں آئے۔

ابوالحسن کا قید کیا جانا

اُمرائے حبش کا اقتدار

جب بیجاپور کا محاصرہ اٹھ گیا تو پھر ان حبشیوں نے کوشش کی کہ اقتدار اُن کے ہاتھ میں آ جائے۔ تھوڑے زمانے تک تو ابوالحسن کے ساتھ بالاتفاق کام کرتے رہے مگر یہ کاغذ کی ناؤ بھلا کب تک چل سکتی جس طرح ایک میان میں دو تلواریں، ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح ایک اقتدار کے دو دعویدار یکجا نہیں رہ سکتے۔ یہاں اب ابوالحسن اور حبشیوں کے درمیان اسی اقتدار کے لیے سخت رقابت پیدا ہو گئی۔ حبشیوں نے محض موقع کی نزاکت کا احساس کر کے اقتدار ابوالحسن کے سپرد کر دیا تھا مگر اب چونکہ کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا اس لیے ابوالحسن کی وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے! وہ چاہتے تھے کہ کسی حیلے سے اسے قید کر کے خود حکومت پر قابض و متصرف ہو جائیں۔ اس رقابت نے بالآخر کشیدگی پیدا کر دی۔ ابوالحسن تو غریب اکیلا تھا اور یہ تین اُس کے خلاف میں

(بسلسلۂ گزشتہ) محاصرہ کیا گیا! اس محاصرے کی جو تفصیلات دی ہیں وہ، وہ محاصرہ ہے جس کو فرشتے نے بیجاپور کے محاصرے سے پہلے لکھا ہے جس کی تفصیل دی گئی یعنی آقا ترکمان کی وفاداری کا جس میں ذکر ہے۔

برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی کے مصنفین کا بیان ہے کہ جب بیجاپور کے محاصرے سے فوجیں لوٹی ہیں اور نلدرگ کا ارادہ کیا گیا اُس زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا، فوج ناندگاؤں میں تھی کہ بادشاہ کے انتقال کی خبر ملی! اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ، شاہ میر کے اصرار سے نلدرگ کے محاصرے کے لیے آیا۔ فرشتے کے اعتبار سے ان واقعات کو گزر کر ایک سال ہو گیا ہے اور یہ بیجاپور کے محاصرے سے پہلے کے ہیں، مگر یہاں ان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے (دیکھو تاریخ قطب شاہی اور برہان مآثر و تاریخ فرشتہ)۔

متحد و متفق۔ کہاں تک ان کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتا۔ کوئی نہ کوئی موقع ہاتھ آگیا ہوگا کہ ابوالحسن کو غفلت میں پاکر انھوں نے قید کر دیا[1]۔ ابوالحسن کا قید ہونا ہی تھا کہ پھر حکومت کی کل ان حبشیوں کے ہاتھ میں آگئی اس طرح ابوالحسن کی حکومت اور اُس کے اقتدار کا زمانہ بیجاپور کے محاصرے کے اٹھنے کے بعد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر حسب معمول یا حسب سابق "اتحاد ثلاثہ" اہل حبش قایم ہوتا ہے جس میں کہ اخلاص خاں آتالیق اور عہدہ دار اعلی کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اگر حبشیوں کی اس کارروائی پر تنقیدی نظر کی جائے تو سوائے اسکے اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا کہ انھوں نے انتہا درجے کی احسان فراموشی سے کام لیا کہ ایک ایسا شخص جو پورے ملک اور پوری ریاست کا محسن تھا اس کے ساتھ یہ بُرا سلوک کیا۔ ان کی مزید احسان فراموشی کی دلیل یہ ہے کہ مقصود خاں حبشی جیسے محسن کو بھی انھوں نے قید کر ڈالا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ان کو عین الملک کی قید سے بچایا تھا۔ مگر اُس کے احسان کے باوجود انھوں نے اسے اس وجہ سے قید کر ڈالا کہ وہ زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔

---

[1] اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی تفصیل تاریخ فرشتہ میں نہیں۔ فرشتہ محاصرۂ بیجاپور کے اٹھنے کے بعد ابوالحسن کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ خود لکھتا ہے کہ محاصرۂ بیجاپور کے زمانے میں ابوالحسن مقتدر رہا، اور حبشی حکومت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ بعد کے واقعات کے سلسلے میں وہ یکدم اخلاص خاں اور دیگر حبشی اُمرا کا اس طرح ذکر کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہی حکومت پر فائز ہیں۔ یہ نہیں ظاہر کرتا کہ کس طرح ان حبشیوں نے ابوالحسن کو حکومت سے خارج کیا۔ البتہ بساتین السلاطین سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حبشیوں نے چندے ابوالحسن کے ساتھ بالاتفاق و بالاشتراک کام کیا۔ اُس کے بعد جب انھوں نے ابوالحسن کے ایسے آثار دیکھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے حکومت کا مالک ہونا چاہتا تھا تو خود پیش دستی کر کے ابوالحسن کو انھوں نے قید کر ڈالا۔ چونکہ دوران محاصرہ میں ابوالحسن حکومت پر فائز تھا اس لیے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ محاصرے کے بعد حبشیوں نے اسے حکومت سے خارج کر دیا اور حسب سابق وہی حاکم ہو گئے۔ ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ و بساتین السلاطین۔ صفحہ (۱۸۰)۔

جب حکومت پھران حبشیوں کے ہاتھ میں آگئی تو انھوں نے اپنے میں کے ہی ایک آدمی کو امیر زنبیل استرآبادی کے مقابلہ کو روانہ کیا یہ شخص دلاور خاں تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ اب وہ ایک خاص حیثیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یوں تو جب سے کہ حبشی گروہ حکومت پر قابض تھا یہ شخص بھی حکومت کا شریک رہا اور حکومت کے کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز رہا[۱] مگر اب تک وہ اک طرح پس پردہ تھا۔ اخلاص خاں چونکہ اس دوران میں پیش پیش رہتا ہے اس لیے حمید خاں اور دلاور خاں کے حالات اور اُن کی کارگزاریاں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں مگر اب وہ پہلی مرتبہ افسر اعلیٰ بنا کر ایک زبردست مہم پر بھیجا جا رہا تھا۔ یہ گلبرگہ کی مہم تھی۔ اس مہم میں اُس نے اپنے آپ کو ایسا کارداں ثابت کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اُس کی ترقی کا راستہ صاف ہو گیا اور اس مہم سے واپس ہونے کے بعد اخلاص خاں کا خاتمہ کر کے خود وکیل السلطنت ہو گیا۔ اس طرح یہ مہم اُس کی ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے اور یہاں سے اُس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا وہ طویل دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً ۸ سال تک جاری رہتا ہے۔ بحیثیت اتالیق کے آٹھ سال تک بیجاپور میں برسر اقتدار رہا۔ آئندہ چلکر اُس نے اپنی قابلیت کا غیر معمولی ثبوت دیا۔ یہی وہ ایک اتالیق ہے جس نے کہ ایک عرصے تک بیجاپور پر حکمرانی کی۔ اور باقی جتنے اتالیق ہوئے ہیں اُن کی حکومت صرف مہینوں پر مشتمل رہی[۲] چونکہ دلاور خاں سے آئندہ صفحات میں زیادہ عرصے تک سابقہ رہے گا اس لیے اُس کے متعلق تمہیداً یہ دو چار لفظ لکھ دیئے گئے۔

دلاور خاں اور امیر زنبیل استرآبادی کا مقابلہ

محمد قلی قطب شاہ نے سات ہزار فوج دیکر مصطفےٰ خاں کو اس مہم پر نامزد کیا تھا۔ ادھر امیر زنبیل استرآبادی اپنی فوجوں کو لیکر عازم گلبرگہ ہوا اور دلاور خاں اپنے بیجاپوری لشکر کے ساتھ اُس کے حملے کے روکنے کیلیے اُس کے سر پر آن پہنچا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ معرکہ نہایت سخت اور خونریز تھا۔ اس میں مصطفےٰ خاں کو شکست فاش ہوئی اور بہت سامان غنیمت عادل شاہیوں کے ہاتھ لگا جس میں ۱۵۰ ہاتھی بھی شامل تھے[۳] اس زبردست کامیابی کے بعد دلاور خاں بیجاپور واپس ہوا۔ فرشتے نے اس جنگ کے متعلق صرف اسی قدر تفصیل دی ہے۔ مگر تاریخ قطب شاہی، بساتین السلاطین

---

[۱] اخلاص خاں کے زمانے میں وہ سرنوبتی کے عہدے پر فائز رہا۔

[۲] کامل خاں اور کشور خاں کے عہد ہائے حکومت نو مہینوں پر مشتمل رہے۔ اخلاص خاں نے کوئی دو سال حکومت کی۔

[۳] تاریخ فرشتہ۔

اور حدیقۃ العالم میں مزید تفصیلات درج ہیں۔ چونکہ یہ معرکہ نہ صرف بیرونی سیاسیات کے نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ داخلی حالات پر بھی اس نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس کے متعلق مزید تفصیل دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ جبوش ثلاثہ نے اس قطب شاہی حملے کے روکنے کے لیے اپنے میں کے ایک آدمی کو سپہ سالار تو بنا دیا مگر اب ضرورت اس امر کی تھی کہ مزید فوج ہو حال حال میں جو کچھ حالات پیش آئے تھے اُن کی وجہ سے اکثر اُمرا بددل اور پریشان ہو چکے تھے۔ اب انھوں نے ان اُمراء کی تالیف قلوب شروع کی خصوصیت کے ساتھ عین الملک اور آنکس خاں کو بڑی چاپلوسی سے مدد کے لیے طلب کیا۔

اُن کو ہر طرح خوش کرنے کی تدبیر کی گئی[1] جب یہ لوگ آگئے تو بیجاپور کی ایک اچھی خاصی فوج تیار ہو گئی۔ اصل فوج تو بیس ہزار تھی۔ مگر عین الملک اور آنکس خاں کے آجانے کی وجہ سے دس ہزار سوار کا اور اضافہ ہوا۔[2] اخلاص خاں نے اس مہم پر اتنی کثیر فوج روانہ کر دی کہ خود اُس کے پاس دارالخلافہ کے انتظام کے لیے بہت کم سپاہ رہ گئے۔ جب بیجاپور کی یہ زبردست فوج روانہ ہوئی تو قطب شاہیوں نے احمد نگر سے مدد طلب کی چونکہ موجودہ خارجہ پالیسی میں احمد نگر اور گولکنڈہ ہمرنگ و ہمخیال تھے وہاں سے دو تین ہزار کا ایک دستہ مرزا یادگار، رستم خاں، شمشیر خاں جیسے سرداروں کی سرکردگی میں روانہ کر دیا گیا۔ بیجاپور کی فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی یہ فوجیں قطب شاہی افواج سے ملحق ہو گئیں۔[3] جب دلاور خاں کی فوج مخالفوں کے

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی میں یہ لکھا ہے کہ اس جنگ میں پیشقدمی بیجاپوریوں کی طرف سے ہوئی چونکہ بیجاپور کی سلطنت یہ چاہتی تھی کہ اُن علاقہ جات کو حاصل کر لے جو اس سے پہلے کے معرکوں میں چھین لیے گئے تھے اُن کے استخلاص کے لیے دلاور خاں کی سرکردگی میں یہ فوج بھیجی گئی تھی۔ دلاور خاں کے حملے کی مدافعت کی غرض سے قطب شاہ نے اپنی فوجیں روانہ کیں۔ حالانکہ تاریخ فرشتہ اور بساتین السلاطین میں اسکے خلاف میں واقعات درج ہیں جو اوپر دیے گئے ہیں۔ تاریخ قطب شاہی صفحہ ۴۹۰ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔ برہان مآثر میں لکھا ہے کہ جب عادل شاہی امیروں نے دیکھا کہ حملہ آوروں کی فوجیں روانہ ہو گئی ہیں تو انھوں نے اُن علاقوں کو حاصل کرنے کی فکر کی جو کہ محمد قلی نے اس عرصے میں اُسے چھین لیے تھے۔ اس طرح یہ بھی قریب قریب قطب شاہی کی تصدیق کرتا ہے۔

[2] ۔ بساتین السلاطین۔

[3] ۔ تاریخ قطب شاہی۔

[4] ۔ تاریخ قطب شاہی قلمی نسخہ صفحہ ۴۹۰۔

بالکل مقابل ہوگئی تو اُس نے ایک اچھا اور مناسب موقعہ دیکھ کر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ بارش کا موسم تھا اس لیے چھ مہینے تک معمولی جھڑپ اور موقتی پیکار سے بڑھ کر کوئی جنگ نہ ہوئی۔[1] بارش کے ختم ہوجانے کے بعد بیجاپوری افواج نے دشمن کو تنگ کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ ایک زبردست جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا صبح سے دوپہر تک بڑی زبردست اور گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ عالم خاں و طاہر محمد خاں کے حملوں کی وجہ سے بیجاپوریوں کا میمنہ متزلزل ہوگیا، حالانکہ آنکس خاں جو حصے کی سپہ سالاری کر رہا تھا اس نے بڑی مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ایک عرصے تک حملے کو روکے رہا۔ صلابت خاں کے پے در پے صف شکن حملوں نے بیجاپوریوں کے میسرہ کو بھی شکست دے دی۔ اب کوئی بات باقی نہ تھی کہ بیجاپور کو شکست ہوجائے۔ مگر اس اثناء میں جنگ کی صورت حال بالکل بدل گئی۔ وہ یہ کہ جب میمنہ و میسرہ کو پسپائی ہوئی تو مخالفین یہ جان کر ان کے پیر میدان سے اکھڑ گئے ہیں فوراً بے ترتیبی کے ساتھ تاخت و تاراج اور لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوگئے۔ مال غنیمت کی تلاش میں یہ کامیاب فوج پریشان و منتشر ہونے لگی۔ دلاور خاں نے یہاں پر اپنی کاردانی اور فوجی قابلیت کا زبردست ثبوت دیا۔ وہ جنگ کے شروع ہونے سے پیشتر ہی فوج کے بہترین حصے کو لیکر کسی کمین گاہ میں چھپ گیا تھا کہ اچانک حملہ کرکے عین وقت پر مخالف فوج کو پریشان کردے جب جنگ کا یہ نقشہ ہوگیا تو وہ فوراً اپنی کمین گاہ سے نکل کر غنیم پر ٹوٹ پڑا جو اس وقت فتح کے یقین اور لوٹ مار کی فکر میں پریشان تھا۔ مرزا یادگار اور میر زنبیل ابھی تک کچھ فوج کے ساتھ میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دلاور خاں کا پہلا حملہ ان پر ہوا۔ یہ تھوڑی سی فوج دلاور خاں کے زبردست حملے کی تاب نہ لا سکی۔ بالآخر شکست ہوئی جب اس شکست کی خبر پریشان و منتشر حصہ ہائے فوج کو ملی تو میدان چھوڑ کر فوراً بھاگ نکلی۔

میدان دلاور خاں کے ہاتھ رہا کئی قطب شاہی اور نظام شاہی ہاتھی[2] اور بہت کچھ مال غنیمت بیجاپوریوں کے ہاتھ آیا۔ بساتین السلاطین کے مطابق بیس ہاتھی عادل شاہیوں کو ہاتھ لگے۔ اس طرح قطب شاہیوں کا یہ

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کی تعداد (۳۱۵) تھی۔ بساتین السلاطین کا مصنف (۱۲۰) بتلاتا ہے۔ فرشتہ (۱۵۰)۔

حملہ بھی ناکام رہا۔[۱]

اخلاص خاں کے عہد اقتدار کی یہ آخری کارروائی تھی جو بیجاپور کی حد تک بہت کامیاب رہی چونکہ اسکے بعد ہی حبشیوں کے آپس کی نا اتفاقیوں کی وجہ سے ان کا "اتحاد ثلاثہ" ٹوٹ جاتا ہے اور اخلاص خاں کا عہد اقتدار بھی ختم ہوجاتا ہے اس لیے واجب الحفظ یہاں پر ان حملوں اور فوج کشیوں کے متعلق لکھنے چاہئیں جو اس چھوٹے سے دور میں غیر ممالک کی طرف سے بیجاپور پر ہوئے۔ یوں تو کشور خاں کے زمانے سے ہی اندرونی حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے قطب شاہی اور احمد نگری حملے ہو رہے تھے۔ مگر اخلاص خاں کے زمانے میں تو یہ حالت ہوگئی کہ بیجاپور کا تک محاصرہ کرلیا گیا اور بیجاپور کے فتح ہوجانے میں کوئی بات ہی باقی نہ رہی تھی۔ مگر ابوالحسن نے بیجاپور کو بچالیا۔ ابوالحسن کے بعد جب پھر اخلاص خاں دوسرا اقتدار ہوگیا تو قطب شاہ نے گلبرگہ چھیننے کے لیے مصطفےٰ خاں کو بھیج رکھا تھا۔ اس طرح پھر وہی خارجی حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو ابوالحسن کے مختصر سے زمانے میں اس کی قابل قدر کوششوں سے منقطع ہوگیا تھا۔ یہاں پر یہ لکھنا پڑتا ہے کہ یہ محض بیجاپور کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں جبکہ اندرون ملک بدامنی

---

[۱] برہان مآثر کے مصنف نے اس جنگ کی کچھ اور تفصیل دی ہے، وہ یہ ہے کہ عادل شاہیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی افواج اپنے ملک کو روانہ ہوگئی ہیں تو وہ کھوئے ہوئے علاقوں کے حاصل کرنے کی فکر کرنے لگے۔ دلاور خاں اس مہم پر روانہ کیا گیا۔ مرزا امیر نبیل نے اپنے بادشاہ کو لکھا کہ عادل شاہی افواج کا ایک زبردست اجتماع ہوا ہے اور مقابلے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، موجودہ فوج ناکافی ہے مزید امداد بھیجی جائے۔ محمد قلی نے کمک روانہ کی، اسی اثنا میں میر شاہ میر کے دشمنوں نے ایک جھوٹا اور جعلی خط محمد قلی کے سامنے پیش کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عادل شاہیوں کا طرفدار ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے کہ وہ ہمت سے لڑیں اور گولکنڈہ کے غیر ملکی فریق کی ہمدردیاں ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ محمد قلی نے بغیر تحقیقات کے میر شاہ میر کو قید کر دیا چونکہ یہ شخص غیر ملکی فریق کا رہبر تھا اکثر امراد اور سرداران فوج بددل ہوگئے۔ اس بے دلی اور ناراضی کے عالم میں بھلا فوج کیا لڑ سکتی۔ بغیر ایک تیر چلائے کے تمام فوج غائب ہوگئی۔ میدان عادل شاہیوں کے ہاتھ رہا۔ بے شمار مال غنیمت ان کو ملا جس میں ۳۱۵ ہاتھی تھے (ملاحظہ ہو برہان مآثر)۔

پھیلی ہوئی ہوا ور سخت کشمکش کا سلسلہ جاری ہو بیرونی حملوں سے اُسے خلاف توقع نجات مل گئی اور وہ بھی کامیابی کیساتھ۔ یوں تو یہ اندرونی کشمکش اور خارجی حملے اپنے بُرے نتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکے مگر بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیجاپور کے حق میں ان کے کچھ زیادہ بُرے اثرات مترتب نہ ہوئے اور اُس کی طاقت کو کچھ غیر معمولی دھکا نہیں لگا جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ بیرونی سلطنتوں کو اس کا موقع نہیں مل سکا کہ وہ اپنے اُن جارحانہ منصوبوں کو پورا کر سکیں جو انھوں نے بیجاپور کے خلاف باندھے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود اندرونی کمزوریوں کے بیجاپور نے کس طرح اپنے دشمنوں کے اتنے زبردست اجتماع کو توڑا اور انھیں بے نیل و مرام اپنے ملک کو واپس ہونے پر مجبور کیا ہوگا۔

اس سے اگر کچھ نہیں تو کم از کم بیجاپور کی بنیادی مضبوطی ظاہر ہوتی کہ پچھلے بادشاہوں نے اتنا مضبوط و مستحکم اور باوقار بنا دیا تھا کہ باوجود ایک تھوڑے سے زمانے کی پریشانیوں کے وہ دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب و سرخرو نکلتا ہے۔ دوسرے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نازک اور پر آشوب زمانے میں اس وقت بھی بیجاپور میں ایسی ہستیاں موجود تھیں جنھیں مغتنمات سے سمجھا جانا چاہیئے۔ مثلاً ابو الحسن، چاند بی بی وغیرہ۔ ان کا وجود ہی ایک اچھا اور زبردست اخلاقی اثر پیدا کرتا تھا جو مادی قوت کی جان ہوا کرتا ہے اور خود حبشیوں (اور خصوصیت کے ساتھ اخلاص خاں) کے متعلق بھی یہ کہنا چاہیئے کہ بیشک آپس میں یہ لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور بعض اوقات اتنا لڑتے کہ خود ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جاتا تھا، مگر پھر بھی وہ بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں بیجاپوری ریاست کے بچانے اور عادل شاہی خاندان کی حفاظت کرنے کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے۔ اگر امرا میں آپس میں اتفاق ہوتا اور خود غرضی کا پہلو ذرا کمزور رہتا تو یقیناً ابراہیم کا یہ ابتدائی عہد بھی کامیاب اور درخشاں رہتا جتنا کہ اُس کا آیندہ دور رہا۔ اگر کسی چیز نے ابراہیم کے اس "دورِ طفولیت" کو تاریک بنا دیا تو وہ بھی اُمرا کی آپس کی کشمکش، لڑائیاں اور خود غرضیاں تھیں جس کی باعث دوسری ریاستوں کو اتنی ہمت ہوئی کہ وہ بیجاپور پر چڑھ آئیں۔ مگر یہ سلطنت بیجاپور کی بلند اقبالی اور اُس کی بنیادی قوت کا مظاہر تھا کہ باوجود پے درپے حملوں کے وہ اُن کو روکنے میں منصور و کامیاب رہتا ہے۔

"اتحادِ ثلاثہ" کی شکست — اخلاص خاں کا زوال

جب دلاور خاں کو قطب شاہیوں اور احمد نگریوں کے مقابلے میں یہ زبردست کامیابی

حاصل ہوئی تو اُس کی طاقت وقوت اور عظمت و وقار میں بڑا اضافہ ہوگیا اب اُس کے پاس ایک زبردست فوج تھی جو بالکل
اُس کے حکم میں تھی ۔ اس وقت جتنے اُمراء اور سردار فوج کے ساتھ تھے وہ سب اُس کے کہنے میں تھے ! ورادھر اخلاص خاں
کے پاس بہت کم فوجیں رہ گئی تھیں کیونکہ قطب شاہی حملے کی مدافعت کے لیے اُس نے ریاستی فوجوں کے بیشتر حصے کو دلاور خاں
کے تحت روانہ کر دیا تھا ۔ اب اُس کے پاس اتنی کافی سپاہ نہ تھی جس سے کہ اگر موقع ہو تو وہ اپنی مدافعت و محافظت کر سکے ۔
یوں بھی اخلاص خاں ملک میں کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہ تھا ۔ اگر اُس کے خلاف اچانک کوئی کارروائی ہو تو شہر کا ایک بچہ بھی شاید اُسکی
حمایت میں اُنگلی نہ اٹھائے ۔ دلاور خاں اس حقیقت سے خوب آگاہ تھا ۔ یہ شخص فطرۃً ایک حوصلہ مند آدمی واقع ہوا تھا ۔
گو وہ سرنوبتی کے عہدے پر فائز تھا اور اُس کو اتنی بڑی فوج کی سپہ سالاری دی گئی تھی ، مگر پھر بھی وہ اس پر قانع نہ تھا ۔
اور اُس کی خواہش تھی کہ وہ ملک کا سب سے اعلیٰ عہدہ حاصل کرے ۔ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہوگا کہ جب اخلاص خاں
وکیل السلطنت ہونے کے لائق ہے تو میں کیوں نہیں ؟ مجھ میں جتنی قابلیتیں ہیں وہ شاید ہی اخلاص خاں میں ہوں ! غرض
اُس کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی نے اُسے بے چین کر رکھا تھا ۔ وہ موقع کا متلاشی تھا کہ اپنی اس دیرینہ آرزو کو پورا
کرے ۔ قدرت نے اُس کو ایک زبردست اور زرین موقع بھی اس وقت عطا کر دیا تھا ۔ شاید اس سے بہتر موقع پھر کبھی
ہاتھ نہ آئے ۔ اس لیے اب وہ اخلاص خاں کی معزولی کا درپے ہوا جس وقت سے کہ ان حبشی اُمراء نے اقتدار حاصل کیا تھا ان میں
غیر معمولی اتحاد و اتفاق جاری رہا اور دراصل یہی وہ اتحاد تھا جس کی بناء پر اخلاص خاں نے اتنے عرصے تک بیجاپور پر
حکومت کی اور کوئی دشمن ان پر غالب نہ آسکتا تھا ۔ اُلٹے وہ جس کو چاہتے زیر کر لیتے تھے چنانچہ ابوالحسن کا معزول
ہو کر قید کیا جانا ان کے غیر معمولی اتفاق و اتحاد کی ایک بہترین مثال ہے ۔ غرض اسی اتحاد نے اتنے عرصے تک ان کو
برقرار رکھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ انھوں نے اقتدار جو حاصل کیا وہ خود ان کی باہمی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا چونکہ اخلاص خاں
عمر میں بڑا تجربہ کار اور باعتبار فوج کے زیادہ ذی وقار تھا اس لیے قدرتاً وہ حکومت کے سب سے بڑے عہدے پر
فائز رہا ! ور اپنے ان دونوں ساتھیوں کی مدد سے حکومت کرتا رہا لیکن قوت و اقتدار ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کو
بہت جلد بدمست کر دیتے ہیں ! اور رفتہ رفتہ حکومت کا ایسا چسکہ لگتا ہے کہ اُس میں کسی دوسرے کی شرکت تلخ اور
ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے یہیں سے اتفاق و اتحاد کی وہ کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں جن سے کہ خود یہ اقتدار حاصل کیا
گیا تھا ! اس طرح مقتدر ہستیاں مائل بہ زوال ہونے لگتی ہیں ۔ اب یہاں بھی یہی ہوا جب تک حکومت کا نشہ چڑھا نہ تھا

ان حبشیوں کا اتحاد بڑا مضبوط اور مستحکم رہا لیکن جب یکبارگی اس شراب نے انھیں مست کر دیا تو پھر ان کی طبیعتوں کے اصلی جوہر ظاہر ہونے لگے اور طبائع کے اختلاف نے انھیں بہت جلد ایک دوسرے سے بیزار کر دیا۔ حمید خاں سادہ دل، نیک طینت اور کریم النفس آدمی تھا اس لیے اس کی جانب سے نہ اخلاص خاں کو کچھ ڈر تھا اور نہ دلاور خاں کو کچھ خوف۔ مگر دلاور خاں ان تینوں میں بہت ہشیار، چالباز اور عیار واقع ہوا تھا۔ موقع کی نزاکت کو جان کر ایک عرصے تک اخلاص خاں کے ماتحت کام کرتا رہا، مگر ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہتا تھا کہ کسی صورت سے ان دونوں (اخلاص خاں و حمید خاں) میں افتراق پیدا کر کے ان کو لڑا دے! اور یہ آپس میں جب لڑ لڑ کر کمزور ہو جائیں تو ان دونوں کو علیٰحدہ کر کے حکومت پر خود قابض ہو جائے اُس کی ابتدا سے یہی پالیسی تھی مگر حمید خاں جیسے نیک دل آدمی کو لڑا دینا بھی آسان نہ تھا اس لیے ایک عرصے تک وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ عجیب بات ہے کہ قدرت جن کو ترقی دینا چاہتی ہے اُن کو مناسب مواقع بھی عطا کرتی ہے چنانچہ دلاور خاں کی خوش قسمتی سے دوران حکومت میں اخلاص خاں اور حمید خاں کی ٹھن گئی۔ مگر اس نفاق کے ظاہر کرنے سے پہلے ہم کو دلاور خاں کی کارروائیوں پر نظر ڈالنا چاہیئے کہ وہ قطب شاہیوں کو شکست دیکر کن کاروبار میں مصروف رہا۔

دلاور خاں کی واپسی کی خبر | اوپر لکھ دیا گیا ہے کہ دلاور خاں نے قطب شاہیوں کے خلاف کامیابی کیا حاصل کی کہ اُس کے اقتدار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ دراصل اس کامیابی کے معنی اخلاص خاں کا زوال اور دلاور خاں کا عروج تھا ایک زبردست فوج اُس کے پاس تھی اور کہنا چاہیئے کہ اس ایک فتح نے حکومت کے محور و مرکز کو بدل دیا۔ گو بظاہر اب بھی مستقر پر اخلاص خاں ہی وکیل السلطنت تھا مگر بے دست و پا اور دلاور خاں اگرچہ اس وقت محض ایک کامیاب جنرل کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اقتدار کا اصلی مرکز وہی ہو گیا تھا۔ غرض قطب شاہیوں کو شکست دینے کے بعد اُس نے اپنی فتح کی خبر بیجاپور روانہ کر دی اور خود بھی چلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ جب اخلاص خاں کو معلوم ہوا کہ دلاور خاں بڑے جاہ و حشم کے ساتھ بیجاپور آنیوالا ہے تو اُسے اپنی فکر ہوئی کہ مبادا وہ قوت و اقتدار جو اسے اس اثنا میں حاصل ہوا ہے اُسکے خلاف ہی دلاور خاں نہ استعمال کرے۔ اُس کا یہ اندیشہ رفتہ رفتہ قوی ہو گیا اور چاروں طرف جو ایک نگاہ ڈالی تو

کسی کو اپنا دوست نہ پایا۔ اپنی ذاتی حفاظت و مدافعت کے لیے اور موقع ہو تو دلاور خاں سے مقابلہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کافی فوج بھی نہ تھی۔ اس لیے اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

اخلاص خاں کی تدابیر

اب صرف اُس کے پاس ایک چارۂ کار تھا کہ کسی صورت سے دلاور خاں کی آمد اسی حد تک روک لی جائے کہ اس عرصے میں وہ اپنی مدافعت کے لیے کچھ سامان مہیا کر سکے۔ اس غرض سے اُس نے ایک شاہی فرمان دلاور خاں کے نام روانہ کیا کہ تا حکم ثانی دلاور خاں بیجاپور کا ارادہ نہ کرے۔ اور اس وقت جہاں مقیم ہو وہیں ٹھہرا رہے۔ اور جو کچھ مال غنیمت اسپ و فیل وغیرہ اس جنگ میں حاصل ہوئے ہوں وہ حضور میں روانہ کر دے۔ دلاور خاں اس کے لیے تیار ہی تھا۔ اور وہ اخلاص خاں کا داؤ سمجھ گیا۔ اس وار کو خالی دینے کی فکر کرنے لگا۔ مدبر اور کارداں تو تھا ہی اُس نے فوراً بڑے امرا اور سرداروں کی ایک مجلس مشورت طلب کی۔ اور اُس عام مجلس میں اخلاص خاں کا یہ حکم پڑھ کر سنایا ساتھ ہی بتلایا کہ اخلاص خاں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ خود تن تنہا حکومت کرے اور ہم کو حکومت سے بیدخل کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ شاہی فرمان کے ذریعہ ہماری بیجاپور کو روانگی ممنوع قرار دی ہے۔ گویا اس طریقے سے وہ سب کو جلاوطن کیا چاہتا ہے۔ اور خود بلا شرکت غیرے حکومت پر قابض رہنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دلاور خاں کا یہ منطقی استدلال ایسا تھا کہ سب کی سمجھ میں آ گیا اور وہ بھی اخلاص خاں کے حکم کے وہی معنی لینے لگے جو دلاور خاں نے بتلائے تھے۔ اور پھر جیسا پہلا کہا گیا ہے اخلاص خاں سے بہت کم لوگ خوش تھے۔ اُس کی اُن کارروائیوں کو اور بھی مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک تو یوں بھی وطن یاد آ رہا تھا اور سب بے چین تھے جنگ میں کامیابی حاصل کر کے وہ اپنے اپنے گھروں کو جانے کی فکر میں تھے کہ اخلاص خاں کا یہ نادری حکم پہنچا۔ اس لیے اُن کو یہ زبردستی کی روک بھلی معلوم نہ ہوئی۔ سب کے سب بگڑ بیٹھے اور دلاور خاں سے ہر ایک نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کو آخری وقت تک مدد دینے کے لیے تیار ہے۔ دلاور خاں کا مطلب پورا ہو گیا۔ اُس نے سرداروں کے موقتی جذبات کا بہت خوبی سے فائدہ اٹھایا۔ اور قبل اس کے کہ اخلاص خاں اپنی محافظت کی کچھ فکر کرتا وہ اُس کے سر پر آن پہنچا۔

ادھر اخلاص خاں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اگر دلاور خاں تھوڑا سا تساہل کرے یا کسی وجہ سے بھی اُس کی آمد ڈھیل میں پڑ جائے تو اُس کے مقابلے کے لیے کافی تیاری کر لی جاسکے۔ اس وقت خاص

قلعۂ شاہی (ارک بیجاپور) پر حیدر خاں مقرر تھا۔ بارہا اس قلعہ کی قلعداری پر جھگڑا ہو چکا تھا جو وکیل السلطنت ہوتا وہ اپنے آدمی کو یہاں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب تک قلعہ قابو میں نہ ہو بھلا اپنی حفاظت کا کیا یقین، مگر اخلاص خاں کی بد قسمتی سے حیدر خاں، دلاور خاں کا دوست اور عزیز تھا جس زمانے میں حبشی یک جان و یک قالب تھے یہ اُس وقت کا مقرر کیا ہوا آدمی تھا، اب جو ان میں آپس میں بگڑ گئی تو ان کی پارٹی میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ حیدر خاں اپنی عزیز داری کی بنا پر دلاور خاں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا اس طرح دلاور خاں اگر ایکدم سر پر آن پہنچے تو اخلاص خاں اُس کے پنجے میں تھا۔ اس وقت اخلاص خاں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کسی طرح حیدر خاں کو معزول کر کے اُس کی جگہ پر کسی اپنے آدمی کو فائز کر دے تاکہ قلعہ اپنے قابو میں رہ سکے۔ اس کے لیے تھوڑی مہلت کی ضرورت تھی، مگر دلاور خاں، حیدر خاں کی موجودگی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ اب اُس کی کوشش یہ ہوئی کہ حیدر خاں کے نکالے جانے سے پہلے ہی وہ بیجاپور پہنچ جائے۔ اس لیے برق و باد کی مانند مہینوں کی راہ دنوں میں طے کرتا ہوا دس روز کا راستہ پانچ روز میں قطع کر کے بیجاپور آ پہنچا۔ ہر روز اور ہر منزل پر برابر اُسے شاہی حکم (جو دراصل اخلاص خاں کے حکم تھے) پہنچتے تھے کہ وہ توقف کرے۔ مگر اُس نے ان کی پروا نہ کی۔ جب بیجاپور کے قریب پہنچا تو اُسے ایک تاکیدی حکم ملا کہ وہ آج شہر میں داخل نہ ہو بلکہ دوسرے روز اپنے سفر کی تکان دور کر کے آستاں بوسی کا شرف حاصل کرے۔ دلاور خاں جانتا تھا کہ یہ سب اخلاص خاں کی چالیں ہیں اور محض مہلت لیکر اپنے کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ برابر اُس کے وار خالی دے رہا تھا۔ اب جبکہ اُسے یہ تاکیدی حکم ملا تو اُس نے جواباً کہلا بھیجا کہ آج ہی آستاں بوسی کا شرف حاصل کرنا ہمارے لیے باعث سعادتمندی ہوگا، اس لیے تاخیر کی گنجایش نہیں۔

جب دلاور خاں آ ہی گیا تو اخلاص خاں کو ظاہرداری کی خاطر سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ وہ اُس کے استقبال کو جائے جیسے کہ ایک کامیاب جنرل کے استقبال کو حکومت کے نمایندے جاتے ہیں اور اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

دلاور خاں کا خیر مقدم امرائے حبش کے اختلافات

اخلاص خاں نے بادشاہ کو ہمراہ لیکر دلاور خاں اور دیگر سرداران فوج کا طوعاً و کرہاً استقبال کیا اور بڑی عزت و توقیر کے ساتھ اُن کو شہر میں لایا۔ ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں خوش کیا گیا۔ گریہ سب ظاہری نمایش تھی، اندرونی طور پر فسادوں اور رنجشوں کا مواد پک رہا تھا اور محض ایک ٹیس کی ضرورت تھی کہ بہ نکلے۔ نہ صرف اخلاص خاں و دلاور خاں، بلکہ ہر شخص اپنی جگہ سمجھا ہوا تھا کہ یہ ظاہرداریاں

زیادہ عرصے تک چل نہیں سکتیں۔ اِس وقت حکومت اور اقتدار کے دعویدار دو شخص تھے! اور ان میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہونا ضروری تھا۔ یوں تو حمید خاں بھی ان دو کے علاوہ امیدوار تھا، مگر حقیقی کشمکش دراصل دلاور خاں اور اخلاص خاں کے درمیان ہی تھی حمید خاں کی اگر کچھ اہمیت تھی تو یہی کہ وہ جس کسی کا بھی ساتھ دے گا اُس کا پلّہ اُس کے دشمن کے مقابل میں بھاری ہو جائے گا۔ دلاور خاں چونکہ ہشیار اور بلا کا سیاس واقع ہوا تھا، حمید خاں کی اہمیت کی جو خاص نزاکت تھی اُس کو تاڑ گیا چونکہ اُس کا اصلی رقیب اور مد مقابل اس وقت اخلاص خاں تھا جس کو وہ ہٹانا چاہتا تھا اس لیے اُس نے حمید خاں سے دوستی پیدا کر لی اور دوستی کو استوار کرتا گیا! اوپر کسی جگہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اُسکی ابتدا سے پالیسی یہی تھی کہ کسی طرح ان دونوں کو لڑا کر کمزور کر دے اور پھر خود قابض ہو جائے۔ اب چونکہ اخلاص خاں سے مخالفت بھی بڑھ گئی تھی اس لیے حمید خاں کو اپنا کر کے اُسے اخلاص خاں کے خلاف اکسانے لگا۔ اخلاص خاں بیوقوف بھی تھا کہ موقع کی اہمیت کا پورا پورا احساس نہ کر سکا، اور عین اُس زمانے میں جبکہ دلاور خاں اُس کے خلاف ہو گیا تھا اُس نے حمید خاں سے بھی لڑائی مول لی۔ حالانکہ اُسے چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے نازک موقع پر اُس کی ہر طرح دلجوئی کرتا اور تالیف قلب کے ذریعہ اپنا بنا رکھتا۔ یہ تو کچھ سوجھی نہیں الٹے حمید خاں کو بھی دشمن بنا لیا۔ رفتہ رفتہ اخلاص خاں اور حمید خاں کی بُری طرح ٹھن گئی، اور بگڑی بھی ایسی کہ توپ و تفنگ کی نوبت آگئی! ورنہ معاملہ بالکل معمولی تھا۔ محض کچھ ہاتھیوں پر جھگڑا تھا، اور کچھ یہ کہ اخلاص خاں نے جاگیریں زیادہ داب رکھی تھیں۔ یہ اس کی سراسر زیادتی تھی۔ چاہیے تھا کہ تینوں میں علی السویہ تقسیم کر دیتا۔ اخلاص خاں کو چاہیئے تھا کہ حمید خاں اور دلاور خاں کے مطالبے پورے کر دیتا۔ مگر ضدی اور ہٹیلا بلا کا تھا جو کہہ گیا سو کہہ گیا! برابر اپنی ضد پر قایم رہا۔ حمید خاں اور دلاور خاں تو یہاں تک بھی راضی ہو گئے کہ "ایک لاکھ" کی جاگیر وہ اُن دونوں سے زیادہ اپنے دسترخوان کے خرچ کے طور پر لے سکتا ہے مگر اس سے زیادہ نہیں! اخلاص خاں کسی قسم کے شرایط بھی سننے کے لیے آمادہ نہ تھا، اُس کے ضدی پن نے اُس کی عقل و ہوش کو سلب کر لیا تھا، اس ذرا سے معاملے کو اتنا طول دیا کہ لڑائی کی نوبت پہنچ گئی۔ لڑائی زیادہ تر حمید خاں اور اخلاص خاں کے درمیان تھی اور دلاور خاں کبھی مُنہ نہ آتا تھا، مگر اس فتنہ و فساد کی آگ کو اور زیادہ مشتعل کرنے میں برابر دلچسپی لے رہا تھا۔ کارروائی تو پوری کئے گیا مگر آخر وقت تک پس پردہ رہا! دھر اُس کو کچھ سمجھاتا اور ادھر اس کو کچھ نتیجہ یہ ہوا کہ حمید خاں اپنے گھر بیٹھ گیا۔ اُدھر اخلاص خاں نے بھی اپنے گھر کی

قلعہ بندی کرلی طرفین سے توپیں سر ہونے لگیں۔ اس آپس کی پیکار میں بیچارے راہ چلتے شہری زخمی ہو جاتے تھے یہ کشمکش اور خانہ جنگی کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ اس کے تباہ کن اثرات ونتائج کا اندازہ اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کو ابراہیم زبیری نے اس خانہ جنگی کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "ہر روز از ہر طرف توپ و دیگر آلات حرب در کار بود۔ مردم فقیر مسکین و رعیت درمیان جنگ ایشاں پامال حوادث می گشت چنانکہ یک روز مولانا دوست محمد استر آبادی در دکان سوداگر نشستہ بود کہ گولۂ توپ از جانب اخلاص خاں بر شش نفر از نفران مولانا مشار الیہ رسید۔ یکے بر دیگرے خوردہ از ہم پاشیدہ ہلاک گشتند۔" غرض اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے امن پسند رعایا مفت میں پس رہی تھی۔ جب یہ جھگڑا طول کھینچنے لگا ملک کے بعض سر برآوردہ لوگوں نے اس امر کی کوشش کی کہ صلح ہو جائے۔ مگر اخلاص خاں کی ضد نے کام بننے نہ دیا اور دوسرے دلاور خاں بھی اس صلح کو دل سے پسند نہ کرتا تھا۔ گو بظاہر اُس نے بھی پیشقدمی کی چنانچہ رفیع الدین شیرازی صدر جہاں و شیخ سالم، مولانا دوست محمد خاں وغیرہ اخلاص خاں کے پاس مصالحت کی غرض سے گئے۔ اُسے بہتیرا سمجھایا، سلطنت کی حالت بتلائی، دشمنوں کا چاروں طرف دانت لگائے بیٹھنا ظاہر کیا اور یہ بتلایا کہ یہ موقع لڑنے جھگڑنے کا نہیں آپس میں صلح کرلینی چاہیئے۔ مگر ان کوششوں کا کوئی سودمند نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

معاملات بگڑتے ہی گئے، توپیں سر ہوتیں، تیر و تفنگ سے کام لیا جاتا اور ہر طریقے سے بدامنی پیدا ہو رہی تھی۔ رنجشوں کا ایک سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ کشمکش جاری رہی، ہاتھیوں پر جھگڑے، ملک کی کمی زیادتی پر جھگڑے، اختیارات پر جھگڑے۔ غرض کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر کہ ایک دوسرے کو کچھ اعتراض نہ ہوتا جتنی کہ دربار میں آتے تو مسلح آدمیوں کو ساتھ لاتے، اور خود مسلح رہتے۔ یہاں تک بدگمانی بڑھی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے پر قطعاً اعتبار نہ کرتا تھا۔ بالآخر اس طولانی نفاق نے اپنا رنگ جمایا اخلاص خاں دن بدن کمزور ہوتا گیا، اُس کی ضد نے اُس کے بہت سارے دشمن بنا دئے۔ وہ لوگ بھی اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے جو ابتداءً اُس کے ساتھی تھے چنانچہ عین الملک و آنکس خاں بھی حمید خاں و دلاور خاں سے آملے جو اب تک اخلاص خاں کا ساتھ دے رہے تھے اُس کے لوگوں نے یہاں تک کنارہ کشی اختیار کی بالآخر وہ بیچارہ یکا و تنہا رہ گیا اب اس وقت حمید خاں اور دلاور خاں میں خوب اتفاق تھا اور ان دونوں کا پلہ بھاری تھا۔ آخر کار دلاور خاں نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور اخلاص خاں کے

گھر کو گھیر لیا۔ اخلاص خاں یہ جانتا تو تھا ہی کہ آثار کچھ ٹھیک نہیں جب دلاور خاں نے یہ کارروائی کی تو پریشان ہو گیا اور خفیہ طور پر کسی صورت سے اپنے بچوں کو لیکر حمید خاں کے گھر آیا کہ اُس سے کچھ مدد طلب کرے۔ مگر بُرے وقت کا کون ساتھی ہوتا ہے، دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے ہی اخلاص خاں پر جلا بیٹھا تھا، بھلا اس وقت کیا سیدھے منھ بات کرتا۔ رُخ کر کے ایک بات نہ کی، البتہ سرسری طور پر اتنا ضرور کہہ دیا کہ اُس کی جان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچایا جائے گا، اور مکہ معظمہ جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اخلاص خاں کو تھوڑا بہت اطمینان تو ہو گیا مگر پھر بھی دلاور خاں کی جانب سے خدشہ تھا کیونکہ یہ وعدہ تو حمید خاں نے کیا تھا، اور اخلاص خاں یہ جانتا تھا کہ جب اقتدار دلاور خاں کے ہاتھ میں آجائے (جو کہ آنا لازمی ہے) تو پھر حمید خاں کس شمار و قطار میں۔ اسی وجہ سے وہ پورے طور پر مطمئن نہ ہوا۔

ادھر دوسرے روز حمید خاں اور دلاور خاں نے دربار میں اپنی حاضری بتائی اور وہاں بادشاہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس باریابی کے معنی یہ تھے کہ سرکاری طور پر اقتدار اخلاص خاں کے ہاتھ سے نکل کر دلاور خاں اور حمید خاں کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے بعد دلاور خاں نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام شہر کے محافظین اور پہرہ داروں کو احکام روانہ کر دئیے کہ شہر کے تمام دروازے بند کر دئیے جائیں، اور اخلاص خاں کو فرار ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے۔

اخلاص خاں کی گرفتاری اور قید کیا جانا۔

اخلاص خاں نے اس عرصے میں پھر ایک بار حمید خاں کو اپنا بنانے کی کوشش کی اور اُس کے گھر پر آیا۔ مگر دلاور خاں کے آدمیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اُسے بادشاہ نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مرحمت فرمادی ہے، وہ سفر کی تیاریاں کر رہا ہے اور جلد از جلد عازم حرمین و شریفین ہو جائیگا اخلاص خاں کو تو جان کے لالے پڑے تھے اُس نے اسی کو غنیمت جانا اور سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا، مگر اُس غریب کی قسمت میں بیجاپور سے صحیح و سلامت جانا نہیں لکھا تھا۔ سرکاری طور پر احمد خاں کو اخلاص خاں کے ساتھ اُسے سرحد تک پہنچانے کے لیے مقرر کیا گیا، مگر حقیقت میں اُس کے مقرر کئے جانے کا کچھ اور ہی مقصد تھا جو ابھی ظاہر ہوتا ہے! احمد خاں دراصل دلاور خاں کا سکھایا پڑھایا تھا۔ دلاور خاں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اخلاص خاں صحیح و سلامت اُس کے پنجے سے نکل جائے۔ اس لیے اُس نے یہ تدبیر اختیار کی تھی جب اخلاص خاں احمد خاں کی معیت میں مرتضیٰ آباد (مریچ) پہنچا تو احمد خاں نے اُسے مزید سرکاری حکم سنائے۔ وہ احکام یہ تھے کہ جب تک بارش کا

موسم ختم نہ ہولے اخلاص خاں دریا کے سفر کا ارادہ نہ کرے! ور مناسب موسم کے انتظار میں چند سے یہیں (یعنی مرتضیٰ آباد مرج) میں قیام گزیں رہے۔ ان احکام کا سُننا ہی تھا کہ اخلاص خاں کی روح سرد ہوگئی۔ وہ بچہ بھی نہ تھا کہ اُس کا اصلی مقصد نہ سمجھتا اور دلاور خاں کی چالبازیوں کو نہ تاڑ لیتا۔ یہ حکم اُس کے لیے حبس دوام کے حکم سے کچھ کم نہ تھا۔ یہ دلاور خاں کی عیاری اور چالاکی تھی کہ عین شہر میں اخلاص خاں کے ساتھ کچھ بُرا سلوک نہیں کیا بلکہ اپنی سفاکی کو ایک تدبیری جامہ پہنا کر اس طرح اخلاص خاں کو مرتضیٰ آباد مرج میں قید کروادیا۔ اور دراصل احمد خاں روانہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ وہ اخلاص خاں کو مرج سے ایک قدم آگے بڑھنے نہ دے بلکہ یہیں قید کر دے چنانچہ اس پر عمل ہوا، اخلاص خاں قید کر دیا گیا اور تھوڑے دنوں کے بعد دلاور خاں کے حکم سے ہی اُسے اندھا بھی کر دیا گیا۔ دلاور خاں کے عہد اقتدار تک (جو ہشت سالہ دور ہے) اخلاص خاں مع اہل و عیال کے قلعہ مرج میں قید رہا۔ جب ابراہیم نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اخلاص خاں کو بھول نہیں گیا بلکہ اُس کو اور اُس کے بچوں کو رہائی عطا کی۔ بیجاپور طلب کیا، اور کچھ سرکاری طور پر وظیفہ مقرر کر دیا کہ وہ اور اُس کا خاندان آسودگی سے زندگی بسر کر سکے۔ اخلاص خاں کا انتقال ۱۰۲۰ھ میں ہوا۔

اخلاص خاں کا دورِ حکومت اور کیریکٹر۔	اس طرح اخلاص خاں کا دورِ حکومت ختم ہوتا ہے دو سال تک اس نے بحیثیت ریجنٹ کے حکومت کی۔ بدنسبت دوسرے متولیوں کے جو اس سے پہلے

گزر چکے تھے اس نے زیادہ عرصے تک حکومت کی! اس کے دور میں بیجاپور میں نہ صرف خانہ جنگیاں ہوئیں بلکہ بیرونی حملوں کا بھی ایک طویل سلسلہ جاری رہا! اس طریقے سے یہ مختصر سا زمانہ نہایت پُرآشوب ہے۔ اس عرصے میں وہ زمانہ بھی شریک ہے جبکہ اخلاص خاں حقیقی معنی میں وکیل السلطنت نہ تھا بلکہ ابوالحسن اُس کی جگہ پر کارفرما تھا۔ لیکن ابوالحسن کے بعد پھر وہ حسب سابق مقتدر ہو گیا! اس کی طبیعت کی تیزی اور ہٹیلے پن نے اس کو بہت نقصان پہنچایا، ورنہ یہ ممکن تھا کہ وہ اور زیادہ عرصے تک حکومت کرسکتا۔ بیجاپوری محاصرے کے وقت اس نے بڑے ایثار سے کام لیا کہ خود بخود اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستعفی ہو گیا اور ابوالحسن کو حکومت کا موقع دیا! اگر وہ اس وقت بھی جبکہ حالات اُس کے خلاف

ہو رہے تھے اسی طرح از خود مستعفی ہو جاتا جیسا کہ اس سے پہلے کیا تھا تو شاید اُسے یہ بُرا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر دلاور خاں کی چالبازی، ہشیاری اور عیاری نے اُسے پنپنے نہ دیا۔[لہ]

لہ۔ اخلاص خاں کے زوال کے متعلق یا زیادہ صحیح طور پر اخلاص خاں جس طرح کہ دلاور خاں کے پنجے میں پھنسا ہے اُس کے متعلق اوپر جو تفصیل دی گئی ہے وہ زیادہ تر تحفتہ الملوک و بساتین السلاطین سے لی گئی ہے۔ مگر تاریخ فرشتہ میں اس کے خلاف واقعات درج ہیں۔ چنانچہ وہ یہ لکھتا ہے کہ دلاور خاں قطب شاہیوں کو شکست دینے کے بعد خود وکیل السلطنت ہونا چاہتا تھا۔ اور اخلاص خاں کو معزول کرنے کی فکر کرنے لگا اس لیے اُس نے حیدر خاں قلعدار کو مواعید دلفریب اور عہد میثاق کے ذریعہ اپنا ہمخیال کر لیا۔ اس کارروائی کو تکمیل کو پہنچا کر وہ حسن آباد گلبرگہ سے بیجاپور آیا۔ جب اللہ پور کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنے آدمیوں کو اخلاص خاں کے ہاں روانہ کیا۔ چنانچہ فرشتے کے الفاظ ہیں "متعلقان معتمد خود را نزد اخلاص خاں فرستادہ تقریبات انگیختہ چنداں لوازم اخلاص و اعتقاد و شرایط و چاپلوسی بتقدیم رسانید کہ او غافل مطلق شدہ دلاور خاں را جز و ضعیف عاجز دانستہ و از رعایت حزم دور افتادہ در محافظت و ضبط شہر و قلعہ نکوشید۔" اسطرح اخلاص خاں نہ صرف غافل ہو گیا بلکہ دلاور خاں کو کہلا بھیجا کہ موقع ملتے ہی حضور میں باریاب کروا دوں گا۔ دلاور خاں نے جب دیکھا کہ اخلاص خاں بالکل غافل ہو گیا ہے تو سات ہزار فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر قلعۂ ارک پر قبضہ کر لیا۔ جہاں پر حیدر خاں نے حسب وعدہ کوئی مزاحمت نہ کی۔ دلاور خاں نے چاروں طرف اپنے آدمی مقرر کر دئیے، بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور باریابی بھی حاصل ہو گئی جس وقت دلاور خاں شہر میں داخل ہوا ہے اخلاص خاں دیوانداری کے کام سے فراغت پا کر اپنے گھر میں آرام کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اُسے معلوم ہوا کہ شہر میں ایک کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ فوراً تین چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلاور خاں کے مقابلے کو نکلا۔ لیکن دلاور خاں کی فوج کی گولیوں کی بوچھار نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ چار مہینے تک اخلاص خاں نے

اُس کے کیرکٹر کے متعلق یہ بات صاف اور صریح طور پر واضح ہے کہ جس وقت اُس کے ہاتھ میں اقتدار آیا اُس میں سفاکی اور ظالمانہ اوصاف بھی سرایت کر گئے چونکہ اُس نے اپنے زمانے میں اپنے دشمنوں کے ساتھ کبھی رحمدلی کا سلوک نہیں کیا تھا اس لیے وہ رحمدلی کے سلوک کا مستحق بھی نہ تھا۔ کشور خاں کے اہل و عیال کے ساتھ وہ جو سلوک کرنا چاہتا تھا وہ اس کے کیرکٹر کے ایک شرمناک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اُس کی یہ کوتاہ ظرفی و کینہ پروری پر دال ہے کہ وہ اپنی اُس مخاصمت کو جو اُسے کشور خاں سے تھی اُس کے بیگناہ عورتوں اور بچوں پر نکالنا چاہتا تھا۔ آدمی نہایت تندمزاج، غصیلا، ضدی اور اپنی ہٹ کا تھا، مگر اُس کے ساتھ ہی بہادر، وفادار اور نمک حلال بھی تھا اس نے مالک کے ساتھ کبھی بدخواہی نہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی طبیعت کی کمزوریوں کی

(بسلسلۂ گزشتہ) شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور فریقین میں جنگ ہوتی رہی۔ بالآخر اخلاص خاں کے ساتھی اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ چنانچہ بلبل خاں حبشی نے جو کسی زمانے میں مصطفیٰ خاں اردستانی کے خاص ملازمین میں سے تھا اور اُس کے قتل کے بعد سے اخلاص خاں کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر لیا تھا، عین اُس موقع پر بے وفائی کی اور دلاور خاں سے مل گیا جس کی وجہ سے اُسکی طاقت میں اضافہ ہو گیا اور اخلاص خاں کمزور پڑ گیا۔ اخلاص خاں میں اب مقاومت کی تاب نہ رہی، مگر پھر بھی وہ بھاگنے کو عار سمجھتا تھا اس لیے نہ بھاگا۔ دلاور خاں نے اُسے گھیر کر پکڑ لیا اور اندھا کروا دیا۔ اس طرح فرشتہ اور بساتین السلاطین و تحفۃ الملوک کے بیانات میں اخلاص خاں کے زوال کے متعلق اختلاف ہے۔ رفیع الدین شیرازی کا بیان مصدقہ معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اس وقت یہاں پر موجود تھا اور فرشتہ ان واقعات کے بعد بیجاپور آیا ہے۔ اس وجہ سے تحفۃ الملوک اور بساتین السلاطین کے بیان کو (جو تحفۃ الملوک کی پیروی کیا کرتا ہے)، ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہاں پر یہ بھی لکھ دینا چاہیئے کہ گو واقعات میں کچھ اختلاف ہے مگر کوئی اہم اختلاف نہیں۔ ملاحظہ ہو (فرشتہ، بساتین السلاطین، تحفۃ الملوک)۔

وجہ سے وہ ملک کو زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکا۔ بلکہ الٹے خانہ جنگیوں اور بیرونی مشکلات کا باعث ہوا۔

جدید نثر کے بانی

(۱)

جدید نثر کی پیدائش کا بھی تقریباً وہی زمانہ ہے جو جدید نظم کا ہے ۔ ۱۸۳۶ء میں سرکاری زبان بجائے فارسی کے اُردو قرار پائی سینکڑوں عدالتی الفاظ اور اصطلاحیں پیدا ہونا شروع ہوئیں ۔ مدعی ۔ سمن ۔ ازالہ حیثیت عرفی وغیرہ اکثر الفاظ اسی عہد کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں ۔ سرکاری مدارس کے کورس کی کتابیں بھی تیار ہونا شروع ہوئیں ۔ یہ زیادہ تر مغربی طرز پر لکھی جاتی تھیں (ان میں اکثر ترجمے تھے) ان کے لیے بھی بہت سے نئے الفاظ تراشنے پڑے ۔ طرز بیان میں سادگی کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تکلف یکقلم موقوف کر دیا گیا اور بے ساختگی نے اس کی جگہ لے لی ۔ اسی سلسلے میں اخباروں کو آزادی ملی ۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے اُردو نستعلیق ٹائپ پیش کیا جا چکا تھا مگر مصارف کی زیادتی کی وجہ سے لوگ اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے ۔ پھر ۱۸۳۷ء میں لیتھو کا رواج بھی ہو گیا ۔ جس سے تصنیف و تالیف کی اشاعت میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں ۔ ۱۸۴۸ء میں تقریباً بارہ چھاپے خانے لکھنؤ میں موجود تھے ان میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں ۔ مطابع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نولکشور نے اپنا مطبع جاری کیا ۔ جس کی بدولت فارسی ۔ عربی ۔ سنسکرت اور ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھیں ۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہنچے تعلم و تعلیم کی ارزانی ہو گئی ۔ قرآن شریف باترجمہ ۔ حدیث ۔ تفسیر ۔ فقہ وغیرہ جملہ علوم اہل اسلام و نیز وید پران بیدک وغیرہ علوم ہنود یکساں طور پر فراخدلی سے شایع کئے گئے[۱] ۔

طباعت کی آسانیوں اور اخبار کی آزادی کے نتیجے کے طور پر ملک میں متعدد اخبارات شایع ہونا شروع ہوئے ۔ اُردو اخبار اور سید الاخبار اُردو کے پہلے اخبار ہیں ۔ موخر الذکر میں سر سید کے مضامین اکثر شایع ہوتے رہتے تھے ۔ سر سید ہی وہ پہلے

---

[۱] ۔ تاریخ ادب اُردو حصۂ نثر صفحہ ۷۳ ۔

شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے علمی باتیں سادہ زبان میں لکھنا شروع کیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اگر سر سید اس کی ابتدا نہ کرتے تو سادہ نگاری کی ابتدا ہی نہ ہوتی کیونکہ انگریزی اثرات جو روز افزوں طور پر پڑ رہے تھے ان کا لازمی نتیجہ یہی تھا لیکن سر سید کی پیش بینی نے سادہ نگاری کی ابتدا کا سہرا ان کے سر باندھا۔

دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی مخصوص پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنے جیسا جوش و خروش اور صداقت و راست بازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سر سید کا تھا۔ ان کے رفیقوں کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا شرف رکھتے تھے یہ ہیں:۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین۔

۲
نثاران اردو

انیسویں صدی کے اختتام پر اردو نثر کافی نشو و نما پا چکی تھی۔ دہلی کالج کے فارغ التحصیل طلبا، سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر، مضمون نگاران تہذیب الاخلاق و اودھ پنچ وغیرہ جدید خیالات کا اظہار سیدھی سادی زبان میں کرنے لگے تھے۔ اور فلسفہ سائنس کی بعض کتابیں، اور دیگر علوم و فنون تیزی کے ساتھ اردو کے قالب میں آرہے تھے، اس سلسلے میں سر سید اور ان کے رفقاء کے کارنامے آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں آزاد سا انشا پرداز اردو کو نواز چکا تھا۔ سید احمد فرہنگ آصفیہ کی تالیف سے زبان پر احسان عظیم کر چکے تھے انگریزی تعلیم ملک میں عام ہو چکی تھی اور نہایت سرعت کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کا لازمی اثر خیالات اور ادبی رجحانات پر ہو رہا تھا۔

مولوی عبد الحلیم شرر پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اردو زبان میں نئے طرز کے خالص ادبی مضامین اور ناول لکھنا شروع کئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول سے اردو کو روشناس کرا دیا تھا، اور نذیر احمد نے بھی اس قسم کی کوششیں کی تھیں لیکن شرر نے ناول نگاری میں خاص طور پر مہارت حاصل کی۔ اس کے باوجود بھی شرر کے ناول بعض حیثیتوں سے ناقص ہیں۔

یہ عام طور پر کردار کا صرف ایک پہلو پیش کرتے ہیں، اعلیٰ طبقے کے علاوہ ان کی دنیا میں کوئی رہتا ہی نہیں اس سے بھی

بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کے ملک عزیز، منصور، عمرو، زہیرا ور دوسرے ہیرو بالکل یکساں کردار کے ہوتے ہیں۔ سوا نام کی تبدیلی اور بعض مرتبہ حلیہ کی ذراسی تبدیلی کے ان میں کوئی اور فرق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان کی ہیروئن ہمیشہ وہی ایک لڑکی ہوتی ہے۔ یہاں تواکثر حسن صورت اور حسن سیرت دونوں کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ان کے اسلوب کی شگفتگی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے مگر نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ بیسیوں صفحے پڑھتے چلے جاؤ مگر کوئی فقرہ یا جملہ ایسا نہیں ملتا جس کو دیکھ کر جی چاہے کہ دل میں اُتار لو اور حفظ کرلو۔

سچ تو یہ ہے کہ اپنے موضوع کی وجہ سے شرر کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ تاریخ اسلام کے فراموش شدہ ٹکڑے جب یاد دلائے گئے تو ملک میں عام طور پر ان کے مطالعے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی ہر دلعزیزی کی بناء صرف اسلامی تاریخ کے ناشر ہونے پر ہے۔ دراصل والٹر اسکاٹ کی طرح وہ ہم کو جس چیز سے متعارف کراتے ہیں اس کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اس قدر تصرف رکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دل میں جس قسم کے جذبات چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (کسی ناول نگار کا یہ کمال کچھ کم نہیں) یہ اور بات ہے کہ ان کے ناول زندگی سے بہت زیادہ قریب نہیں ہوتے اور انھوں نے کسی ایسے کردار کی تخلیق نہیں کی جس کو زمانہ یاد رکھے۔

ہمارے خیال میں شرر کو زندہ رکھنے والے صرف ان کے مضامین ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریزی انشاپردازی کی خوبصورت بندشوں کو اُردو میں داخل کیا مگر تشبیہیں اور استعارے وہی پرانے ایشیائی رکھے۔ انھوں نے خیالی مضامین کو لیا اور ان میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجب خوبصورتی سے انھیں اُردو میں کھپا دیا۔

شرر نے ہی دراصل وہ زبان شروع کی جو جدید اُردو کہلاتی ہے بحیثیت مجموعی وہ متین، محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے شاعرانہ خیال آفرینی کی حیثیت میں وہ شاعری کے رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبا ہوا ہے۔[۱]

یہ مضامین جو دلگداز میں چھپے تھے سید مبارک علی تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدوں میں "مضامین شرر" کے

---

[۱] تاریخ ادب اُردو حصہ نثر صفحہ ۱۳۳ و ۱۳۴۔

نام سے حال ہی میں شایع کئے ہیں۔

یوں تو ان کی ہر تصنیف قابل مطالعہ ہے مگر علی الخصوص قدیم لکھنؤ کے حالات پر جو مضمون "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے لکھا خاص طور پر قابل قدر ہے۔ یہ کتابی صورت میں شایع ہو چکا ہے۔ ان کی جملہ تصانیف اس کثرت سے ہیں کہ ان کی مکمل فہرست دینا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔ یہاں ان کے جاری کردہ اخبارات و رسائل اور ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد باعتبار مضامین تاریخ ادب اردو سے نقل کی جاتی ہے:۔

اخبارات و رسائل

(۱) محشر ہفتہ وار	(۵) اتحاد پندرہ روزہ
(۲) دلگداز ماہوار	(۶) العرفان ماہوار
(۳) مہذب ہفتہ وار	(۷) دل افروز ماہوار
(۴) پردۂ عصمت پندرہ روزہ	(۸) ظریف ہفتہ وار

تصانیف

خیالی ناول	(۱۴)	تاریخ مثلاً تاریخ سندھ وغیرہ	(۱۵)
تاریخی ناول	(۲۸)	نظم و ڈراما مثلاً شہید وفا وغیرہ	(۶)
سوانحعمریاں	(۲۱)	متفرق	(۱۸)

جملہ (۱۰۲)

اگر انیسویں صدی آزاد۔ سرسید۔ حالی۔ نذیر احمد۔ شبلی۔ ذکاء اللہ وغیرہ اہل قلم پر فخر کر سکتی ہے تو بیسویں صدی کا سر بھی مولوی عبدالحق۔ سر عبدالقادر۔ حسن نظامی۔ سید سلیمان۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ مہدی حسن افادی۔ ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں کی وجہ سے اس کے سامنے بلند رہے گا۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن کے دم سے اردو نہ صرف علمی زبان بنی بلکہ دنیا کی مشہور زبانوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہوئی۔ زمانۂ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب قابل مدیر رسالۂ اردو اور آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو کا اسم گرامی خاص طور پر نمایاں ہے[1]۔ آپ کی زندگی کا

---

[1] تاریخ ادب اردو حصۂ نثر صفحہ ۴۸۔

بیشتر حصہ زبان اُردو کی خدمت میں صرف ہو چکا ہے۔ اکابر سلف کی زندہ مثال، سادگی پسند اور خاموش کام کرنے والوں میں میاں ہیں۔ ان کی قوت نقد بہت زبردست ہے۔

میں صاحب تاریخ ادب اُردو کی اس رائے سے کس طرح اتفاق کر لوں کہ آپ کا کوئی خاص طرز نہیں ہے۔ اگر طرز یا اسلوب کے معنی یہ ہیں کہ عبارت خواہ مخواہ رنگین بنائی جائے اس میں عربی، فارسی کے بے محل الفاظ اور ترکیبوں کا بیوند لگایا جائے تو بے شک ان کا کوئی خاص طرز نہیں لیکن اسلوب کے اگر یہ معنی ہیں کہ عبارت میں ایک خاص بات ہو، اور مصنف ہمیشہ اپنی تحریروں میں وہی انداز قائم رکھے اور وہ انداز بھی ایسا ہو کہ دوسرے اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھیں اور اس کی نقل نہ کر سکیں تو مولانا کے صاحب طرز ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر زور اس سلسلے میں لکھتے ہیں "کسی ادیب کی زبردست کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد دوربینی سے مستقبل قریب میں اپنے ملک اور ادبیت کے جو رجحانات ہوں ان کا صحیح اندازہ قائم کر لے اور پھر اس کے مطابق اپنے کارناموں کی تخلیق کرے۔ مولانا حالی نے اس تخلیق کی ابتدا کی اور مولوی عبدالحق نے اس کو اختتام پر پہنچایا"[1] درحقیقت مولانا کا طرز تحریر حالی سے کہیں زیادہ شگفتہ ہے۔ حالی اکثر انگریزی الفاظ اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ مگر مولانا انگریزی کا خیال بھی ظاہر کرتے وقت نہ تو عبارت میں گنجلک پیدا ہونے دیتے ہیں اور نہ کہیں انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مولانا جب کسی فضا میں قدم رکھتے ہیں تو اس پر پورے طور سے حاوی ہو جاتے ہیں۔

دوسری خاص بات ان کے اسلوب میں یہ ہے کہ ہندی کے سُبک الفاظ کو ہرگز نہیں چھوڑتے۔ اور وہی لفظ جو اب تک عبارت میں استعمال نہیں ہوا تھا ان کی تحریر میں آکر ہیرے کی طرح چمکنے لگتا ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دراصل ایسے ہی اسلوب کو سادہ و پرکار کہا جاتا ہے ملاحظہ ہو:۔

"خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔۔۔ جو خیال جس طرح دل میں آتا ہے اسی طرح ٹپک پڑتا ہے نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور

---

[1] اُردو کے اسالیب بیان۔

اگر وہ ایسا دل ہے جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو
جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہو گی! اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا
چاہتے ہو تو آؤ دیکھو وہ پاک دل ان خطوط میں لپٹا ہوا ہے۔"

(مقدمہ مکتوبات حالی)

ہاں، یہ تو بھول ہی گیا تھا کسی کتاب پر مقدمہ لکھنا یوں تو ایک مدت سے اُردو زبان میں رائج ہے،
مگر عام طور پر اس کے باقاعدہ اصول کا لحاظ بہت کم کیا جاتا تھا۔ مولانا نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی
اور اس شد و مد سے کی کہ ان کے مخالفین بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں ان کے حلقے میں وہ "مقدمہ باز" کے لقب
سے یاد کیے جاتے ہیں۔

سلیم مرحوم بھی حالی کے اسکول کے پیرو تھے اور بعض کا خیال ہے کہ اُن کی عبارت میں مولوی عبدالحق سے
زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ وضع اصطلاحات ہمارے سامنے ہے مگر اس میں کسی مقام پر اس نام نہاد جوش خروش کا
پتہ نہیں ملتا بہر حال ان کے محسن اُردو ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

سر عبدالقادر کا نام مخزن کے اجرا اور اقبال کو اُردو میدان میں پیش کرنے کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔
سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک مخزن آپ کی ادارت میں نکلتا رہا۔ مخزن کا یہ دور ہمیشہ یادگار رہے گا اور اس کے مضامین
ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ مخزن نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اُردو سے مانوس کرنے کا اہم کام انجام دیا۔
اس سلسلے میں منشی دیا نراین نگم کا ذکر بھی ضروری ہے "دنیائے جریدہ نگاری میں کون اس نام سے واقف نہیں"[1]
زمانہ جس کی ادارت آپ کے ہاتھ میں ہے اُردو کا قدیم ترین زندہ پرچہ ہے اس کا شمار اُردو کے ان چند مخصوص
پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ نگم صاحب کے مضامین جب نکلتے ہیں نہایت
اچھے تلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ وہ بہت کم لکھتے ہیں۔

لالہ سری رام کا زندہ جاوید کارنامہ ان کا تذکرہ ہزار داستان معروف بہ خمخانہ جاوید ہے۔ اس تذکرے میں

---

[1] تاریخ ادب اُردو صفحہ ۹۹۔

اس کثرت سے چھوٹے بڑے شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے کہ الف سے ش تک پہنچنے میں مصنف کو چار جلدیں لکھنی پڑیں۔ ان کی محنت کا کچھ اندازہ اُن کے کارنامے کو دیکھنے کے بعد لگایا جا سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد کا نام ادق اردو کو رواج دینے کی وجہ سے ہمیشہ لیا جائے گا۔ حالانکہ اس حلقے میں (نیاز۔ آزاد۔ یلدرم۔ عبداللہ عمادی اور بہت سے نئے بگڑے کم علم اخباری مضمون نویس) اُردو کو بالکل عربی یا فارسی کی طرف راغب کرنے کا جو رواج ہے اس سے اُردو کو بجائے فائدے کے نقصان ہی پہنچ رہا ہے۔ مگر موصوف نے اپنے "الہلال" میں سیاست اور مذہب کے مضامین لکھ کر اس طرز کا سب سے بہتر حق ادا کیا۔

اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ ہے جس میں حسن نظامی کی تحریر کا بانکپن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کی تحریروں میں غضب کی جاذبیت ہوتی ہے۔ اور واقعی ان کے مضامین پڑھتے وقت دل کا کنول کھلا رہتا ہے۔ جملوں کی برجستگی، ترکیبوں کی شوخی اور اسلوب کی سادگی ہر پڑھنے والے کو اپنے میں محو کر لیتی ہے۔

اسی طرح عبدالماجد دریابادی بھی ایک بانکے اسلوب کے مالک ہیں، ان کی عبارت میں رنگینی زیادہ ہوتی ہے۔ عربی، فارسی ترکیبیں خوشنمائی سے استعمال کرتے ہیں۔ مگر صرف اس حد تک جتنا کہ کھانے میں نمک۔ فلسفۂ اجتماع، تاریخ اخلاق یورپ۔ مکالمات برکلے وغیرہ ان کی مشہور تصنیفیں ہیں۔ ان کی ذات بھی اُردو کے لیے بسا غنیمت ہے۔

ظفر علی خاں سیاسی خیالات اور اخباری دنیا میں بہت مقبولیت رکھتے ہیں۔ ان کا ترجمہ معرکۂ مذہب و سائنس ایک قابل قدر کتاب ہے۔ اخبار زمیندار ان کے قلم کی جولانگاہ ہے مگر ہیجان آفریں اور اشتعال انگیز انداز میں لکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں اُردو نثاروں کی اس قدر کثرت ہے کہ ان سب کا ذکر کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ تاریخ ادب اُردو صفحہ (۹۲) سے لے کر نثاروں کی ایک فہرست یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"(۱) پنڈت بشن نرائن در آنجہانی (۲) مرزا جعفر علی خاں اثر (۳) احسن مارہروی (صاحب نمونہ منثورات) (۴) سلطان حیدر جوش (۵) رشید احمد صدیقی (۶) جلیل قدوائی (۷) مسعود حسن رضوی وغیرہ۔"

آج کل اُردو میں ظرافت نگاری کا بھی بہت رواج ہو گیا ہے۔ ملا رموزی، عظیم بیگ چغتائی، ایم اسلم، شوکت تھانوی، تمکین کاظمی۔ فرحت اللہ بیگ وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان میں فرحت اللہ بیگ دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے کی وجہ سے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ عام طور پر دوسرے حضرات زبردستی ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں، اور صرف دفع الوقتی کے لیے

ان کی تصانیف اگر پڑھی جائیں تو پڑھی جائیں حسن نظامی کو ان میں سے ایک بھی نہیں پہنچتا۔ "اودھ پنچ" کے اڈیٹر حالانکہ سجاد حسین مرحوم کے سے ظرافت کے ماہر نہیں ہیں پھر بھی اس زمانے میں بہت کچھ غنیمت ہیں۔

آغا حیدر حسن دہلی کے محاورات اور مستورات کی زبان خوب لکھتے ہیں۔

۳

اُردو ناول نگار

اکثر شرر اور سرشار کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ سرشار بھی اس زمانے میں اتنی ہی شہرت کے مالک تھے جتنی کہ شرر کی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں ایک ہی میدان کے مرد تھے۔ صاحب سیر المصنفین[1] نے مخزن ۱۹۰۶ء کے ایک نمبر سے کسی صاحب کا مضمون نقل کیا ہے اس میں سرشار اور شرر کا مقابلہ اچھی طرح کیا گیا ہے میں بھی اسی پر اکتفا کرتا ہوں:۔

فطرت انسانی کا علم جس قدر سرشار کے یہاں نمایاں ہے شرر کے ہاں اس کی مثال نہیں پائی جاتی۔ دونوں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں لیکن فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے سرشار کا پلہ بھاری ہے۔ سرشار کی نگاہ بالعموم ظاہری نمایش و آرایش کی طرف رہتی ہے اور عبارت آرائی اس کا خاص شیوہ ہے۔ تاہم اس کی ذہانت اسے زبردستی اس معراج پر پہنچا دیتی ہے جو کبھی شرر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہمیں شبہ ہے کہ آزاد اور خوجی جیسے آدمی دنیا میں کہیں مل سکیں۔ تاہم وہ آدمی ہیں ان کی رگوں میں انسانی خون دوڑ رہا ہے اور ان کے خیالات میں انسانیت کی بو بھی پائی جاتی ہے اس کے علاوہ ان میں کچھ ایسی کشش ہے کہ لامحالہ ہمارے دل پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ شرر کا کوئی کردار ایسا نہیں۔ سرشار کا ہر ایک کیرکٹر اپنی خصوصیت میں دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے۔ شرر کے تمام کردار ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اگر کوئی اختلاف ہوتا ہے تو صرف لباس کا۔ منصور کے جسم پر افغانی لباس ہے۔ عزیز ترکی بھیس میں ہے۔ زیاد عبا، قبا پہنے عرب کا سوانگ بھر کر سامنے آیا ہے۔ ان میں اتنی یکسانیت ہے کہ سب سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ شرر میں یہ بھی عیب ہے کہ وہ اپنی قوت مشاہدہ کا استعمال

---

[1] محمد یحییٰ۔

نہیں کرتے اور اپنی ذاتی رائے اور تعصبات کو جا و بیجا دخل دیتے ہیں! اور سرشار اپنے کرداروں کے پیچھے خود کو پورے طور پر چھپا لیتا ہے۔" [۱]

فسانۂ آزاد کا مطالعہ کرنے والا یہ ہرگز نہیں معلوم کر سکتا کہ مسلمانوں کی معاشرت کی تصویر کھینچنے والا ایک ہندو ہے۔ مگر شرر کے بہت سے ناول ان کو نہ صرف مسلمان بلکہ حنفی بھی ثابت کر دیتے ہیں۔ شرر کے سب ناول بلا استثنا تاریخی افسانے ہیں۔ تاریخی ناولوں کے علاوہ جو خیالی ناول ان کے قلم سے نکلے وہ ان کی شہرت میں کسی طرح کا اضافہ نہ کر سکے۔ بدر النسا کی مصیبت" اور "میوہ تلخ" میں شرر بہت پست نظر آتے ہیں۔ تاریخی ناولوں کے ذریعے سے اکثر غلط خیالات عوام میں رائج کرنے کا الزام شرر پر لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ شرر کو بعض باتوں میں سرشار پر فوقیت بھی حاصل ہے۔ سرشار کے ہاں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا، ان کا ناول در اصل ایک کھونٹی ہوتا ہے جس پر مختلف قسم اور مختلف ناپ کے رنگ برنگ کے کپڑے ٹنگے نظر آتے ہیں۔ اس معجون مرکب کا ذائقہ مجموعی طور پر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہر جز و فرداً فرداً نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی تصانیف ناول نویسی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ شرر ترتیب اور قصے کے اٹھان میں ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔

اسلوب بیان میں شرر کی تحریر محنت کا نتیجہ ہے اور آورد کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمہ شرر سے اچھی طرح کبھی نہیں لکھا گیا۔ مگر عام طور پر شرر کا اسلوب صاف اور سنجیدہ ہوتا ہے! ور نثر کہیں کہیں غور و فکر کا پتہ دیتی ہیں۔ اور ناول نویسی کے علاوہ علمی باتوں کے بیان کرنے میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرر کے ناقلوں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ سرشار کو نقل کرنا شفق اور قوس قزح کا رنگ اڑانے کی کوشش کرنا ہے۔ سرشار اپنی جدت کی وجہ سے "ممتنع الجواب" ہے اس لیے اس کا اثر اردو نثر پر بالکل نہیں پڑا۔ وہ ناول نویسی کے میدان میں ایک چھلاوہ ہے جو رہنمائی کے بدلے راہ راست سے دور لے جاتا ہے۔ برخلاف اس کے شرر نے نومشق مصنفوں کے لیے ایک نہایت قابل قدر نمونہ پیش کیا ہے جس کی تقلید اگر انھیں بلند نہیں کرے گی تو

---

[۱] سیر المصنفین حصۂ دوم صفحہ ۵۵۲ و ۵۵۳۔

ناکامی کے گڑھے میں بھی نہیں گرائے گی۔"

شرر کے ناول ظرافت کی چاشنی سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور سرشار ہم کو اکثر بہت ہنساتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم اس کے بہت زیادہ گرویدہ ہیں۔ خوجی کا نام سنتے ہی ہمارے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے، مگر شرر کا کوئی کردار ہمارا دل خوش نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ دبستان لکھنؤ کے ایک اور ادیب مرزا محمد ہادی رسوا نے شرر اور سرشار دونوں کے رنگوں کو اپنے ناولوں کے ذریعے زیادہ گہرا کر دیا۔ مرزا صاحب کی بہترین تصنیف "امراؤ جان ادا" ہے جس کو لکھے ہوئے تقریباً پچیس سال ہوئے ہوں گے۔ یہ اعلیٰ درجے کا ناول ہے اور اس کی عبارت بھی نہایت عمدہ ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ اس کا پلاٹ نہایت عمدہ، باقاعدہ اور منظم ہے۔ اور اس کے کردار صاف واضح طور پر نظر آتے ہیں اور ہم ان کو ذرا بھی اجنبی محسوس نہیں کرتے۔ رام بابو صاحب سکسینہ صفحہ (۳۸۱) پر لکھتے ہیں کہ "ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی، اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی" مرزا کے اکثر ناولوں کا یہی حال ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے یہ اردو کے تمام ناول نگاروں سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے تمام پلاٹ بہت باقاعدہ طور پر منظم ہوتے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

امراؤ جان ادا۔ ذات شریف۔ شریف زادہ۔ خونی عاشق (کسی دوسری زبان کے ناول کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر زبان کے لحاظ سے بے مثل ہے) خونی شہزادہ خونی مصور۔ بہرام کی رہائی۔ مثنوی صبح امید۔ نوبہار مرقع لیلیٰ مجنوں وغیرہ۔ ایک عرصے تک مرزا صاحب دارالترجمہ میں کام کرتے رہے مگر اس سے نہ تو اردو زبان کو کوئی خاص فائدہ پہنچا اور نہ خود ان کا کوئی کارنامہ عالم شہود میں آیا۔ بلکہ انھوں نے عمداً جو زبان فلسفہ اور منطق کی کتابوں میں استعمال کی وہ کسی صورت میں قابل تحسین نہیں کہی جاسکتی۔ اس قسم کی عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ عبارت سے پیری کا ضعف دماغ ظاہر ہے۔

> "امور متعددہ سے جو امر ذہن پر زیادہ موثر ہے یعنی زیادہ بسط یا قبض پیدا کرتا ہے اس کی تاثیر مرجح ہوتی ہے۔ جو امور عند الذہن حاضر ہیں ان میں اکثر کسی ایک واقعہ کی یاد آوری کی تاثیر کو بڑھا دیتے ہیں۔" (عالم رویا)

افسوس کہ ابھی تین سال ہوئے کہ مرزا ہم سے چھین لیے گیے۔ بہرحال ان کا وجود اردو کے لیے بہت غنیمت تھا اور ان کی علمیت کے بہت کم ادیب اردو کو نصیب ہوئے ہیں۔

حکیم محمد علی کا بھی انتقال سات آٹھ برس ہوئے کہ ہو گیا۔ یہ بھی مشہور ناول نگار تھے ان کے ناول محبت حسن سرور دیوال دیوی گورا۔ رام پیاری جعفر و عباسہ۔ اختر و حسینہ ہیں۔ نیل کا سانپ (رائیڈر ہیگرڈ کی کاوپیٹرا کا ترجمہ) ہیں حکیم صاحب گو پختہ کار ادیب تھے مگر اعلیٰ درجے کے ناول نگار نہیں کہے جا سکتے ان کے ناول زندگی سے بہت دور ہوتے ہیں وہ اس زمانے کے رنگ سے بالکل بے خبر تھے اور اس سوسائٹی کے حالات سے ناواقف تھے جس کی تصویر کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی کا علم بھی انھیں بہت محدود تھا اور لطیف جذبات سے بھی بہت کچھ اجنبی تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے پند و نصائح اکثر ناول کو بے مزہ کر دیا کرتے ہیں۔ بعض کے خیال کے مطابق یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ناول کو ادب لطیف بنانے کی کوشش کی اور ان کے ناولوں میں ادبی اور فنی نزاکتوں کے علاوہ کردار نگاری اور اشخاص قصہ میں رنگا رنگی بھی موجود ہے۔[1]

راشد الخیری نے حافظ نذیر احمد کے اسلوب کا خاکہ اڑانے کی کوشش کی اور اپنی توجہ عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کے مصائب زندگی پر مبذول کی۔ ان کی عبارت میں بعض لوگوں کے خیال میں بہت درد اور تاثیر ہوتی ہے۔ لہٰذا مصور غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوحۂ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرہ مغرب یاسمین شام۔ سمرنا کا چاند۔ درشہوار وغیرہ ان کے ناول کافی مشہور ہیں۔ ان کے صاحب طرز ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ پھر بھی محاورات کے استعمال کی کثرت سے اکثر طبیعت اکتا جاتی ہے اس کے علاوہ ان کا اسلوب ایسا ہے کہ ایک دو ناول پڑھنے کے بعد پھر ان کے ناولوں کی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ان کی محاورہ نگاری صاف طور پر آورد کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ نذیر احمد میں بھی ایک حد تک یہ عیب ہے۔

حافظ نذیر احمد نے ناول کو تعلیم اخلاق و مذہب کا ذریعہ بنایا تھا، راشد الخیری بھی انھیں کے نقش قدم پر چلتے چلتے ایک دوسری لیک پر جا پہنچے۔ ان کے (حافظ صاحب) ناول ڈکنز کی طرح مظلوم افراد انسانی کے ساتھ ہمدردانہ احساسات سے پُر ہیں، لیکن راشد الخیری نے اپنے احساس کو صنف نازک ہی تک محدود رکھا اور اس طرح اس کو سنجیدہ مسائل کا حامل بنا دیا۔

[1] دنیائے افسانہ صفحہ ۱۷۱

نیاز فتح پوری میں سب سے زیادہ قابل توجہ اسلوب بیان کی دلکشی ہے ان کے ناول تو معمولی واقعات حیات پر مبنی ہوتے ہیں لیکن کردار کی ذہنی بلندی عام افراد انسانی سے بیحد بلند ہوتی ہے فلسفیانہ خیالات اس کے ہر فعل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ "شہاب کی سرگزشت" میں شہاب ہماری دنیا کے انسان کی بجائے کسی اور دنیا کا معلوم ہوتا ہے انتہا یہ کہ وہ محبت کرنے بھی فلسفیانہ انداز خیال کو فراموش نہیں کرتا اس کی سنجیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ پورے فسانے میں وہ نہ خود کہیں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور نہ ہمارا دل خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے مختصر افسانے بھی ایک عرصے سے برابر شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں خاص کر یہ بات قابل غور ہے کہ یہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو ایک رومانی فضا میں پہنچا دیتے ہیں۔ ان کے قصے زیادہ تر خیالی ہوتے ہیں۔ اور صداقت سے دور ہونے کا الزام ان پر لگایا جا سکتا ہے لیکن مصنف کی پیدا کردہ رومانی فضا میں ہیں صداقت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اگر ہمیشہ صداقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے تو کبھی کبھی افسانہ بھی صداقت سے زیادہ تعجب خیز ہوتا ہے[1] یہ قول نیاز کے اکثر افسانوں پر صادق آتا ہے۔ ان کے بیان کی عمدگی بھی سارے قصے کو روشن کر دیتی ہے جملہ کی ساخت انوکھی ترکیبیں الفاظ توازن اور ترتیب، الفاظ کی موسیقیت کو ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت کہا جاتا ہے مگر کبھی اس دھن میں وہ صراحۃً کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں اور ایسی انوکھی ترکیبیں لے آتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔

نیاز اردو میں ٹیگوری طرز عبارت کو رائج کرنے کے مجرم بھی ہیں، انھوں نے "گیتان جلی" کا ترجمہ کیا اور وہی انداز اپنے افسانوں کی زبان کا رکھا۔ اس کا اثر عام طور پر نوجوان ادیبوں پر پڑا اور بہت سے گمراہ ہوگئے، سجاد حیدر یلدرم بھی اکثر رومانی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اکثر پلاٹ کے بہت سے ٹکڑے دوسروں کے پاس سے مستعار لیکر ان کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ ادب کے لیے مایۂ ناز بن جاتے ہیں۔ نیاز بھی اکثر دوسروں کی تصانیف سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سجاد حیدر نفس انسانی کی نازک کیفیت کو پیش کرنے میں اکثر کامیاب رہتے ہیں جس سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہو رہا ہے انھوں نے بہت سے ترکی ترجمے کئے اور

---

[1] دنیائے افسانہ صفحہ ۱۸۶۔

اپنا طرز بھی رفتہ رفتہ ویسا ہی بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے سجاد پر بھی یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ "مقامی رنگ" کی ان میں بہت کمی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کمی تمام افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ امتیاز علی تاج اور عابد علی عابد نے یہ کمی ایک حد تک پنجابی فضا کو مختصر افسانوں میں جگہ دیکر پوری کی۔ ان دونوں کے افسانے فنی لحاظ سے بہت قابل قدر ہوتے ہیں مگر یہ صاحب طرز نہیں کہے جاسکتے کیونکہ ان کا کوئی خاص اسلوب بیان نہیں ہے۔ ان کے علاوہ پریم چند نے یوں تو ناول بھی لکھے ہیں مگر ان کا اصلی فن میرے خیال میں مختصر افسانہ نگاری ہے۔ گاؤں کی زندگی کے ہو بہو نقشے بڑی خوبی سے پیش کرنا انھیں کا حصہ ہے۔ جذبات انسانی سے ان کی واقفیت نیاز سے بڑھی ہوئی ہے۔ اسلوب بھی بہت دلکش اور تکلفات سے پاک ہے۔ تاج صاحب نے پریم بتیسی (جلد دوم۔ طبع دوم ۱۹۲۲ء) کے دیباچہ میں ان کے افسانوں کی خصوصیات گنائی ہیں۔ (۱) مطالعہ فطرت (۲) روزمرہ کے معمولی واقعات (۳) انداز بیان کی سادہ اور بے تکلف روش۔ اس کا بھی اشارہ کیا ہے کہ ان کے حزینہ افسانے خاص طور پر اثر کرتے ہیں۔ سدرشن بالکل پریم چند کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ پریم چند نے بہارستان کے دیباچہ میں ان کی خصوصیات بھی گنائی ہیں۔ (۱) اثر۔ (۲) ہر کہانی میں حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ (۳) لطافت بیان کا کافی سرمایہ ہوتا ہے۔ (۴) پلاٹ عام طور پر ڈرامائی ہوتے ہیں۔ (۵) اساسی جذبات پر افسانوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ تمام باتیں سدرشن سے زیادہ خود دیباچہ نگار کے پاس پائی جاتی ہیں! ان میں وہ فنی کمال بھی نہیں جو پریم چند میں پایا جاتا ہے۔ فی زمانہ ناول نگاروں (اور افسانہ نگاروں) کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ ان سب کے نام بتانا بھی ایک امر محال ہے۔ بہرطور حسب ذیل حضرات ان سب میں مشہور و ممتاز ہیں۔ (۱) حامد اللہ افسر (۲) مجنوں (۳) احمد حسین خاں (۴) سید عابد علی (۵) حکیم احمد شجاع (۶) ظفر عمر (۷) مولوی فدا علی خنجر لکھنوی[1]

اردو داں پبلک کا رجحان آج کل مختصر قصوں کی طرف زیادہ ہے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہیں۔ اول تو اس عہد اضطراب میں وقت کی کمی کا سوال سب سے زیادہ اہم ہے اور طویل ناول وقت واحد میں ختم

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۱۴۲۔

نہ کرسکنے کی وجہ سے جو قلمی الجھنیں پیش آتی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے مختصر افسانوں کا رواج بڑھ گیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل رسائل و جرائد کی بیحد کثرت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رسائل اپنی دلچسپی بڑھانے کے لیے افسانوں کا شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ناول چونکہ ایک ہی نمبر میں ختم نہیں ہوسکتے اس وجہ سے وہ مختصر افسانوں کا شائع کرنا قابل ترجیح خیال کرتے ہیں۔ ناول اور مختصر قصہ دراصل مغرب کے اثر کے کارنامے ہیں اور ان میں اچھی خاصی ترقی ہو رہی ہے۔ خاصکر مختصر افسانے اُردو میں اچھے لکھے جانے لگے ہیں۔ اس فن پر بھی عبدالقادر صاحب سروری نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں کردار اور افسانہ، دنیائے افسانہ زیادہ مشہور ہیں۔ پنجاب کی ایک انجمن ارباب علم کا مقصد ہی اعلیٰ قصے پیدا کرنا ہے۔ بہرحال اُردو مختصر افسانوں کا مستقبل بہت ہی اچھا ہے اور ناول کے زوال کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُردو میں بہت کم اچھے ناول اب تک لکھے گئے ہیں۔

۴

اُردو ڈراما

ہمارے ڈرامے ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔ حالانکہ وہ بات تو نہیں رہی جو بالکل ہی ابتدا میں تھی، اور بہت کچھ ترقی اس صنف میں ہوئی! اورنٹیل تھیٹریکل کمپنی کے رونق بنارسی اور میاں حسینی ظریف اور پھر وکٹوریہ ناٹک کمپنی میں طالب بنارسی ابتدائی دور کی یادگار رہیں۔ اس کے بعد احسن و آرزو لکھنوی نے اس کی طرف توجہ کی۔ توجہ کیا ان حضرات نے اپنا ذریعۂ معاش اسی فن کو بنا لیا۔ ان کے ڈراموں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ مرزا رسوا نے بھی مرقع لیلیٰ مجنوں ایک منظوم ڈراما لکھا تھا، مگر اس میں بھی ڈرامے کا انداز نہیں پایا جاتا۔ بیتاب بھی احسن اور آرزو کے رنگ میں لکھتے رہیں، ان کی زبان میں اکثر غلطیاں ہوتی رہیں۔

آغا حشر کشمیری نے اس طرف بہت نام پیدا کیا۔ کوئی انھیں انڈین شکسپیر اور کوئی اُردو کا مارلو کہتا ہے۔ مگر ان کے ڈرامے بھی معمولی درجے کے ہوتے رہیں، بات چیت ان تمام لوگوں کے ہاں ہمیشہ مقفیٰ عبارت میں ہوتی ہے۔ فطرت سے اکثر دور جا پڑتے رہیں، موقع بے موقع اشعار کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ ڈرامے کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ عام طور پر یہ لوگ جس جذبے کو دکھاتے ہیں اس کی انتہائی معراج جو یقیناً غیر فطری ہوتی ہے ان کی کوششوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے! ان سب کے رنگ ہمیشہ "فوق البھڑک" ہوتے رہیں۔ لطافت کی بجائے شدت جذبات کو پسند کرتے رہیں۔ خاتمہ اکثر کمزور ہوتا ہے اور فطرتی انداز بہت کم پائے جاتے رہیں۔ پھر بھی ان سب میں آغا حشر غنیمت رہیں! اُردو میں ان کی تصنیفات کچھ نہ کچھ درجہ ضرور رکھتی رہیں۔ ان پیشہ وروں کے علاوہ اور لوگ بھی اکثر ڈرامے کی طرف توجہ کرتے رہتے رہیں۔ ان میں محمد عمر، نور الٰہی صاحبان خاص طور پر قابل ذکر رہیں انھوں نے ایک کتاب بھی اس فن پر لکھی ہے، اور خوب لکھی ہے۔ ناٹک ساگر کی توصیف نہ کرنا درحقیقت ادب کی اس صنف پر ظلم کرنا ہے۔

شوق قدوائی نے میکفرسن اور لوسی۔ قاسم وزہرہ شہر نے شہید وفا، عزیز مرزا نے وکرم اروسی اور ظفر علی خاں نے روس وجاپان کا ترجمہ کیا اور خوب کیا۔ حضرت کیفی دہلوی نے مراری داد اا ور راج دلاری اور عبد الماجد دریا آبادی نے زود پشیماں اچھا خاصا لکھا ہے۔ اس کے باوجود بھی اردو میں اب تک کوئی ڈراما ایسا نہیں لکھا گیا جو ہم غیر ممالک کے سامنے فخریہ پیش کرسکیں۔ یہاں نہ تو ایکشن کی اہمیت سمجھی جاتی ہے، نہ فطری اٹھان پر زور دیا جاتا ہے۔ ادبی ڈرامے ادب کے شاہکار نہیں ہوتے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک ڈراما انارکلی لکھا گیا ہے۔ اس کا شہرہ بہت ہوا وہ خیر اتنا کچھ برا نہیں ہے۔

یہاں ڈرامے نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ خود تھیٹر کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور اس میں پارٹ کرنا سوسائٹی میں معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اب خدا خدا کرکے یہ حجاب تھوڑا تھوڑا اٹھ رہا ہے اور کالج اور اسکول کے طلبا حصہ لینے لگے ہیں۔ ممکن ہے کہ ڈرامے کی کچھ ترقی ہو جائے۔

۵

اُردو کے موجودہ سرچشمے

اس زمانے میں پنجاب صوبۂ آگرہ اور دکن اُردو کے تین عظیم مرکز بن گئے ہیں۔ پنجاب اپنے رسائل وجرائد اور متعدد انجمنوں کی وجہ سے مشہور ہے! ورجتنے اخبار اور رسائل وہاں سے نکلتے ہیں شاید کیا، یقیناً کسی دوسری جگہ سے شایع نہیں ہوتے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں پچاسی فیصدی تیسرے درجے کے ہوتے ہیں پھر بھی ہمایوں، ادبی دنیا، مخزن اور کاروان ایسے پرچے ہیں جن پر پنجاب اگر ناز کرے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہاں کی انجمنوں میں اُردو مرکز لائبریری نے ایک طویل سلسلہ مطبوعات کا شایع کیا ہے، جو یقیناً بڑی ہمت کا کام تھا۔ حال ہی میں وہاں سے جامع اللغات ایک بہت بڑی اور ایک حد تک مکمل اُردو لغت شایع کی گئی ہے جس کی طباعت ابھی جاری ہے۔ ادب لطیف ظرافت اور ادب عوام کے سلسلے میں پنجاب والے بہت کام کر رہے ہیں۔ مگر اُردو کی مستقل خدمت آج کل جیسی حیدرآباد میں ہو رہی ہے بیحد امید افزا ہے۔ دکن میں اس وقت دو تین بہت ہی اہم ادارے اُردو کا مستقبل سنوارنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اور جس قسم کا علمی کام ان میں ہو رہا ہے اس کو دیکھ کر توقع ہے کہ بہت جلد اُردو زبان میں اعلیٰ علمی سرمایہ مثل انگریزی کے جمع ہو جائے۔ دار الترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کے افراد اُردو میں جدید علوم وفنون کی کتابیں سرعت کے ساتھ تیار کر رہے ہیں! ایک شعبہ وضع اصطلاحات علمیہ کا بھی قائم ہے۔ تقریباً تین سو کتابیں اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں۔ یہ کتابیں علم معاشیات۔ تاریخ منطق۔ اخلاقیات۔ قانون۔ نفسیات۔ مابعد الطبیعات۔ طبعیات۔ عمرانیات۔ ریاضی۔ علم حیاتیات اور کیمیا وغیرہ پر لکھی یا ترجمہ کی گئی ہیں۔ سیاست۔ انجینری اور جدید طب (ڈاکٹری) پر بھی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں! بہرحال اُردو میں یہاں اتنا سرمایہ ہوگیا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں آج (۱۴) سال سے تمام جدید علوم وفنون اُردو ہی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یہاں کی مطبوعات کی ایک فہرست سید ضامن علی صاحب ام اے نے اُردو سروے کمیٹی کی رپورٹ میں دی ہے جو صفحہ (۹۷) سے ۱۳۶ تک پھیلی ہوئی ہے۔

دکن کا دوسرا ادارہ انجمن ترقی اردو ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قدیم اردو کے مصنفین کی بہت سی کتابیں طبع کیں جس کی وجہ سے آج سے سینکڑوں برس پہلے کا اردو ادب روشنی میں آگیا۔ یہ کام جتنی محنت اور صرفے کا تھا اتنی ہی خوش اسلوبی اور سلیقے کا بھی۔ مولوی عبدالحق صاحب انجمن کے آنریری سکریٹری قابل مبارک باد ہیں کہ ان کے ہاتھوں اردو کی ایسی عظیم خدمت ہوئی اور ہو رہی ہے۔ انجمن دو رسالے شایع کرتی ہے۔ اردو اور سائنس، یہ دونوں رسالے ہندوستان کے دوسرے تجارتی رسالوں کو دیکھتے ہوئے ایک نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔ ایک مدت سے پیشہ وروں کی اصطلاحات اور اردو کا بڑا لغت تیار کیا جا رہا ہے۔ یو۔ پی۔ میں بھی دارالمصنفین شبلی اکاڈمی اور ہندوستانی اکاڈمی بھی اردو کی بہت اہم خدمت انجام دے رہی ہیں۔ دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) نے اردو ادب کی خاص طور پر بہت خدمت کی ہے۔ ندوے نے بھی بہت سے مشہور اہل قلم پیدا کیے۔ مولوی عبدالسلام، مولوی سید سلیمان اردو کے زبردست مصنفین میں ہیں۔ ایک رسالہ معارف بھی شایع کیا جاتا ہے جس کا وقار علمی طبقے میں کافی ہے۔ ہمیں صرف ان انجمنوں سے یہ شکایت ہے کہ یہ اردو کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اسلامی روایات کا اس کے پرچے میں بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

اودہ میں ابھی حال ہی میں ایک انجمن ہندوستانی اکاڈمی نامی قائم ہوئی ہے، جو بہت قابل قدر کام کر رہی ہے۔ اکاڈمی کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں وقیع مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان اہم اداروں کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں سینکڑوں انجمنیں قائم ہیں جن میں سے بیشتر صرف شعر و شاعری کی ترویج میں لگی ہوئی ہیں۔ اور بری بھلی کچھ نہ کچھ اردو کی خدمت کر رہی ہیں۔ تقریباً تین سو اخبار و رسائل اردو کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ ان میں ہر ایک میں ایک ادھ افسانہ یا ڈراما اور علمی مضمون ضرور ہوتا ہے۔ بہرحال یہ حالات دیکھتے ہوئے توقع کی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی گزشتہ صدی سے پیچھے نہیں رہے گی۔ ابھی صرف ۴۴ سال گزرے ہیں، اتنے کم عرصے میں جس سرعت سے کام ہوا ہے وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ۶۶ برس کے طویل عرصے کے بعد بیسویں صدی واقعی اردو کو اعلیٰ درجے کی علمی زبان بنا دے۔ جنگ عظیم کے بعد تھوڑا بہت اضطراب اور معاشی پریشانیاں ملک میں پھیل گئی ہیں، اس پر بھی حامیان اردو خدا کے فضل سے ہمت کیے ہوئے ہیں۔

۶

خاتمہ

جدید نظم اور نثر دونوں کا حال بہت مختصر پیمانہ میں آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ اُردو ادب کا طالب علم ان دونوں حصوں کو دیکھنے کے بعد اپنے ذہن میں موجودہ ادب کا جو تصور قائم کر سکتا ہے وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

سب سے پہلے جو بات ہم کو متوجہ کرتی ہے وہ جدید نثر اور جدید نظم کی پیدائش کا زمانہ ہے۔ ایک عجیب اتفاق سے دونوں کا آغاز ہنگامہ ۵۷ء کے بعد ہوا، اور تقریباً وہی بزرگ ہستیاں جدید نظم کے موتی پرونے میں مصروف رہیں جنھوں نے جدید نثر کی بنیاد ڈالی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ فورٹ ولیم کالج اور مرزا غالب جدید نثر کے بانی ہیں۔ مگر تحقیق کی نظر اور انصاف کی زبان سختی سے اس کی مخالفت کرتی ہے۔ میر امن اور میر شیر علی افسوس، اور آج کل کی ترقی یافتہ اُردو کے آبا! خیال ہی سے حیرت ہوتی ہے۔ وہ غریب سوا سیدھی سادی زبان میں قصہ کہانی کہہ لینے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے، رہے مرزا نوشہ وہ بھی اس برات کے دُلھا نہیں! ان کے پاس سوا خطوط کے اور ہے کیا۔ جب کسی کتاب کے دیباچے پر قلم اٹھاتے ہیں تو تحسین کی نو طرز مرصع اور سرور کی فسانۂ عجائب کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو مرحوم "دلی کالج" کے فارغ التحصیل طلبا، اور سر سید ہماری آپکی تحریری زبان کے بانی ہیں۔ اس مقدس گروہ میں آزاد کی شگفتہ بیانی، سر سید کی خاموش جوش میں ڈوبی ہوئی دل آویزی۔ حالی کی سادہ اور سلیس اُردو کے ساتھ ذکاء اللہ اور نذیر احمد (جن کے دلی کے روڑے مشہور ہیں) کی تصانیف ایسے کارنامے اور ایسی یادگاریں ہیں جن پر جدید نثر کی بنیاد ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چلکر کوئی ان سے اچھا باغبان، باغ اُردو کو سنوارے، ابھی تک تو یہ بانیان ادب ہم سے بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ شرر اور شبلی

درسیانی کرٹی ہیں۔ ان کا تعلق جتنا کہ موجودہ عہد سے ہے اتنا ہی پیش رو زمانے سے۔ گزشتہ گروہ منتخب کے بانی نثر جدید ہونے کی سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ عہد موجودہ میں نثر کی جتنی شکلیں رائج ہیں اور جن پر آج کل کی نثر کی بنیاد قایم ہے وہ سب ان بزرگوں کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔

مضمون نویسی۔ تاریخ اور سوانح عمریاں، افسانے۔ ڈرامے اور تنقید کے علاوہ دوسری شکل اور کونسی ہے۔ اب دیکھیے کہ سرسید۔ مولانا حالی۔ نواب محسن الملک۔ چراغ علی آزاد اور شرر اس چمن میں پہلے آبیاری کرنے والے ہیں یا نہیں۔ تہذیب الاخلاق' اور دلگداز کے فائل اس کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ سوانح عمریاں لکھنے کا بانی' حیات سعدی اور حیات جاوید لکھنے والے کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ بیسویں صدی بھی حیات جاوید کا جواب ابتک پیش نہ کرسکی' آج غالب کی پرستش یادگار غالب کی وجہ سے ہو رہی ہے یا نہیں۔ رہی تاریخ' وہ محمد ذکا'اللہ اور شبلی کی بنائی ہوئی شاہراہ ہے اس سلسلے میں مولانا شبلی کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

سیرۃ النعمان۔ سوانح مولانا روم۔ الفاروق۔ الغزالی اور المامون' اُردو میں ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

ڈراما بھی اسی عہد میں کاوس جی نے شروع کیا اس کے بعد آزاد نے۔ پھر شرر کا منظوم ڈراما فلیپانا' عالم وجود میں آیا آج کل اس میں بہت سی ترقیاں ہوئیں' پھر بھی اُردو کی یہ صنف ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ تنقید ادب کا صحیح مذاق مولانا حالی کا پیدا کردہ ہے' ان کا مقدمہ شعر و شاعری اس قسم کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ نظم آزاد کا دیباچہ (جو دراصل آزاد کا ایک مضمون ہے) بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے بعد شعرالعجم۔ موازنۂ انیس و دبیر' شبلی کی کوششیں ہیں۔ موازنے کے بعد' حیات انیس۔ واقعات انیس اور یادگار انیس کے ساتھ ہی ساتھ المیزان اور حیات دبیر ظہور میں آئیں اس کے بعد مولانا امداد امام اثر کی کاشف الحقائق ہے۔ عبدالسلام کی شعرالہند۔ عبدالحی مرحوم کی گل رعنا اور پھر آج کل ڈاکٹر زور اور مولوی عبدالقادر سروری کی چند تنقیدی کتابیں ترتیب کے لحاظ سے چاہے جتنی اعلیٰ ہوں مگر یا تو شعرالعجم کی خوشہ چینی کا نتیجہ ہیں یا مقدمے کے اثر کا۔ مقدمہ نگاری البتہ بیسویں صدی کا تحفہ ہے۔ اس میدان کے

سرشار مولوی عبدالحق اور حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں۔ مختصر افسانے ابتدائی شکل میں اودھ پنچ کے پرانے فائلوں میں مل جاتے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کو اس بات کا فخر ہے کہ اس خاص صنف میں اس نے بہت ترقی کی۔ اسی طرح ناول حالانکہ سرشار۔ نذیر احمد اور شرر کی محنت کا ثمرہ ہے، پھر بھی مرزا رسوا وغیرہ نے اس کو بہت ترقی دی، اور وہ تمام خامیاں جو ان لوگوں میں تھیں دور کر دیں۔ ایک خاتون کی کتاب شوکت آرا بیگم پر ہم بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ ہاں ایک ادب لطیف ایسی چیز ہے جو خالص بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔

ادب لطیف دراصل وسعت علم شعری احساس اور حکیمانہ نزاکت خیال کے گلدستے کا نام ہوتا ہے۔ یہ صنف کسی ادب میں اس وقت وجود میں آتی ہے جب ادب کا انتہائی عروج ہو جاتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر یہ صنف اپنے محاسن کے ساتھ اردو میں صورت پذیر ہوتی۔ مگر رونا تو اس کا ہے کہ آج کل ادب لطیف کے نام سے ہر قسم کی بے راہ روی روا رکھی جاتی ہے۔ نوجوان اس مرض میں زیادہ مبتلا نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے ادب لطیف کا تعلق صرف جنس لطیف سے ہوتا ہے۔ ادب لطیف کی "زلزلہ افگن" اور "آسمان شگاف" ترکیبیں آج کل جو ہنگامہ برپا کر رہی ہیں وہ اردو کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ گناہ افسوس تو یہ ہے کہ خوبصورت بھی نہیں، اس کا جلوہ محض سیمیائی بلکہ زیادہ تر مشاطگی کا رہین منت ہوتا ہے۔ پھر اس پر یہ شور کہ یہی آرٹ ہے آرٹ۔

الغرض یہ "حسن مذاق" یہ "ارتعاش رنگین" یہ "آشوب خیال" مع اپنی گاڑھی گاڑھی لخت سامانیوں کے ادبی و معاشرتی زندگی میں اس قدر رچ گیا ہے کہ اب اس سے عہدہ برآ ہونا محال نظر آرہا ہے[1]۔ یہ دراصل نیاز کا ناز ہے اور ظفر علی خاں بھی اس بدعت کے بانیوں میں ہیں۔

آج کل قہقہوں کی گونج سے ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں چرخ پیر کی پرانی چھت نہ بیٹھ جائے۔ مگر اس سلسلے میں بہت کم حقیقی ظرافت ملتی ہے۔ حسن نظامی۔ رشید احمد صدیقی۔ فرحت اللہ بیگ، حکیم ممتاز حسین اڈیٹر اودھ پنچ پھر بھی بہت غنیمت ہیں، ورنہ اور جتنے بھی ہیں وہ سب "ننھے کی اماں" "وہ" "بھابی" یا اور

---

[1] سہیل جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۰۱ (علیگڈھ)۔

دوسری عورتوں کے بغیر مذاق کر ہی نہیں سکتے۔ خدا ان پر اور ساتھ ہی ساتھ اُردو پر رحم کرے۔

ادبی رسالوں کی زیادتی سے جہاں اُردو کو فائدے پہنچ رہے ہیں، وہاں تیسرے درجے کے کارنامے حد سے سوا عالم وجود میں آرہے ہیں جو کسی ادب کے لیے قابل مبارکباد نہیں ہو سکتے۔ آج کل اُردو کا اصلی سرمایہ دارالترجمہ اور جامعہ ملیہ کے ترجموں میں ہے، اور حقیقی فائدہ بھی انھیں سے پہنچ رہا ہے۔

نظم میں البتہ اس عہد میں بہت کچھ ترقیاں ہوئی ہیں اور موسیقی کا خیال نظموں کی بہتات ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دے رہی ہے لیکن محنت اور ذکاوت سے پیدا کیے ہوئے کارناموں کی کمی پھر بھی محسوس ہو رہی ہے۔ اقبال کے دم سے بہت کچھ آنسو پونچھ جاتے ہیں، پھر بھی حقیقی شاعری کی طرف اچھی رفتار سے ترقی ہو رہی ہے۔ غزل، فانی اور حسرت کی وجہ سے زندہ ہے اس عہد کی مقبول ترین صنف شعر غزل اور مثنوی ہے مثنوی سے محدود بحروں کی قید اٹھ جانے سے بہت کچھ فوائد حاصل ہوئے، اور غزل نے بھی اصغر۔ عزیز۔ اصغر۔ جگر۔ فانی و حسرت کی وجہ سے پھر سنبھالا لیا ہے۔

خدا ہمارے ادب کو یہ ترقیاں راس لائے۔

"مہاراج آپ سے بڑھ کر بھارت دیس میں کاریگروں کا کوئی مائی باپ نظر نہیں آتا۔ میں نے اپنے ان بوڑھے ہاتھوں سے پریم مندر کی ایک پجارن کو مورتی کے روپ میں ڈھالا ہے۔ روپیہ پیسہ تو ایشور کی مہربانی سے بہت کچھ مل جائیگا لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے سکھی بھگوان جی اس سندر دیوی کے مکھ سکھ پر دھیان کریں اور مجھے اپنی محنت کی سچی داد ملے۔"

راجہ بکرماجیت سے زیادہ فن کا پہچاننے والا اور بالغ نظر قدر دان عہد بکرماجیت میں کوئی اور نہ تھا۔ اُس نے ہرتیش کے اس مجسمے کا بہت دیر تک اور غائر مطالعہ کیا جوں جوں وہ اسے عمیق نظر سے دیکھتا جاتا تھا اُسکی دلچسپی میں یک گونہ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بوڑھے ہرتیش نے پجارن کے چہرے پر دھیان گیان کی جو کیفیات منقوش کردی تھیں اُنکی خوبی الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے ہونٹوں میں عاجزانہ جنبش تھی۔ ذاتی تقدس اور نسائی وقار نے چہرے کو غیر معمولی طور پر نورانی بنا رکھا تھا اور آنچل اس احتیاط کے ساتھ سر پر ڈال دیا تھا جیسے کوئی نئی نویلی اپنے پتی کے آگے کھڑی ہوئی اُس کے کسی حکم کا انتظار کر رہی ہو۔

بکرماجیت نے شاہانہ تمکنت کے ساتھ ہرتیش چندر سے مخاطب ہوکر کہا "ہرتیش بھائی تمہارے کام پر کون حرف رکھ سکتا ہے، ملک کے بہترین کاریگر تمہاری اُستادی کا لوہا مانتے ہیں، مگر ابکی تم نے یہ مورت ایسی اچھی تیار کی ہے کہ بس جی ہی تو خوش کر دیا۔ خدا تمہاری کوششوں میں اور برکت دے۔"

بوڑھا ہرتیش اطمینان اور مسرت کا سانس لیتے ہوئے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ جہاں پناہ کو با ادب ہوکر آداب بجا لایا اور خوش خوش اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

اس نے اپنی زندگی میں ایسے صدہا مجسمے تیار کیے۔ محبت، ہمدردی، حلم، انکسار، خودداری، اخلاقی جراءت

اور مردانہ وقار کے بیسیوں مرمریں دیوتا، جن کے حُسن اور دلاویزی پر ملک کا ہر شخص فریفتہ نظر آتا تھا۔

جگدیش قدیم زمانے کی مشعلیں عہدِ نشین میں جلانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے آبا و اجداد کے نقشِ قدم پر چل کر ویسے ہی بت تیار کیے لیکن ان کے پوجنے والے ملک میں بہت کم پائے جاتے تھے۔ وہ اپنا بہتر سے بہتر شاہکار جن میں کوئی محبت کا مشوالاعلوم ہوتا تو کوئی عزت اور خودداری کی مجسّم مورت، شو روم میں لا کر رکھ دیتا اور خود اس اُمید میں بیٹھا رہتا کہ لوگ تعریف و تحسین کے ذریعے اسے اس کی محنت کا صلہ دیں گے اور کوئی با مذاق نواب بیش قیمت رقم کے عوض انھیں اپنے محل کی زینت بنائے گا لیکن اہلِ وطن کی ناقدردانی اُس کے دل کا خون کر دیتی اور وہ ان مجسّموں کو نہایت مایوسی کے ساتھ طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیتا۔

"ارے رام رام!" جگدیش نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ "سرسوتی دیوی (علم کی دیوی) اور پریم داتا کی لوگ اس زمانے میں آ گیا (عزت نہیں کرتے تو کیا یہ فقط لکشمی دیوی ہی کے پوجن ہارے ہیں؟ ان داتا کے سوا انھیں کسی سے محبت نہیں ہے؟"

عمر میں پہلی مرتبہ اُس نے دولت کا ایک بت تیار کیا اور بہت جلد سارے شہر میں "جگدیش" اور اس کے جدید "مجسّمہ" کا بول بالا ہو گیا۔ لوگ دور دور سے اس مجازی "ان داتا" کی زیارت کو چلے آ رہے تھے۔ کوئی کہتا "مبارک ہے وہ ملک جہاں جگدیش بابو جیسے بے مثل بت تراش پیدا ہوتے ہیں!" اور انتہائی عقیدت کے ساتھ مردانہ وار ان داتا کے گرد گھومنے لگتا۔

"ہے پربھو آنند داتا دھیان مجھ پر کیجیے" ایک زائر نے بت کی سرکار میں گڑگڑا کر اپنی مفلسی اور بے مائگی کا رونا رویا۔ "ہم اپنے تخیلی خدا کی تسخیر تیرے ہی بل پر کیا کرتے ہیں، اے انسان کو خوش حال اور نجات کا مستحق بنانے والی مورت۔ اُس کے نام پر خیرات دے کر لوگوں کو حج اور زیارت کے لیے امداد بہم پہنچا کر اور بعض صورتوں میں تو خدا بھی تیرے آگے ہماری نظروں میں پھیکا پڑ جاتا ہے۔

تیری پرستش کے بغیر کلیساؤں میں گھنٹیاں، دوشیزہ مقدس اور من موہن لڑکیوں کے ملکوتی نغمے، مندر کے ناقوس، جلتی ہوئی آگ کے اطراف پیشہ ور پنڈت کی کتھا، واعظ کی تلقین اور دنیا کی وہ تمام چیزیں جو بظاہر اللہ کے ڈر سے کی جاتی ہیں یک لخت بے نمود ہو جاتیں۔ میرے دھنوان پرمشور (دولتمند خدا) مجھ بھی دولت سے

سرفراز کر، اور دیکھ کہ میں کس خوبی سے تیرا پرچار کرتا ہوں۔"

جگدیش، مہاجن کی اس گفتگو سے اپنی جگہ بیٹھا ہوا، بید کی مانند لرز رہا تھا۔

"ایشور کرے، میں اس بے دینی کا باعث نہ قرار دیا جاؤں!" اُس نے اپنے دل میں کہا "دولت کی پرچھائیں پر لوگ اتنے الجھ گئے کہ اب انھیں خدا بھی یاد نہیں آتا، اور آتا بھی ہے تو ناپاک خیال اور بُری نیت کے ساتھ۔ سنا بھائی اب میں ایسے بُت تیار نہ کروں گا۔ دنیا خواہ اُن کی کتنی ہی سیوا کیوں نہ کرے، یہ مجسمہ ہرگز میرا شاہکار نہیں ہے اور لوگ دل و جان سے اس پر نثار ہو رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر مجھے مردانہ وقار نظر نہیں آتا۔ اس کی پیشانی پر خودداری کی سج دھج قیامت تک پیدا نہیں ہو سکتی!"

جگدیش اب ایک اور مجسمے کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھا۔ معبودِ حقیقی کا ایک خوشگوار تخیل اور آسمانی صفات کا ایک موزوں اور متناسب مرکب۔ اس مرتبہ اُس کی حُسن کارانہ کاوشوں کا نہایت ہی دلچسپ اور مرغوب موضوع تھا۔

"میں ضرور ہر شخص سے اپنی محنت کی سچی داد لوں گا" اُس نے تھوڑی دیر کے لیے اوزار زمین پر رکھ دیے اور خود بھی دراز ہو گیا۔ "میرا یہ شاہکار، ہر شجنبدر کے زمانے میں بھی عنقا سمجھا جائے گا، اس کے چہرے کا وقار بڑے بڑے رشیوں اور مہاتماؤں کو اپنے آگے زیر کرے گا، اس کی پریمی آنکھیں سارے عالم کو محبت اور ہمدردی کا سبق دیں گی، خودداری، عزت، حلم اور بُردباری کی یہ حسین مورت، دنیادار انسانوں کو ضرور اپنا پرستار بنا لے گی اور اُن کے دل میں معبودِ حقیقی کی یاد از سرِ نو تازہ ہو جائے گی۔ ہندوستانی آرٹ میں واقعیت کا عنصر صرف میرے خاندان ہی نے داخل کیا ہے، لیکن وہ لوگ انسان کی صفاتِ حمیدہ کا تصوّر منتشر صورت میں عوام کے سامنے پیش کرتے تھے اور میں نے انھیں اکٹھا کر دیا ہے۔"

چند روز بعد جگدیش کا یہ مجسمہ پہلی مرتبہ شوروم میں رکھا گیا۔ جگدیش اس کی دلاویزی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اس سے متعلق عوام کا رجحان معلوم کرنے کے لیے۔

ہر شخص جگدیش اور اُس کے مجسّمے کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کون اُس بُت کی پرستش کرے گا جو اپنے پجاریوں کو طرح طرح کی مصیبتوں اور سخت ترین امتحانوں میں مبتلا کر دے!"

اُن کی معنی خیز خاموشی جگدیش کو یہ پیام سنا رہی تھی۔

صبح سے شام تک تماشائیوں کا اس مقام پر ہجوم رہا، لیکن سب "جگدیش" اور اُس کے "معبود" پر نہایت نفرت اور بے حرمتی کے ساتھ نظر ڈالتے ہوئے وہاں سے گذر گئے۔

"میرے دیالو بھگوان! میں نے کتنا بڑا پاپ اپنے سر لے لیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ دنیا والے تیرے ساتھ ایسی بے حرمتی کا برتاؤ کریں گے وہ تو صاف کہتے ہیں کہ تو انھی کو نوازتا ہے اور انہیں پر اپنے کرپا کرتا ہے جو تیرے حکم کی پابندی نہیں کرتے اور تیری ہدایتوں کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ پرماتما! میری خطا معاف کردے!"

جگدیش نے، بُت کے سامنے دوزانو ہو کر، بُت کے سامنے یہ الفاظ ادا کیئے، وہ اب بہت ہی مضمحل نظر آرہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح، وہ بُت کے پاؤں پر گر گیا۔ فقط

مرزا سرفراز علی بی اے (عثمانیہ)
مددگار سٹی کالج

حسنِ خوابیدہ سے

لذتِ دردِ محبت سے خبردار نہ ہو سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

دردِ الفت کی قسم عشق کے ایماں کی قسم
چاکِ دامن کی قسم، چاکِ گریباں کی قسم
مرمریں دوش پہ اس زلفِ پریشاں کی قسم

تو کبھی رنج و مصیبت میں گرفتار نہ ہو سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

ہو گئی محفلِ زہرہ میں خموشی پیدا
نظر آتا نہیں جلّادِ فلک کا چہرا
آسمانوں سے چلی آتی ہے جنّت کی ہوا

نالۂ دردِ نہ سن اور شرربار نہ ہو سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

صدقۂ حسن ہے سن دونوں جہاں کی دولت
تیری آغوش میں ہے کون و مکاں کی دولت
تیرے قبضے میں ہے میرے دل و جاں کی دولت

تو متاعِ غمِ ہستی کا خریدار نہ ہو سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

میں ستاروں کو سناتا ہوں کہانی دل کی
چرخ کی نذر ہے یہ شعلہ بیانی دل کی
سنتے ہیں دونوں جہاں مرثیہ خوانی دل کی

تو مری شعلہ نوائی سے خبردار نہ ہو سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

حسنِ معصوم کو تو جلوہ نما رہنے دے
رُخ سے اس ریشمی آنچل کو ہٹا رہنے دے
رات بھر یونہی گریبان کھلا رہنے دے
میری بیتاب نگاہی سے تو بیزار نہ ہو   سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہوا

حسنِ خوابیدہ میں ہم شانِ خدا دیکھیں گے
نیند میں حسن کی دیوی کو چھپا دیکھیں گے
صبح سوئے ہوئے فتنے کو جگا دیکھیں گے
اب خدا کے لیے تو نیند سے ہشیار نہ ہو   سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہوا

محمد عبد القیوم خاں باقی ام۔اے (عثمانیہ)

لذت دردِ محبت سے خبردار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

دردِ الفت کی قسم عشق کے ایماں کی قسم
چاکِ دامن کی قسم، چاکِ گریباں کی قسم
مرمریں دوش پہ اس زلفِ پریشاں کی قسم

تو کبھی رنج و مصیبت میں گرفتار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

ہو گئی محفلِ زہرہ میں خموشی پیدا
نظر آتا نہیں جلّادِ فلک کا پہرا
آسمانوں سے چلی آتی ہے جنت کی ہوا

نالۂ درد نہ سن اور شرر بار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

صدقۂ حسن ہے سن دونوں جہاں کی دولت
تیری آغوش میں ہے کون و مکاں کی دولت
تیرے قبضے میں ہے میرے دل و جاں کی دولت

تو متاعِ غمِ ہستی کا خریدار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

میں ستاروں کو سناتا ہوں کہانی دل کی
چرخ کی نذر ہے یہ شعلہ بیانی دل کی
سنتے ہیں دونوں جہاں مرثیہ خوانی دل کی

تو مری شعلہ نوائی سے خبردار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہو!

حُسنِ معصوم کو تو جلوہ نما رہنے دے
رُخ سے اس ریشمی آنچل کو ہٹا رہنے دے
رات بھر تو ہی گریبان کھُلا رہنے دے
میری بیتاب نگاہی سے تو بیزار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہوا

حُسنِ خوابیدہ میں ہم شانِ خدا دیکھیں گے
نیند میں حُسن کی دیوی کو چھپا دیکھیں گے
صبح سوئے ہوئے فتنے کو جگا دیکھیں گے
اب خدا کے لیے تو نیند سے ہشیار نہ ہو — سونے والے مری فریاد سے بیدار نہ ہوا

محمد عبد القیوم خاں باقی ام اے (عثمانیہ)

بہار کا خواب

مرحبا اے دل کہ وہ جانِ بہار آ ہی گیا
جس حیات افروز کا تھا انتظار آہی گیا

اک جہانِ رنگ و بُو بر دوش ہے مستِ شباب
ہے جلو میں زندگی رعنائیاں ہیں ہم رکاب

حشر برپا کر رہا ہے آج یہ مستِ خرام
ہو نہ جائے منتشر ربطِ عناصر کا نظام

موجزن ہے چارسو عالم میں طوفانِ حیات
نشۂ عیش و طرب میں جھومتی ہے کائنات

فیضِ موسم ہے کہ داغِ دل فروزاں ہو گئے
تارِ دامن رگِ کشِ تارِ رگِ جاں ہو گئے

دل کی یہ حالت کہ سازِ نغمۂ بیتاب ہے
جنبشِ موجِ نفس بھی جنبشِ مضراب ہے

اس نگاہِ فتنہ زا کی برق پاشی الاماں!
خون کے بدلے رگوں میں کوندتی ہیں بجلیاں

یہ چہرۂ گلگوں پہ ہے چینِ جبیں کا پیچ و تاب
یا شفق کے جال میں الجھی شعاعِ آفتاب

مد بھری آنکھوں میں یوں کیفِ شرابِ لالہ فام
شوخیِ رفتارِ ساقی جیسے چھلکاتی ہے جام

مُسکرانے میں لبوں پر عکسِ دنداں ضو فگن
چومتی ہے منہ کلی کا چاند کی چنچل کرن

اک نظر دیکھے تو دم لعلِ بدخشاں چھوڑ دے
ہونٹ جیسے بارِ شبنم گل کی پتی موڑ دے

خوش خرامی پر ہوئی موجِ صبا دل سے نثار
پانی پانی ہو رہا ہے شرم سے ابرِ بہار

ہے تری رفتار موجِ قلزمِ طوفانِ حُسن
ہاں ڈبو دے مجھکو بھی اے بحرِ بے پایانِ حُسن

دُور آنکھوں سے رہا گر آئینہ تو کیا ہوا
تجھ میں اپنا عکس دیکھوں اس قدر نزدیک آ

وہ ہنسا، تقدیر چمکی، کارگر آہیں ہوئیں
عشق کے شانوں کی زینت حُسن کی باہیں ہوئیں

کر چکا آرائشِ منزل فریبِ جستجو
اک طلسمِ خواب تھی یہ کائناتِ رنگ و بو

ظلمتِ شب میں سرابِ آرزو روپوش ہے
میں نے پا کر کھو دیا کچھ صرف اتنا ہوش ہے

سید سکندر علی وجد بی اے عثمانیہ

تنقید و تبصرہ

کارامروز | مجموعۂ منظومات جناب سیماب اکبر آبادی، قیمت غیر مجلد ۸؍ ۲۵۶ صفحات۔

آگرہ کو اُردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے، اور جدید اُردو نے شاہجہانی دور میں آگرہ ہی میں ارتقائی منزلیں طے کی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت سے آج تک اس سرزمین کو اُردو شعر و سخن سے خاص تعلق رہا ہے۔ میر تقی میرؔ، ولی محمد نظیرؔ اور اسد اللہ خاں غالبؔ کے بعد جناب سیمابؔ نے آگرہ کے اس امتیاز کو قائم رکھنے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ وہ اُردو کے بہت بڑے شاعر، انشا پرداز اور ادیب ہیں۔ اور ان سب سے زیادہ اہم ان کی شخصیت ہے جس نے آگرہ کے متعدد نوجوانوں کو شعر و سخن اور علم و فضل کی خدمت کے لیے آمادہ کر دیا۔ صوبۂ متحدہ میں اس وقت آگرہ ہی ایسا مقام ہے جس کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں وہاں کے نوجوان علم و ادب کی خدمتگزاری میں اپنے صوبہ کے دوسرے شہروں کے نوجوانوں سے پیش پیش رہیں گے۔ خاصکر ان کے شاگردوں ساغرؔ، منتظرؔ وغیرہ سے اُردو زبان کی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

حضرت سیمابؔ صوبۂ متحدہ کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے حالاتِ حاضرہ اور ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اپنی شاعرانہ قوتوں سے کام لیا اور قدیم طرز کی شاعری کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انکی غزلیں قدیم رنگِ تغزل سے مُعرّا نہیں ہیں اور ان کی نظمیں اس قدر جدید رنگ کی ہیں کہ بعض دفعہ ان کے اور اقبالؔ کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ کے اور اُن کے کلام میں اتنا فرق ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں فلسفہ و سیاست کو زیادہ دخل ہے اور سیمابؔ کے کلام میں شعریت اور زبان کو۔ اقبالؔ کے خیالات بعض دفعہ اتنی بلند پروازی کرنے لگتے ہیں کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ سیمابؔ زبان اور اسلوب کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ بلند سے بلند تخیل کو بھی خوبی کے ساتھ قلمبند کر لیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان اور اسلوب کی خاطر بعض دفعہ خیال کا خون کرنا بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے جہاں سیمابؔ کے کلام میں ایک طرح کی شگفتگی

نظر آتی ہے بعض جگہ خیالات کی یکسانیت اور زبان کی پابندیاں پڑھنے والے کی دلچسپی کے سلسلے کو منقطع کردیتی ہیں ۔ زبان اور اسلوب کی شگفتگی کو برقرار رکھنے کی خاطر بعض نظموں میں جناب سیماب نے آورد سے بھی کام لیا مگر اس طرزروش پر وہ مجبور ہیں کیونکہ ان کی نشوونما جس ماحول میں ہوئی اس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ وہ خیال سے زیادہ زبان اور اسلوب پر زور دیتے اُردو کے جملہ غزل گو شعراء کا یہی شیوہ رہا ہے اور خاصکر فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے ۔

بہرحال اُردو ادب کی تاریخ میں سیماب اکبرآبادی کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل رہے گی کہ وہ صوبۂ متحدہ کے پہلے بلند پایہ شاعر ہیں جنھوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کردی جو ان کی تقلید میں اُردو کو جدید طرز کی شاعری سے مالامال کردیگی ۔

سیماب اکبرآبادی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ انکے وطن آگرے کا ذکر پایا جاتا ہے انھوں نے اپنے خطبوں مضمونوں، غزلوں اور نظموں میں غرض ہر جگہ آگرہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی خدمات زبان کو گنوایا ہے ۔ زیر نظر مجموعہ "کار امروز" کا ایک حصہ ارض تاج کے متعلق نظموں پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اپنی وطن پرستی کا بہترین ثبوت دیا ہے یوں تو اکثر شعراء اپنے وطن کا ذکر کہیں نہ کہیں اپنے کلام میں ضرور کرتے ہیں لیکن جناب سیماب اس جذبہ سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اسی جذبہ نے ان کے شاگردوں میں بعض ایسے افراد پیدا کردیئے جو ان کے بعد بھی ان کے وطن کا نام اُردو ادب میں روشن کرتے رہیں گے ۔

سید محی الدین قادری زور

باقیاتِ فانی | مجموعۂ کلام مولوی میر شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی ۔

جناب فانی عہد حاضر کے اُن اُردو شاعروں میں سے ہیں جنھیں خاص مقبولیت حاصل ہے اور جن کا کلام اکثر محفلوں اور مجلسوں میں سنا جاتا ہے اور جن کی شاعری ہماری زبان کے نوجوان شاعروں پر اثر انداز ہے ۔ باقیات فانی انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے یہ ایک بہت مختصر سا دیوان ہے جس میں تقریباً ایک ہزار اشعار ہیں لیکن شاعر کے کلام کا معیار کمیت سے زیادہ کیفیت پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے اس دیوان کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔

اُردو زبان اس زمانے میں جن کٹھن منزلوں سے گزر رہی ہے اُن کا اقتضاء یہ ہے کہ اُردو بولنے والے نوجوان اپنی زبان کے مسائل اور شعر و سخن کے نکات سے بخوبی واقف رہیں لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ بعض نوجوان شعراء اپنے کلام میں حد سے زیادہ آزادی اور بے پروائی سے کام لے رہے ہیں جس کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں یہ بے راہ روی اُن کو منزل مقصود سے دور نہ کر دے۔ اس خرابی کے اسباب و علل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مبتدی شاعروں کے ذوق کی تعمیر میں عہد حاضر کے بلند پایہ شعراء کے کلام کے مطالعہ کو زیادہ تر دخل ہے۔ انھیں بلند پایہ شاعروں میں فانی بھی شامل ہیں جن کے مذکورہ بالا مختصر دیوان میں متعدد ایسے شعر نظر سے گذرتے ہیں جن کی سند پیش کر کے نوجوان شعراء اپنی بے راہ روی کو جائز سمجھ لیتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اس دیوان میں جو اعلیٰ پایہ کے اشعار ہیں وہ کن خصوصیات پر مشتمل ہیں۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی اچھے شاعر کے اچھے اشعار کے ساتھ ساتھ ناقص اشعار بھی قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور حسن عقیدت یا لَے کے ساتھ پڑھتے رہنے کی وجہ سے اُن اشعار کے نقایص پر نظر پڑنے نہیں پاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے شاعروں کے کلام میں بھی ویسے ہی ناقص اشعار کا اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ذیل میں باقیات فانی کے چند اشعار پر نظر ڈالی جاتی ہے تاکہ مبتدی شاعر ان کے نقایص سے واقف ہوں اور خود اُن سے بچتے رہیں۔ ان کے اظہار سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کلام فانی پر اعتراض کیا جائے بلکہ ہماری یہ خواہش ہے کہ اُردو کے نوجوان شعراء اس قسم کے معایب سے حتی الامکان بچ سکیں۔

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا　　　دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

"من بیقرار" کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اسلیے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں　　　دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے، ردیف "رویا" کی بجائے "روتا ہے" چاہیے۔

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری　　　مل مل کے بجلیوں سے ابر بہار رویا

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے چونکہ پہلے مصرع میں "کیا" حرف استفہام ہے اس لیے دوسرے مصرع میں "مل مل"

نظر آتی ہے بعض جگہ خیالات کی یکسانیت اور زبان کی پابندیاں پڑھنے والے کی دلچسپی کے سلسلے کو منقطع کر دیتی ہیں۔ زبان اور اسلوب کی شگفتگی کو برقرار رکھنے کی خاطر بعض نظموں میں جناب سیماب نے آورد سے بھی کام لیا مگر اس طرز روش پر وہ مجبور ہیں کیونکہ ان کی نشوونما جس ماحول میں ہوئی اس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ وہ خیال سے زیادہ زبان اور اسلوب پر زور دیتے۔ اردو کے جملہ غزل گو شعراء کا یہی شیوہ رہا ہے اور خاصکر فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے۔

بہر حال اردو ادب کی تاریخ میں سیماب اکبرآبادی کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل رہے گی کہ وہ صوبۂ متحدہ کے پہلے بلند پایہ شاعر ہیں جنھوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کر دی جو ان کی تقلید میں اردو کو جدید طرز کی شاعری سے مالا مال کر دیگی۔

سیماب اکبرآبادی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ انکے وطن آگرے کا ذکر پایا جاتا ہے انھوں نے اپنے خطبوں، مضمونوں، غزلوں اور نظموں میں غرض ہر جگہ آگرہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی خدمات زبان کو گنوایا ہے۔ زیر نظر مجموعہ "کار امروز" کا ایک حصہ ارض تاج کے متعلق نظموں پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اپنی وطن پرستی کا بہترین ثبوت دیا ہے یوں تو اکثر شعراء اپنے وطن کا ذکر کہیں نہ کہیں اپنے کلام میں ضرور کرتے ہیں، لیکن جناب سیماب اس جذبہ سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اسی جذبہ نے ان کے شاگردوں میں بعض ایسے افراد پیدا کر دیئے جو ان کے بعد بھی ان کے وطن کا نام اردو ادب میں روشن کرتے رہیں گے۔

سید محی الدین قادری زور

باقیات فانی | مجموعۂ کلام مولوی میر شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی۔

جناب فانی عہد حاضر کے ان اردو شاعروں میں سے ہیں جنھیں خاص مقبولیت حاصل ہے اور جن کا کلام اکثر محفلوں اور مجلسوں میں سنا جاتا ہے اور جن کی شاعری ہماری زبان کے نوجوان شاعروں پہ اثر انداز ہے۔ باقیات فانی انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے، یہ ایک بہت مختصر سا دیوان ہے جس میں تقریباً ایک ہزار اشعار ہیں، لیکن شاعر کے کلام کا معیار کمیت سے زیادہ کیفیت پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے اس دیوان کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اُردو زبان اس زمانے میں جن کٹھن منزلوں سے گزر رہی ہے اُن کا اقتضا یہ ہے کہ اُردو بولنے والے نوجوان اپنی زبان کے مسائل اور شعر و سخن کے نکات سے بخوبی واقف رہیں لیکن دیکھا یہ جا رہا ہے کہ بعض نوجوان شعرا اپنے کلام میں حد سے زیادہ آزادی اور بے پروائی سے کام لے رہے ہیں جس کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں یہ بے راہ روی اُن کو منزلِ مقصود سے دور نہ کر دے۔ اس خرابی کے اسباب و علل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مبتدی شاعروں کے ذوق کی تعمیر میں عہدِ حاضر کے بلند پایہ شعرا کے کلام کے مطالعہ کو زیادہ تر دخل ہے۔ انھیں بلند پایہ شاعروں میں فانی بھی شامل ہیں جن کے مذکورہ بالا مختصر دیوان میں متعدد ایسے شعر نظر سے گذرتے ہیں جن کی سند پیش کر کے نوجوان شعرا اپنی بے راہ روی کو جائز سمجھ لیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس دیوان میں جو اعلیٰ پایہ کے اشعار ہیں وہ کن خصوصیات پر مشتمل ہیں۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی اچھے شاعر کے اچھے اشعار کے ساتھ ساتھ ناقص اشعار بھی قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور حسنِ عقیدت پالنے کے ساتھ پڑھتے رہنے کی وجہ سے اُن اشعار کے نقایص پر نظر پڑنے نہیں پاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے شاعروں کے کلام میں بھی ویسے ہی ناقص اشعار کا اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ذیل میں باقیاتِ فانی کے چند اشعار پر نظر ڈالی جاتی ہے تاکہ مبتدی شاعر ان کے نقایص سے واقف ہوں اور خود اُن سے بچتے رہیں۔ ان کے اظہار سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کلامِ فانی پر اعتراض کیا جائے بلکہ ہماری یہ خواہش ہے کہ اُردو کے نوجوان شعرا اس قسم کے معایب سے حتی الامکان بچ سکیں۔

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا — دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

"من بیقرار" کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اسلیے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں — دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے، ردیف "رویا" کی بجائے "روتا ہے" چاہیئے۔

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری — مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے چونکہ پہلے مصرع میں "کیا" حرفِ استفہام ہے اس لیے دوسرے مصرع میں "مل مل"

نظر آتی ہے بعض جگہ خیالات کی یکسانیت اور زبان کی پابندیاں پڑھنے والے کی دلچسپی کے سلسلے کو منقطع کر دیتی ہیں۔ زبان اور اسلوب کی شگفتگی کو برقرار رکھنے کی خاطر بعض نظموں میں جناب سیماب نے آورد سے بھی کام لیا مگر اس طرز روش پر وہ مجبور ہیں کیونکہ ان کی نشوونما جس ماحول میں ہوئی اس کا اقتضا ہی یہ تھا کہ وہ خیال سے زیادہ زبان اور اسلوب پر زور دیتے۔ اردو کے جملہ غزل گو شعراء کا یہی شیوہ رہا ہے اور خاصکر فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے۔

بہرحال اردو ادب کی تاریخ میں سیماب اکبر آبادی کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل رہے گی کہ وہ صوبہ متحدہ کے پہلے بلند پایہ شاعر ہیں جنھوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھیں اور اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کر دی جو ان کی تقلید میں اردو کو جدید طرز کی شاعری سے مالامال کر دیگی۔

سیماب اکبر آبادی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ انکے وطن آگرے کا ذکر پایا جاتا ہے انھوں نے اپنے خطبوں، مضمونوں، غزلوں اور نظموں میں غرض ہر جگہ آگرہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی خدمات زبان کو گنوایا ہے۔ زیر نظر مجموعہ "کار امروز" کا ایک حصہ ارض تاج کے متعلق نظموں پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے اپنی وطن پرستی کا بہترین ثبوت دیا ہے یوں تو اکثر شعراء اپنے وطن کا ذکر کہیں نہ کہیں اپنے کلام میں ضرور کرتے ہیں لیکن جناب سیماب اس جذبہ سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اسی جذبہ نے ان کے شاگردوں میں بعض ایسے افراد پیدا کر دیئے جو ان کے بعد بھی ان کے وطن کا نام اردو ادب میں روشن کرتے رہیں گے۔

سید محی الدین قادری زور

باقیات فانی | مجموعۂ کلام مولوی میر شوکت علی خاں صاحب فانی بدایونی۔

جناب فانی عہد حاضر کے ان اردو شاعروں میں سے ہیں جنھیں خاص مقبولیت حاصل ہے اور جن کا کلام اکثر محفلوں اور مجلسوں میں سنا جاتا ہے اور جن کی شاعری ہماری زبان کے نوجوان شاعروں پر اثر انداز ہے۔ باقیات فانی انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے یہ ایک بہت مختصر سا دیوان ہے جس میں تقریباً ایک ہزار اشعار ہیں لیکن شاعر کے کلام کا معیار کمیت سے زیادہ کیفیت پر منحصر ہے اور اس لحاظ سے اس دیوان کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اُردو زبان اس زمانے میں جن کٹھن منزلوں سے گزر رہی ہے اُن کا اقتضا یہ ہے کہ اُردو بولنے والے نوجوان اپنی زبان کے مسائل اور شعر و سخن کے نکات سے بخوبی واقف رہیں لیکن دیکھا یہ جارہا ہے کہ بعض نوجوان شعرا اپنے کلام میں حد سے زیادہ آزادی اور بے پروائی سے کام لے رہے ہیں جس کی وجہ سے اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں یہ بے راہ روی اُن کو منزل مقصود سے دور نہ کر دے! اس خرابی کے اسباب و علل پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مبتدی شاعروں کے ذوق کی تعمیر میں عہد حاضر کے بلند پایہ شعرا کے کلام کے مطالعہ کو زیادہ تر دخل ہے انھیں بلند پایہ شاعروں میں فانی بھی شامل ہیں جن کے مذکورہ بالا مختصر دیوان میں متعدد ایسے شعر نظر سے گذرتے ہیں جن کی سند پیش کر کے نوجوان شعرا اپنی بے راہ روی کو جائز سمجھ لیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس دیوان میں جو اعلیٰ پایہ کے اشعار ہیں وہ کن خصوصیات پر مشتمل ہیں۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی اچھے شاعر کے اچھے اشعار کے ساتھ ساتھ ناقص اشعار بھی قبولیت حاصل کر لیتے ہیں اور حسن عقیدت یا لَے کے ساتھ پڑھتے رہنے کی وجہ سے اُن اشعار کے نقایص پر نظر پڑنے نہیں پاتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے شاعروں کے کلام میں بھی ویسے ہی ناقص اشعار کا اضافہ ہونے لگتا ہے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ذیل میں باقیات فانی کے چند اشعار پر نظر ڈالی جاتی ہے تاکہ مبتدی شاعر ان کے نقایص سے واقف ہوں اور خود اُن سے بچتے رہیں! ان کے اظہار سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کلام فانی پر اعتراض کیا جائے بلکہ ہماری یہ خواہش ہے کہ اُردو کے نوجوان شعرا اس قسم کے معایب سے حتی الامکان بچ سکیں۔

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بیقرار رویا — دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا

"من بیقرار" کا ترجمہ "میں بیقرار" صحیح نہیں اسلیے کہ فارسی ترکیب میں لفظ "من" مضاف واقع ہوا ہے۔

آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں — دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

دونوں مصرعوں میں زمانہ کا تطابق الفاظ سے صحیح نہیں ہے، ردیف "رویا" کی بجائے "روتا ہے" چاہیئے۔

کیا اس کو بیقراری یاد آ گئی ہماری — مل مل کے بجلیوں سے ابر بہار رویا

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں ہے چونکہ پہلے مصرع میں "کیا" حرف استفہام ہے اس لیے دوسرے مصرع میں "مل مل"

کی بجائے "کیوں مل" ہونا چاہیئے۔

آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں — یہ جانتا ہوں دل ادھر آیا اُدھر گیا

اس شعر میں دل کا آنا کس معنی میں استعمال ہوا ہے اگر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے "آنا جانا" تو عاشق کا دل "ٹینس بال" ٹھیرا یعنی ادھر آیا اُدھر گیا، اگر "دل کا آنا" مجازاً عاشق ہونا کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی ادھر آیا ادھر گیا سے کیا مراد ہے؟

شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھے — صبح بہار حشر کا چہرا اُتر گیا

"جی اٹھے" یہ الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ "شام ہجر کے مارے" کشتگان شام ہجر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی ہیں "وہ لوگ جن کو شام ہجر نے ستایا ہے"۔ جیسے مصیبت کا مارا، جو مصیبت زدگا ترجمہ ہے، کشتۂ مصیبت کا نہیں۔

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود — شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

پہلے مصرع میں "غم ہستی" کا ذکر ہے، دوسرے میں مصرع میں غم کی تکرار ہے اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ "دفتر غم" آیا ہستی کا ہے یا عشق و ہوس کا؟

ہزار ڈھونڈیئے اُس کا نشاں نہیں ملتا — جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

"جبیں ملے تو ملے" اس سے کیا مراد ہے؟ جبیں تو آستاں کے ہر متلاشی کے ساتھ ہے۔

چشم ساقی اثر مے سے نہیں ہے گلرنگ — دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا

پیمانے کو دل کا مضاف الیہ قرار دینے کی بجائے اگر یوں کہا جاتا کہ پیمانہ میرے دل کے خون سے لبریز ہے تو شعر بامعنی اور تشبیہ کامل ہوتی۔

لوح دل کو غم الفت کو قلم کہتے ہیں — کُن ہے انداز رقم حسن کے افسانے کا

"غم" کو قلم سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہے، "اور کو" کی تکرار بھی مخل فصاحت! "کن" ایک کلمۃ اللفظی ہے اسی لحاظ سے انداز رقم کی جگہ پر "انداز بیان" زیادہ موزوں تھا۔

کس کی آنکھیں دم آخر مجھے یاد آئی ہیں — دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

"چھلکتے" کی مناسبت سے مصرع اول میں آنکھوں کے ساتھ کوئی تشبیہ از قبیل "پرنم"، یا "مخمور" لائی جاتی تو

بہتر تھا۔

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

پہلے مصرع میں "بھی" کے بعد "تو" کا لفظ زائد اور مخل فصاحت ہے "بھی تو" کی بجائے لفظ "آپ" چاہیئے۔

علاوہ بریں مصرع ثانی کی ترکیب بھی مہمل ہے کیونکہ کسی کے مرجانے کا حیلہ کوئی نہیں ڈھونڈتا البتہ مار ڈالنے کے لیے حیلہ درکار ہے۔

اب اسے دار پہ لیجا کے سُلادے ساقی یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دار پر سلانے کی زحمت ساقی کو کیوں دیجا رہی ہے؟ اور "دار پہ سُلانا" کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اگر "سُولی دینا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو یہ غلط ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں "دار پر چڑھانا" مستعمل ہے۔

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

بہتر تو یہ تھا کہ پیمانے کی مناسبت سے صرف آنکھ کا ذکر ہوتا یا آنکھوں کی مناسبت سے پیمانے کی جمع لائی جاتی

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں لیئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

یہ شعر جو کریہہ منظر پیش کر رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

کہنے کو ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی آپ کی جان سے دور آپ کے مرجانے کا

"مرجانا" کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو مرجانے کے بعد یعنی فوت ہوجانے کے بعد "آپ کی جان سے دور" کہنا لغو ہے۔ یہ تو اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی حادثہ وغیرہ ابھی وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ "مرجانا" اگر "عاشق ہونا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی "آپ کی جان سے دور" کہنا بے محل ہے اگرچہ مطلق "مرجانا" "عاشق ہونا" کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

یاں ہوش سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا اُس بزم میں ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا

"بیزار ہونا" یعنی ناراض ہونا، ملول ہونا، ناخوش ہونا، یہاں کیا معنی مراد ہیں؟ اور اس کو ہوش سے کیا تعلق ہے؟ قطع نظر اس کے جب مصرع اولیٰ میں ہوش سے بیزار ہونے کی نفی کر دی گئی ہے تو شاعر ہشیار قرار پاتا ہے

ایسی صورت میں مصرع ثانی میں یہ کہنا کہ ہشیار ہوا بھی نہیں جاتا بے معنی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم وعدہ پرسش نہیں کرتے یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا

پرسش کا لفظ اگرچہ عیادت کے معنی میں مستعمل ہے لیکن وعدہ کے لفظ کی وجہ سے سامع کا ذہن جامیؔ کے مندرجۂ ذیل شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے:۔

روز محشر کہ جاں گداز بود اولیں پرسش نماز بود

قطع نظر اس سے قافیہ میں لفظ "بیمار" نہیں معلوم کس معنی میں استعمال ہوا ہے؛ اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو یہ درست نہیں، اس لیے کہ بیمار ہونا انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے اور اگر لفظ "بیمار" سے مجازاً عاشق مراد ہے تو مصرع ثانی کے یہ معنی ہوئے کہ ہم سے عاشق ہوا بھی نہیں جاتا۔

دیکھا نہ گیا اُس سے تڑپتے ہوئے دل کو ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا

مصرع ثانی میں معشوق کو ظالم کے لفظ سے خطاب کیا گیا ہے؛ اس لیے مصرع اولیٰ میں لفظ "اُس سے" خطاب کرنا مانع فصاحت ہے "اُس سے" کی عوض اگر "میرے" ہوتا تو یہ عیب مٹ جاتا اور ایک گونہ روانی پیدا ہو جاتی

جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا

پہلے مصرع کا مطلب تو صاف ہے لیکن لفظ "قسمیں" مصرع کے آخر میں واقع ہونے کی وجہ سے "جاتے ہوئے کھاتے ہو" میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

غم گیا ہے اگر منزل جاناں ہے بہت دور کیا خاک رہِ یار ہوا بھی نہیں جاتا

دوسرے مصرع میں لفظ "یار" موجود ہے؛ اس لیے منزل کو جاناں کی طرف مضاف کرنا درست نہیں یا تو لفظ "جاناں" رہے یا لفظ "یار" اگر بہ رعایت قافیہ "جاناں" کی عوض "مقصود" وغیرہ اس معنی کا کوئی لفظ مصرع اول میں لایا جاتا تو یہ نقص رفع ہو جاتا۔

خون ناحق کا گلہ تھا کچھ ادب کا جوش تھا لاش کی صورت زباں تھی اور میں خاموش تھا

"لاش کی صورت زباں تھی" کہہ کر یہ معنی لینا کہ زبان لاش کی طرح بے زبان تھی مہمل ہے۔

تو برقِ معرفت بخشا دلِ آگاہ نے ورنہ پہلے سوزِ غم اک شعلۂ بے ہوش تھا

مصرع ثانی میں سوزِ غم کو شعلہ اور پھر شعلہ کو بے ہوش کہنا ببول بسولا لے گئی کیسے پھنکوں راب کے مصداق ہے۔

سرگزشتِ عمر کہیے اس کو یا رودادِ عشق   دل کے لب جنبش میں تھے اور میں سراپا گوش تھا

"سراپا گوش" کی بجائے ہمہ تن گوش ہوتا تو بہتر تھا۔ "دل کے لب جنبش میں تھے" کہنے سے حقیقی معنی یعنی لبوں کی حرکت ثابت ہوتی ہے، مجازی معنی لینے کے لیے کوئی قرینہ چاہیے جیسے حکیم سنائی نے مسکرانے کو لب تبسم سے تعبیر کیا ہے شعر:۔

ہجراں زدہ را لبِ تبسم   جز در رُخِ دوستاں نہ جنبد

اگر بات کرنے کو "لب تکلم" کی جنبش سے تعبیر کیا جاتا تو شعر بامعنی ہوتا۔

پی اور وہ پی ازل میں کہ اتری نہ حشر تک   یادش بخیر، دل بھی عجب بادہ نوش تھا

"یادش بخیر" دعا کے طور پر غائب کے حق میں بولا جاتا ہے متوفی کے لیے نہیں، چونکہ مصرع ثانی میں "بادہ نوش تھا" کہنے سے بادہ نوش کا متوفی ہونا ظاہر ہوتا ہے اس لیے "یادش بخیر" کا استعمال بے موقع ہے۔

دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی   ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

"بنی" کی مناسبت سے "مٹی" چاہیئے "مٹ گئی" کہنا صحیح نہیں۔ مصرع ثانی میں "دو" جو اسم عدد ہے معدود یعنی بوندوں سے بہت دور جا پڑا ہے جس سے خون کا تعدد لازم آتا ہے چاہیئے تو یہ تھا کہ شاعر دو خون کی بوندوں کے عوض خون کی دو بوندوں میں" کہتا۔

کیا یہ فانی کر رہا تھا عالمِ ہستی کی سیر   آگے آگے بیخودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

بیخودی سے بیخودی موہانی اور ہوش سے ہوش مراد لیے جائیں تو شعر بامعنی اور پُر لطف ہو سکتا ہے، ورنہ مہمل ہے۔

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی   چاک داماں بھی باندازہ درِماں نکلا

مصرع اول میں لفظ "بھی" زائد ہے کیونکہ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جنوں کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی اس کو آزادی کی توقع تھی۔

بجلیاں شاخِ نشیمن پہ بھی جاتی ہیں   کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

شاعر نے دوسرے مصرع کو پہلے مصرع کی کیوں علت قرار دی ہے واضح نہیں۔ قطع نظر اس سے بجلیوں کے ساتھ "بجھنے" کا لفظ استعمال کرنا مضحکہ خیز ہے۔

چارہ گر ناصح مشفق دل بے صبر و قرار　　جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

لفظ "قرار" پر بھی بار، قافیہ کی ضرورت ہے "دل بے صبر و قرار" کہنے سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ "قرار" دل بے صبر سے جدا ہے۔

تمام قوت غم صرفِ دل ہوئی ورنہ　　زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا

موجودہ صورت میں پہلا مصرع دوسرے مصرع کی علت قرار نہیں پا سکتا! اگر "غم" کی جگہ پر "دل" کا لفظ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ "دل، غم کی وجہ سے ناتواں ہو گیا ہے ورنہ نالہ و فغاں سے زمیں ہوتی نہ آسماں ہوتا"

مٹا دیا غم فرقت نے ورنہ میں فانی　　ہنوز راتمی مرگ ناگہاں ہوتا

پہلے مصرع میں "میں فانی" غیر فصیح ہے، دوسرے مصرع میں ردیف "ہوتا" بھی بے معنی ہے یہ مقام "رہتا" کا ہے۔

کیوں خون دل لگی ہی رہیگی جگر میں آگ　　اے ننگ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا

"اے ننگِ عاشقی" کہہ کر خون دل کو غیرت دلانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر یہ نہیں چاہتا کہ جگر میں آگ لگی رہے یعنی سوز محبت باقی رہے حالانکہ جگر میں آگ کا لگا رہنا ہی عین عشق ہے۔

قاتل سنبھل کہ یہ نگہہ دالپسیں نہیں　　خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا

"یہ لہو میں بجھا ہوا خنجر" کیا بلا ہے؟ زہر میں بجھا ہوا خنجر یا نشتر تو اردو میں مستعمل ہے جو زیادہ تیز اور مہلک سمجھا جاتا ہے۔

اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے　　پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا

یعنی معشوق عاشق کو عاشق ہی کے دل میں ڈھونڈتا پھرتا ہے؟ کیا خوب! اور یا میان کشتی و کشتی میان دریا۔

روز جزا گلہ تو کیا شکر ستم ہی بن پڑا　　ہائے کہ دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا

دوسرا مصرع مہمل ہے۔ ہائے کے بعد "کہ" کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ نیز "دل کے درد نے درد کو دل بنا دیا" ایسا ہی ہے جیسا کوئی زید کے شاعر ہونے کو یوں بیان کرے کہ زید نے زید کو شاعر بنا دیا۔

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتہً چپ ہو گئے　　وہ چھپا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

"وہ چھپا" فصحا نہیں بولتے اس کی جگہ پر "یوں" اگر ہوتا تو فصاحت کا پہلو نہ دبتا۔ اسی طرح "ہم" کی تکرار بھی مخل فصاحت ہے۔

دل کو پہلو سے نکل جانے کی پھر رٹ لگ گئی　　پھر کسی نے آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کر دیا

"رٹ لگنا" یعنی بار بار کہے جانا لیکن اردو میں اس کا استعمال نام کے ساتھ ہوتا ہے فعل کے ساتھ نہیں جیسے ع اُس نام لگ گئی ہے رٹ اُس کو۔

بچ رہا تھا اک جو آنسو دار و گیر ضبط سے　　جوشش غم نے پھر اُس قطرہ کو دریا کر دیا

لفظ "پھر" مفید معنی نہیں کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس سے پہلے بھی جوشش غم نے آنسو کو دریا کر دیا تھا۔

دردمندان ازل پر عشق کا احساں نہیں　　درد یاں دل سے گیا کب تھا کہ پیدا کر دیا

تو کیا درد ازلی عشق سے سوا ہے؟

کس قدر بیزار تھا دل مجھ سے ضبط شوق پر　　جب کہا دل کا کیا ظالم نے رسوا کر دیا

صنف نظم سے قطع نظر مصرع ثانی میں اگر اسم کی عوض اسم اشارہ لایا جاتا تو لفظ "دل" کی تکرار کا عیب مٹ جاتا۔

ماسوائے دل میں اک ہنگامہ برپا کر دیا　　چشم کافر کا وہ دل لیکر مکر دیکھنا

"ماسوا" بمعنی جو سوا ہو عموماً ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ماسوائے ذات باری تعالیٰ ہیں یعنی موجودات مخلوقات۔ لیکن اردو میں "سوا" بمعنی علاوہ مستعمل ہے اور اس کے ساتھ لفظ "ما" عموماً نہیں ہوتا۔ یہاں ماسوائے دل سے کیا مراد ہے؟ اور دل کے سوا عاشق کے پاس وہ کونسی چیزیں ہیں جن میں ہنگامہ برپا ہو سکتا ہے۔

تشنہ لب بھی تھا میں ساقی جان سے بیزار بھی　　ساغر اور پھر زہر سے لبریز ساغر دیکھنا

مصرع اول میں لفظ "تھا" مخل معنی ہے اس کی جگہ پر لفظ "ہوں" اگر ہوتا تو ردیف با معنی ہو سکتی۔

تجلیات وہم ہیں مشاہدات آب و گل　　کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

"تجلیات" کو "وہم" کی طرف مضاف کرنا درست نہیں، اس لیے کہ "وہم" کو ضو اور تابندگی سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

دل اذیت آفریں رہین امتحاں نہیں　　　خدائے بے نیاز۔ ہے جہان اضطراب کا

خدا کا لفظ مجازاً بھی استعمال ہوتا ہے جیسے خدائے سخن وغیرہ لیکن خدا کے لفظ کے ساتھ "بے نیاز" بطور صفت لانے کے بعد خدا کے معنی حقیقی ہوں گے یعنی پروردگار کائنات، لہٰذا دل کو خدائے بے نیاز کہنا سوئے ادب ہے۔

جہان بے سکوں میں سکون ہی سکون ہے　　　مری نگاہِ مضطرب ہے رازِ انقلاب کا

بحالت اضافت لفظ "بے سکوں" میں "نون" کا اعلان صحیح نہیں خواہ اُردو میں ہو خواہ فارسی میں۔

وہ صرف صد یقیں سہی حیات پھر حیات ہے　　　کہاں سے لاؤں اعتبار مرگِ کامیاب کا

لفظ "صرف" زاید ہے، اس کے ہوتے ہوئے لفظ "صد" کی ضرورت نہیں اور اگر لفظ "صد" ہو تو صرف لفظ "صرف" نہ ہونا چاہیئے۔

آسماں گرم تلافی چاہیئے کیسا قفس　　　بجلیوں کے اک اشارہ میں قفس کا در کھلا

دوسرا مصرع مہمل ہے۔ تمام بجلیوں کا ایک ہی امر پر متفق ہو کر اک اشارہ کرنا محال ہے، ردیف بھی صحیح نہیں، کھل جاتا ہے یا کھل جائیگا چاہیئے۔

ہجر ساقی میں ہمارے گھر کی کیفیت نہ پوچھ　　　بند در ہر شیشہ خالی دل بھرا ساغر کھلا

شاعر اپنے گھر کی کیفیت بیان کر رہا ہے اس لحاظ سے دوسرے مصرع میں دل کا ذکر جس کا تعلق ذاتِ شاعر سے ہے، بے موقع ہے، گھر کا ذکر کرتے ہوئے "ہر شیشہ" کہہ کر شیشۂ شراب مراد لینا بھی صحیح نہیں اگر میخانہ کا ذکر ہوتا تو "ہر شیشہ" سے مراد شیشۂ شراب ہو سکتا۔ ساغر کھلا کا مطلب بھی نہیں کھلتا۔

بند ہے بابِ قفس ہو سر تو پٹکے جائیے　　　ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

دوسرا مصرع مہمل ہے تیلیوں کی بافت میں جو روزن ہوتے ہیں ان کو "در" کہنا صحیح نہیں "کھلا" ردیف بھی مفید معنی نہیں "کھلا ہوا" چاہیئے۔

اللہ اللہ اک دعائے مرگ کے دو دو اثر　　　واں کھلا بابِ اجابت یاں قفس کا در کھلا

"دو" کی تکرار اختصار کے لیے آتی ہے جیسے دو دو باتیں یعنی مختصر بات چیت دو دو نوکیں یعنی تھوڑی سی سخت کلامی "اک دعا کے دو دو اثر" کہہ کر دو طرح کا اثر مراد لینا صحیح نہیں، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اک دعا کے

دو اشعر کہنا ہی کافی ہے۔

دل میں زخم اشکوں میں خوں صورت ہیں عالم پر ہیں   وہ نگۂ اُف وہ مژہ نشتر چبھا خنجر کھلا

مصرع ثانی مہمل ہے، نشتر تو خیر چبھا! لیکن "خنجر کھلا" سے کیا مراد ہے؟

عہد جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں   ہم بھی جیتے تھے جب تک مرنا یکتا زمانہ تھا

یہ شعر ضعفِ نظم کی ایک افسوسناک مثال ہے قطع نظر اس سے "نہ" میں نون کے فتح کا اشباع اور "کا" کے الف کا اخفا دونوں ناجائز ہیں۔

دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو میخانے کو   ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا

دونوں مصرعوں کی بندش کا تو ذکر ہی کیا! یہ کہنا کہ دل اب دل ہے ایک بے معنی سی بات ہے۔

آہستہ گذر صرصرِ غم وادیٔ دل میں   برباد نہ کر خاکِ شہیدانِ تمنا

"گذر" امر کا صیغہ ہے "گذرنا" سے۔ اردو میں "گذرنا" کے کئی معنی ہیں، مثلاً راستے سے گذرنا۔ یا اس سے گذرنا۔ لیکن مطلق "گذرنا" داخل ہونا کے معنی میں صحیح نہیں، لہذا بجائے "میں" پہلے مصرع میں "سے" چاہیئے۔

"شہیدانِ تمنا" کے معنی ازروئے ترکیب وہ لوگ جن کو تمنا نے شہید کر ڈالا لیکن شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "وہ تمنائیں جو شہید ہو گئیں" غلط اور شعر مہمل ہے۔ (باقی آیندہ)

(ن)

فسانہ | از میر توفیق علی خاں وحشت قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ مطبع عہد آفریں معظم جاہی مارکٹ۔

یہ تین ایکٹ کا ایک مختصر ڈراما ہے جس میں حیدرآباد کی سماجی زندگی کے بعض کمزور پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اصلاح معاشرت کا جذبہ بلاشبہ مستحسن اور قابل ستایش ہے اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے ڈرامے سے بہتر و موزوں کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ "سرِ دلبراں" کی نقاب کشائی کے لیے "حدیثِ دیگراں" ہی اثر آفریں ہے۔ ڈرامے کا پلاٹ اچھا ہے۔ زبان و بیان کے متعلق فاضل مقدمہ نگار مولوی میر حسن صاحب رقمطراز ہیں کہ "اس ڈرامے میں معیاری حیدرآبادی اور مدراسی اردو استعمال کی گئی ہے خصوصاً حیدرآبادی اردو کو وحشت صاحب نے جس حسن اور

لطافت کے ساتھ استعمال کیا ہے اس کی مثالیں اُردو ادب میں مشکل سے ملیں گی۔ اس وجہ سے مکالمہ بعض مقامات پر غیر معمولی طور پر دلچسپ ہو گیا ہے۔" یہ رائے کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ تصنیف و تالیف میں مقامی زبان اور محاوروں کی ٹھوس ٹھانس اس کو دیگر اقطاع ملک کے بولنے والوں میں مقبولیت عام سے ہم آغوش نہیں ہونے دیتی۔ گو یہ درست ہے اور اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ منظر تمثیل پر مقامی بولی کی موزوں اور غیر موزوں بھرمار موقتی طور پر ڈرامے کی کامیابی کا موجب ہوتی ہے لیکن وہ ادبیات کا شاہکار نہیں بن سکتا۔ اگر بالفرض بہ لحاظ کردار مقامی بولی کا استعمال ناگزیر ہو تو اس میں آٹے اور نمک کا سا توازن ہونا چاہیئے ورنہ ظاہر ہے کہ ہر چیز کی کثرت اس کا لطف کھو دیتی ہے۔ زیر نظر ڈرامے میں قدیم دکھنی اور دہقانی زبان اس شد و مد کے ساتھ برتی گئی ہے کہ تھوڑے سے مطالعے سے طبیعت اُکتا جاتی ہے، البتہ کہیں کہیں اس کے فطری استعمال سے مکالمہ دلچسپ ہو گیا ہے۔ اور یہ کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہے۔

س م ح

داغ | از مولوی نور اللہ محمد صاحب نوری۔ قیمت مجلد عہ/ بے جلد عہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

نور اللہ محمد صاحب نوری حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی شاعروں پر ایک عرصہ سے کام کر رہے ہیں، قبل ازیں جناب جلیل مانک پوری اور جناب نظم طباطبائی پر ان کے مضامین "مجلۂ عثمانیہ" میں شایع ہو چکے ہیں۔ حضرت داغ اور ان کے کلام پر یہ کتاب غالباً اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

داغ دہلوی نہ صرف اس لیے کہ وہ جہاں آباد کی بزم تغزل کی آخری شمع تھے بلکہ حیدرآباد میں بھی انکی شاعرانہ زندگی کا بہترین حصہ گذرا ہے، اس قابل تھے کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ جناب نوری نے اس جانب توجہ کی۔ ہم مصنف کو ان کے اس ذوق کار پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ہر چند اس تصنیف سے ہمارے ذہن پر وہ اثرات مرتسم نہ ہو سکے جو کسی اچھی کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتے ہیں۔

کتاب کا اسلوب نگارش سب سے پہلے مرکز توجہ ہوتا ہے۔ اُردو ادب کے اس ارتقائی دور میں یہ طرز تحریر ارباب نظر پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈال سکتی۔ کاش نوری صاحب اس کو جدید انداز میں

لکھنے کی کوشش کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت داغ اور ان کے شاگردوں کے حالات فراہم کرنے میں بہت کوشش سے کام لیا گیا ہے۔

کسی چیز کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے وقت تبصرہ نگار کا وسیع النظر ہونا ضروری ہے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرنے سے کوئی اچھا اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ کا تغزل اس قابل ہے کہ اس کو اردو نظمیات کی تاریخ میں مستقل جگہ حاصل رہے گی لیکن داغ زبان کی رو میں اس طرح بہ جاتے تھے کہ بعض وقت ان کے تخیل کی پستی بازاری پن پیدا کر دیتی تھی۔ داغ کے کلام میں اکثر شعر ایسے ملیں گے جن میں زبان کی لطافت تو موجود ہے لیکن وہ معیار شاعری سے گرے ہوئے ہیں۔ موجودہ صورت میں اس کتاب کو حسن عقیدت کا ایک مرقع سمجھنا چاہیئے۔

نوری صاحب کا یہ کہنا کہ داغ کی وجہ سے حیدرآباد میں ادبی مرکزیت پیدا ہوئی ایک لطیف مغالطہ ہے۔ حیدرآباد میں ادبی مرکزیت اس زمانہ میں ہی پیدا ہو چکی تھی جب دہلی میں اردو کا کوئی شاعر موجود نہیں تھا۔ اس سلسلے میں امیر مینائی کا نام لینا اور بھی ستم ظریفی ہے۔ اس لیے کہ امیر نے حیدرآباد میں اپنی شاعری کا کوئی ایسا دیرپا نقش نہیں چھوڑا جو قابل لحاظ ہو۔

بعض جگہ عبارت بھی غیر مربوط ہو گئی ہے اور اس میں وہ جوش اور تسلسل نہیں پایا جاتا جو خیالات کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے ان مخلصانہ اعتراضات پر نوری صاحب ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ چونکہ ان کو اردو ادبیات کی خدمتگزاری کا شوق ہے اس لیے ہم نے چند باتیں برسبیل تذکرہ بیان کر دی ہیں تاکہ ان کی روشنی میں آیندہ وہ بہتر تصنیف پیش کر سکیں۔

حیدرآباد میں داغ کے کئی شاگرد ہیں۔ اس کے علاوہ یوں بھی داغ کا کلام مقبول رہا ہے اسلیے اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو داغ سے دلچسپی رکھتا ہے۔

م

اورنگ آباد دکن مرتبہ محمد معین الدین متعلم مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء قیمت ار ۔ ملنے کا پتہ کوچک بزم ادب ڈپو کشل منڈی نمبر ۱۷۸/۱ - ا ب

اورنگ آباد سرزمین دکن کا وہ خطہ ہے جو ایلورہ اور ایجنٹا کی نادر روزگار تاریخی یادگاروں، اولیائے کرام کے مزاروں، خلد آباد اور دولت آباد کے جنت نظر نظاروں، تاج محل ثانی یعنی مقبرہ رابعہ دورانی، گولکنڈہ کے نازک دماغ تاجدار کی آرام گاہ اور خاندان مغلیہ کے باعظمت شہنشاہ کے مدفن کے باعث، جس کا نام نامی اس کے لیے وجہ شہرت ہے، رہتی دنیا تک سیاحوں اور مورخوں کی جولاں گاہ رہے گا۔ اس چھوٹے سے خطہ ملک پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن مرتب نے (۱۶) صفحات کے مختصر سے رسالے میں بعض اہم مقامات سے متعلق اجمالی واقعات قلمبند کئے ہیں۔ طرز بیان سیدھا سادہ اور عام فہم ہے کہیں کہیں کتابت اور زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ مختصر رسالہ اس قابل ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے طلباء اس کا مطالعہ کریں، نیز ایک طالب علم کی پہلی کوشش ہونے کے لحاظ سے ہمت افزائی کا مستحق ہے۔

س م ح

نوٹ:- بہت سی کتابوں پر اس نمبر میں تبصرہ نہیں کیا جا سکا کیونکہ گنجائش نہیں تھی۔ انشاءاللہ آیندہ نمبر میں ان سب کتابوں پر تنقید کی جائیگی۔

مجلۂ طیلسانین

۱۔ مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے، جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شائع ہوگا۔

۲۔ اس رسالہ میں طیلسانین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شائع ہونگے جو جامعہ عثمانیہ کی ام، اے اور ام یس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کیے گئے ہیں۔ نیز انجمن طیلسانین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روئداد بھی پیش کی جائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابل اشاعت متصور نہ ہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریداران بلدہ حیدرآباد و خریداران اضلاع سے ۱۲/ بشمول محصول ٹپہ۔

۶۔ زرچندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلئے منتظم اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مطبوعات مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ

۱۔ اُردو ادب بیسویں صدی میں تالیف مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ایم اے

موجودہ صدی کے اُردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ .... قیمت ۱۲؍

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست تالیف

مولوی سید علی محسن صاحب ام، اے ری سرچ اسکالر (جامعہ عثمانیہ)۔ عادل شاہی ریاست کے دورِ تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ .... قیمت ۱۱؍

(ملنے کے پتے)

(۱) دفتر مجلس علمیہ گھانسی بازار حیدر آباد دکن۔

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ ”

(۳) بک اسٹال جامعۂ عثمانیہ۔ ”

(۴) مکتبہ علمیہ چار مینار۔ ”

(۵) مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

(۶) صدیق بک ڈپو لکھنو۔

مجلّہ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد دکن

مجلس ادارت

جلد اول — جون ۱۹۳۷ء

نمبر ۳ — امرداد ۱۳۴۶ف

مجلۂ طیلسانین

مجلس علمیہ طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ

ناشر

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ

گھانسی بازار

حیدرآباد دکن

مجلسِ ادارت

مجلۂ طیلسانین

فہرست مضامین

جلد اول	جون ۱۹۳۷ء م امرداد ۱۳۴۶ف	نمبر ۳

سید مہدی حسین (عثمانیہ) منتظم اعزازی

نے

اعظم جاہی مشین پریس میں چھپوا کر دفتر مجلہ طیلسانیین گھانسی بازار حیدرآباد دکن سے

شایع کیا

اداریہ

اس نمبر میں مولوی سید علی محسن صاحب کا مقالہ جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے مکمل طور پر طبع کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ابواب کی تقسیم کے لحاظ سے اس کو دو قسطوں میں شایع کرنا غیر مفید معلوم ہو رہا تھا۔ اس طرح اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ دو مقالے تمام و کمال شایع ہو گئے جنھیں مجلس علمیہ نے علحدہ کتابی صورت میں بھی شایع کیا ہے۔

اس دفعہ مقالے کی تکمیل کی وجہ سے دیگر مضامین کے لیے زیادہ جگہ نہیں دی جا سکی لیکن آیندہ کے لیے ہم نے قارئین کی دلچسپی کے مدنظر یہ قرار دے لیا ہے کہ مقالات کے صرف دو جز ہر اشاعت میں شایع کیے جائیں اور مابقی گنجایش مختلف علمی و ادبی مضامین کے لیے محفوظ رہے۔ رسالہ کی موجودہ ظاہری صورت بھی بہت کم دلکش اور جاذب نظر ہے اگرچہ ایک علمی رسالے کے لیے عامیانہ پرچوں کی روش اختیار کرنی غیر ضروری ہی نہیں بلکہ ایک حد تک نازیبا بھی ہے، لیکن جہاں تک طباعت و کتابت کا تعلق ہے اُمید ہے کہ ہم بہت جلد موجودہ دشواریوں پر غلبہ پائینگے اور آیندہ نمبر سے اس کی صوری اور معنوی خوبیوں میں آپ کو غیر معمولی اضافہ نظر آئے گا۔

مجلۂ طیلسانئین کے متعلق بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ یہ رسالہ بالکلیہ طیلسانئین عثمانیہ کے لیے مخصوص ہے اور اس میں صرف اُنھی کے مضامین اور منظومات شایع ہوں گے۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگرچہ یہ رسالہ طیلسانئین و تعلیم یافتگان جامعۂ عثمانیہ کا ترجمان ہے لیکن دیگر اہل قلم حضرات بھی اس کے قلمی معاون ہو سکتے ہیں۔ اس رسالے کی اجرائی سے مجلس علمیہ کا مقصد طیلسانئین کی علمی و ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کے علاوہ اُردو زبان

اورادب کی خدمت بھی ہے اور مجلس ہذا کی تاسیس کانفرنس طیلسانئین کے جس رزولیوشن کے تحت عمل میں آئی ہے اس کا مدعا بھی یہی ہے کہ طیلسانئین کے علمی کارناموں کی نشرواشاعت کے ساتھ ساتھ ملک کی دیگر علمی انجمنوں اور اداروں کے ساتھ تعاون عمل کیا جائے اور علم و ادب کی ترقی میں ممکنہ جدوجہد کی جائے۔

اُردو کا رسم خط، املا، قواعد ایسی چیزیں ہیں جن کی اصلاح کی طرف فوری توجہ ناگزیر ہے، تاوقتیکہ ان چیزوں کی اصلاح عمل میں نہ آئے اُردو زبان کی توسیع و ترقی کی کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ اس وقت قواعد کی جو کتابیں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رائج ہیں اُن میں نہ صرف اصطلاحات کا زبردست اختلاف پایا جاتا ہے بلکہ بنیادی طور پر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے۔ قواعد کے بیسیوں مسائل مختلف فیہ اور حل طلب ہیں۔ اُن کے تصفیے کے لیے انٹرنیشنل کانفرنس آف انگلش گرامر کیطرح ایک کل ہند مجلس منعقد کرکے اصطلاحات، اُن کی تعریفیں اور حدود متعین کر دینے چاہئیں تاکہ ہندوستان کے طول و عرض میں قواعد کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن سب میں یکسانیت پیدا ہو اور تحصیل زبان میں دشواری نہ ہو۔ اسی طرح اُردو رسم خط اور املا میں ضروری ترمیمیں ایک کل ہند مجلس میں طے کر دی جائیں اور تمام مدارس و مکاتب میں اُن پابندی ہونے لگے تو اس سے بھی زبان سیکھنا آسان ہو جائے گا۔

گذشتہ اکتوبر میں بہ مقام علی گڈھ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس نے اصلاح زبان کے لیے گیارہ ارکان کی ایک مستقل کمیٹی اغراض ذیل کے لیے تجویز کی تھی:۔

ا۔ زبان کے مسائل کے متعلق ملک کے سربرآوردہ اہل ادب کی رائیں حاصل کرکے اُن پر غور کرے اور اُن رایوں کی بناء پر فیصلے صادر کرے۔

۲۔ ان تمام تجویزوں پر غور کرے اور فیصلے صادر کرے جن سے رسم خط اور طباعت کی اصلاح مقصود ہو۔

جہاں تک ہمیں علم ہے اس کمیٹی نے جس کے ارکان ہندوستان کے مختلف صوبوں کے صاحب رائے اصحاب ہیں اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ کل ہند اُردو کانفرنس کے بعد

علی گڈھ ہی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جوبلی کے سلسلے میں بھی ایک اردو کانفرنس ہوئی اور کئی خطبے اور لکچر ہوئے لیکن اس تمام قیل وقال کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ محض نشستند و گفتند و برخاستند ہی کو بڑا کارنامہ سمجھ لیا جائے، اس وقت عمل کی اور پُرجوش عمل کی ضرورت ہے۔ اس مستقل مجلس اصلاح زبان کو چاہیئے کہ بہت جلد ایک سوال بند مرتب کرکے ملک کے مختلف مدیروں، ادیبوں اور مسائل زبان سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے پاس بھیجے اور اُن کے بیانات کی روشنی میں باہم بحث و تمحیص کے بعد جلد جلد اپنی تجاویز ملک کے سامنے پیش کرے۔

نواب سر مسعود جنگ بہادر کی اچانک اور ناگہانی وفات سے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں کو بہت زبردست نقصان پہنچا۔ مرحوم نہ صرف اس لحاظ سے کہ ایک نامی دادا کے پوتے اور ایک نامور باپ کے بیٹے تھے، بلکہ بجائے خود بھی ہندوستان اور خصوصاً مسلمان قوم کے منتخب ماہرین تعلیم میں شمار کیے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں بحیثیت ناظم تعلیمات انھوں نے جو تعلیمی خدمات انجام دیں اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس میں بھی جس جوش و سرگرمی سے حصہ لیا اس کو اہل حیدرآباد کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ سررشتۂ تعلیمات میں جو ہمہ جہتی ترقی اُن کے دورِ نظامت میں ہوئی اور سررشتہ کے وقار میں جو غیرمعمولی اضافہ اُن کی حُسن توجہ سے ہوا اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ ان شاندار تعلیمی خدمات کے علاوہ مرحوم کو ادبیات اور شعر و شاعری سے خاص شغف تھا۔ انھیں اپنے والد مرحوم جسٹس محمود کی طرح بڑا اچھا حافظہ قدرت سے ملا تھا اور اساتذہ کے پاکیزہ اشعار انھیں بہت یاد تھے۔ اُن کے ذوق ادب کی یادگار ان کا عمدہ مجموعہ انتخاب شعرائے اُردو "انتخاب زریں" موجود ہے۔ مرحوم نے قیام حیدرآباد کے زمانے میں جاپان کا سفر کرکے جاپان اور اس کے تعلیمی نظم و نسق پر جو مبسوط کتاب قلمبند کی تھی وہ بجائے خود ایک معرکۃ الآرا تعلیمی تصنیف ہے۔ ان تعلیمی اور علمی خدمات کے علاوہ اپنے پسندیدہ خصائل اور اخلاق حمیدہ کے لحاظ سے بھی وہ ایک قابل رشک انسان تھے۔ ہر شخص اُن کے اخلاق کا گرویدہ تھا۔ ان کے انتقال سے مسلمانوں کا ایک مغتنم وجود دنیا سے اُٹھ گیا اور ہندوستان ایک بڑے ماہر تعلیم سے محروم ہوگیا۔

ہندوستان کی بہت سے جامعات میں اُردو میں ایم اے کی کلاسیں قائم ہوگئی ہیں اور بہ لحاظ نصاب و نتائج بھی ان کا معیار کافی بلند نظر آتا ہے لیکن یہ ایک عجیب افسوسناک

امر ہے کہ ان خاص شہروں میں جنھیں اُردو کے مرکز ہونے کا دعویٰ رہا ہے اب تک اُردو ام، اے کی جماعت قائم نہیں کی گئی۔ بالخصوص یہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ دہلی، لکھنؤ کی جامعات میں اُردو کے ساتھ اس طرح کی بے پروائی روا رکھی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس خصوص میں نہ صرف ان شہروں کی مقامی انجمنوں اور ذی اثر شخصیتوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ انجمن ترقی اُردو کو بھی بطور خاص اس میں دلچسپی لے کر اداراں باب متعلقہ کو اس بارے میں توجہ دلانی اور پیہم کوشش کر کے ام، اے کی جماعت قایم کرانی چاہیئے۔

جامعہ عثمانیہ میں انگریزی ادب اور معاشیات میں ام، اے کی جماعتوں کے قیام کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی اور ان جماعتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے طلبہ کو جنھیں ان مضامین کا خاص ذوق ہوتا تھا بڑی دقتیں اُٹھا کر دوسری جامعات میں شریک ہونا پڑتا تھا اور اکثر طلبہ عدم استطاعت کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے بحمداللہ ارباب جامعہ کی توجہ سے اب یہ شعبے بھی یہاں قایم ہو گئے ہیں اور ایک ضروری چیز کی تکمیل کر دی گئی ہے خصوصاً انگریزی ادب کی جماعت قایم ہونے کی وجہ سے سر رشتۂ تعلیمات کو موزوں اور لایق اساتذۂ انگریزی دستیاب نہ ہونے کی جو شکایت ہے رفع ہو جائے گی۔

حیدر آباد کی موجودہ مجلس بلدیہ کا یہ آخری سال ہے اس سال کے آخر میں آیندہ تین سال کے لیے ارکان بلدیہ کا انتخاب عمل میں آنے والا ہے۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے بلدی خدمات کے لیے عثمانیہ بلدی جماعت کے نام سے جو بڑی بلدی پارٹی قایم کی ہے اور جس میں تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر روشن خیال افراد بہ تعداد کثیر شریک ہیں اس نے انتخاب میں اپنی طرف سے ہر حلقے کے لیے امیدوار نامزد کیے ہیں۔ یہ امر ہر آئینہ موجب مسرت ہے کہ عام طور پر عثمانیہ بلدی جماعت کے کارنامے قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ جماعت محض خدمت ابنائے وطن کے جذبے کے تحت قائم کی گئی ہے اور ہر قسم کے فرقہ وارانہ احساسات سے قطع نظر کر کے اس نے محض شہریت کے بہترین مفاد کو اپنا نصب العین بنایا ہے اس لیے عام طور پر اس کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس جماعت کے نامزدہ امیدوار انتخابات کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گذر کر خود مجلس بلدیہ میں بھی اسی جوش عمل اور خلوص سے بلدی خدمات انجام دیں گے۔

ادب اور قومیت

ادب کیا ہے؟ قومی حالات، روایات اور رجحانات کا آئینہ، موجودہ سوسائٹی کی جیتی جاگتی تصویر اور ہر قسم کے ادائے خیال کا موزوں سانچا، ادب ہی کے ذریعہ دنیا نے اپنے مختلف نوع کے تمدنوں اور قابل یادگار تاریخوں کی نگہداشت کی ہے اس کی کوئی صنف بھی ایسی نہیں جس نے سماج کو شائستہ اور کار آمد بنانے میں ہاتھ نہ بٹایا ہو کسی قوم کے معائب اور محاسن کا صحیح اور اطمینان بخش اندازہ، سوسائٹی کی چھان بین ہی سے لگایا جا سکتا ہے اور سوسائٹی ادب کے سوا، کہیں اور اپنے حقیقی رنگ میں نظر نہیں آسکتی چنانچہ اسی بنا پر قومی شاعر اور قومی انشاپرداز، اپنے ماحول کا سچا ترجمان اور بہترین نمایندہ سمجھا جاتا ہے، مذکورۂ بالا نظریہ مقام اور وقت کی قید سے بے نیاز اور دنیا کے ہر گوشے میں قبول کیے جانے کا مستحق ہے۔

تاریخ عالم کے سرسری مطالعے سے ہم پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان نے ابتدائے آفرینش سے آج تک علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے میدان میں جو تگ و دو کی ہے اُس کی کامل نگہداشت، ادب کے علاوہ کسی اور واسطے سے ناممکن تھی اور ادب نے اپنے اس فریضے کو بوجوہ احسن انجام دیا، ماضی کو اس نے جہل اور ناواقفیت کی تاریکیوں سے، یک لخت بے نیاز کر دیا، ہمارے آبا و اجداد کی پُرخلوص جد و جہد اور شاندار کارنامے، ادب ہی کے خزانوں میں نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ ہیں عمل کی تلقین اور کائنات کے ہر ذرہ سے اکتساب فیض کا درس ہمیں ادب کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاہنامہ اور دوسرے تاریخی ماخذوں کے بغیر، اہل ایران اپنی قیامت خیز نبرد آزمائیوں اور معاشرتی روایات کو اپنے قومی کردار کی حیثیت سے ہرگز پیش نہ کر سکتے۔ آپ مطالعہ کی میز کے روبرو بیٹھے ہوئے جھوم جھوم کر رستم اور سہراب کی عبرتناک داستان پڑھ رہے ہیں، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا دل اس قصۂ پارینہ کے افسوسناک نتائج پر کرب اور اضطراب کے عالم میں کروٹیں لے رہا ہوگا۔ دو زرہ پوش سپاہی، نیزے بڑھائے جنگی گھوڑوں پر سوار، ایک دوسرے کو آنکھیں دکھاتے اور رجز پڑھتے ہوئے، میدان جنگ میں برسرپیکار ہیں، دونوں نے اپنی ہندی شمشیروں کو بڑے تپاک کے ساتھ بے نیام کر لیا اور ایک خونریز جنگ اور تباہ کن غلط فہمی کی بنا پر، بوڑھے باپ نے اپنے ہونہار بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ

اُتار دیا۔ فردوسی کو انتقال کیے ہوئے اکٹھے ایک ہزار سال کا عرصہ ہوتا ہے لیکن اُس کا ادبی شاہکار اقوام عالم کی تمدنی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل رہے گا، اسی طرح آپ والٹیئر

اور رُوسو کی تصانیف کے بغیر یورپ کے ذہنی، سیاسی اور معاشرتی ارتقاد کا صحیح اندازہ اپنے ذہن میں قائم نہیں کر سکتے۔ اور نہ فرانس کے شہرۂ آفاق انقلاب کے محرکات پوری طرح آپ کی سمجھ میں آسکیں گے۔

ہندوستانی زبان میں بھارت ماتا کا تمدن، تہذیب اور شائستگی مضمر ہے، ہندوستان میں، ہندو مُسلم اتحاد کا خواب بجز چند بے معنی تاویلات۔ اور غلط تصورات کے اس زبان کے ذریعہ ایک بڑی حد تک تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور انشاءاللہ یہی زبان ع

آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں

بچھڑوں کو پھر ملادیں نقشِ دُوئی مٹادیں

والی دیرینہ آرزو کو خوش اسلوبی کے ساتھ عملی جامہ پہنا سکے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زبان میں ہندوستان کی صدہا سالہ تمدنی زندگی، ذہنی کیفیات اور تصورات کا سرمایہ نہایت شرح وبسط اور رواداری کے ساتھ محفوظ ہے۔ دکن کی علمی، سیاسی اور فنی سرگرمیاں، قطب شاہی دربار میں فضل وکمال کی سرپرستی، مُلّا نصرتی، وجہی، ابن نشاطی، عبداللہ حسینی، بہاؤالدین گنج العلم جیسے اہل کمال کی فاضلانہ جدوجہد، دکن کے ادبی سفیر یعنی ولی اورنگ آبادی کی شمالی ہند کو روانگی اور وہاں اس زبان کا شاندار استقبال، مغلیہ دربار کی مٹتی ہوئی یادگاریں اور زوال آمادہ بادشاہوں، اُمراء اور عوام کی عیش پسندی، غزل اور قصیدے کے ذریعہ خود ستائی اور جھوٹی خوشامد کا دوردورہ، سلطنت کے تار و پود کا قوم کے ذہنی اور اخلاقی افلاس کے باعث عبرتناک طریقہ سے بکھر جانا، دربار اودھ کے ہوش فرسا ہنگامے، فورٹ ولیم کالج کی عظیم الشان اُردو نوازی، ڈاکٹر گل کرسٹ، کپتان ٹیلر، ولیم مالکل اسمتھ، اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے علم دوستوں کی پُرخلوص اُردو خدمات، بہارستان دکن کے سرگرم علمی ادارے دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ، جہاں کی فرہنگ اور برسوں کی ان تھک کوششوں نے اس زبان میں "پھول والوں کی سیر" "فسانۂ آزاد" سے آگے بڑھ کر سنجیدہ مضامین اور قابل قدر سائنٹفک تحقیق کا سلیقہ پیدا کیا، یہ تاریخ ادب اُردو سے زیادہ ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں اپنی مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔

انگریزی ادب کی تاریخ، اپنی عظیم الشان ادبی تحریکوں کے ذریعہ آپ کو اہل انگلستان کی حیرت انگیز ترقی کا

پتہ دیتی ہے۔ آج انگریزی حکومت کا شمار، دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا ہے، اس تعجب انگیز قومی انقلاب کا حال آپ ورڈسورتھ کی تصانیف اور کلام میں بخوبی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ابنائے وطن کی مادہ پرستی پر انگلستان کے شاعر اعظم (ورڈسورتھ) نے اپنی متعدد نظموں میں نفرت اور مایوسی کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی عزیز قوم کو فیضان سماوی سے محروم اور برق اور بخارات کا فریفتہ دیکھ کر ان کی مادی خوشحالی پر مسرت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کے روحانی اضمحلال اور بے یقینی پر خون کے آنسو بہاتا ہے، وہ کبھی بارگاہ ایزدی سے بے دینی اور کفر و الحاد کا طلبگار ہے،

O! Great God, I had rather be a Pagan etc.

اور کبھی ملٹن کی یاد میں بے قرار

Milton, thou should'st be living at this hour etc

وغیرہ

اس کے علاوہ انگلستان کے اور دوسرے شاعروں اور انشاء پردازوں نے، مضامین اور نظموں کے ذریعہ لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور قومی خوشحالی میں معتد بہ مدد دی ہے۔ ایک انگریز نونہال شیر خواری کے زمانے میں بھی قومی وقار اور حب وطن کی لوریاں سنا کرتا ہے! اور یہ درس کہ "برطانوی قوم کبھی غلام نہیں بنیگی" نظموں اور گیتوں کے قالب میں اتنے بار اُس کے آگے دُہرایا جاتا ہے کہ وہ اسے جیتے جی، ایک لمحہ کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا۔

اُردو ادب میں دہلی اور لکھنؤ اسکول اور میر، سودا، آتش، ناسخ، داغ، حالی اور اقبال وغیرہ کا زمانہ اضافی اصطلاح میں نہیں بلکہ صد ہا برس کی جامع تاریخ ہے۔

ادب کی دو صنفیں ہیں یعنی نثر اور نظم، دونوں کا دنیا میں مساوی بول بالا ہے، جہاں ہم حضرت علیؓ، اڈمنڈ۔ بَرک، سرسید اور ایسی ہی یگانہ روزگار ہستیوں کے خطبات اور مقالات سے اپنے معلومات میں وسعت اور خیال میں بلندی پیدا کر سکتے ہیں، وہاں ہیں فن شعر کی غیر معمولی قوتوں اور پیغمبرانہ بصیرت افروزیوں سے سر مو انکار نہیں ہو سکتا، نثر کی صنف کئی شاخوں پر منقسم ہے، تنقید نگاری، ادب لطیف، ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ وغیرہ۔

تنقید کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو پرکھنا یا کھوٹے اور کھرے میں تمیز پیدا کرنا۔ تنقید نگاری نہایت مشکل

ذمہ دارانہ کام ہے، اس سے انسان کی عقل وتمیز، اخلاق اور شائستگی اور دماغی قابلیتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مختصر یہ کہ ایک اچھا نقاد قوم کا باعزت رہنما اور سچا علمبردار ہوتا ہے اور بے لوث تنقیدیں قومی اخلاق کو سنوارنے کا شریفانہ طریق کار۔

ادب لطیف نام ہے، انسان کے جذبات شعری کو الفاظ کے حسین نثری قالب میں ڈھالنے کا۔ گہرے اور کارآمد مطالب کو دلنشیں پیرایہ میں ادا کرنا، انشاپرداز کے ذوق کا سخت ترین امتحان ہے، چند بے معنی الفاظ اور غیر متناسب لکیریں، ادب لطیف کا سرمایہ نہیں ہوسکتیں۔

ناول اور افسانے میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے کسی قوم یا فرد کی بہادری، رومان اور مذہبی معتقدات ان اصناف کا موضوع سمجھے جاسکتے ہیں۔ ناول میں وقت، حالات اور مباحث کافی طویل ہوتے ہیں، اس لیے یہ حجم میں افسانے سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، اعلیٰ درجے کے افسانوں کی ابتدا ڈرامائی شان رکھتی ہے اور ان کا اختتام قارئین کو، غیر متوقع نتائج کے انکشاف سے ایک قسم کی دلخوش کن حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ آج کل کی کاروباری دنیا، ناول کے مقابلہ میں افسانہ کو زیادہ پسندیدہ اور فائدہ مند سمجھتی ہے گو کہ ان دونوں کا فریضہ صرف ایک ہے اور وہ یہی کہ سوسائٹی کے تاریک اور روشن پہلو نہایت واضح طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔

فطرت نگاری اور انسانی زندگی کا قریب ترین مطالعہ ڈراما کے لوازم میں سے ہے۔ ادب کی یہ صنف بھی صحت بخش فضا پیدا کرنے اور اس کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھی جانی چاہیئے۔

شاعری کا شمار، فنون لطیفہ میں ہوتا ہے، یہ فنون، انسان کی وجدانی کیفیات لذت پسندی اور لطیف جذبات کی نشو و نما کے ضامن ہیں، مفکرین نے ان میں بھی ایک اور ذیلی تقسیم کی ہے، مادّی اور غیر مادّی۔ مادی فنون سے مُراد وہ فنون ہیں، جن کی تکمیل پتھر، اینٹ، چونا اور اس قسم کی بے شمار مادّی اشیاء کے استعمال کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ معماری اور سنگ تراشی اسی قبیل کے فنون میں داخل ہیں۔ شاعری، موسیقی اور مصوری، غیر مادّی فنون ہیں۔

ایثار، انسان کا اعلیٰ ترین کردار ہے، جو شاعری، انسان میں محبت، ہمدردی اور ایثار کے جذبات کو نہ اُبھارے بیکار ہے، سماج کے جمود کو توڑنا، جذبات میں قیامت خیز حرکت پیدا کرنا، تخلیق کی قابلیت، طباعی اور جدّت شاعری کے سب سے زیادہ مقدم وظائف ہیں۔ ادب کی اس مقدس صنف کو واردات قلبی سے

نزدیک کا تعلق ہوتا ہے۔

لفظی بازی گری اور فحش انداز بیان، کسی بے احتیاط شاعر کے وہ خطرناک حربے ہیں، جن سے بڑی بڑی قومیں، آن کی آن میں گمنام اور معطل ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے قدرت کے اس عطیہ کا صحیح استعمال ہم میں وہ ساری خوبیاں پیدا کر سکتا ہے جو اور ذرائع سے پیدا نہیں ہو سکتیں، چنانچہ ایک بلند پایہ شاعر کا کلام، قوم کی ذہنی زندگی میں دائمی مسرت اور قلبی راحت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

مرزا سرفراز علی بی اے (عثمانیہ)
مددگار سٹی کالج

*

اُردو کا گھنٹہ

ایک ایکٹ ڈراما

[کمرۂ جماعت۔ دروازے کے قریب سیدھی جانب ایک سیاہ تختہ اسٹینڈ پر رکھا ہے جس سے کچھ فاصلہ پر دیوار سے قریب ایک اونچی کرسی ہے۔ سامنے ایک میز رکھی ہے جماعت کا ٹائم ٹیبل دیوار پر چسپاں ہے۔ استاد کی کرسی سے کوئی دو گز کے فاصلہ سے طلبا کی نشستیں شروع ہوتی ہیں۔ جماعت میں شور وغل مچا ہوا ہے۔ دس بارہ سے لیکر بیس بائیس سال کے طلبا بھی موجود ہیں۔ بشیر ہندوستان کی ایک مشہور جامعہ کے گریجویٹ ہیں۔ ان کے مضامین سائنس اور حیاتیات وغیرہ تھے لیکن میرٹھ کے ہونے کی وجہ سے اُردو کے ماہر سمجھے جاتے ہیں کل ہی تقرر ہوا ہے۔ درس دینے کا پہلا موقعہ ہے گھنٹی بجتی ہے تو جماعت میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔]

(سامنے کی نشستوں کے پانچ سات طلبا بیک وقت) آیئے، آیئے۔

(بشیر گھبرائے ہوئے سر جھکائے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ شور وغل میں لحظہ بلحظہ اضافہ ہوتا جاتا ہے جب اسیطرح کوئی دو منٹ گذر جاتے ہیں اکثر طلبا اپنی نشستیں چھوڑ کر اپنے احباب کے بازو بیٹھے گفتگو شروع کر دیتے ہیں بشیر کو جب قدرے سکون محسوس ہوتا ہے تو نیلی کتاب Emergency کا باب دیکھتے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی ٹھان لیتے ہیں)

بشیر۔ (پہلی دفعہ ڈرتے ڈرتے سر اُٹھا کر ایک خاص قسم کی بلند آواز میں) Silence

پہلا شاگرد۔ (جو سامنے کی ایک نشست پر بیٹھا ہے) جناب یہ اُردو کا گھنٹہ ہے۔

بشیر۔ ٹھیک ہے۔

دوسرا شاگرد۔ ٹھیک تو ہے لیکن Silence ! لفظ اُردو نہیں ہے۔

بشیر۔ (گھبراہٹ میں) اُردو تو۔۔۔۔ نہیں ہے۔ مگر اُردو میں مستعمل ہے۔

(طلبا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں)

تیسرا شاگرد۔ صاب آپ کا نام کیا ہے؟

بشیر۔ (بگڑ کر) خاموش رہو۔

(اس پر سب ملکر اور شور مچانے اور پیر گھسنے لگتے ہیں۔

بشر۔ (ہینڈ بک بند کرکے اپنی جگہ سے اٹھ کر)
خاموش، خاموش۔ تم کھڑے ہو جاؤ، تم بیٹھ جاؤ۔
سیدھے بیٹھو، باہر کی طرف مت دیکھو۔
پہلا شاگرد۔ صاب آپ کیا کامیاب ہیں؟
(استاد کے غصہ کا پارہ چڑھ جاتا ہے)۔
چوتھا شاگرد۔ صاب آپ کی شادی ہو چکی۔
پانچواں شاگرد۔ (پیچھے کی ایک نشست پر سے) ایک
اکن ایک۔

(طلبا زور سے ہنستے ہیں)

تیسرا شاگرد۔ سوٹ تو بڑا زور دار ہے۔
پانچواں شاگرد۔ (دبی آواز میں گن گنا تا ہے)
بالم آئے بسو میرے من میں۔
(پوری جماعت بشر کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگتی ہے۔
اتنے میں پریشانی میں بشر کے ہاتھ سے چاک جس سے
وہ بار بار میز پر کچھ لکھتے اور مٹتے جا رہے تھے گر جاتا
ہے تو کوئی دس طلبا لپکتے ہیں۔ ان میں سے ایک
چاک اٹھاتا ہے تو دوسرا اُس سے چھین کر اُستاد کے
آگے میز پر رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں
بشر کے اطراف تقریباً تمام طالب علم جمع ہو جاتے ہیں)۔
پہلا شاگرد۔ صاب۔
بشر۔ (غصہ سے) اپنی جگہ سے اٹھ کر چلے جاؤ یہاں سے۔
(طلبا اپنی اپنی نشستوں کو واپس جاتے ہیں)
پہلا شاگرد۔ (اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) گھنٹہ ختم

ہو رہا ہے صاب، کچھ پڑھائیے۔
بشر۔ (اب کچھ ہمت بندھ چکی ہے) خاموش، پہلے آپ
لوگ اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں۔

(سب بیٹھ جاتے ہیں)

بشر۔ ہاں۔ کونسا سبق شروع کرنا ہے۔
پانچواں شاگرد۔ اخضر کے کیا معنی ہیں جناب؟
بشر۔ زمرد نہیں، فیروزہ کا رنگ نیلا اودا.....
خضر کے آگے ضرورت شعری سے بعض اوقات الف کا
اضافہ بھی کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اس لفظ کو
جہاں تک مجھے یاد ہے اخذ کرنے والے کے معنوں
میں بھی لکھنؤ یا دلی کے بعض اساتذہ نے استعمال
کیا ہے (قدرے بلند آواز میں، متانت کے ساتھ)
بڑا وسیع لفظ ہے۔ خیر اب یہ بتلائیے کہ کونسا سبق
شروع کرنا ہے۔
پہلا شاگرد۔ پہلی نظم صاب، جو پچانویں صفحہ پر ہے۔
(کتاب کھول کر پڑھتا ہے)
یہ دیواروں کا جنگل قدرتی پریوں کی بستی ہے یہاں
خاموشیاں اگتی ہیں موسیقی برستی ہے۔
بشر۔ بڑا پیارا شعر ہے۔ صفت تجنیس کو بڑے سلیقہ
کے ساتھ استعمال کیا ہے چونکہ بستی کا لفظ پہلے
مصرع میں آگیا ہے اس لیے اُس کی رعایت سے شاعر نے
جنگل میں دیواریں کھڑی کر دیں۔ اور چونکہ یہ دیواریں
شہروں کے شور و شغب سے دور جنگل میں واقع ہیں

اس لیے ان پر کائی کی جگہ خاموشیاں اگتی ہیں، جنھیں
سرسبز و شاداب رکھنے کے لیے موسلادھار نغمہ ریز
بارش ہوتی رہتی ہے۔ واللہ خوب شعر ہے صاحب۔
اقبال نے تو یہاں کمال ہی کر دیا ہے۔ گو زبان

چھٹا شاگرد۔ (بات کاٹ کر) صاب یہ اقبال کا
نہیں حفیظ جالندھری کا شعر ہے۔

بشر۔ (متانت سے) حیرت ہے۔ رنگ تو اقبال
ہی کا ہے۔ خیر یہ سمجھ لیجیے کہ حفیظ نے اقبال کے
رنگ میں کہا ہے۔

(تمام لڑکے ہنس پڑتے ہیں)

دوسرا شاگرد۔ ایک اور شعر پوچھنا ہے صاب۔

بشر۔ صفحہ کا نمبر بتلاؤ۔

دوسرا شاگرد۔ صاب وہ کتاب میں نہیں ہے۔
مجھے یاد ہے۔ میں بتا دیجئے۔

(پڑھتا ہے)

اے دل تو اس گلی میں پامالِ ناز ہو جا
قدموں کو سر پہ رکھ کر تو سرفراز ہو جا

بشر۔ (شعر کے ختم ہوتے ہی) بڑا آسان شعر ہے۔
مطلب یہ ہے کہ۔۔۔ اے دل تو گلی میں۔۔ پامالِ

پہلا شاگرد۔ ناز ہو جا۔

بشر۔ قدموں پہ

پہلا شاگرد۔ یہ نہیں کو ہے صاب۔

(کچھ لڑکے ہنستے ہیں)

بشر۔ (پہلے شاگرد سے) تمھارا نام کیا ہے؟

پہلا شاگرد۔ اختر۔

بشر۔ اختر، ذرا اس شعر کو بورڈ پر لکھ دو۔

(اختر بورڈ پر لکھ دیتا ہے، استاد پڑھتا ہے)

اے دل تو اس گلی میں

پہلا شاگرد۔ (ہنسی روکتے ہوئے) گلی نہیں گلی ہے
صاب وہ۔

(جماعت میں ایک زوردار قہقہہ پڑتا ہے۔ اس قدر
شور ہوتا ہے کہ بشر گھبرا کر باہر کی طرف دیکھتے ہیں کہ
کوئی انھیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر جماعت کو ہاتھ سے
خاموشی کا اشارہ کر کے)

بشر۔ (پڑھتا ہے) اے دل تو۔۔۔۔ سنئے، مطلب
یہ ہے کہ، شاعر کہتا ہے کہ اے میرے دل تو اس گلی میں
یعنے معشوق کے کوچہ میں۔ پامال ہونا۔ روندا جانا۔
پامالِ ناز ہونا، معشوق کے ناز سے روندا جانا۔

تیسرا شاگرد۔ صاب کیا ناز کے بھی پیر ہوتے ہیں؟

بشر۔ کیوں نہیں، یہاں شاعر نے ناز کو ایک آدمی
فرض کیا ہے۔

آٹھواں شاگرد۔ آدمی نہیں صاب، عورت فرض
کیا ہوگا۔

(قہقہہ)

بشر۔ آدمی پیر رکھتا ہے لہٰذا ناز کے بھی پیر نکل
آئے ہیں۔ سمجھے۔

ساتواں شاگرد۔ (ایک شریر طالب علم) صاب،
پیٹ میں سے پیر نکالنے کے کیا معنے ہیں۔

(طلباء مارے ہنسی کے بیتاب ہو جاتے ہیں)

بشر۔ (ضبط کر کے اس طرح کہ گویا اس سوال کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا) ایک شعر کی تفہیم ختم بھی نہیں ہوئی، دوسرے سوالات شروع ہو گئے آپ بیٹھئے۔ اس کے معنی پھر بتلا دوں گا (دستی سے پیشانی کا پسینہ پونچکر) ہاں تو پامالِ ناز ہو جا یہاں ناز سے مراد معشوق ہے۔ اس لیے پامالِ ناز ہو جا کے معنے ہوئے معشوق کے پیروں کے نیچے کچل جا۔

چوتھا شاگرد۔ (بری صورت بنا کر) اررر۔

(دبی ہنسی)

بشر۔ بھئی تھوڑی دیر ٹھیر جاؤ تاکہ مطلب سب کی سمجھ میں آجائے۔ ہاں تو پہلے مصرعہ میں شاعر اپنے دل سے کہہ رہا ہے کہ اے دل تو معشوق کے قدموں میں روندا جا۔ قدموں کو سر پہ رکھ کر یعنے معشوق کے پیروں کو اپنے سر پر رکھ کر۔ تو سرفراز ہو جا۔ سرفراز ہونا یعنے عزت حاصل کرنا۔ سرفراز ہو جا یعنے اعزاز حاصل کر۔ پورے شعر کے معنے ہوئے اے دل تو معشوق ناز کی بنا پر جو بھی ظلم و ستم اور زور و زیادتی تجھ پر کرے اُسے برداشت کر لے اور اُس کی قدمبوسی کا شرف حاصل کر کے دونوں جہاں کی سعادتِ دارین کا مالک بن جا۔

چھٹا شاگرد۔ مگر صاب، وہ قدموں کو سر پہ رکھ کر نہیں بلکہ قدموں پہ سر کو رکھ کر ہے۔

بشر۔ (پریشانی کے عالم میں)

It dose'nt mrke any difference

چھٹا شاگرد۔ کیسے نہیں صاب۔ قدموں کو سر پر رکھنا، سر پر پیر رکھنے کے برابر ہے، اور سر پر پیر رکھ کر بھاگ جانا کے معنے فرار ہو جانے کے ہیں۔

پانچواں شاگرد۔ (ایک شریر اور ذہین لڑکا)
ہاں صاب اصل میں یہ شعر یوں ہونا چاہیئے ۔

اے دل تو اس گلی میں پامالِ ناز ہو جا
قدموں کو سر پہ رکھ کر یاں سے فرار ہو جا

(سب کھل کھلا کر ہنستے ہیں۔ اتنے میں گھنٹی بجتی ہے تو بشر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ پردہ تیزی کے ساتھ گرتا ہے)۔

میر حسن ایم اے (عثمانیہ)

"باقیاتِ فانیؔ" پر ایک تنقیدی نظر

از۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

گزشتہ نمبر میں مولوی شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی کے کلام پر جو تنقید شایع ہوئی تھی اس کا دوسرا حصہ اس اشاعت میں پیش کیا جاتا ہے۔ "اس قسم کی تنقیدوں کا مقصد جیسا کہ حضرت نقاد نے اپنے تمہیدی نوٹ میں بیان کیا ہے کسی کی شہرت و مقبولیت کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ محض ادب کی خدمت، اصلاح زبان اور نوجوان شعراء کو ادبی اور لسانی اغلاط سے بچانا ہے"۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ تنقید جس سنجیدہ انداز میں لکھی گئی ہے اس کو ضرور پسند کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اور اہل قلم حضرات کوئی تنقید تحریر فرمائیں، یا اس تنقید پر اظہار خیال فرمائیں تو ہم بخوشی اس کو شایع کریں گے بشرطیکہ سنجیدہ انداز میں ہو اور کسی قسم کی ذاتی تعریض یا تنقیص مقصود نہ ہو۔" (ادارہ)

ظہورِ جلوہ کو ہے ایک زندگی درکار — کوئی اجل کی طرح دیر آشنا نہ ملا ۵۶

"دیر آشنا" اُس شخص کو کہتے ہیں جو دیر میں بے تکلف ہو (ایک زمانے کے بعد ملنے والا) "دیر آشنا" نہیں۔

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے — کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا ۵۷

"چھوٹ گیا" بصیغۂ ماضی کہنے سے یہ لازم آتا ہے کہ درِ زنداں کھلا ہوا تھا اور قیدی چھوٹ گیا، حالانکہ شاعر یہ سوال کر رہا ہے کہ "کیوں درِ زنداں کھلتا ہے؟" اس لیے اقتضائے مقام یہ ہے کہ یوں کہے "کیا کوئی قیدی چھوٹ رہا ہے؟"

اگر ردیف کی رعایت منظور ہے تو مصرعِ اول میں "کھلتا ہے" کی جگہ "پر کھلا ہے" ہونا چاہیئے۔

صیاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا — بیدرد بندبند کسی کا جکڑ گیا ۵۸

"پروں میں گرہ باندھنا" بے معنی ہے! اردو میں "پر باندھنا" بولتے ہیں۔

ہوتا ہے آج فیصلہ اُمید و یاس کا — مٹتا ہے اب وہ دل جو بسا اور اُجڑ گیا ۵۹

دل کی اُمید کو بسنے سے اور یاس کو اُجڑنے سے تعبیر کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ دل میں کبھی اُمید اور کبھی یاس ہوتی ہے، اس مناسبت سے "بسا اور اجڑ گیا" کی بجائے بصیغۂ ماضی استمراری "بستا تھا اور اجڑتا تھا" چاہیئے۔

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں — آنکھ کھلی تو دنیا دیکھی بند ہوئی افسانہ تھا ۶۰

"آنکھ کھلنا" پیدا ہونا۔ "آنکھ بند ہونا" فوت ہونا۔ اس لحاظ سے شعبدے مرگ و زیست سے متعلق ہوں گے آنکھوں سے نہیں۔

فانی گو کیسا ہی سہی پھر بھی تجھ سے نسبت تھی — دیوانہ تھا تھا کس کا تیرا ہی دیوانہ تھا ۶۱

تھا، تھا!! تھا!!! سے شعر میں جو لطف موسیقی پیدا ہو گیا ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

وہی برقِ تجلّی کارفرما اب بھی ہے لیکن — نگاہوں کو میسر ہی نہیں بے ہوش ہو جانا ۶۲

نگاہیں چکا چوند ہو سکتی ہیں، خیرہ ہو سکتی ہیں "بے ہوش" نہیں۔ مصرع ثانی بے معنی ہو گیا۔

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں — جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا ۶۳

لفظ "فقط" تخصیص، حصر و انحصار کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں "فقط" کے بجائے "یہی" لایا جاتا تو بہتر تھا قطع نظر اس سے "خاموشی" کو "کام" سے تعبیر کرنا ایک مہمل سی بات ہے۔

شبِ غم میں بھی میری سخت جانی کو نہ موت آئی — ترا کام اے اجل اب خنجرِ قاتل سے نکلے گا ۶۴

لفظ "شب" کو غم کی طرف مضاف کرنے کے بعد "میں" کا لفظ اضافہ کرنا فصاحت کے منافی ہے۔

دوسرا مصرع مہمل ہے، اس لیے کہ "کام" شاعر کا ہے اور "کام" سے مراد شبِ غم سخت جانی کو موت آنا ہے اس لیے "ترا کام" کی جگہ پر "مرا کام" لایا جاتا تو مصرع بامعنی ہوتا۔

تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا — دل اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا ۶۵

دوسرا مصرع اگر یوں ہوتا تو بہت اچھا تھا۔

دم اس کے ساتھ نکلے گا اگر یہ دل سے نکلے گا

کیونکہ تیر کا دل سے دل کو لیکر نکلنا آسان ہے مشکل نہیں۔

تصور کیا ترا آیا قیامت آ گئی دل میں — کہ اب ہر ولولہ باہر قرارِ دل سے نکلے گا ۶۶

ولولے دل سے نکلیں گے، یا قرارِ دل سے؟ قیامت کا دل میں در آنا بھی عجیب بات ہے۔

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر — موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانہ چاہا ۶۷

لفظ "بہانہ" کے ساتھ کرنا، لانا، بنانا، چلنا، رکھنا، ڈھونڈنا، استعمال ہوتا ہے "چاہنا" نہیں۔

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا   دولتِ دوجہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا   ۶۸

بحالت اضافت "دوجہاں" میں "واو" کو ملفوظہ لانا صحیح نہیں۔ "دُو" فارسی کا لفظ ہے، فارسی میں اور جب اُردو میں فارسی ترکیب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو "واو" معدولہ ہوگا جیسے ع

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا (ذوق)

اور جب اُردو کی ترکیب میں استعمال ہوتا ہے تو "واو" کو ملفوظہ لانا ضروری ہے جیسے ع

سُن لیجئے دُو بول ہے افسانہ ہمارا (میر)

علاوہ اس کے مصرع اولیٰ میں حرف نفی "نہ" کی تقدیم بھی مخلِ فصاحت ہے۔

کیا سوال تو آوازِ بازگشت آئی   جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا   ۶۹

پہلے مصرع میں لفظ "سوال" بصیغہ واحد لایا گیا ہے اس لیے دوسرے مصرع میں لفظ "سوال" جو بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے درست نہیں۔ نیز "طلب" بمعنی مطلوب غلط ہے۔

ہوش جب تک ہے گلا گھونٹ کے مرجانے کا   دمِ شمشیر کا احساں ترے بسمل سے اٹھا   ۷۰

دوسرے مصرع میں "اٹھا" ردیف بصیغہ ماضی ہے اس لیے مصرع اول میں "ہے" کی عوض "تھا" چاہیے۔

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر   قیدِ آدابِ تماشا بھی تو محفل سے اٹھا   ۷۱

"آزاد کرنا" رہا کرنا، چھوڑنا، قید سے رہا کرنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہاں آنکھ کو آزاد کر کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ نیز "بھی تو" کا کیا کہنا۔

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہ خلش   یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا   ۷۲

لفظ "کوئی" کا استعمال اُس وقت صحیح ہوتا جبکہ تیر کے کئی پیکاں ہوتے۔

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے   زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا   ۷۳

"موت آنے تک نہ آئے" یعنے قضا آنے کے بعد آئے، اس موقع پر یہ کہنا کہ "مرنا بھی مشکل ہو گیا" صدائے بے ہنگام ہے۔

کرکے دل کا خون کیا بیتابیاں کم ہو گئیں   جو لہو آنکھوں سے دامن پر گرا دل ہو گیا   ۷۴

"دل خون ہونا" یا "دل خون کرنا" اُردو میں مستعمل ہے "دل کا خون کرنا" بے معنی، نیز دو مصرعوں میں اتنے "ک" جمع

ہو گئے ہیں کہ شعر خاصا کا فستان بنگیا ہے۔

۷۵ کب سے آغوشِ لحد میں ہم ہیں سرتاپا فرار — وہ ستم پرور ہے اب تک بدگمانِ اضطراب

"فرار" بمعنی "بھاگنا"۔ یہاں "سرتاپا فرار" کے کیا معنی ہیں؟ اگر آمادۂ فرار مراد ہے تو کہاں بھاگنے کا ارادہ ہے؟

۷۶ مجھ کو مضطر دیکھ کر اُن کو حجاب آنے لگا — ہو چلی ہیں وہ نگاہیں رازدانِ اضطراب

"ہو چلی ہیں" غیر فصیح ہے، "ہونی چلی ہیں" چاہیئے۔

۷۷ بس ایک آہِ جہاں سوز کے اثر تک ہیں — یہ خار برقِ قفس، دام آسماں صیاد

مصرع ثانی میں قفس، دام، آسماں، صیاد، کو ایک حد تک مناسبت ہے اس لیے کہ آسماں نے صیاد کے ذریعہ دام میں گرفتار کیا اور قفس میں ڈالا لیکن "خار برق" کو اسیری کی شکایت سے کیا تعلق؟

۷۸ کر نہ فریاد خموشی میں اثر پیدا کر — درد بنکر دلِ بیدرد میں گھر پیدا کر

"گھر پیدا کرنا" غلط ہے، اس موقع پر اُردو میں "گھر کرنا" کہتے ہیں۔

۷۹ تہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کر دیکھ — قطرے قطرے میں سمندر ہے نظر پیدا کر

پہلا مصرع عجزِ نظم کا ایک نمونہ ہے۔ "کر کر" کی فصاحت تعریف سے مستغنی ہے۔

۸۰ جتنے غم چاہے دیئے جا مجھے یارب لیکن — ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر

اگرچہ "تازہ" کا لفظ کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن جگر کے ساتھ استعمال ہونے کی وجہ سے سامع کا ذہن لفظ "باسی" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو تازہ کی ضد ہے یعنے تازہ کلیجی۔

۸۱ عشق عشق ہو شاید حُسن میں فنا ہو کر — انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتداء ہو کر

پہلا مصرع مہمل ہے کیونکہ حُسن میں فنا ہونا ہی عین عشق ہے اس لیے "عشق عشق ہو شاید" کہنا بے معنی ہے۔ علی ہذا دوسرے مصرع کا دوسرا ٹکڑا "دل کی ابتداء ہو کر" فضول ہے۔

۸۲ بندۂ خدائی ہے مدعی خدائی کا — بندے نے خدائی کی بندۂ خدا ہو کر

یہ شعر لفظی رعایتوں کا بے معنی ذخیرہ ہے۔

۸۳ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں — درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

مصرع اول کے حُسنِ بندش سے قطع نظر، درد سے مراد آیا دردِ محبت ہے، یا کوئی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درد؟ اگر دردِ محبت ہی مراد ہے، تو اُس پر خدا کی مار کیوں؟

دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز　　　　دُور لیجا ہٹا کے سرحدِ ناز　　۸۴

"سرحد" بمعنی حدِ فاصل، کنارہ، انتہا، وغیرہ۔ اِس کے متعلق "دُور ہٹا" کہنا ہی کافی ہے "لیجا" کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے صحیح نہیں، کیونکہ اس کا اطلاق عموماً اُس شے پر ہوتا ہے جو منتقل ہونے کے قابل ہو۔

پر ہیں اور مشقِ حیلۂ پرواز　　　　ہوں اسیرِ فریبِ آزادی　　۸۵

دوسرے مصرع میں لفظِ "حیلہ" غالباً اس لیے لایا گیا ہے کہ مصرع اول میں لفظِ "فریب" آگیا ہے، ورنہ لفظِ "حیلہ" کو مصرع سے کوئی معنوی ربط نہیں ہے، اس لیے کہ اُڑنے کی کوشش کرتے ہیں نہ کہ حیلہ، بہانہ۔

ہاں چلی جائے یادِ زلفِ دراز　　　　ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو　　۸۶

اگرچہ "چلے جانا" جاری رہنا کے معنی میں بھی مستعمل ہے، لیکن یہاں پہلے مصرع میں "نہ ہو" کے الفاظ ہونیکی وجہ سے سامع کا ذہن "چلی جائے" یعنے "روانہ ہو جائے" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

دلِ عاشق ہے ایک دوزخِ راز　　　　دھیان تیرا بہشتِ شوق سہی　　۸۷

شاعر نے پہلے مصرع میں معشوق کے دھیان کو "بہشتِ شوق" سے تعبیر کیا ہے یعنے جس طرح اہلِ ایمان کو بہشت میں آسایش نصیب ہوگی اسی طرح شوق کو بھی معشوق کے دھیان میں آرام و راحت ملتی ہے، "بہشتِ شوق" کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں "دوزخِ راز" کے معنی یہی ہوں گے کہ جس طرح گنہگاروں کو دوزخ میں عذاب ہوگا، اسی طرح "رازِ عشق" کو بھی عاشق کے دل میں عذاب ہوتا ہے۔

ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش　　　　دل چُرا کر نگاہ ہے خاموش　　۸۸

شاعر نے "نگاہ" کو "خاموش" کہا ہے، گویا دل چُرانے سے پہلے "نگاہ" شور و شیون کرتی تھی۔

ٹوٹتا ہے ترے عہد میں نیرنگ نامِ عشق　　　　برہم ہے تیری ذات سے سارا نظامِ عشق　　۸۹

"نیرنگ" بمعنی طلسم سہی، لیکن اُردو میں "طلسم ٹوٹنا" بولتے ہیں "نیرنگ ٹوٹنا" نہیں کہتے۔

یہ ترا عالمِ مستی وہ تیرا عالمِ ہوش　　　　کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز　　۹۰

مصرعِ اول میں چار چیزیں بیان کی گئی ہیں، وحدت، کثرت، حقیقت، مجاز، اور مصرعِ ثانی میں صرف دو عالم کا ذکر ہے یعنے عالمِ مستی اور عالمِ ہوش، اگر مجاز کو عالمِ مستی سے تعبیر کریں اور حقیقت کو عالمِ ہوش سے تو وحدت، اور کثرت، زائد رہ جاتے ہیں، اس کے برعکس اگر مستی اور ہوش کو کثرت، اور وحدت سے تعبیر کریں تو حقیقت اور مجاز غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔

عجب اک سانحۂ ہوش ربا تھی وہ نگاہ میں ہوں اک عمر سے فانیؔ ہمہ تن ماتمِ ہوش ۹۱

مطلق "نگاہ" کو سانحہ کہنا صحیح نہیں، اگر یہ کہا جاتا کہ اس کا "نگاہ ڈالنا" ایک سانحہ تھا تو مصرع بامعنی ہوتا۔

عدمِ ہوش پہ ہے فطرتِ ہستی مائل کس توقع پہ اٹھائے کوئی نازِ غمِ ہوش ۹۲

"عدمِ ہوش" یعنے ہوش کی نیستی، یا ہوش کا نہ ہونا، اس لحاظ سے مصرع اول کے یہ معنی ہوئے کہ فطرت، ہوش کی نیستی پر مائل ہے۔ لیکن جب ہوش کا وجود ہی ثابت نہ ہو تو پھر اس کے نہ ہونے پر مائل ہونیکے کیا معنی۔

اے عشق خاکِ دل پہ ذرا مشقِ فتنہ کر پیدا کر اس زمیں سے کوئی آسمانِ داغ ۹۳

فتنے برپا کرنے کی مشق کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے "مشقِ فتنہ کر" کی ترکیب مہمل ہے۔

شمع ہوں بے نیازِ ظلمت و نور آئینہ ہوں بغیرِ صیقل و زنگ ۹۴

شمع جو بے نور ہو اور آئینہ جو بے صیقل ہو اُس کا کیا کہنا۔

کیا کہیں کیوں خاموش ہوئے ہیں سُنکے تری فرقت کی خبر ہم نالۂ دل کے جتنے تھے اجزا ہو گئے سارے درہم و برہم ۹۵

مصرع اول میں لفظ "فرقت" اُس وقت بامعنی ہو سکتا ہے جبکہ اس سے معشوق کی فرقت دائمی یعنے "وفات" مراد لیجائے۔

گو بیٹھے بھی اٹھے بھی ہم محفلِ دشمن میں تیری خاطر بیٹھ گئے دلِ زار کی صورت اٹھے صورتِ دردِ جگر ہم ۹۶

مصرع ثانی میں "اٹھے" کی مناسبت سے دلِ زار کی صورت "بیٹھے" چاہیئے "بیٹھ گئے" صحیح نہیں۔

ڈوب ہی جائے کشتیٔ ہستی کچھ تو آخر ورنہ کہاں تک بحرِ تلاطم خیزِ جہاں میں یوں ہی رہیں گے زیر و زبر ہم ۹۷

پہلے مصرع کی بندش کا تو ذکر ہی کیا، لیکن "زیر و زبر ہم" کے ساتھ کرنا، ہونا، استعمال ہوتا ہے "رہنا" نہیں۔

گھڑیاں اپنی عمر کی ہم نے غنچوں میں چل پھر کے گذاریں آئے تھے فانیؔ باغِ جہاں میں گویا مثلِ نسیمِ سحر ہم ۹۸

مصرع ثانی میں "باغِ جہاں" کی عوض صرف "باغ" کا ذکر ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ مصرع اولیٰ میں غنچوں سے مراد حقیقی غنچے ہیں جو درختِ گل پر ہوتے ہیں، چونکہ شاعر نے باغِ جہاں کا ذکر کیا ہے اس مناسبت سے غنچوں کے عوض غنچہ دہن وغیرہ الفاظ لائے جاتے تو شعر بامعنی ہوتا۔

یہاں بھی ہے دلِ آگاہ وقفِ لذتِ درد خرابِ مستیٔ عیشِ خمار ہم بھی ہیں ۹۹

مصرع ثانی کی ترکیب مہمل ہے، "خرابِ خمارِ مستیٔ عیش" یا "خرابِ مستیٔ عیش" کہنا چاہیئے۔

نہ دن کو چین ہے نہ راتوں کو نیند تری طرح اداس جلے ہوئے تو چراغِ مزار ہم بھی ہیں ۱۰۰

چراغِ مزار کے متعلق یہ کہنا کہ وہ راتوں کو اُداس رہتا ہے، ایک حد تک درست ہے لیکن "چراغِ مزار" کا دن کو چپ رہنا کیا معنی؟ شاید بزعم شاعر "چراغِ مزار" بولتا بھی ہے۔

جنوں نے دی ہمیں راحت، گر نہ اے فانی — نشانۂ المِ روزگار ہم بھی ہیں ۱۰۱

پہلے مصرع میں بصیغۂ ماضی یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنوں نے راحت دی، اس مناسبت سے ردیف "ہیں" صحیح نہیں، "تھے" چاہیئے۔

مرگِ بے ہنگام فانی وجہ تسکیں ہو چکی — زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں ۱۰۲

"مرگِ بے ہنگام" یعنے بے وقت کی موت، اگرچہ غیر فصیح ہے لیکن جب فانی کے لیے موت وجہ تسکین ہو چکی تو پھر زندگی کس کی، اور گھبرانے والا کون۔

عالمِ درد کا نظام آکے ذرا الٹ نہ دو — عشق سے فرق آ گیا حُسن کے امتیاز میں ۱۰۳

یہ واضح نہیں کہ یہاں "امتیاز" کس معنی میں استعمال ہوا ہے، اگر اس سے مراد مرتبہ اور شان ہے تو اس سے حُسن کی توہین لازم آتی ہے جو منافی عشق ہے، اگر شناخت اور پہچان کے معنی لیے جائیں تو مصرع کے یہ معنی ہوں گے کہ عشق کی وجہ سے عاشق حُسن کی شناخت نہ کر سکا حالانکہ عاشق سے بڑھ کر حُسن کی شناخت اور کون کر سکتا ہے۔

فصل خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں — یادِ وصالِ مختصر ملکے شبِ دراز میں ۱۰۴

"وصالِ مختصر" یعنے چہ . . . . . تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔

چشم براہ یار ہوں منتظرِ فشار ہوں — سبزۂ رہگذار ہوں عالمِ عرضِ ناز میں ۱۰۵

"سبزۂ رہگذار" تو پامال ہو سکتا ہے لیکن "فشار" رہگذار پر نہیں لحد میں ہو سکتا ہے۔

بے اثری مجھے قبول ایسے اثر کو کیا کروں — اب تو خدا اثر نہ دے آہِ اثر گداز میں ۱۰۶

مصرع اول میں لفظ "ایسے" مفید معنی نہیں اس لیے کہ وہ اثر جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُسکا کہیں ذکر ہی نہیں۔ نیز آہ کی صفت "اثر گداز" مہمل ہے۔

چارہ شبِ فراق کا شکر نہیں تو کچھ نہیں — بوئے مزاجِ یار ہے نبضِ بہانہ باز میں ۱۰۷

مصرع ثانی میں "بہانہ باز" ہونے کی وجہ سے "بوئے مزاج" کی عوض خوئے مزاج زیادہ مناسب تھا۔ "بو" اس موقع پر کہنا درست نہیں، اردو میں "خوبو" مستعمل ہے۔

انبار آنسوؤں کے ہیں خونِ جگر کے ڈھیر — معمور ہے خزانۂ سرکارِ آستیں ۱۰۸

"آنسوؤں" کا انبار، خون جگر کا ڈھیر، صحیح نہیں ہے۔ اردو میں سیّال اشیاء کے لیے لفظ "انبار" یا "ڈھیر" استعمال نہیں ہوتا۔

کل تک جو ہاتھ چشم و چراغِ جنوں رہا — ہے آج فرطِ ضعف سے آزارِ آستیں ۱۰۹

"آزار" بمعنی ایذا، رنج، بیماری، روگ۔ یہاں کونسے معنی مراد ہیں۔

ہر نفس وقفِ خیالِ رخِ جاناں کرلیں — زندگی ہجر میں دشوار ہے آساں کرلیں ۱۱۰

"ہر نفس" کے بعد علامتِ مفعول چاہیئے۔ اس کے بغیر لفظ "نفس" وقف کرنے کا مفعول نہیں ہوسکتا۔ موجودہ ترکیب میں "ہر نفس" کے معنی ہر لحظہ، ہر لمحہ کے ہوں گے، اور وہ شے جو وقفِ خیال کیجاتی ہے، مذکور نہیں۔

بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرّے — یہی ذرّے اڑالیجائیں گے اک دن بیاباں کو ۱۱۰

یہ کہنا کہ بیاباں کو کچھ خاک کے ذرّے یہاں لے آئے تھے، پھر یہ کہنا کہ یہی ذرّے بیاباں کو اڑا لیجائیں گے، آخر اس (آورد و برد) کا حاصل۔

خدا غارت کرے دل کو بڑی مشکل میں ڈالا ہے — یہ سمجھا عمر بھر ناداں فریبِ عشق آساں کو ۱۱۱

"خدا غارت کرے" عورتیں بولتی ہیں بد دعا کے محل پر۔

دلِ فانی سے گو نکلی مگر آساں نہیں نکلی — عجب شے ہے خدا بخشے امیدِ وصلِ جاناں کو ۱۱۲

"خدا بخشے" کہہ کر جو امیدِ وصل کے حق میں مغفرت کی دعا کیجاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے امید کو ایک شخص قرار دیا ہے لیکن پھر اس کو "عجب شے" کہنا مضحکہ خیز ہے۔

ستم کا لطف بھی ہے امتیازِ لطف کے دم تک — کرم بھی کیوں نہ ہو بیداد گر بیداد ہی کیوں ہو ۱۱۳

پہلے مصرع کا یہ ٹکڑا "امتیازِ لطف کے دم تک" مہمل ہے۔ "دم تک" یعنی "جیتے جی" غیر ذی روح کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔

ٹھکانا ہے سرِ تقدیر پہ ہر خونِ ناحق کا — تری تلوار میرے خون میں ڈوبی ہوئی کیوں ہو ۱۱۴

"سر پر خون ہونا" یعنی گناہِ قتل ذمہ ہونا" لیکن "سر پر خون کا ٹھکانا ہونا" مضحکہ خیز ہے۔

تو جانِ مدعائے دل اور دل جگہ جگہ — ہے ایک شمع رونقِ محفل جگہ جگہ ۱۱۵

پہلے مصرع میں ردیف مخلِ معنی ہے "جگہ جگہ" کے معنی ہر جگہ، ہر ایک جگہ کے ہیں، یہ تو معنی نہیں ہو سکتے کہ دل ہر ایک پہلو میں ہے۔

۱۱۶ دنیائے دل میں ہیں ترے بسمل جگہ جگہ — حسرت جدا امید جدا آرزو جدا

"جگہ جگہ" کہنے میں "جدا جدا" کا مفہوم ہے، مصرع اول یوں چاہیئے ع

حسرت کہیں امید کہیں آرزو کہیں

۱۱۷ دیوار کی صورت کو ملا لیتے ہیں در سے — بیکاریِ وحشت میں ہم اے گریۂ وحشت

"بیکاریِ وحشت" صحیح نہیں، اس لیے کہ شاعر "بیکار" بالکل نہیں ہے گریۂ وحشت میں مشغول ہے، مصرع ثانی بھی مہمل ہے، اگر دیوار کو در کی صورت کر دینا مقصود ہے تو "ملا لیتے" کی بجائے "بدلتے" چاہیئے۔

۱۱۸ غیرتِ غم کو رام کر اُف کی مجال رہ نہ جائے — جبر قبولِ عام کر کارِ فغاں تمام کر

فارسی میں "کار تمام ساختن" آیا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ "کام تمام کرنا" دو معنی میں مستعمل ہے، ایک کام انجام دینا، دوسرے ہلاک کرنا، مصرع اول میں اگر یہ بیان کیا جاتا کہ فغاں کا کام تمام کر دے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ فغاں کا خاتمہ کر دے تاکہ فغاں باقی نہ رہے لیکن موجودہ ترکیب میں "کام" کے عوض "کار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی مضاف کی حیثیت سے جو مخل معنی ہے۔

۱۱۹ عہدِ کرم نباہ دے پرسشِ حال رہ نہ جائے — نزع میں دادِ آہ دے اب نہ حیا کو راہ دے

"عہد نباہنا" ایفائے عہد کے معنی میں غلط ہے۔

۱۲۰ زخمِ جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے — اب جو ہوا ہوا تمام چھوڑ خدا پہ اندمال

ردیف "رہ نہ جائے" زاید ہے یہاں جس کے کچھ معنی نہیں۔

۱۲۱ اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے — جو دل کی حسرتیں ہیں سب دل میں ہوں تو بہتر

دل کی حسرتیں تو دل میں موجود ہیں اور شاعر یہ چاہتا ہے کہ حسرتیں دل سے نکلنے نہ پائیں، ایسی صورت میں "مہمان رہ نہ جائے" کے عوض "مہمان جانے نہ پائے" چاہیئے۔ "باہر رہ جائے" اس وقت کہہ سکتے جبکہ کوئی گھر کے باہر ہے اور اندر آنا چاہتا ہے۔

۱۲۲ یہ ایک رہ گیا ہے میدان رہ نہ جائے — سب منزلیں ہوئیں طے محشر ہے اور باقی

پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی (اے دل سب منزلیں طے ہوئیں اور محشر ہے) اس جملہ میں "اور" کے کیا معنی ہیں؟

اگر اس کے عوض "صرف" یا اسی قبیل کا کوئی لفظ ہوتا تو مصرع بامعنی ہوتا۔

وہ جامِ کفر پرور بھر دے کہ مست کر دے　　　　مستوں کے دل میں ساقی ایمان رہ نہ جائے　۱۲۳

پہلے مصرع میں ساقی سے یہ استدعا کی جا رہی ہے کہ جامِ کفر پرور بھر کے مست کر دے، یعنی استدعا کرنے والے مست نہیں ہیں، اور جامِ کفر پرور سے مست ہونا چاہتے ہیں، ایسی حالت میں استدعا کرنے والوں کے متعلق "مستوں" کا لفظ استعمال کرنا مہمل ہے، اس لیے کہ جب وہ مست ہیں تو پھر مست ہونے کی تمنا کے کیا معنی؟ "مستوں" کے عوض اگر "رندوں" کا لفظ ہوتا تو شعر بامعنی ہوتا۔

تھی شکستِ دل مگر تا حدِ آوازِ شکست　　　　ٹوٹ کر بھی دل طلسمِ شوقِ یاس آمیز ہے　۱۲۴

پہلے مصرع کے الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دل ٹوٹا اور وہاں تک ٹوٹا جہاں تک کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز گئی ؟؟؟؟؟

مرگِ فانی کو ہے یارب آہ اب کیا انتظار　　　　دیر سے پیمانۂ عمرِ وفا لبریز ہے　۱۲۵

دوسرے مصرع میں "دیر سے پیمانۂ عمر لبریز ہے" کافی تھا لفظ "وفا" کیا افادۂ معنی کر رہا ہے؟

بعدِ فنا بھی کم نہ ہوئیں بے قراریاں　　　　لاشہ نہ تھا مرا کوئی بجلی کفن میں تھی　۱۲۶

پہلے مصرع میں لفظ "فنا" صحیح نہیں، جب فنا ہو گئے تو پھر کفن دفن اور لاشہ کس کا؟ اس موقع پر اگر لفظ "مرگ" کا استعمال ہوتا تو شعر بامعنی ہوتا۔

تمہارے عشق کا اللہ رے فیض　　　　جگر میں دھوم ہے دردِ جگر کی　۱۲۷

اس شعر میں قافیہ "جگر" زاید ہے کیونکہ "جگر میں درد کی دھوم ہے" کہنے سے مطلب ادا ہو جاتا ہے۔

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی　　　　دامنوں کی ہے خبر اور نہ گریبانوں کی　۱۲۸

دوسرے مصرع میں شاعر نے یہ بیان کیا ہے کہ اب دامن کی خبر ہے نہ گریبان کی خبر ہے، اس سے وحشت کا بڑھ جانا صاف ظاہر ہوتا ہے، ایسی حالت میں "وحشت کم ہے یا بڑھ گئی" بطور استفہام کے کہنا مہمل ہے۔

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی　　　　دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی　۱۲۹

"خیر تو ہے" یا "خیر ہے" اس جگہ بولتے ہیں جب کوئی کسی کے پاس بے وقت آتا ہے، یا بے محل کوئی کام کرتا ہے، یہ معنی تو یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے، "خیر تو ہے" کہہ کر اس سے "خیر و عافیت" مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

حسن مجبورِ تغافل ہے ادب شرطِ وفا　　　　رہ گئی شرم غمِ عشق کے افسانوں کی　۱۳۰

"شرم رہ جانا" (عزت و آبرو میں فرق نہ آنا)، غمِ عشق کے افسانوں کی شرم رہ گئی یعنی افسانوں کی عزت و آبرو میں فرق نہ آیا، کیا خوب!!

۱۳۱ چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہیں توبہ!! آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

"آنکھ پڑنا" اُردو میں کئی معنوں میں مستعمل ہے جیسے رغبت اور لالچ سے دیکھنا، یا حسد سے دیکھنا، "پیمانے" چشمِ ساقی کو رغبت اور لالچ سے کیوں دیکھیں؟ یا حسد کیوں کریں؟ البتہ اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ چھلکتے ہوئے پیمانے چشمِ ساقی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن "آنکھ پڑنا" رشک کی نگاہوں سے دیکھنا، کے معنی میں غلط ہے۔

۱۳۲ دل ہے وہ طاقِ غمکدۂ عمرِ دوش کا رکھی ہے جس پہ شمع تمنا بجھی ہوئی

"عمرِ دوش" یہ ترکیب مہمل ہے، "دوش" کے معنی گذری ہوئی رات یعنی عمرِ شب گذشتہ۔

۱۳۳ میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں تصویرِ گردِ بادِ وفا ہوں مٹی ہوئی

"نشان" اگر آثار اور کھوج کے معنی میں ہے تو اس کی صفت شکستہ غلط ہے، اگر "ستون" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو راستہ میں نصب کیا جاتا ہے تو شعر کا لطف ظاہر ہے۔

۱۳۴ کیجیے دعا کہ اُف تو کرے دردمندِ عشق اول تو دل کی چوٹ پھر اتنی دکھی ہوئی

"دل دکھنا" تو اُردو میں مستعمل ہے، "دکھی ہوئی چوٹ" کے کیا معنی؟ "چوٹ" ضرب کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور "دکھ" کے معنی میں بھی، اگر یہاں "چوٹ" بمعنی "ضرب" ہے تو اس کے متعلق "دکھی ہوئی" کہنا غلط ہے، اس لیے کہ ضرب خود دکھ دینے والی ہوتی ہے، اگر "چوٹ" بمعنی صدمہ استعمال ہوا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں اس لیے کہ صدمہ دکھا ہوا نہیں ہوتا۔

۱۳۵ مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

"آنکھ" کا لفظ بصیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے اس لیے لفظ "آنسو" کی جو خبر آئے گی وہ بصیغۂ جمع ہونی چاہیے، اس لحاظ سے پہلے مصرع میں "کیا ہے" صحیح نہیں "کیا ہیں" چاہیئے، اور اسی طرح مصرع ثانی میں "انگارہ" کی جگہ "انگارے"، اور "بہہ جائے" کے عوض "بہہ جائیں" ہونا چاہیئے۔

(باقی آیندہ)

تنقید و تبصرہ

انمول جواہرات مصنفہ و مولفہ ہرچرن لال صاحب وامن صفحات (۶۴) قیمت ۸/ ملنے کا پتہ۔ سرن داس۔ پریم نگر۔ دیال باغ۔ آگرہ۔

ہرچرن لال صاحب وامن کے دس مضامین کا مجموعہ ہے! اور اس کے آخر میں بہت کام کی باتیں جو مفید مقدسوں کا کام دے سکتی ہیں "اشارے" کے عنوان سے پیش کی گئی ہیں بعض مضامین پہلے رسائل میں شایع ہو چکے ہیں، اور اس قابل ہیں کہ ان کو دوبارہ شایع کیا جاتا۔

مصنف ایک روشن خیال اور آزاد مشرب ہندو ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہبی و روحانی تعلیم کی اشاعت ہی خدا کی تمام برکتوں کو بنی نوع انسان تک پہنچانے کا واحد طریق عمل ہے۔ وہ غلط تعصبات سے پرہیز کرتے ہیں اور اس مختصر مجموعہ کو محض اس لیے شایع کیا ہے کہ ہندستانی گروہ غور و فکر کرنے اور مفید نکات ذہن نشین کرنے کے عادی نہیں اور دھرم اور رسم و رواج میں تنگ دلی اور پیچیدگیوں سے بچیں۔

اس قسم کے مضامین اور کتابوں کی اردو کو ضرورت ہے، اور توقع ہے کہ وامن صاحب اپنے اس مفید اور دلچسپ مشغلہ کو جاری رکھیں گے، اور اپنے مضامین میں مستعملہ اردو الفاظ کی جگہ غیر مانوس ہندی یا انگریزی الفاظ استعمال نہ کریں گے جیسا کہ اس مجموعہ میں بعض جگہ کیا گیا ہے۔

تسہیل البلاغت مصنفہ سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی سابق پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن۔ صفحات (۲۵۰) قیمت (۔/۲) ناشر صفوۃ اللہ بیگ سجاد منزل دہلی۔

اس کتاب کے مصنف ۱۹۱۵ء سے نظام کالج میں اردو کے معلم تھے، اور اس زمانے میں

کالج کے طلباء کو علم بلاغت کی تحصیل میں مدد دینے کے لیے انھوں نے جو لکچر تیار کیے تھے یہ کتاب انھیں کا مجموعہ ہے، اور اب عام فائدہ کی غرض سے شایع کی گئی ہے۔ سجاد مرزا بیگ صاحب نے اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ حکمت اور فلسفہ ان کا خاص موضوع ہے اس وجہ سے ان کے اسلوب میں خاص علمیت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کو موضوع کے لحاظ سے چار عنوانوں پر تقسیم کیا ہے (۱) علم معانی (۲) علم بیان (۳) علم بدیع اور (۴) علم بلاغت۔ ان چاروں عنوانوں کے ضمن میں مولف کے اکتیس ۳۱ لکچر مندرج ہیں جن میں سے بعض نہایت دلچسپ اور مفید ہیں، لیکن ان کے اسلوب بیان میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔ بعض لکچر اس پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مخاطب چھوٹی جماعت کے طالب علم ہیں، اور بعض لکچروں کا اسلوب نہایت عالمانہ اور گنجلک سے معمور ہے۔

یہ کتاب آج سے (۱۷) سال قبل لکھی گئی تھی، جیسا کہ اس کے دیباچہ کی تاریخ ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آج اردو کے عام طالب علم بھی جانتے ہیں کہ گذشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں ہماری زبان کے متعلق معلومات میں کتنا اضافہ ہو چکا ہے، لیکن تسہیل البلاغت ان تمام جدید تحقیقات اور معلومات سے محروم ہے۔ خاصکر اس کا دوسرا لکچر جو ''ٹکسالی زبان'' پر لکھا گیا ہے نہایت دقیانوسی اور غیر محققانہ معلومات پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے وہی مذموم و متروک راگ پھر سے الاپا ہے جس کو اس سے بہت پیشتر میر امن دہلوی نے باغ و بہار کے دیباچہ میں، اور محمد حسین آزاد نے آبحیات میں الاپا تھا۔ یعنی دہلی کی زبان اردوئے معلّیٰ ہے، اور اس شہر کے علاوہ کسی اور شہر یا صوبہ کو اردو کی مرکزیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ اہل لکھنؤ بھی مولف تسہیل البلاغت کی نظروں میں اہل زبان نہیں ہیں، بلکہ زباں داں۔

اس غیر علمی اور مخرب زبان خیال پر مصنف نے بہت سی جگہ اور وقت صرف کر دیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ایک محلے والے دوسرے محلے والوں کو، اور ایک شہر والے دوسرے شہر والوں کو بے زبان قرار دیتے رہیں، اور اس طرح سے آپس ہی میں کٹ مریں۔ کوئی زبان کسی خاص ملک یا شہر کی میراث نہیں ہوتی۔ جس ملک یا شہر میں زبان کے استعمال

کرنے والے اور اس کو ترقی دینے والے پیدا ہوں گے وہی ملک یا شہر زبان کا مرکز قرار پائے گا۔ اُردو زبان کے ارتقائی مدارج کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک گولکنڈہ اور بیجاپور میں اُردو زبان میں تصنیفات وتالیفات کی گئیں اور اعلیٰ پایہ کے شاعر پیدا ہوئے، اُردو کے مرکز گولکنڈہ اور بیجاپور ہی تھے، اس وقت لکھنؤ کا تو وجود ہی نہ تھا اور اہل دہلی یہ جانتے بھی نہ تھے کہ اُردو زبان تصنیف وتالیف اور شعر وسخن کے لیے استعمال کیجا سکتی ہے۔ اُن کے یہاں اُردو محض بازاری بولی تھی اور علم وفضل اور شعر وسخن کے لیے فارسی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ہندوؤں نے بھی فارسی سیکھی اور اُن میں سے بعض اس اجنبی زبان کے اچھے شاعر اور انشا پرداز بھی ہوئے۔ اگر مسلمان اہل ہند کی کسی زبان میں لکھنا چاہتے تھے تو برج بھاشا میں لکھتے تھے جیسا کہ عبدالرحیم خانخاں اور دیگر مسلمان شعرا نے لکھا۔ اگر انھیں اس امر کا علم ہوتا کہ ہم جو زبان گھروں اور بازاروں میں بولتے ہیں اس میں اہل دکن تصنیف وتالیف بھی کرتے ہیں اور ہم سے پہلے کے زمانہ میں بھی وہاں یہ زبان شعر وسخن اور علم وفضل کے لیے استعمال کی جا چکی ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ دلی وآگرہ میں عہد اکبر میں بھی بجائے برج بھاشا میں لکھنے کے اُردو ہی میں لکھا جاتا۔

جب گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کو زوال ہوا اور مغل فوجوں کے ساتھ یہاں کے کتب خانے اور شعرا شمالی ہند پہنچے تو اہل دہلی کو معلوم ہوا کہ دکن میں اُردو اتنی ترقی کر چکی ہے۔ اس علم کے بعد انھوں نے بھی فارسی گوئی کو ترک کر کے اُردو میں لکھنا شروع کیا اور اُس وقت یعنی عہد محمد شاہ سے دلی اُردو کا مرکز قرار پاتی ہے، اگرچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی لیکن اہل دہلی نے اس وقت گولکنڈہ اور بیجاپور ہی کی زبان کی تقلید کی اور انھیں مقامات کو اُردو زبان کا مرکز سمجھتے رہے۔ بعد میں جب مرزا مظہر جان جاناں نے یہ تحریک اٹھائی کہ ہمیں دکن کی زبان کی تقلید کرنیکی بجائے خود دہلی کے روزمرہ میں لکھنا چاہیئے تو اول اول دہلی کے دوسرے شاعروں مثلاً آبرو، ناجی، حاتم اور فغاں وغیرہ نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت میں

آبرو کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے جس کو شاہ حاتم نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں نقل کیا ہے۔
آبرو کا قطعہ یہ ہے :-

وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے　　اُن ستیں کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف　　لغو ہیں گے فعل اس کے ریختے میں حرف ہے

لیکن اُن مخالفتوں کے باوجود مرزا مظہر کی تحریک چل نکلی اور شاہ جہاں آباد کے روزمرہ اور فارسی کے افعال و حروف اُردو میں داخل ہو گئے۔

ابھی دہلی میں اُردو زبان پوری طرح سے دہلوی رنگ سے متاثر نہ ہونے پائی تھی کہ اس پر تباہی کے بادل منڈلانے لگے اور دہلی کے ارباب کمال لکھنؤ کی طرف ہجرت کر گئے۔ ان دہلوی نو واردوں نے لکھنؤ میں شعر وسخن کا ذوق پھیلا دیا۔ لکھنؤ اس وقت آباد ہوا تھا اور اس نئے شہر کی تازگی اور شباب کے ساتھ ساتھ اُردو بھی نئی زندگی حاصل کرنے لگی۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت اُردو میں جو ایک طرح کی پختگی اور ایک گونہ باضابطگی نظر آتی ہے وہ لکھنؤ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ لکھنؤ میں اُردو زبان نے علمی و ادبی شان پیدا کر لی۔ اور جب لکھنؤ اور دہلی دونوں شہر تباہ ہوئے تو اُردو کے بڑے بڑے شاعر اور انشاپرداز ہندوستان کے مختلف شہروں میں منتشر ہو گئے اس وقت سے ان دونوں شہروں کی مرکزیت ختم ہو گئی، اب اُردو تمام ہندوستان کی زبان ہے۔ جو بھی اس کی خدمت کرے گا اُس کے لسانی و ادبی خزانے میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ وہی اس زبان کا محسن اور اہل زبان ہے۔

آجکل جبکہ اُردو اور ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا ہے اور اُردو کے مقابلہ میں ہندی کی ہمہ گیری اور فضیلت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ایسے خیالات اور کتابوں کی اشاعت اُردو کے لیے مضرت رساں ہے جن میں اُردو کو کسی خاص شہر یا محلے ہی تک محدود بتایا جاتا ہو اور اہل دلّی کے سوا تمام شہروں اور صوبوں کے رہنے والوں کو اُردو کے اہل زبان نہیں سمجھا جاتا۔ اس قسم کے دقیانوسی اور جاہلانہ خیالات کی اشاعت سے نہ صرف اُردو زبان پر ظلم کرنا ہے بلکہ حقیقت و واقعیت کا خون کرنا۔

چند دکنی پہیلیاں | مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب ام اے استاد عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی صفحات (۱۴۴) سلسلۂ مطبوعات ہندستانی اکیڈمی۔ قیمت ۱۲؍

یہ کتاب اس سے قبل رسالہ ہندوستانی میں بالاقساط شایع ہو چکی ہے اور اس میں مدراس کی اُردو زبان کی پہلیوں کو گیارہ ابواب میں پیش کیا گیا ہے، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بڑی محنت اور تلاش سے دوسو اڑتیس پہلیاں جمع کی گئی ہیں۔ ان کے جمع کرنے میں مرتب کو حکیم محمد غوث صاحب نیلوری اور سید محمد قاسم صاحب ڈپٹی کمشنر پولیس مدراس نے قابل قدر مدد دی ہے۔

پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنے مختصر سے قیام مدراس کے زمانہ میں وہاں کے احباب کی مدد سے اس مفید اور دلچسپ کام کو انجام دیا جیسا کہ انھوں نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

"اس مجموعۂ لغز کے مطالعہ سے ان پہلیوں کی عام دلکشی اور دل آویزی کا اندازہ ہوگا اور اگر کہیں یہ چیستاں پڑھنے والے کی طبع نازک کو ناگوار بھی گذرے تو کم ازکم اس بنا پر ضرور معافی کے قابل ہوگی کہ یہ چیزیں عالم فاضل لوگوں اور بڑے بزرگوں کے لیے نہیں ہیں۔ نہ وہ اس کا موضوع ہیں اور نہ خاص طور پر ان کے کاموں کے لیے بنی ہیں۔ ان سے روزانہ لطف اندوز ہونے والے زیادہ تر اور مجموعی طور پر عورتیں اور بچے ہیں۔"

اس مجموعہ کے دیباچہ میں مولوی نعیم الرحمٰن صاحب نے دکھنی زبان کے متعلق بھی بعض دلچسپ معلومات تحریر کی ہیں، اس سلسلے میں اس امر کا اظہار بھی ضروری تھا کہ خود دکن میں حیدر آبادکی اور مدراس کی اُردو میں خاص طور پر امتیاز کیا جاتا ہے۔ حیدر آباد کی عام بول چال کی زبان بھی دکنی اُردو ہی ہے لیکن اس میں اور مدراس کی زبان میں بہت زیادہ فرق ہے۔ نہ صرف الفاظ اور محاورات کی حد تک بلکہ لب و لہجہ اور گرامر میں بھی۔ اگرچہ مولف نے اپنے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ:۔

"اس اصطلاح کا اطلاق نہ صرف حیدر آباد دکن کی اکثر آبادی کی بلکہ جنوبی ہند کے اکثر مسلمانوں کی اس زبان پر بھی ہوتا ہے جو اُردو زبان ہی کی ایک بولی ہے اور

یہی آخری دکنی۔ خاص کر وہ بولی جو احاطۂ مدراس اور میسور وغیرہ میں مستعمل ہے جس سے اس وقت مجھے بحث ہے اور جس کی چند پہیلیاں ناظرین کے سامنے پیش کرنا میرا مقصد ہے۔"

اس بیان سے ظاہر ہے کہ خود مولف بھی حیدر آبادی دکنی اور مدراسی دکنی میں فرق کرتے ہیں، لیکن بہتر ہوتا کہ اس کو وہ اپنے اس پُر از معلومات مقدمہ میں وضاحت سے بیان کر دیتے تاکہ غلط فہمی کا اندیشہ باقی نہ رہ جاتا۔ اب شبہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ پہیلیاں حیدر آباد میں بھی اسی زبان اور لب و لہجہ کے ساتھ رائج ہیں۔ اس غلط فہمی سے بچنے کا سب سے بڑا ذریعہ تو یہی تھا کہ اس کتاب کا نام "چند دکنی پہیلیاں" کی بجائے "مدراسی اُردو کی چند پہیلیاں" رکھا جاتا۔

ہر زبان مقام اور حالات کے لحاظ سے لفظی اشکال، لب و لہجہ اور گرامر میں تبدیلی حاصل کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں اُردو زبان کا بھی یہی حال رہا۔ ہر صوبہ میں اس کا نام اور خصوصیات جدا ہو گئیں۔ گجرات میں اس کو گجری کہنے لگے اور تلنگانہ میں "ترکانا"۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اُردو کو ان مختلف ناموں سے منسوب کیا جائے۔ دکنی بھی آخر اُردو ہی ہے خواہ وہ حیدر آباد کی ہو یا مدراس کی اس لیے بجائے مقامی ناموں کو استعمال کرنے کے یہی بہتر ہے کہ لفظ اُردو یا ہندوستانی کے ساتھ اس مقام یا صوبہ کا نام شریک کر دیا جائے۔ اس طرح سے زبان کی ہمہ گیری اور وسعت کا خیال اوجھل نہ ہونے پائے گا۔

دکنی اُردو کی خصوصیات اور شمالی اُردو کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے میں مولف نے خاص زحمت اٹھائی ہے، مگر اس موضوع پر گذشتہ چند سال کے عرصہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے ان جدید تحقیقات سے مستفید ہونے کی بجائے گریرسن کے لینگوسٹک سروے آف انڈیا کی معلومات پر بھروسہ کیا ہے جو اب کم از کم اُردو کی حد تک تقویم پارینہ ثابت ہو چکی ہے۔

اس موضوع کے متعلق رسالہ اُردو میں کئی مضمونوں میں بحث کی جا چکی ہے۔ "کلیات ولی" اور "سب رس" کے دیباچوں میں کافی مواد موجود ہے۔ اور پنجاب میں اُردو اور ہندوستانی لسانیات میں تو یہ موضوع خاص طور پر زیر بحث آگیا ہے۔ ان سب جدید ترین عصری تحریروں کے مقابلہ میں گریرسن کی معلومات سے سند لینا اُردو پر ظلم کرنا ہے۔

مولوی نعیم الرحمٰن صاحب نے ان پہلیوں کو جمع کرکے اُردو میں ایک قابل قدر کام کا آغاز کیا ہے، اور مختلف مقامات کے اُردو بولنے والوں کو دعوت عمل دی ہے کہ وہ بھی اپنے یہاں کی پہلیوں کو اسی طرح علمی طریقہ پر مرتب کرکے شایع کریں۔

عام فہم عروض | از جناب منظر صاحب صدیقی اکبرآبادی چھوٹی کراون تقطیع صفحات (۷۷) قیمت ۸؍ سلسلہ مطبوعات قصرالادب آگرہ کی چوتھی کڑی ہے، اس میں علم عروض اور فن شعر پر گیارہ ابواب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور مثالوں کے ساتھ شعر کہنے کے طریقے بتائے گئے ہیں مولف نے ہر باب کو ایک درس قرار دیا ہے اور مدارس کے طلباء کے لیے نہایت عام فہم اور سلیس زبان میں علم عروض کی ضروری معلومات پیش کردی ہیں۔

جناب منظر صدیقی آگرہ کے مشہور شاعر اور انشاپرداز ہیں رسالہ کنول کے مدیر ہیں اور اپنے خاص ذوق اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے اُردو کے نوجوان خدمت گزاروں میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فن شعر میں بڑا اچھا دخل ہے اور وہ شاعری اور انشاپردازی کی بلندیوں سے اُتر کر اس قسم کی درسی اور ابتدائی کتابوں کی تصنیف وتالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

فن عروض کے متعلق اس وقت تک کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں جن میں "راز عروض" "جان سخن" "چراغ سخن" "ایضاح القوافی" "تلخیص عروض وقوافیہ" وغیرہ مشہور ہیں، مگر زیر نظر کتاب بالکل جدید اصول پر لکھی گئی ہے، اور اس کا اسلوب اس قدر سلیس اور سادہ ہے کہ ہر طالب علم بغیر کسی مدد کے اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اس میں غیر ضروری بحثوں اور اظہار لیاقت سے پرہیز کیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاصکر مبتدیوں اور طالب علموں کو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

انشائے لطیف | از لطیف الدین احمد صاحب۔ چھوٹی کراون تقطیع صفحات (۲۷۰) قیمت عا؍ یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۵ء تک لکھے گئے تھے۔ ان کو مصنف اپنے روز اول کے افسانے قرار دیتے ہیں۔ یہ پہلے رسائل میں شایع ہوچکے ہیں، بہتر ہوتا کہ ان کے ساتھ جہاں سنہ تصنیف دے دیا گیا ہے اُن رسائل کا نام بھی درج کردیا جاتا جن میں شایع ہوئے تھے۔

لطیف الدین احمد صاحب کے افسانے "نگارؔ" میں خاص دلچسپی کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

اُن میں ایک خاص جدّت ہے وہ جگہ جگہ موجودہ فضا اور سماج پر حملے کرتے چلے جاتے ہیں۔ حضرت نیاز فتحپوری کی طرح ان کے اسلوب میں بھی جدید ترکیبیں نظر سے گذرتی ہیں۔

انھوں نے بعض الفاظ کے مفہوم یا املا میں ابداع سے کام لیا ہے جو توسیع زبان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن وسعت نظری اور جدت پسندی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بعض رایج الفاظ کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے، اُردو زبان میں ایسے مضامین نظم و نثر کے لیے جو بالکل ترجمہ نہ ہوں یا جن کا کوئی جزو بھی دوسری جگہ سے لیا گیا ہو۔ ماخوذ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یہ لفظ اس مفہوم پر پوری طرح سے حاوی ہے، اور اس کے دیکھتے ہی ہر شخص یہ سمجھ جاتا ہے کہ اس مضمون یا نظم یا افسانے کا کوئی جز کسی اور جگہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ "انشائے لطیف" میں ایسے افسانوں کے لیے ماخوذ کی جگہ مختار کا لفظ لکھا گیا ہے، جو ماخوذ کے مفہوم کو شاید ہی ادا کر سکے۔ مستعملہ علمی و ادبی جو اصطلاحوں کی پابندی ہر ادیب و شاعر کو کرنی چاہیئے خواہ وہ کیسا ہی جدت پسند اور نادرفن کیوں نہ ہو۔ اگر ہر شخص اپنے زور تخیل سے نئی نئی اصطلاحیں یا ترکیبیں استعمال کرتا جائے گا تو زبان کی یکسانیت اور ہم آہنگی باقی نہ رہے گی اور اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری زبان کو اس طوائف الملوکی سے ضرر نہ پہنچے۔

لطیف الدین احمد صاحب کے افسانے نہایت دلچسپ ہیں اور انھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ ان بارہ تیرہ سال پہلے کی تحریروں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ توقع ہے کہ اُن کے اپنے دیگر افسانوں کے مجموعے بھی اسی آب و تاب کے ساتھ شایع ہوں گے اور اُردو زبان کے افسانوی ادب میں ل۔ احمد کا نام خاص شہرت کا مالک رہے گا۔

"ض"

متولیان ریاست

باب ششم

دلاور خاں حبشی

دلاور خاں اور حمید خاں کی ان بن، حمید خاں کا قید ہونا

گزشتہ باب میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اخلاص خاں، حمید خاں اور دلاور خاں کی متفقہ کوششوں سے معزول کیا گیا اور پھر اسے قید کر دیا گیا، اس کے بعد قدرتی طور پر تمام ملکی اختیارات ان دونوں کے ہاتھ میں آ گئے اور چند روز تک ان دونوں نے متحدہ طور پر مہمات ملکی کو انجام دیا، مگر دلاور خاں اور حمید خاں کا یہ اتفاق و اتحاد محض وقتی تھا اس میں پائیداری کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی، کیونکہ دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اسی طرح قابلیتوں کے اعتبار سے بھی یہ ایک دوسرے سے بالکل متغائر تھے، دلاور خاں ایک نہایت ہوشیار اور تجربہ کار آدمی تھا، یہ اسی کی چالاکیوں کا نتیجہ تھا کہ اخلاص خاں جیسا آدمی پسپا ہو گیا، اور بالآخر اس کو ہار ماننی پڑی، حمید خاں محض بھرتی کا آدمی تھا، دراصل اخلاص خاں کے اکھاڑنے کے لیے دلاور خاں نے اس کو اپنا ساتھی بنا لیا اور اس کو بھڑکا کر اخلاص خاں کا مخالف بنا دیا تھا، مطلب یہ تھا کہ جب دونوں لڑ کر کمزور ہو جائیں تو خود قابض ہو جائے اور وکیل السلطنت کا عہدہ حاصل کر لے! اور اس کو یقین تھا کہ اخلاص خاں سے اگر راستہ صاف ہو جائے تو حمید خاں کو بیدخل کر دینا ایک منٹ کا کام ہے، وہ اس کی سادگی اور سادہ لوحی کو اچھی طرح جانتا تھا، اور اس کی جانب سے اسے کوئی خطرہ نہ تھا، اسی لیے چند روز تک محض نمائش کے لیے اسے اپنی حکومت کا شریک بنائے رکھا اور ہر طرح اس کی دلجوئی کی، اس چال سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حمید خاں کچھ غافل ہو جائے اور اس اثنا میں کوئی مناسب موقع بھی ہاتھ آئے کہ اس کو بھی نکال باہر کیا جائے، اس اصول پر کام کر کے اس نے حمید خاں کو غافل کر دیا، یہ غریب نہایت سیدھا سادہ آدمی تھا اسے سیاسی داؤ پیچ سے کسی قسم کی مناسبت نہ تھی۔ وہ بھلا دلاور خاں کی چالبازیوں کو کیا خاک سمجھ سکتا، وہ نہایت سادگی سے اخلاص خاں کے اکھاڑنے میں

دلاور خاں کا ساتھ دیا مگر یہ نہ سمجھا کہ خود اپنے حق میں اس کے کیا نتائج ہوں گے، ان وجوہات کی بناء پر چند روز تو ایسے گذرے کہ حمید خاں اور دلاور خاں ایک جان دو قالب ہوگئے، اور مہمات ملکی کو متحدہ اور متفقہ طور پر انجام دینے لگے، لیکن اصلی قوت کار کر و محور دلاور خاں تھا، اگرچہ غیر محسوس طور پر حمید خاں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر رہا تھا، وجہ صاف ظاہر ہے ایک پکا مدبر اور غیر معمولی طور پر معاملہ فہم واقع ہوا تھا، اور تمام سیاسی جوڑ توڑ کے نازک اصولوں سے پورا واقف تھا، دوسرے میں یہ سارے اوصاف قطعاً مفقود تھے اور وہ تدبر اور سیاست دانی کی نزاکتوں سے عاری تھا، اگر کچھ استعداد تھی بھی تو دلاور خاں کی دانشمندی کے سامنے وہ ماند پڑ گئی، اور وہ اپنے اس "دوست نما حریف" کے مقابل چمک نہ سکا، اور اس پر طرہ یہ کہ سادہ لوحی سے وہ اس پر پورا اعتماد و اعتبار کئے ہوئے تھا اس وجہ سے غافل رہا اور موقع کو کھو دیا، جب صورت حال ایسی ہو تو بھلا یہ ظاہری اتفاق و اتحاد کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ نفاق ہونا لازمی تھا بالآخر ہو کر ہی رہا۔

حمید خاں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اخلاص خاں کے ہٹ جانے سے وکیل السلطنت کا عہدہ خالی ہو جاتا ہے، اگر اس عہدے پر دلاور خاں قابض ہو جائے تو کم از کم سرنوبتی کا اُسے عہدہ لینا چاہیئے اور اسی عہدہ پر وہ دانت لگائے بیٹھا تھا۔ دلاور خاں نے بھی اسے غافل رکھنے کے لیے چند روز تک اس کو ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ بالکل اسکے فریب میں آگیا، اور اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر ہی نہ کر سکا۔

جب دلاور خاں کے پاؤں خوب اچھی طرح جم گئے تو وہ حمید خاں کی طرف متوجہ ہوا، یہاں سے کھلم کھلا مخالفت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دلاور خاں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ اب اسے حمید خاں سے کسی قسم کا خوف نہیں رہا ہے، اس لیے اس نے سرنوبتی کے عہدہ پر (جس پر کہ حمید خاں دانت لگائے بیٹھا تھا) اپنے بیٹے کمال خاں کو مامور کیا۔[1]

دلاور خاں کا یہ فعل حمید خاں کے حق میں اعلان جنگ سے کچھ کم نہ تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دلاور خاں اپنے ذاتی استحکام کی تدابیر میں مصروف ہے، اور اپنی کامل ترقی کے لیے اپنا راستہ صاف کر رہا ہے، اس راہ میں جو بھی آئیں وہ اُس کے نزدیک اس کے دشمن ہوں گے اور ان دشمنوں کا وہ بیدردی سے خاتمہ کر دے گا۔ کمال خاں کا سرنوبتی پر فائز ہونا اس اتفاق و اتحاد کی آخری کڑی کا ٹوٹنا تھا جو ایک زمانے میں "حبشیوں کے اتحاد" کے نام سے قائم ہوا تھا

[1] بساتین السلاطین

جس کے تین بڑے رکن تھے جس میں سے ایک اخلاص خاں کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا اب یہ دوسرا رکن بھی علیحدہ کیا جا رہا تھا۔
دلاور خاں کی اس حرکت سے حمید خاں کو نہ صرف رنج ہوا بلکہ پریشانی بھی ہوئی اس وجہ سے کہ جب اتفاق ہی باقی نہ ہو تو
دلاور خاں کی طرف سے ہر قسم کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس نے آج اسے ایک عہدے سے محروم کیا ہے کل اس کی جان بھی
لے لیگا۔ اور عہدے سے محروم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا مد مقابل رکھنا نہیں چاہتا تھا نیز وہ اپنے ہم پلہ ذی عزت
لوگوں کو ذمہ دار خدمات دینا محض اس لیے نہ چاہتا تھا کہ اس کو ان سے عاقبت کار غداری کا اندیشہ تھا۔ وہ
ایسے لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا جو بالکلیہ اس کے حکم میں ہوں جو ترقی اور عروج کے لیے محض اسکے ممنون احسان
ہوں، جن پر وہ کامل طور پر اعتبار و اعتماد کر سکے، حمید خاں ہزار صاف دل و سادہ نفس ہو گر پھر بھی وہ بڑے
ذی حیثیت امرا میں سے تھا اس کی طاقت و قوت بھی بہت کافی تھی، وہ اخلاص خاں کے ساتھ کام کر چکا تھا، اسکو
حکومت کا چسکا لگا تھا، یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جن کی طرف سے دلاور خاں چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا، اس لیے وہ
آہستہ آہستہ حمید خاں کی جڑیں کاٹنے لگا، سرنوبتی کے عہدے کا نہ دیا جانا گویا اس کی قوت کی پہلی جڑ کاٹنا تھا،
اور حمید خاں کے زوال کا ابتدائی زینہ تھا، اس عہدے سے محروم کئے جانے سے حمید خاں بھی تاڑ گیا کہ دلاور خاں
پرخاش پر آمادہ ہے، اور غالباً یہ ارادہ رکھتا ہے کہ ساری قوت و اقتدار اس سے چھین کر اس کو اسی طرح قید کر دے
جس طرح کہ اس نے اخلاص خاں کو قید کر دیا تھا، غرض دلاور خاں کے اس طرز عمل سے حمید خاں کو بڑی تشویش
پیدا ہو گئی تھی اور اب وہ اس طرح دلاور خاں کے پنجے میں تھا کہ رہائی بھی ممکن نہ تھی، وقت ہاتھ سے گذر چکا تھا،
مخالفت میں انگلی بھی اٹھائی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے کہ دلاور خاں ہر آئینہ نظم و نسق ملک پر حاوی ہو گیا تھا، مگر
حمید خاں کی یہ پریشانی و تشویش زیادہ عرصہ تک نہ رہی، کیونکہ دلاور خاں نے بہت جلد ایک شاہی حکم
نکلوا دیا کہ حمید خاں بغیر اجازت شاہی گھر سے باہر قدم نہ نکالے،[ا] گھر پر پہرے بٹھا دئیے گئے چاروں طرف
شہر کے بڑے بڑے دروازوں پر احکام روانہ کر دئیے گئے کہ حمید خاں کو کسی حال شہر سے باہر جانے
نہ دیا جائے[۲] اور ساتھ ہی ایک اور حکم بایں مضمون حمید خاں کے پاس روانہ کیا گیا کہ[۳] اسپ و فیل و

[ا] تذکرۃ الملوک۔

سلاح خانہ امارت "محصور" میں داخل کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر اس کی ذاتی جائداد ضبط کر لی گئی، اس نے بھاگ جانا چاہا مگر شہر کے دروازوں پر پہرہ تھا۔ غرض جب حمید خاں ہر طرح عاجز آ گیا تو دلاور خاں نے اسے گرفتار کروا کے ستارہ کے قلعہ روانہ کر دیا، اس طرح دلاور خاں کے عہد اقتدار کا سب سے پہلا اور اہم واقعہ حمید خاں کی گرفتاری اور حبس ہے۔ دلاور خاں نے اپنے سب سے بڑے حریف کو عاجز کر کے قید کر لیا۔ دلاور خاں کی راہ ترقی میں حمید خاں ایک کانٹا تھا جو بہت بری طرح اس کی آنکھ میں کھٹک رہا تھا، جب یکبارگی اس نے حمید خاں پر قابو پایا تو خود کو حقیقی معنی میں بیجاپور کا وکیل السلطنت تصور کرنے لگا۔

اگر دلاور خاں کی اس حرکت کو خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے جانچا جائے تو یہ آئین اخلاص و مروت کے خلاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک وفادار دوست کو جس نے اس پر اس قدر اعتماد اور بھروسہ کیا ہو اور ہر مہم میں ساتھ دیا ہو یوں بیدردی کے ساتھ اُس کو تباہ و تاراج کیا جائے، اسے ذلیل و رسوا کیا جائے اور اسے محبوس کر دیا جائے مگر سیاسیات، بالخصوص عملی سیاسیات عبارت ہے تدبر و چالاکی سے جس کو محض اخلاقیات اور آئین مروت و محبت سے کوئی واسطہ نہیں، کہنے کو ہم تھوڑی دیر کے لیے دلاور خاں کو بُرا بھلا کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک دوست کے ساتھ بیوفائی کی اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا، مگر خود حمید خاں کو کیا کہا جائے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اخلاص خاں کو نکالنے میں دلاور خاں کا اتنا ساتھ دیا، آخر اخلاص خاں بھی تو اُن ہی میں سے ایک تھا جس کا کام حمید خاں اور دلاور خاں نے متحدہ طور پر اخلاص خاں کے خلاف کیا تھا اسی کام اور اسی اصول کو دلاور خاں نے حمید خاں کے ساتھ برتا، جس کلھاڑی سے ان دونوں نے ملکر اخلاص خاں کی جڑیں کاٹی تھیں اسی کلھاڑی کی دوسری ضرب میں دلاور خاں نے حمید خاں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، اگر حمید خاں کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو غالباً اس چیز کو پہلے ہی سمجھ لیتا اور اس اندیشہ کو ابتدا ہی میں محسوس کر لیتا، مگر اس کی غفلت نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا، اس کے تساہل نے اس کا سارا کام بگاڑ دیا، ورنہ دلاور خاں کی کیا مجال تھی کہ اس آسانی کے ساتھ حمید خاں جیسے پایہ کے آدمی کو اس طرح تباہ اور ذلیل و رسوا

کرسکتا حمید خاں کی حیثیت اور اس کی طاقت کا اندازہ تذکرۃ الملوک کے ان الفاظ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔
"آنقدر اسپ و فیل و سلاح کہ حمید خاں جمع کردہ بود ہیچ کدام ازیں امرا نداشتند"۔ مگر باوجود جاہ و حشمت دولت و ثروت کے دلاور خاں، حمید خاں پر بآسانی غالب آگیا جو اس کی کاردانی اور ہشیاری کی روشن دلیل ہے۔

دلاور خاں کا بحیثیت وکیل السلطنت کے انتظامات مملکت میں مشغول ہونا، استحکامی تدابیر

جب حمید خاں سے میدان خالی ہو گیا تو دلاور خاں کو اطمینان حاصل ہوا، اب اس نے محسوس کیا کہ حقیقی معنی میں وہ مختار سلطنت اور ملک کا سب سے بڑا عہدہ دار ہے، اب کوئی ایسا شخص نہیں جس سے اس کو کسی قسم کا خوف ہو سکتا تھا، ایسے لوگ جو اس سے بچے ہوئے تھے اور جن سے کچھ اندیشہ بھی تھا تو وہ دوسرے درجہ کے لوگ تھے ان کو بھی اس نے آہستہ آہستہ برخاست کرنا شروع کیا، چنانچہ رفیع الدین شیرازی کہتا ہے کہ "غریباں کہ در زمان جہاں پناہ (علی عادل شاہ) جمع شدہ بودند از مجلسی و کارکنان و امراء و سپاہی و سوداگر کہ ہمہ پنج شش ہزار بودند متفرق گشتہ"[1] غرض اس کی پالیسی یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسا عنصر نہ رہے جو کبھی کسی موقع پر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو، چونکہ وہ حبشی تھا اس لیے اسے غیر ملکی عنصر سے بہت خوف تھا اسی لیے انھیں ایسا تنگ کیا کہ یہ لوگ بیجاپور کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے، حقیقت تو یہ ہے کہ دلاور خاں ایک نہایت قابل اور کارداں آدمی تھا، وہ جو پالیسی اختیار کرتا اس پر اس خوبی سے کاربند ہو جاتا تھا کہ اس کے حق میں اس کے بہترین نتائج مترتب ہوتے، یوں تو اس سے پہلے بھی ایک نہیں بلکہ دو تین متولیان سلطنت گذر چکے ہیں، مگر جو تدبر، معاملہ فہمی، وقت شناسی اور سیاست دانی دلاور خاں میں پائی جاتی تھی وہ اس سے پہلے کے کسی وکیل السلطنت میں نہیں ملتی، کسی نے تند خوئی و بدمزاجی سے اپنا کام بگاڑ لیا، کسی نے جلد بازی، تیزی، ناعاقبت اندیشی و عدم تدبر سے، مگر دلاور خاں میں نہ صرف یہ خامیاں نہیں تھیں بلکہ وہ سیاسیات کے نازک پہلوؤں سے واقفیت رکھنے، سلطنت کے کاروبار چلانے، ریاست کو اپنی مٹھی میں لے لینے اور ہر شخص کو خوش و راضی رکھ کر اپنا مطلب نکال لینے میں ان سبھوں کا استاد تھا، مختصر یہ کہ عملی سیاست کے میدان میں وہ ایک کامیاب انسان تھا، اس کو سیاسی زندگی کے ایسے جوڑ توڑ معلوم تھے اور اس عمدگی سے وہ ان پر عمل پیرا تھا کہ دن بدن اس کی

[1] تحفتہ الملوک۔

قوت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، اُسے منصب وکالت حسب خواہش تو ملا مگر ضرورت اس امر کی تھی کہ حاصل شدہ قوت کو برقرار رکھنے اور اپنے موجودہ عہدہ پر بحال رہنے کی استحکامی تدابیر شروع کی جائیں۔

استحکام کی دو شکلیں ہو سکتی تھیں ایک تو یہ کہ مخالف عنصر کو سیاسی قوت سے محروم کر دیا جائے۔ (۲) دوسرے یہ کہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے تمام ملک کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب جلیلہ کو اپنے لوگوں اور ہواخواہوں میں تقسیم کر دے۔ پہلے ہم ان انتظامات کی تفصیل دیں گے کہ جن کے ذریعہ اس نے تمام ملک کو اپنی مٹھی میں لے لیا سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کہ ملک کے بڑے بڑے ذی حیثیت گھرانوں سے رشتہ اتحاد جوڑا، ذی اثر، طاقتور امراء کو اس نے اپنی بیٹیاں، پوتیاں دیں، اور ایسے ہی گھرانوں کی لڑکیاں اپنے بیٹوں، پوتوں کے لیے لیں۔ اس طریقہ سے امراء کے ایک بڑے بھاری اور طاقتور طبقہ کو اپنا ہمنوا اور حامی بنا لیا! اور ان سے خوشگوار تعلقات[1] پیدا کر لیے۔ دوسرے حکومت کے بڑے عہدوں پر اپنے متعلقین اور لواحقین کو مامور کر دیا، چنانچہ اس کے خود چار بیٹے ملک میں سب سے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے۔ اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد خاں کو ابراہیم کا استاد اور اتالیق مقرر کیا کہ وہ بادشاہ کو گلستان، بوستاں اور قرآن شریف کا سبق دے۔ ابراہیم تو ابھی بچہ ہی تھا، اس کی تعلیم و تربیت جاری تھی، پچھلے دو متولیوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا، انھوں نے اسے لہو ولعب میں چھوڑ رکھا تھا، اور وہ اپنی اپنی فکر میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ بادشاہ کی تعلیم و تربیت بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی۔ دلاور خاں کے عہد اقتدار کا یہ ایک روشن پہلو تو ہے کہ اس نے اس طرف بھی توجہ کی، خواہ وہ توجہ ایک حد تک غرض آلودہ ہی کیوں نہ ہو، مانا کہ اس نے اپنے بیٹے کو بارسوخ بنانے کے لیے یہ اہم خدمت اسکے سپرد کی مگر پھر بھی اس سے بادشاہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام تو ہو گیا، اس کا یہ بڑا بیٹا بہت لائق و فاضل تھا اور اپنے عہد کے قابل ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا، اس طرح اس کا اسی خدمت پر مامور کیا جانا کچھ برا نہ تھا۔ دوسرے بیٹے کمال خاں کو سرنوبتی کا عہدہ دیا گیا تھا، جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بادشاہ کے ساتھ چوگان بازی اور دوسرے کھیلوں میں بھی شریک رہتا تھا گویا ایک طریقہ سے کھیلوں اور مردانہ فنون کے سکھانے کا کام اس کے ذمہ تھا۔ تیسرے بیٹے حیرت خاں کو ایک بلند پایہ

[1] بساتین۔

امیر بنا کر بادشاہ کا مقرب خاص اور مصاحب بنا دیا، اور بادشاہ کی محافظت اور پاسبانی کا کام بھی سپرد کیا۔ چوتھے بیٹے عبدالقادر کو سلک امیران صاحب شوکت میں داخل کر کے قلعۂ ارک (بیجاپور) کا قلعہ دار بنا دیا چونکہ یہ لڑکا کم عمر تھا اور اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتا تھا، لہٰذا اس خدمت کو رومی خاں[1] منجانب عبدالقادر انجام دیتا تھا، رومی خاں خاندان شاہی کے خانہ زادوں میں سے تھا اور کچھ دور کا رشتہ بھی رکھتا تھا۔

ان اہم عہدوں اور مناصب جلیلہ کے علاوہ ہر ایک لڑکے کو اس نے "دو ہزار اسپی کماندار" بھی بنا دیا اور چھ ہزار نہایت آزمودہ کار فوجیں ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس براہ راست اس کے حکم میں رہتی تھیں۔ بلبل خاں جو اخلاص خاں سے غداری کر کے اس کے ساتھ مل گیا تھا اور جس کی وجہ سے دراصل اخلاص خاں کے خلاف اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کو بہت بڑا عہدہ دیا اور اپنا آغوشی فرزند بنا لیا[2] تھا۔

ان کارروائیوں کے علاوہ اس نے چند مزید تدابیر اپنے استحکام کے لیے جو اختیار کیں ان کی تفصیل یہ ہے:

سب سے پہلی چیز تو وہی جس کا اوپر ذکر کیا گیا یعنی غیر ملکی فریق کا ریاست سے خارج کیا جانا[3]، فرشتہ کے مطابق ساٹھ[4] حبشیوں اور ایک سو غیر ملکیوں کے سوا باقی سب کا اخراج عمل میں آیا، پھر خصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے عہدہ دار الگ کئے گئے اور جو پہلے ہی الگ تھے انھیں قید کیا گیا یا قتل کر دیا گیا، چنانچہ ابوالحسن جو اخلاص خاں کے زمانہ میں قید ہوا تھا دلاور خاں کے حکم سے پہلے اندھا کیا گیا اور پھر قتل کر دیا گیا۔ حاجی بشیر[4] جو علی عادل شاہ کا ایک با حیثیت مقرب تھا اس کا بھی وہی حشر ہوا، غالب خاں لکداراموی کو

---

[1] تذکرۃ الملوک۔

[2] بساتین السلاطین۔

[3] برگس، صفحہ ۱۵۶ لیکن فرشتہ کے فارسی نسخہ میں حسب ذیل عبارت پائی جاتی ہے:

"صد ہزار نفر از غریباں وشصت ہزار نفر از حبشیاں .... بر داشتہ از قلمرو اخراج کردہ"

[4] حاجی نور۔ فرشتہ

کچھ بغاوت کی تھی حکمت اور تدبیر کے ذریعہ مغلوب کر کے قید کر دیا گیا، اور اس کے بعد اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں،
دلاور خاں کا دست ستم اس قدر دراز ہونے لگا تھا کہ چاند بی بی بھی اس کی فریب کاریوں سے محفوظ نہ رہ سکی،
اور اُس کے اختیارات میں بہت کمی کر دی گئی، اور وہ بھی وکیل السلطنت کی ایماء کے بغیر ایک تنکے کو ادھر سے
اُدھر نہ کر سکتی تھی۔ غرض اپنی اس کارروائی کو اس نے یہاں تک پھیلایا کہ بڑے سے بڑے عہدہ دار سے لیکر
حرم سرا اور دربار شاہی کے چھوٹے سے چھوٹے ملازم اور خدمتگار (خواہ وہ عورت ہو کہ مرد) دلاور خاں کے
اشاروں پر کام کرتے تھے اور یہ سب لوگ اپنی اپنی خدمات پر اسی کے حکم سے مامور کئے گئے تھے مختصر یہ کہ
اس کے حکم کے بغیر شاہی محل میں پتہ بھی نہ ہل سکتا تھا۔ محل کی خدمتگار عورتیں اور خادمائیں دلاور خاں کی
سکھائی پڑھائی ہوتی تھیں، اور وہ خفیہ طور پر اسے رتی رتی کی خبر دیتی تھیں، اس طرح اگر شاہی محل میں
پتہ کھڑک جاتا تو اس کو فی الفور اس کی خبر ہو جاتی، ان سخت انتظامات کی وجہ سے خود بخود چاند بی بی کے اختیارات کی
تحدید عمل میں آئی۔ غرض جس طرف دیکھو دلاور خاں کا ہی بول بالا نظر آتا تھا، ہر طرف "دلاور خانیوں"
ہی کی حکومت تھی، پوری ریاست اس وقت اس کے پنجے میں تھی، بادشاہ اور چاند بی بی اسکے زیر نگرانی
اور زیر حکم۔ دلاور خاں اس وقت اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ اس کو بیجاپور کا "آمر مطلق" اگر کہا جائے تو بجا ہے،
اور یہ "آمریت" کا دور دورہ تقریباً آٹھ سال تک برابر جاری رہا۔

گو اس کے پہلے بھی متولیوں نے اپنے استحکام کی غرض سے ایسے انتظامات ضرور کئے تھے مگر کسی نے ان
انتظامات کو اس قدر نہیں پھیلایا اور نہ کسی کو اتنی کامیابی نصیب ہوئی۔

علمی سرپرستی | انھی استحکامی انتظامات کے سلسلہ میں اور ملکی انتظامات پر توجہ کرنے سے پیشتر دلاور خاں کے
کیرکٹر کے ایک درخشاں پہلو کو بھی دکھا دینا چاہیئے، وہ یہ کہ اس نے علوم و فنون کی سرپرستی کرنی شروع کی،
کیونکہ وہ خود ایک نہایت قابل اور لایق آدمی تھا، اکثر علما، و فضلا اور طلبا، کو دوست رکھتا اور
انھیں ہر طرح علوم و فنون کی ترغیب و تحریص دیتا اور مدد بھی کرتا تھا، اس کی علمی سرپرستی کے
باعث تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف مقامات کے علما اور لایق لوگوں سے ملک معمور نظر آنے لگا۔ بالخصوص
گجرات اور لاہور کے علما نے بیجاپور کو اپنا مرکز بنا لیا تھا[1]، رات دن علم و فن کے چرچے رہتے تھے،

[1] تذکرۃ الملوک۔

فقہی مسائل پر تحقیقی بحثیں ہوتیں، مناظرے اور مکالمہ کا سلسلہ جاری رہتا، اور یہ لوگ اکثر دلاور خاں کے گھر پر ہی مطالعہ تفاسیر و احادیث میں اپنا وقت گذارتے، دلاور خاں بھی ان کا شریک رہتا جب تک وہ برسر اقتدار رہا برابر علمی طبقے کی سرپرستی کرتا رہا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علوم و فنون کا سچا مربی اور ہی خواہ بھی تھا، اس علمی خدمت سے اس نے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا، اسی سلسلہ میں ایک اور چیز جو قابل ذکر ہے یہ ہے کہ دلاور خاں نے مذہب امامیہ کو خارج کر کے حنفی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا، کیونکہ وہ خود بھی حنفی تھا، بادشاہ کو بھی اس نے اسی مذہب کی تعلیم دی۔

انتظامات ملکی، دلاور خاں کی پہلی مہم، بلبل خاں کا کرناٹک پر حملہ[1]

مصطفےٰ خاں اردستانی کے بعد سے دارالسلطنت بیجاپور میں کچھ ایسی بدانتظامی اور بے اطمینانی رہی کہ متولیان ریاست کو اپنے ذاتی استحکام و استقلال کی اکھاڑ پچھاڑ میں اور ہمسایہ ریاستوں کی یورشوں کے مقابلے سے اتنی فرصت نہ ملسکی کہ ملک کے دور دراز علاقوں کی طرف توجہ کی جائے مصطفےٰ خاں اردستانی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، نہایت سخت گیر آدمی تھا اور ساتھ ہی زبردست منتظم و مدبر بھی تھا، اور پھر لطف یہ کہ بحیثیت جنرل کے بھی کسی سے کم نہ تھا، ان ہی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر وہ کرناٹک کے مفسد علاقہ پر قابو رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ملیبار ایک بالکل نو مفتوحہ علاقہ تھا، راجہ بیجانگر کی بربادی کے بعد علی عادل شاہ نے کرناٹک پر جو پے در پے حملے کئے اور یہ علاقہ بیجاپور کی ریاست کا ایک جزو بن گیا، لیکن اس سلسلۂ فتوحات کو مصطفےٰ خاں اردستانی نے علی عادل شاہ کے آخر زمانے تک جاری رکھا تھا، اور کئی قلعوں پر متصرف ہو چکا تھا، چنانچہ بنکاپور، بلگاؤں وغیرہ انہیں فتوحات کا نتیجہ تھے۔ جب تک علی عادل شاہ زندہ رہا مصطفےٰ خاں بے کھٹکے اس کامیابی کے سلسلہ کو جاری رکھا اور پھر مفتوحہ علاقے کو اپنے ہی دست اختیار میں رکھا، علی عادل شاہ نے ان علاقوں پر اپنا پورا اقتدار رکھنے کے لیے مفتوحہ علاقوں ہی میں اس کو جاگیریں دیدی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جس وقت علی عادل شاہ کا انتقال ہوا مصطفےٰ خاں بیجاپور میں موجود نہ تھا، علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد بیجاپور میں جو کچھ بدعنوانیاں

[1] اس مہم کا ذکر بساتین السلاطین میں نہیں، اور تحفۃ الملوک میں بھی کہیں ذکر نہیں ملتا، فرشتہ سے واقعات لیے گئے ہیں۔

ہوتی رہیں اُن کی تفصیل نظر سے گذر چکی ہے۔ اور پھر کشور خاں نے تو یہاں تک کیا کہ خود مصطفےٰ خاں کو قتل کروادیا، مصطفےٰ خاں اس خدمت کے لیے بیحد موزوں تھا، اب اس کا ثانی یا نعم البدل ملنا بہت دشوار تھا۔ اول تو اسے ایک عرصہ کا تجربہ تھا، دوسرے سخت گیر اور منتظم ہونے کی وجہ سے اس نے فتنہ وفساد کی جڑیں بالکل کاٹ دی تھیں، اس کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کسی قسم کی شورش بپا کی جائے، چونکہ یہ علاقہ تو مفتوحہ اور دارالسلطنت بیجاپور سے دور تھا، اس لیے اس پر کافی نگرانی نہیں ہوسکتی تھی، پھر چھوٹے چھوٹے زمیندار راجہ، راجکمار جو وجیا نگر کی عظیم الشان ریاست کی ایک حقیر یادگار رہ گئے تھے اس علاقے پر پھیلے ہوئے تھے، انھیں مسلمانوں کی غلامی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ دن بھی ان کو یاد تھے جبکہ خود یہ مسلمان ان کی طاقت وقوت کے رعب وداب سے کانپتے تھے، اس وجہ سے یہاں جب ذرا ڈور ڈھیلی ہوتی فتنہ وفساد ضرور برپا ہوجاتا۔ انھیں حالات کے باعث اس علاقے کی جانب سے ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑتا تھا، ذرا سی غفلت کے ساتھ ہی ہندو زمیندار بغاوت کر بیٹھتے، تمرد اور فساد ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا، ان کی سرکشیوں کو روکنے کے لیے ہمیشہ ایک سخت سپہ سالار کے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، مصطفےٰ خاں ایک زمانے تک اس اہم ضرورت کو پورا کرتا رہا، مگر جب کشور خاں کی دراز دستی کا شکار ہوگیا تو کوئی شخص اس کی جگہ کو اس قابلیت سے پُر نہ کرسکا، اس کے علاوہ چونکہ اندرون ملک مشکلات کا جال پھیلا ہوا تھا، اس لیے بھی توجہ نہ ہوسکی، یہ تمام اثرات یہاں مترتب ہو رہے تھے اور ادھر زمینداروں نے ادھم مچا رکھی تھی، خراج ادا کرنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے آپ کو آزاد سمجھے ہوئے تھے۔

جب دلاور خاں کو اندرونی اور ذاتی انتظامات سے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے کرناٹک کے علاقہ کی طرف توجہ کی۔ دلاور خاں حکومت کا حریص ہی لیکن وہ حکومت کا صحیح استعمال بھی جانتا تھا، وہ حکومت کرنا چاہتا تھا اور شان سے، کامیابی سے، لیاقت سے، وہ حوصلہ مند تھا، اور حکومتی قابلیتیں بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ بیجاپور کو اک منظم اور منتظم حالت میں لانا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ ہر طرف انتظامات ٹھیک ہوں، ملک کے صوبے براہ راست مستقر کے ماتحت ہوں، فساد نہ ہو،

نافرمانی نہ ہو، محصول برابر وصول ہوتا رہے، امن وامان رہے اور عوام الناس کے لیے عدل وانصاف کے چشمے جاری کئے جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ خود ان تمام چشموں کا منبع ہو اور تمام ریاست کی کنجی اسی کے ہاتھ میں رہے، یہ محض اس کی کمزوری تھی، غرض دلاور خاں کی توجہ قدرتاً ادھر مبذول ہوئی، جہاں رائے اور رجواڑوں نے محصول اور خراج دینا بند کر دیا تھا۔ اس نے بلبل خاں کو ایک زبردست فوج دیکر روانہ کیا کہ وہ محصول وصول کر لائے۔ بلبل خاں اس فوج کے ساتھ کرناٹک چلا گیا۔ جب اتنی بڑی فوج کو کرناٹکیوں نے سر پر آتے دیکھا تو ان کے ہوش وحواس گم ہو گئے، اور سب نے یہ تصفیہ کیا کہ بلا تعرض اطاعت قبول کر لی جائے۔ چنانچہ ارسب نائک جو علاقہ جترہ کا ایک چھوٹا سا راجہ یا زمیندار تھا مرعوب ہو کر بلبل خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔

جب ارسب نائک کی امدادی فوجوں کے ساتھ بلبل خاں آگے بڑھا تو شنکر نائک ایک چھوٹے سے راجہ نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا، اس سرکشی کی وجہ یہ تھی کہ اس کا قلعہ کرور بہت مضبوط تھا، خود محصور ہو گیا اور لڑنے کی تیاریاں کرنے لگا، بلبل خاں نے بھی فوجیں بڑھائیں اور اس کے قلعہ کا اچھی طرح محاصرہ کر لیا۔

انتظامات کے سلسلہ میں بلبل خاں ایک روز مورچوں کے نصب کرنے اور دیگر دیکھ بھال میں مصروف تھا کہ یکایک شنکر نائک کے کچھ سپاہیوں نے موقعہ پا کر اس کو وہیں گرفتار کر لیا چونکہ اس کے ساتھ کوئی سپاہی وغیرہ نہ تھے اس لیے وہ ان کے پنجہ میں باسانی پھنس گیا، یہ لوگ اسے پکڑ کر شنکر نائک کے پاس لے گئے اور اس نے اس کو وہیں قید کر لیا لیکن خیر یہ گذری کہ بلبل خاں قتل نہیں کرا دیا گیا۔ جب بلبل خاں ہی گرفتار ہو گیا تو اور کیا کارروائی کی جا سکتی تھی، بغیر افسر کے کوئی فوج بھی کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ بلبل خاں کی اس یکایک گرفتاری سے تمام فوج پریشان ہو گئی اور کرناٹک کی یہ مہم بالکل ناکام رہی۔

بلبل خاں کا قید سے چھوٹنا بلبل خاں اپنی اس غیر متوقع گرفتاری سے بیحد پریشان ہوا، اور اس کو اپنے قتل کئے جانے کا ڈر لگا ہوا تھا، لیکن جب شنکر نائک نے صرف اسے قید کرنے کا حکم دیا تو کچھ جان میں جان آئی۔ غالباً شنکر نائک کی ہمت نہ پڑھی کہ اتنے بڑے جنرل کو قتل ہی کر دے، کیونکہ وہ شاہی افواج سے

لہ۔ تاریخ فرشتہ

مرعوب تھا۔ بلیل خاں کے قتل کرنے سے شنکر نائک کو کچھ حاصل تو نہ ہوتا، سوائے اس کے کہ کچھ اور آفت اس پر نازل ہو جاتی، مگر جب ایسے پایہ کے جنرل کو قید رکھا جائے تو گورنمنٹ اسے واپس لینے کی کوشش کرے گی اور وہ فدیہ لیکر چھوڑ سکتا ہے اور اپنے منہ بولے شرایط حاصل کر سکتا ہے، غالباً اسی خیال سے اس نے بلیل خاں کو قتل نہیں کیا۔ غرض وجہ کچھ بھی ہو مگر بلیل خاں کی تو یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ قتل نہیں کیا گیا۔

یہ تو تھا بہت ہوشیار آدمی، بجائے بدحواسی میں وقت گذارنے اور پریشان رہنے کے اپنی رہائی کی تدبیریں کرنے لگا۔ قلعہ کے چند ادنیٰ ملازمین کو کچھ دے کر اپنا دوست بنا لیا۔ نرمی کے برتاؤ اور حسن سلوک سے جانور بھی رام ہو جاتے ہیں، یہ تو آدمی ہی تھے، اس کے گرویدہ ہو گئے، اسی زمانے میں اتفاقاً مسلسل چھ سات روز تک موسلادھار بارش ہوتی رہی اور قلعہ میں بہت کیچڑ ہو گئی، قلعہ کے اندر بہت سارے مویشی رہتے تھے جو شنکر نائک کی ملک تھے، اس دلدل کی وجہ وہ قلعہ کے اندر نہیں رکھے جا سکتے تھے، اس لیے حکم دیا گیا کہ انھیں باہر کسی خشک جگہ لیجا کر باندھ دیا جائے مویشیوں کے ساتھ ان کا دانہ چارہ، گھاس پات بھی روانہ کیا گیا اور یہ ٹوکروں میں بھر بھر کر باہر لیجا رہے تھے۔ بلیل خاں نے کچھ سائیسوں کو ملا لیا، یہ لوگ پہلے ہی سے اس سے راضی تھے، انھوں نے اسے ایک ٹوکرے میں بٹھا کر اور کچھ گھاس پات اوپر ڈال قلعہ سے باہر پہنچا دیا، کسی کو اس طرح فرار ہی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، اور سائیسوں اور علف برداروں کی بھلا کب تنقیح کی جاتی تھی۔ غرض حسنِ اتفاق کہیئے یا بلیل خاں کی خوش قسمتی کہ اسے ایسا موقع مل گیا، اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اس نے قلعہ سے کیا رہائی پائی گویا موت کے پنجہ سے چھوٹ گیا۔

بلیل خاں نے یہاں سے نکل سیدھا بیجاپور میں جا کر دم لیا۔ بیجاپور میں پہلے ہی اس مہم کی ناکامی کے حالات معلوم ہو گئے تھے۔ دلاور خاں اپنی اس پہلی مہم کی ناکامی پر بہت چیں بہ جبیں ہوا۔ اور اس کو بلیل خاں کی نا اہلی، بداحتیاطی اور بے پروائی پر محمول کیا۔ وہ بیحد ناراض تھا اسلیئے جب بلیل خاں بیجاپور آیا تو دلاور خاں نے کچھ گرمجوشی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ بلیل خاں نے درخواست کی کہ اسے ایک اور موقع دیا جائے تاکہ وہ شنکر نائک کو اس کی اپنی غداری اور نمک حرامی کا مزہ چکھائے مگر

دلاور خاں اس کے لیے تیار نہ تھا، اور اس معاملہ کو کسی اور مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا کیونکہ اس اثنا میں اس کی توجہ دوسرے اہم معاملات کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات کی کوشش، احمد نگر اور گولکنڈہ سے شادی بیاہ کے تعلقات

دلاور خاں حقیقت میں اپنے زمانہ کا ایک اچھا مدبر تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ غیر ممالک سے تعلقات کے اچھے نہ ہونے کا کیا بُرا نتیجہ ہوا۔ مثال کے طور پر کشور خاں اور اخلاص خاں کے دورِ حکومت اس کے پیشِ نظر تھے، وہ ان واقعات اور حالات کا اعادہ پسند نہیں کرتا تھا، اس کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح سلطنت کو استحکام نصیب ہو، یہ استحکام کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اندرونی انتظامات نہایت اچھے ہوں، دوسرے یہ کہ بیرونی ممالک سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے جائیں تاکہ ان کی جانب سے کوئی خطرہ اور خدشہ باقی نہ رہے، چونکہ خود اندرونی خرابی بیرونی حملوں کا باعث ہوا کرتی ہے، اس لیے اس نے پہلے اندرونی انتظامات ٹھیک کر لیے۔ اب جو ان سے فرصت ہوئی تو وہ خارجہ پالیسی کو ایک خاص رنگ دینے لگا، گذشتہ حملوں اور لڑائیوں کی وجہ سے احمد نگر اور گولکنڈہ سے بیجاپور کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے اور سخت کشیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، دلاور خاں یہ جانتا تھا کہ اگر بیجاپور کو امن و امان کی ضرورت ہے اور اپنے آپ کو پھر درست کرنا چاہتا ہے تو پہلے ان دو ریاستوں کو دوست بنالے اور ان سے اچھے تعلقات پیدا کر لے۔ یہ پالیسی حقیقت میں بڑے تدبر اور فراست پر مبنی ہے، بیرونی ممالک سے اچھے تعلقات کا رہنا اور اندرونی انتظامات کا بخوبی انجام پانا حکومت کے اچھے یا بُرے ہونے کی کسوٹی ہے جس پر اسے پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی غرض سے اس نے اب اپنی وہ کوششیں شروع کیں جن سے ان دونوں ریاستوں کو اپنا دوست بنانا مقصود تھا۔ خارجہ تعلقات کا مطلع جو اب تک ابر آلود یا گندہ تھا، اسے دلاور خاں صاف کرنا چاہتا تھا، وہ ان تلخ حقیقتوں سے واقف تھا کہ ناخوشگوار تعلقات کیا کیا بُرے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کی اپنی آنکھوں نے ان مصائب کے مظاہروں کا اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا، لہٰذا اب اس کی دلی خواہش تھی کہ اس آنیوالی مصیبت کا پوری پوری طرح انسداد کر دیا جائے۔ اسی غرض سے وہ احمد نگر اور گولکنڈہ سے صلح و اتحاد پر مائل تھا۔ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا عام طور پر یہی طریقہ ہوتا ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو سفارتیں بھیجی جاتی ہیں، ایک دوسرے کو

بیش بہا تحفہ تحائف روانہ کرتے ہیں اور اچھے تعلقات اور صفائی کی فضا کو قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے،
جب اس خوشگواری کو ایک مستقل اور مضبوط شکل دینی ہوتی ہے تو حسب موقع آپس کی سلطنتیں ایک دوسرے کے
خاندان سے شادیاں کرتی ہیں کہ رشتہ ازدواج سے رشتہ دوستی واتحاد اور مضبوط ہو جائے۔ یہ طریقہ
کامیاب بھی ثابت ہوا ہے مگر ہمیشہ نہیں، بعض اوقات مقصد کے خلاف نتائج برآمد ہوتے ہیں، اتحاد کی
خاطر شادی ہوتی ہے مگر اس سلسلہ میں لین دین کے بعض ایسے مسئلے چھڑ جاتے ہیں کہ خونریزیاں ہو جاتی ہیں۔
چنانچہ ایسی کئی مثالیں ان ریاستوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں، اس سے پہلے اس قسم کے
واقعات کے حوالے دئے جا چکے ہیں۔ یہاں تقریباً وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

احمد نگر سے تعلقات، خدیجہ کی میراں حسین سے شادی ۹۹۲ھ

جس سال کہ ملیبار کی مہم ناکام ثابت ہوئی اسی سال دلاور خاں نے اپنی خارجہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیجاپور سے چند ایلچیوں کو
مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس روانہ کیا! اس سے اس کا یہی مقصد تھا کہ نظام شاہی سلطنت سے تعلقات
اچھے ہو جائیں! اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمرانی کر رہا تھا مگر اس کی نیم دیوانگی کی وجہ سے
صلابت خان ترک وکیل السلطنت ہو کر تمام جزو کل کا مالک بنگیا تھا، جو حیثیت بیجاپور میں دلاور خاں
کی تھی تقریباً وہی حیثیت احمد نگر میں صلابت خاں کو حاصل تھی! اس نے بیجاپور کی اس سفارت کی بڑی
خاطر و مدارت کی،[1] ۹۹۲ھ میں خود نظام شاہی ریاست کی جانب سے چند سفیروں کو عادل شاہی دربار میں
روانہ کیا اور ساتھ ہی ابراہیم کی بہن خدیجہ کو مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میراں حسین سے منسوب کرنے کی درخواست
کی گئی! اس غرض سے قائم بیگ ولد قاسم بیگ بزرگ مرزا محمد تقی نظیری اور جمشید خاں[2] کو بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔
جب دونوں طرف سے حسب دلخواہ شرایط منظور کر لیے گئے تو چار مہینوں کے جشن اور جلسوں کے بعد
دلہن کو مرزا تقی اور دیگر امراء کے ساتھ احمد نگر روانہ کیا، چاند بی بی بھی دلہن کے ساتھ احمد نگر گئیں کیونکہ

[1] - فرشتہ۔

[2] - فرشتہ و برہان ماثر۔

ایک زمانہ سے انھوں نے اپنے ماں باپ کے گھر کی صورت نہ دیکھی تھی اور نیز اپنے بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق رکھتی تھیں۔ ۹۹۳ھ میں دلہن کی پالکی احمد نگر پہنچ گئی اور وہ بیجاپوری اُمراء جو شہزادی کو پہنچانے کے لیے احمد نگر گئے ہوئے تھے وہاں سے بہت کچھ سرفراز ہو کر بیجاپور لوٹے، ان میں سے شیخ سالم عرب نجفی اور غیاث بیگ قزوینی المخاطب بہ چنگیز خاں قابل ذکر ہیں۔[1]

اسی زمانے میں دلاور خاں نے دودمان نظام شاہیہ سے ابراہیم کی شادی کی نسبت کچھ سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی، جب اس کا کچھ اندازہ ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ اس رشتہ کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو خواجہ علی ملک التجار شیرازی کو سفیر بنا کر دارالسلطنت گولکنڈہ (بھاگ نگر) روانہ کیا گیا تاکہ وہ امور ضروری کو طے کر کے بیجاپور اطلاع کرے، جس لڑکی کے لیے خواستگاری کیجا رہی تھی وہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن اور ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی تھی[2]۔ جب محمد قلی قطب شاہ کو اس کا علم ہوا کہ خواجہ علی شیرازی کس غرض سے آرہا ہے تو اس نے اپنے اُمراء اور اعیان کو حکم دیا کہ اس کی خاطر داری میں کسی قسم کا دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ بیجاپور کے سفیر کی بڑی ہی آؤ بھگت کی گئی۔ بھاگ نگر سے کچھ فاصلہ تک آکر گولکنڈہ کے امیروں نے اس کا استقبال کیا۔ بڑی بڑی دعوتیں اور جشن کئے گئے اور ہر طرح اسے خوش کیا گیا۔ جب خواجہ علی حرف مطلب زبان پر لایا تو محمد قلی قطب نے بڑی خوشی سے اس رشتہ کو قبول کیا، تمام معاملات طے ہو چکے تھے اب صرف رخصتی عمل میں آنیوالی تھی، شدہ شدہ یہ خبر احمد نگر کو بھی پہنچ گئی کہ دودمان نظام شاہیہ دخانوادہ قطب شاہیہ کے درمیان ایک مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم کیا جارہا ہے اور اس اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہمشیرۂ قلی قطب شاہ کو ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ بیاہا جارہا ہے۔ احمد نگر پر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے صلابت خاں اس وقت

---

[1] ۔ فرشتہ۔

[2] ۔ برہان مآثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ان بہن سے ابتدأً میراں حسین کی شادی ہونیوالی تھی مگر صلابت خاں جب وکیل السلطنت ہوا تو اس نے گولکنڈہ سے قطع تعلق کر کے بیجاپور کی شہزادی سے میراں حسین کی شادی کی۔ غالباً یہ لڑکی جواب ابراہیم سے منسوب ہوئی رہی تھی۔

بیش بہا تحفہ تحائف روانہ کرتے ہیں اور اچھے تعلقات اور صفائی کی فضا کو قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ جب اس خوشگواری کو ایک مستقل اور مضبوط شکل دینی ہوتی ہے تو حسب موقع آپس کی سلطنتیں ایک دوسرے کے خاندان سے شادیاں کرتی ہیں کہ رشتہ ازدواج سے رشتہ دوستی و اتحاد اور مضبوط ہو جائے۔ یہ طریقہ کامیاب بھی ثابت ہوا ہے مگر ہمیشہ نہیں، بعض اوقات مقصد کے خلاف نتائج برآمد ہوتے ہیں، اتحاد کی خاطر شادی ہوتی ہے مگر اس سلسلہ میں لین دین کے بعض ایسے مسئلے چھڑ جاتے ہیں کہ خونریزیاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسی کئی مثالیں ان ریاستوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں، اس سے پہلے اس قسم کے واقعات کے حوالے دئیے جا چکے ہیں۔ یہاں تقریباً وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

احمد نگر سے تعلقات، خدیجہ کی میراں حسین سے شادی ۹۹۲ھ

جس سال کہ ملیبار کی مہم ناکام ثابت ہوئی اُسی سال دلاور خاں نے اپنی خارجہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیجاپور سے چند ایلچیوں کو مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس روانہ کیا۔ اس سے اس کا یہی مقصد تھا کہ نظام شاہی سلطنت سے تعلقات اچھے ہو جائیں۔ اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمرانی کر رہا تھا مگر اس کی نیم دیوانگی کی وجہ سے صلابت خان ترک وکیل السلطنت ہو کر تمام جزو کل کا مالک بن گیا تھا۔ جو حیثیت بیجاپور میں دلاور خاں کی تھی تقریباً وہی حیثیت احمد نگر میں صلابت خاں کو حاصل تھی اس نے بیجاپور کی اس سفارت کی بڑی خاطر و مدارت کی[1]، ۹۹۲ھ میں خود نظام شاہی ریاست کی جانب سے چند سفیروں کو عادل شاہی دربار میں روانہ کیا اور ساتھ ہی ابراہیم کی بہن خدیجہ کو مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میراں حسین سے منسوب کرنے کی درخواست کی گئی۔ اس غرض سے قائم بیگ ولد قاسم بیگ بزرگ مرزا محمد تقی نظیری اور جمشید خاں[2] کو بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔ جب دونوں طرف سے حسب دلخواہ شرایط منظور کر لیے گئے تو چار مہینوں کے جشن اور جلسوں کے بعد دلہن کو مرزا تقی اور دیگر امراء کے ساتھ احمد نگر روانہ کیا، چاند بی بی بھی دلہن کے ساتھ احمد نگر گئیں کیونکہ

[1] - فرشتہ۔

[2] - فرشتہ و برہان ماثر۔

ایک زمانہ سے انھوں نے اپنے ماں باپ کے گھر کی صورت نہ دیکھی تھی اور نیز اپنے بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق رکھتی تھیں۔ ۹۹۳ھ میں دلہن کی پالکی احمد نگر پہنچ گئی اور وہ بیجاپوری اُمراء جو شہزادی کو پہنچانے کے لیے احمد نگر گئے ہوئے تھے وہاں سے بہت کچھ سرفراز ہو کر بیجاپور لوٹے، ان میں سے شیخ سالم عرب نجفی اور غیاث بیگ قزوینی المخاطب بہ چنگیز خاں قابل ذکر ہیں۔[1]

اسی زمانے میں دلاور خاں نے دودمان نظام شاہیہ سے ابراہیم کی شادی کی نسبت کچھ سلسلہ جنبانی شروع کردی تھی، جب اس کا کچھ اندازہ ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ اس رشتہ کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو خواجہ علی ملک التجار شیرازی کو سفیر بنا کر دار السلطنت گولکنڈہ (بھاگ نگر) روانہ کیا گیا تاکہ وہ امور ضروری کو طے کرکے بیجاپور اطلاع کرے، جس لڑکی کے لیے خواستگاری کی جا رہی تھی وہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن اور ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی تھی۔[2] جب محمد قلی قطب شاہ کو اس کا علم ہوا کہ خواجہ علی شیرازی کس غرض سے آرہا ہے تو اس نے اپنے اُمراء اور اعیان کو حکم دیا کہ اس کی خاطر داری میں کسی قسم کا دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ بیجاپور کے سفیر کی بڑی ہی آؤ بھگت کی گئی۔ بھاگ نگر سے کچھ فاصلہ تک آکر گولکنڈہ کے امیروں نے اس کا استقبال کیا۔ بڑی بڑی دعوتیں اور جشن کئے گئے اور ہر طرح اسے خوش کیا گیا۔ جب خواجہ علی حرف مطلب زبان پر لایا تو محمد قلی قطب نے بڑی خوشی سے اس رشتہ کو قبول کیا، تمام معاملات طے ہو چکے تھے اب صرف رخصتی عمل میں آنیوالی تھی، شدہ شدہ یہ خبر احمد نگر کو بھی پہنچ گئی کہ دودمان نظام شاہیہ دخانوادہ قطب شاہیہ کے درمیان ایک مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم کیا جارہا ہے اور اس اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہمشیرۂ قلی قطب شاہ کو ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ بیاہا جارہا ہے۔ احمد نگر پر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے صلابت خاں اس وقت

---

[1] فرشتہ۔

[2] برہان ماثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ان بہن سے ابتدأ میراں حسین کی شادی ہونیوالی تھی مگر صلابت خاں جب وکیل السلطنت ہوا تو اس نے گولکنڈہ سے قطع تعلق کرکے بیجاپور کی شہزادی سے میراں حسین کی شادی کی۔ غالباً یہ لڑکی جو اب ابراہیم سے منسوب ہوئی وہی تھی۔

حاوی تھا اس کو یہ خبر بہت ناگوار معلوم ہوئی اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اس معاملہ میں احمد نگر سے مطلق رائے نہیں لی گئی، بغیر کسی استمزاج کے یہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو جا رہی تھیں۔ اور خصوصاً قلی قطب شاہ سے اس نے اپنی ناراضگی اور رنجیدگی کا اظہار کیا۔ قلی قطب شاہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت احمد نگر کی طاقت سے کچھ مرعوب تھا اس لیے اس نے پریشان ہو کر ایک دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیا۔ ادھر بیجاپور سے جلدی ہونے لگی کہ شہزادی کو رخصت کر دیا جائے، ادھر احمد نگر کی ناراضگی کا حال سُنکر قطب شاہ تساہل کرنے لگا اور اپنی بہن کی پالکی روانہ نہیں کی۔ فرشتہ اس کی ایک اور وجہ بیان کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے باپ نے مرتے وقت یہ نصیحت کی تھی کہ بغیر احمد نگر کی ریاست کے مشورے کے کوئی کام انجام نہ دینا اور کوئی اتحاد نہ کرنا جب صلابت خاں کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو اس کو اپنے باپ کی نصیحت بھی یاد آئی، اب وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اس زبردستی کی مخالفت اور کشیدگی سے کس طرح نجات ملے، اگر بہن کو رخصت کر دے تو نہ معلوم کیا نتائج ہوں، کہیں لڑائی کی شکل نہ پیدا ہو جائے۔ نہ تساہل ہی کر سکتا تھا کیونکہ بیجاپور کا زور بڑھ رہا تھا۔ وہ عجیب مصیبت میں تھا بہر حال وہ کوشاں تھا کہ کسی صورت سے احمد نگر کا غصہ ٹھنڈا کر کے اپنی بہن کی شادی کے معاملات طے کر دے مگر اس میں بہت تاخیر ہو رہی تھی بیجاپور کو بھی ان حالات کی اطلاع مل گئی تھی، دلاور خاں اور خصوصیت کے ساتھ ابراہیم کو یہ بات بیحد ناگوار گذری کہ صلابت خاں گولکنڈہ پر اثر انداز ہو کر ایک بنی بنائی کارروائی کو بگاڑ دے۔ اور اس کے ساتھ احمد نگر سے رنج کی اور ایک وجہ بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے:۔

جب ابراہیم کی بہن خدیجہ کو میراں حسین سے منسوب کیا گیا تو صلابت خاں نے اس امر پر اصرار کیا کہ دُلہن کے جہیز میں شولاپور کا قلعہ احمد نگر کو دیا جائے کیونکہ چاند بی بی کے جہیز میں یہ قلعہ بیجاپور کو ملا تھا، برہان ماثر نے تو یہ ظاہر کیا ہے کہ ابراہیم نے (یا صحیح طور پر اس کے وکیل السلطنت) اس شرط کو منظور کر لیا تھا مگر یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ دلاور خاں ایسا آدمی نہیں تھا کہ وہ ایسی شرط کو منظور کر لیتا۔ خواہ قبول کیا ہو یا نہ ہو، مگر جب شہزادی احمد نگر پہنچی تو صلابت خاں کا اصرار اور بڑھ گیا۔ جب بیجاپور کی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو دُلہن کو دلہا سے بالکل علٰحدہ رکھا گیا، اور اس وقت تک

شہزادہ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ احمد نگر کا مطالبہ پورا نہ ہو اس میں بیجاپور کی تحقیر تھی ایک تو صلابت خاں کی یہ حرکت اور دوسری طرف اسی کی وجہ سے گولکنڈہ سے شہزادی کا نہ آنا یہ ایسی چیزیں تھیں جو سلیم الطبع سے سلیم الطبع شخص کو جھڑکانے کے لیے کافی تھیں۔ دلاور خاں اپنی اور اپنی سلطنت کی اس میں ہتک سمجھ رہا تھا بادشاہ بھی جو اس وقت جوان ہو گیا تھا بیحد غضب آلود تھا جب معاملات سلجھتے ہی نظر نہ آئے تو دلاور خاں نے ٹھانی کہ دونوں ریاستوں پر فوج کشی کر کے مطالب براری کی جائے کیونکہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، چنانچہ حملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

قطب شاہی اور نظام شاہی سرحدوں پر فوج کشی۔ جب فوجیں آراستہ ہو گئیں تو دلاور خاں نے ابراہیم کو لیکر سرحد نظام شاہی کی طرف پہلے رخ کیا، کیونکہ یہی بانی فساد تھی اور اس سے دوہری دوہری شکایت تھی۔ ابراہیم کی یہ پہلی فوج کشی ہے جس میں اس نے حصہ لیا۔ بیجاپوری فوجوں نے سرحد کے قریب پہنچکر قلعہ اوسہ کا محاصرہ کر لیا اس مہم میں دلاور خاں نے مزید تقویت کے لیے برید کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا جب بیجاپوری فوجوں نے اوسہ کا محاصرہ کر لیا اور احمد نگر پر چڑھائی کی تیاری کرنے لگیں تو یہ خبر مرتضیٰ نظام شاہ کو بھی پہنچ گئی جو ایک زمانہ سے گوشہ نشین تھا۔ تمام حالات صلابت خاں سے دریافت کئے اور جب معلوم ہوا کہ سارے جھگڑے اور فساد کا باعث وہی ہے تو فوراً عہدے سے معزول کر کے قید کر دیا۔ نظام شاہی حکومت کی طرف سے صلح کے لیے اکثر امراء دلاور خاں کے پاس آئے، دلاور خاں بھی معاملات کو زیادہ بڑھانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ جب اصلی شکایت رفع ہو گئی یعنی دلہن کو عزت و توقیر کے ساتھ میراں حسین کے سپرد کر دیا گیا تو دلاور خاں نے مراجعت پر رضامندی ظاہر کی۔ بانی شر و فساد یعنی صلابت خاں معزول کر دیا گیا تھا اس لیے گولکنڈہ کی جانب سے بھی اطمینان تھا کہ اب وہ لڑکی کو روانہ کرنے میں تساہل نہیں کریں گے، اس لیے دلاور خاں نے یہاں سے نکل کر سرحد قطب شاہی کی راہ لی[1]۔

---

[1] برہان مآثر نے لکھا ہے کہ جب احمد نگر سے شولاپور کے معاملہ پر بگاڑ ہوا تو ابراہیم نے گولکنڈہ سے اتحاد کیا۔ اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے شادی کر کے اپنا ساتھی اور ہمنوا بنا کر احمد نگر کا رخ کیا، مگر فرشتہ دوسری طرح

جب محمد قلی قطب شاہ کو یہ سُن گُن لگی کہ فوجیں کس غرض سے آرہی ہیں تو اس نے بھی نہایت تیزی سے مصطفےٰ خاں (امیر زنبیل) کی ہمراہی میں (جس کے ساتھ امین الملک، اعتبار خاں، فخر الملک و امین خاں بھی تھے) چاند سلطانہ المعروف بہ ملکۂ جہاں کی سواری باد بہاری نلدرگ روانہ کردی اور وہیں ابراہیم کا عقد ملکۂ جہاں کے ساتھ ہوگیا۔ چالیس روز تک عیش و نشاط کے جلسے ہوتے رہے۔ جب ابراہیم کو معلوم ہوا کہ اس کی دلہن کی سواری آرہی ہے تو خود اس نے اُمراء و اعیان کے ساتھ آدھ کوس تک آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بڑی جاہ و حشمت و تجمل کے ساتھ ابراہیم کی شادی نلدرگ کے تاریخی مقام پر ہوئی[1]۔ اب چونکہ دونوں مطالب حاصل ہوگئے تھے اس لیے بیجاپوری لشکر ابراہیم اور دلاور خاں کی سرکردگی میں کامرانی و کامیابی کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔

ان حالات کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن کی خارجی فضا اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ جو چیزیں اتحاد و اخلاص پیدا کرنے والی ہوتی ہیں وہی رنج و فساد کا باعث ہوا کرتی تھیں۔ دلاور خاں نے کوشش تو اس لیے کی تھی کہ دونوں ریاستوں سے خوشگوار تعلقات پیدا ہوں، لیکن اُلٹا جب تک فوج کشی نہ کی گئی مطلب حاصل نہ ہوا۔ اس طرح جیسا پہلے لکھا گیا ہے اس کارروائی کا خلاف توقع نتیجہ برآمد ہوا۔

احمد نگر پر حملہ ابھی ان حالات سے فرصت نہ ملی تھی کہ بیجاپور کو پھر ایکبار احمد نگر کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ مرتضیٰ نظام شاہ کی دیوانگی کے بارے میں اس سے پہلے بھی لکھا گیا ہے، اب اس کا جنون اور بڑھ گیا،

(بسلسلۂ گذشتہ) ان واقعات کی تفصیل دیتا ہے جو اوپر دی گئی۔ تاریخ قطب شاہی میں ان تفصیلات کا ذکر نہیں، اور نہ یہ بتلایا گیا ہے کہ محمد قلی نے اپنی بہن کی پالکی روانہ کرنے میں کچھ تساہل کیا، جس کی وجہ فوج کشی لاحق ہوئی۔ تحفۃ الملوک نے بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے سرحد قطب شاہ کی طرف توجہ کی گئی اور شادی کے بعد سرحد نظام شاہ کی طرف (ملاحظہ ہو برہان مآثر، تاریخ قطب شاہی، تحفۃ الملوک و تاریخ فرشتہ)۔

[1] تاریخ قطب شاہی۔

اس جنون میں اسے اپنے بیٹے سے شبہ پیدا ہو گیا تھا، اس لیے اس کو قتل کر دینا چاہتا تھا اور اپنے وزیروں اور مشیروں کو اس کام کے لیے مقرر کیا، مگر کوئی ذی ہوش آدمی ایک بے گناہ کو قتل کرنے میں کیا دلچسپی لے سکتا ہے۔ جب یہ ناکام رہے تو انھیں معزول کر دیا، اب مرزا خاں کی باری آئی۔ یہ وکیل السلطنت ہو گیا تھا، اس نے یہ سوچا کہ بادشاہ دیوانہ ہے، اسے معزول کر کے میراں حسین کو تخت نشین کر دیا جائے۔ چونکہ وہ تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے بیجاپور سے مدد طلب کی ابراہیم کی بہن میراں حسین کو دلگئی تھی اس لیے بیجاپور نے مدد کا وعدہ کر لیا۔ ۹۹۶ھ میں تیس ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپوری افواج میراں حسین کی مدد کے لیے پہنچیں خود ابراہیم بھی اس فوج کے ساتھ تھا، لیکن بیجاپور کی یہ فوج میراں حسین کو بادشاہ بنانے میں کوئی مدد نہ دے سکی کیونکہ اسی اثنا میں مرزا خاں کی کوششوں سے میراں حسین تخت و تاج کا مالک بنگیا تھا، اور احمد نگر میں اس کی تاجپوشی عمل میں آچکی تھی۔ ابراہیم کو جب یہ معلوم ہوا کہ میراں حسین بادشاہ ہو گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور مبارکباد کے لیے اپنے ہاں سے آدمی روانہ کئے، اور ساتھ ہی یہ بھی ارادہ تھا کہ احمد نگر جا کر اپنی بہن سے ملاقات کر کے پھر بیجاپور لوٹ جائے، مگر راستے میں خبر ملی کہ میراں حسین نے بادشاہ ہو کر نہایت بیدردی اور بیرحمی کے ساتھ اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے (جو دراصل مرزا خاں کے سمجھانے بجھانے سے میراں حسین نے کیا تھا) ابراہیم کو یہ سنکر بہت رنج ہوا کہ ایک ناخلف بیٹے نے اپنے ہاتھ کسی اور کے خون میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے خون میں رنگے ہیں، نہایت غصہ اور خفگی کے عالم میں اس نے احمد نگر جانے کا ارادہ ترک کر کے بیجاپور کی راہ لی، اور جاتے ہوئے اس نے میر حسین کرد کو میراں حسین کے پاس روانہ کیا۔ فرشتہ کے الفاظ بقیہ بیان کے حامل ہیں، ابراہیم نے اس بیباک اور منہ پھٹ سفیہ کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ "غرض از لشکر کشی ما و آمدن ما بدیں حدود آں بود کہ ترا بر تخت احمد نگر جلوس فرمودہ پدرت مرتضیٰ نظام شاہ را کہ گوشہ اختیار کردہ بود در کنج خانہ یا در یکے از قلاع بوکلے سپردہ نگاہ داریم تا بفراغ بال بغاوت قادر ذو الجلال مشغول باشد، اکنوں شنیدہ میشود کہ از وخامت عاقبت و غضب سلطانی روز الست ترسد شدہ قصد پدر بزرگوار نمودی، و احیاناً اگر زیادہ از حد خود را بوسواس شیطانی دادہ بہ توہم بودی یکے از دو کار بایستی کرد، یا او را نزد من بایستی فرستادی او را بحفاظت تمام نگاہ داشتہ ترا از دغدغہ

خلاص سازم یا آن کہ بہ نشترِ جفا چشم جہاں بیں او را کور گرداند رسانیدہ مرتکب ہلاک پدر بہ پیر نمیکنی"۔[1]

اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ "پدر کشی" راس نہیں آتی، تیری سلطنت مبارک نہ ہوگی اور چند ہی روز میں تو اپنے گناہ کے مکافات کو پہنچے گا۔ اس سفیر کو روانہ کرکے بادشاہ اور دلاور خاں مع فوج کے اپنے مستقر کو واپس ہوگئے۔

دارالسلطنت کی طرف توجہ | جب ان دو تین مہموں سے فراغت حاصل ہوئی تو شاہی سواری بیجاپور کو چلی، بیجاپور پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ تک تو حسب معمول انتظام سلطنت دلاور خاں کی زیر ہدایت چلتا رہا، ان مہموں کے بعد دلاور خاں کا سکہ ملک پر اور بھی اچھی طرح بیٹھ چکا تھا، تمام انتظامات کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی۔ درحقیقت یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حکومت اور بادشاہت ابراہیم نہیں بلکہ دلاور خاں کر رہا تھا کسی بڑے سے بڑے امیر، عالی مرتبت سے عالی مرتبت عہدہ دار کی مجال نہ تھی کہ وکیل السلطنت کے سامنے دم بھی مار سکے، اس نے ایسا انتظام کیا تھا کہ نہ صرف ملک کا سیاسی نظم و نسق اس کے ہاتھ میں کھنچکر آگیا تھا، بلکہ محل کے اندر بھی وہ پورا پورا حاوی تھا۔ بادشاہ کو حق نہ تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر گھونٹ بھر پانی بھی پی سکے، بادشاہ کے اردگرد جتنے ملازمین و خدمتگار اور مقربین رہتے تھے وہ سب دلاور خاں کی آنکھ کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ اس کے خلاف مرضی تنکا بھی نہ ہل سکتا تھا۔ غرض دلاور خاں اس وقت ریاست کا روح رواں اور ایک طرح سے "آمر مطلق" ہوگیا تھا، وہ بیجاپور پر بادشاہت کر رہا تھا، شاید بادشاہوں کو بھی کبھی اتنا مکمل اختیار حاصل نہ ہوا ہوگا، کیونکہ بالعموم بادشاہ اپنے مقربین اور معتمدین کے اختیار تمیزی پر بہت سارے امور سلطنت کی انجام دہی چھوڑ دیتے ہیں، مگر چونکہ دلاور خاں ایک متولی تھا اور بادشاہ نہ تھا اس لیے اس کے استقلال اور اس کی قوت کی بقا کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسروں کو معاملات سلطنت میں کم سے کم دخل دینے کا موقع دے اور زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے، اس طرح قدرتی طور پر اس کی طاقت بڑھتی ہی گئی، لیکن جب دلاور خاں کی قوت معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھی عین اسی وقت ایک ردعمل ہوا، اول تو بادشاہ کو اپنے اتالیق کا

[1] تاریخ فرشتہ۔

غیر معمولی عروج پسند نہ تھا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نفقند نائب کے مقابلہ میں وہ بالکل مجبور محض ہے، اگر چند سال یہی حال رہا تو ابراہیم کی بادشاہت کا تو فقط نام رہے گا اور بیجاپور پر اصلی اور حقیقی حکومت کرنے والا دلاور خاں حبشی ہوگا۔ ابراہیم کی والدہ بھی خائف ہو چلی تھیں اور کوئی تدبیر بھی بن نہ پڑتی تھی، کیونکہ جس کو نمک حلال اور وفادار سمجھ کر وزیر سلطنت بناتے ہیں وہ چند روز کے بعد ایسے پاؤں پھیلاتا ہے کہ الاماں خود بادشاہ کی بادشاہت خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اب اعتماد کیا جائے تو کس پر، اور مدد لی جائے تو کس سے۔ دلاور خاں سمیت اب تک چار متولیان ریاست گذر چکے ہیں، جب ایک نے نمکحرامی کی تو دوسرے کو طلب کیا، جب دوسرے نے رنگ بدلا تو تیسرے سے مدد لی، جب تیسرے کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوئیں تو چوتھے کو وزیر سلطنت بنایا گیا، مگر ان میں سے ہر ایک دوسرے کا استاد ہی نکلتا گیا۔ اب دلاور خاں کے زمانے میں خود متولی اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ اس کے مقابل کوئی بھی چوں نہیں کر سکتا تھا۔ طاقت کا غیر معمولی طور پر بڑھا لینا اشتباہ کا باعث ہو جاتا ہے، خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے کہ جنھوں نے بھی طاقت حاصل کی وہ شرارت پر آمادہ ہوئے، اسلیے سب سہمے ہوئے ہی تھے کہ دیکھئے اب دلاور خاں کی یہ غیر معمولی طاقت کیا رنگ لاتی ہے۔

بادشاہ کی معزولی کی افواہ اسی اثنا میں یہ خبر یا افواہ پھیل گئی کہ دلاور خاں ابراہیم کو معزول کر دینا چاہتا ہے اور اس کی جگہ اس کے بھائی اسمٰعیل کو جو اس وقت مصطفےٰ آباد میں قید ہے بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ سارے شہر میں اک آگ سی لگ گئی۔ یوں بھی عوام الناس اور ملک کے مختلف طبقے دلاور خاں کی ترقی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جب یہ خبر ملی تو ان کے نزدیک اس کا وجود آیۂ آسمانی سے کچھ کم نہ تھا، اس سرے سے اس سرے تک ایک سنسنی پھیل گئی کیونکہ ملک میں جب ایسے انقلابات رونما ہوتے ہیں تو ملک ان کے برے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتا، روزمرہ کی معمولی معاشرتی، معاشی اور تجارتی زندگی پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے، اسی وجہ سے تجارتی اور زراعتی طبقہ کسی ملک میں انقلابات کے موافق نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے معنی حکومت کی مشنری کی سرے سے تبدیلی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ایسی حالت میں ملک میں خونریزیوں کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے، ایک فریق دوسرے فریق سے گتھم گتھا اور

دست وگریباں ہو جاتا ہے، جب کوئی خاص اہم سوال اٹھایا جاتا ہے تو اس کے متعلق آراء کا کتنا اختلاف ہوتا ہے، یہ تو بادشاہ کی تبدیلی کا مسئلہ تھا، ہر ایک طبقہ کے مختلف اغراض ہوتے ہیں اور وہ ان اغراض کے اعتبار سے کسی خاص فریق کے موافق یا مخالف ہو جاتے ہیں، ذی حیثیت اور عالی مرتبت اُمراء کی جنگ میں متوسط اور امن پسند طبقہ پس جاتا ہے! ابھی ملک والوں کو اخلاص خاں کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ حمید خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کی باہمی مخالفتوں میں عام شہری گھن کی طرح پس رہے تھے اور روزانہ کی جھڑپ میں بے گناہ لوگ مارے جاتے تھے۔ دوست محمد صاحب کے ساتھیوں کا دوکان میں ایک گولہ کی زد سے مارا جانا اس کی بین دلیل ہے۔

غرض جب عامۂ خلائق کو اس کی خبر لگی تو وہ سراسیمہ و پریشان ہوئے اور ڈر رہے تھے کہ پھر کہیں ملک میں ایک زبردست خانہ جنگی کا آغاز نہ ہو جائے (اور خانہ جنگی کا ہونا لازمی تھا اگر دلاور خاں کو یہ خیال آ جاتا کہ بادشاہ معزول کر دیا جائے) کیونکہ ہزار دلاور خاں ملک میں انتہائی طاقت حاصل کر لے مگر جب بادشاہ کی علیحدگی کا سوال اُٹھے گا تو بہت سارے نمک حلال اور وفادار اُمراء بادشاہ کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے، لازمی طور پر ملک میں دو فریق پیدا ہو جائیں گے، کچھ تو حقیقی نمک حلالی اور وفاداری کے جذبات سے متاثر ہو کر ابراہیم کا ساتھ دیں گے اور کچھ دلاور خاں کو نکال باہر کرنے اور اس کے طمطراق کا خاتمہ کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ کچھ اپنی ذاتی مخالفتوں، کاوشوں اور مخاصمتوں کی وجہ سے بادشاہ کے طرفدار ہو جائیں گے اور کچھ محض فائدے کی غرض سے دلاور خاں کی ہمنوائی میں اٹھ کھڑے ہوں گے، بہرحال اس طریقہ سے سخت اندیشہ تھا کہ اک زبردست شورش برپا ہو جائے، اور عوام کا طبقہ بھی بے چین تھا۔

بالعموم عام رعایا کو بادشاہ سے اک خاص دلبستگی اور محبت سی پیدا ہو جاتی ہے، ابراہیم گو ابھی نوعمر تھا مگر اس کے اخلاق و عادات اس کی رحمدلی اور کریم النفسی کی روایتیں ملک میں عام تھیں، اس کو تخت شاہی پر متمکن ہو کر اتنا عرصہ گذر چکا تھا کہ ملک کے جذبات اس سے وابستہ ہو جائیں، اور ملک کبھی یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ صرف دلاور خاں کے ذاتی فائدے کے لیے اپنے لائق، رحمدل اور مقبول بادشاہ کو

بے وجہ الگ کر دیا جائے۔ ان وجوہات کی بنا پر تمام شہر میں اک اضطراب سا تھا جب عام شہر کا یہ حال ہو تو شاہی محل کا کیا عالم ہوگا، یہ خبر ایسی نہ تھی کہ ابراہیم اور اس کی والدہ کے کانوں تک نہ پہنچی، شاہی محل میں ایک کہرام مچ گیا، بادشاہ اور اس کی والدہ گھڑی بھر نہ سو سکے، تمام رات پریشانی میں کٹ گئی، ابراہیم اس وقت جوان ہو چکا تھا، وہ دلاور خاں کے اس خیال سے آگاہ ہو کر بوکھلا گیا۔

جب صبح طالع ہوئی تو دلاور خاں حسب معمول سلام کے لیے حاضر ہوا اس کو خفیہ طور پر پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ محل شاہی میں رات بھر کیا حشر برپا رہا، اپنے معمولی فرائض کی انجام دہی کے بعد وہ بادشاہ کو خلوت میں لے گیا اور اس پریشانی کے متعلق استفسار کیا (اس وقت دلاور خاں اور ابراہیم کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کو اتفاقاً رفیع الدین شیرازی نے لفظ بہ لفظ سن لیا، کیونکہ رفیع الدین شیرازی کو جامدار خانہ اکسوت خانہ کا بھی صدر بنایا گیا تھا، اس لیے وہ بادشاہ کے قریب ہی رہتا تھا، اس وقت اتفاق سے وہ کسی دوسرے حصے میں پردے کے پیچھے تھا کہ دلاور خاں نے بادشاہ کو خلوت میں لا کر گفتگو کی اور اس طرح اس نے سن لیا) ابراہیم ذرا ہچکچایا اس کے بعد جی کڑا کر کے جو کچھ سنا تھا من وعن دھرا دیا۔ دلاور خاں جب نفس معاملہ سے آگاہ ہوا تو اس نے بے اختیارانہ اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ باوجود اتنی وفاداری اور جاں نثاری کے شک وشبہ جاتا نہیں اور نت نئے طوفان اٹھائے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اس نے اپنے گھر کی راہ لی اور جاتے ہوئے جو کچھ اہل دربار دربار حال میں موجود تھے انھیں کہتا گیا کہ آیندہ سرکاری کاروبار سب قلعہ میں انجام پائیں گے۔ کوئی شخص کسی حال میں بھی سرکاری کاروبار کی غرض سے اس کے گھر پر نہ آئے، وہ خود ان کی انجام دہی کے لیے قلعہ حاضر ہو جایا کرے گا لیکن اس کے بعد اس پر اس قدر خوف وہراس طاری ہوا کہ وہ بالکل خانہ نشیں ہو گیا اور پانچ چھ روز تک گھر سے باہر قدم نہ ڈالا، تمام سرکاری کاروبار بالکل بند رہے، حکومت کی مشنری یکلخت رک گئی، جہاں روزانہ حکومتی کاروبار کی گرما گرمی رہتی تھی، وہاں ایک سناٹا چھایا ہوا رہنے لگا، سرکاری کاروبار یکایک رک جانے سے ملک کی پریشانیوں میں اور زیادتی ہو گئی، ملک کے سیاہی منش لوگ اس پر تلے ہوئے تھے کہ اگر بادشاہ کا ذرا بھی اشارہ پائیں تو دلاور خاں کو مع اس کے ہمنواؤں کے آن واحد میں

تہ تیغ کرڈالیں۔ بادشاہ کی معزولی کی افواہ نے اس کی ساری طاقت کو یک قلم سلب کرلیا، اور وہ مقہور ومعتوب کی طرح اپنی صورت چھپائے بیٹھا تھا، اس کو کوئی صورت اپنی خلاصی کی نظر نہ آتی تھی، اندیشے بڑھتے ہی جارہے تھے اس کو کسی پر اعتماد باقی نہ رہا تھا، اور وہ کسی کو اپنے پاس آنے بھی نہ دیتا تھا حتیٰ کہ رومی خاں جس کی لڑکی دلاور خاں کے بیٹے عبدالقادر سے منسوب تھی اس پر بھی دلاور خاں کو بھروسہ نہ رہا تھا۔ کاروبار کے تعطل کا یہ عالم تھا کہ رومی خاں جو قلعہ دار تھا قلعہ کے اندر جانے سے احتراز کررہا تھا، اور رفیع الدین شیرازی کا بیان ہے کہ وہ دو چار روز تک بادشاہ کے کپڑے بدلنے کی خدمت انجام نہ دے سکا۔[1]

جب چند روز اسی طرح گذر گئے اور صورت حال کچھ ٹھیک نہ ہوئی تو اس امر کی کوشش کی جانے لگی کہ دلاور خاں پھر برسرکار ہو جائے، اس لیے کہ اگر حکومت یونہی معطل رہے تو نہ معلوم ملک میں کتنے فساد اور برپا ہو جائیں۔ شر وفساد پر جو طبقہ ہمیشہ آمادہ رہتا ہے وہ کیا کچھ ستم نہ ڈھائے اور ملک کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے، لہٰذا ان آنیوالے خطروں سے ملک کو بچانے کے لیے کوئی مصالحت کی صورت نکالنے کی ازبس ضرورت تھی اور فی الحال سب سے اہم کام دلاور خاں کو سمجھا بجھا کر اس کے اپنے عہدے پر بحال کرنا تھا تاکہ کوئی نازک صورت پیدا ہو جائے تو کم از کم اس کا سد باب کیا جاسکے۔ اب تقریباً ہر شخص یہ جان لیا تھا کہ دلاور خاں اس معاملہ میں بے قصور ہے اور وہ ایسی غداری کا مرتکب نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کے افعال اس کی بے گناہی کو ثابت کررہے تھے، ورنہ حقیقتاً اگر وہ غداری پر تلا ہوا ہوتا تو اس طرح خانہ نشیں کیوں ہو جاتا۔ پہلے ہی سے ایسے انتظامات کرتا کہ ملک اور فوج اپنے قابو میں رہے اور کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوسکے، یہ افواہ دراصل دلاور خاں کے انتہائی عروج کو ایک مشتبہ شکل دینے کے لیے اڑائی گئی تھی چنانچہ ایک مصالحتی کمیٹی بٹھائی گئی اور اس کام کے لیے سید اسمٰعیل دبیر جو معتمدین ریاست میں تھا اور خود دلاور خاں کے بیٹے اور امیر حسین متوفی الممالک جسے دلاور خاں اپنا بیٹا کہا کرتا تھا، اور رومی خاں منتخب کئے گئے۔ ان لوگوں نے دلاور خاں کو تمام نشیب و فراز سمجھایا اور بتلایا کہ خود اس طرح معزول ہو کر بیٹھ رہنا خلاف عقل بات ہے، ملک کے ہزار دوست و دشمن لگے رہتے ہیں

[1] تحفۃ الملوک۔

اس بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر ممکن ہے شریر النفس طبقہ بغاوت کر دے اس لیے بہتر ہے کہ پھر وہ معاملات سلطنت کیطرف رجوع کرے لیکن دلاور خاں پر ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا آخر کار اس کے ایک بیٹے محمد خاں نے جو نہایت دانشمند زیرک اور لایق و فاضل آدمی تھا اور اس کے علاوہ دلاور خاں پر بھی اس کا بہت اثر تھا، اپنے باپ کو سمجھایا کہ یہ طرز عمل ٹھیک نہیں ہے اس میں سارے خاندان کی رسوائی ہے اور اگر اس وقت بادشاہ ذرا بھی اشارہ کر دے تو اس کا سارا خاندان برباد ہو جائے گا، عزت و ناموس خاک میں ملجائے گی اور گھر کی عورتیں کہاروں اور چماروں کے حوالے ہو جائیں گی، اس نے اس خوبی سے اس کے طرز عمل کی غلطی ذہن نشین کروائی کہ وہ معاملات سلطنت کی طرف رجوع کرنے پر راضی ہو گیا اس کا راضی ہونا تھا کہ محمد خاں نے رومی خاں کے پاس آدمی دوڑا دیئے کہ دلاور خاں کو سمجھا لیا گیا ہے، اب کوئی تدبیر مصالحت کی کی جائے۔ رومی خاں خود قلعہ کے اندر جانے سے ڈرتا تھا اس لیے ایک معتمد بڑھیا کو ابراہیم کی والدہ کے پاس روانہ کیا کہ اس کا عندیہ لیا جائے، اس وقت ابراہیم اور ابراہیم کی والدہ دونوں دلاور خاں کے اس عجیب طرز عمل سے حیران و پریشان تھے ان کو بھی کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کیا جائے، اگر دلاور خاں نے واقعی نمک حرامی کی تھی تو وہ ان حالات کے معلوم کرتے ہی خانہ نشین کیوں ہو گیا، وہ کچھ زور و قوت سے بھی کام لے سکتا تھا، مانا کہ ملک کا بیشتر حصہ اس کے خلاف ہو گیا تھا گر پھر بھی وہ ایک زمانے سے وکیل السلطنت تھا اسکا اثر و رسوخ بھی کافی تھا، اس کے حامی اور طرفدار موجود تھے آخر کچھ نہ کچھ قوت تو اس کے پاس تھی وہ کچھ تو ہاتھ پاؤں مار سکتا تھا لیکن اس کا خانہ نشین ہو جانا اور از خود معزولی یہ بتا رہی تھی کہ یہ محض افواہ ہی افواہ ہے اور اس کے دل میں نمک حرامی کا خیال تک نہ تھا چونکہ وہ محض خالی الذہن تھا اس لیے واقعات کا یکایک یہ رنگ دیکھ کر گھبرا گیا، پریشانی میں اس سے اور تو کچھ بن نہ پڑا صرف ذاتی محافظت کے لیے خانہ نشین ہو گیا اس لیے ابراہیم اور اس کی والدہ کا دل دلاور خاں کی طرف سے صاف ہو چکا تھا اور بدگمانیاں جاتی رہی تھیں، اگر بفرض محال اب دلاور خاں کی جانب سے انھیں بدگمانی تھی بھی تو وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ دلاور خاں تنہا انھیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا کہ تمام ملک میں

شورش کی آگ پھیل جانے سے ہوسکتا تھا۔ دوسرے ملک نے اس تھوڑے سے عرصہ میں بادشاہ سے جو اپنی وفاداری کا اظہار کیا تھا اس سے دلاور خاں کی قوت دفعتہً سلب ہوگئی تھی اور اس کی عقل بھی ٹھکانے لگ گئی تھی۔ اگر وہ غداری کی طرف راغب بھی تھا تو ان حالات کے مشاہدے کے بعد اس میں ہمت نہ رہی تھی کہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے، اسی بنا پر ابراہیم کی والدہ کا بھی یہی خیال تھا کہ دلاور خاں حکومت کو پھر اپنے ہاتھ میں لے لے اس کے علاوہ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ دلاور خاں کو منا لیا گیا ہے تو اس نے رومی خاں کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کروانے کا وعدہ کر لیا۔

مصالحت دوسرے روز صبح ابراہیم کی والدہ نے اسے سمجھا بجھا کر دلاور خاں کے گھر روانہ کیا، دلاور خاں کی بدگمانی اور پریشانی دور کرنے اور عوام الناس پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ بادشاہ کو دلاور خاں پر کامل اعتماد ہے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اس سے ایک طرف تو دلاور خاں کی تالیف قلب ہوگئی، دوسرے دلاور خاں کی جانب سے جو ملک میں بدگمانی و نفرت پھیل گئی تھی، وہ دور ہو سکتی تھی، کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ بادشاہ اپنے ریجنٹ پر پورا پورا اعتماد رکھتا ہے، جب بادشاہ کا ہی اعتماد ظاہر ہو جائے گا تو پھر عوام الناس کو دلاور خاں سے بدگمانی کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔ درحقیقت تمام ملک کی اسی بدگمانی نے دلاور خاں کی ساری طاقت اور اختیارات کو آن کی آن میں سلب کر لیا تھا۔ غرض رومی خاں کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کر کے بادشاہ بہ نفس نفیس دلاور خاں کی کوٹھی پر آیا، بادشاہ کی آمد کی خبر سنتے ہی دلاور خاں نے دوڑتے ہوئے آکر بادشاہ کے پاؤں چوم لیے اور اپنی وفاداری کا اظہار کیا، بادشاہ نے بھی اسے تسلی اور دلاسا دیا اور اپنے ساتھ قلعہ کو لے گیا۔ ابراہیم جس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا اسی پر دلاور خاں کو بٹھایا گیا اور خود ابراہیم سنگاسن[لہ] میں بیٹھ گیا۔ اس سے بھی یہی منظور تھا کہ بادشاہ کا کامل اعتماد اہل ملک پر ظاہر ہو جائے، دلاور خاں کی کوٹھی سے شاہی محل تک اس طرح بادشاہ اور ریجنٹ کی سواریاں گئیں، خلقت نے بھی اس ملاپ کو بہ نظر استحسان و اطمینان دیکھا اور ملک میں ایک قسم کی طمانیت پیدا ہوگئی، بادشاہ نے مزید تالیف قلب کے خیال سے دلاور خاں کو بہت کچھ تحفہ و تحائف سے سرفراز کرنا چاہا مگر دلاور خاں نے عرض کی اس وقت حضور کے جسم پر جو لباس ہے

لہ تحفۃ الملوک

وہی عطا کر دیا جائے کہ وہ دنیا کے سارے بیش بہا خلعتوں سے اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ بادشاہ نے دلاور خاں کی یہ خواہش پوری کر دی، دلاور خاں نے اس کو اپنی خاص عزت افزائی پر محمول کیا۔ اس لین دین اور سرفرازی کے بعد دلاور خاں کو رسمی طور پر پھر سے وکیل السلطنت کے عہدے پر فائز کیا گیا اور پھر دلاور خاں کے ہاتھ میں ملک کے انتظامات آگئے۔ اس کارروائی سے وہ تمام پریشانیاں اور بدگمانیاں جو نہ معلوم کتنے بڑے فساد کا موجب ثابت ہوتیں یکایک اس طرح دب گئیں جس طرح دبی ہوئی آگ پر پانی چھڑک دیا جائے تو وہ بھسم ہو جاتی ہے۔ جب حکومت کی مشنری چلنے لگی تو ملک کے اس عنصر کو جو فتنہ و فساد کی طرف مائل تھا، اپنی کارروائیوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ رہا اور یکبارگی ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔

دلاور خاں کی استحکامی تدابیر اس واقعہ کے بعد دلاور خاں کی آنکھیں کھل گئیں، وہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ہزار طاقت و قوت اس کو حاصل ہو جائے مگر ذراسی غداری اور نمک حرامی کا خیال برباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔ دلاور خاں اب تک خواب غفلت میں تھا اور اس کو اندازہ نہ تھا کہ ملک میں جذبۂ بادشاہ پرستی کا کیا عالم ہے، حالانکہ وہ وکیل السلطنت اور ملک کا سب سے اعلیٰ اور طاقتور ترین عہدہ دار تھا، فوج اس کے حکم میں، قلعہ اس کے تحت، حتیٰ کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر آن کی آن میں یہ سب اس کے قابو سے اس طرح نکل گئے جیسا کہ پہلے تھے ہی نہیں۔

لہٰذا دلاور خاں اب چونک گیا تھا، اس کی جان جاتے جاتے بچ گئی تھی، وہ برباد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اس لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے استحکامی تدابیر کرنے لگا۔ اب وہ مزید فوج جمع کرنے میں مشغول ہو گیا۔ (محض مزید فوج جمع کر لینا ہی کافی نہ تھا، بلکہ اس کو براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا بھی از حد ضروری تھا کہ جب چاہے اور جس کے مقابل چاہے اسے لا کر کھڑا کر دے) اور اس زبردست فوج کی تیاری میں اسٹیٹ کا بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگا۔ قدیم فوج کو بھی نئے ساز و سامان سے آراستہ کیا اور اس کی تنظیم و ترتیب کی، تقریباً پانچ چھ ہزار ہون[۱] خرچ کر کے نو ہزار سوار، چار ہزار پیادہ، تین سو ہاتھی اس نے ایک جرار و کرار فوج تیار کر لی، بہترین ساز و سامان اعلیٰ درجہ کے گھوڑے اور طاقتور تنومند سپاہی

۱۔ تحفۃ الملوک۔

اور زبردست ماہرین فن جنگ جمع کئے گئے اور اس فوج کو بہترین جنگی اصولوں پر تیار کی ہوئی فوج بنانے میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب فوج تیار ہوگئی تو اس کی کفالت کا سوال پیدا ہوا جو کچھ روپیہ منظور تھا وہ پہلی فوج کی خوراک و ضروریات کے لیے تھا اب اس مزید فوج کے لیے خزانہ پر بار ڈالنا پڑتا تھا لیکن بادشاہ کی منظوری ضروری تھی اس نے منظوری حاصل کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ ایک فوجی مظاہرہ کیا۔ بادشاہ کو ایک برج پر بڑی شان و شوکت سے بٹھایا گیا اور نیچے سے یہ نئی تیار شدہ فوج نہایت آراستگی و پیراستگی کے ساتھ گذرنے لگی۔ بادشاہ نے اس نئی فوج کا معائنہ کرکے بڑی مسرت ظاہر کی، دلاور خاں کی تعریف و تحسین کی اور اس کو اس کے بیٹوں کو خلعتہائے فاخرہ سے سرفراز فرمایا خلعت کے ساتھ ایک انگشتری بھی عنایت ہوئی جو الماس و یاقوت کی تھی، مرصع و زرنگار زین و لگام کے ساتھ ایک اسپ تازی، ہاتھی، شمشیر و خنجر اور ان کی زرین میانیں، غرض دلاور خاں کو بہت کچھ سرفراز کیا گیا اس تمام عطا کا اندازہ رفیع الدین[1] "تقریباً دو لاکھ ہون" بتاتا ہے یہ تو فقط عطیہ او تحفہ تھا اب اس فوج کے اخراجات کے لیے ایک سو قریے مزید دلاور خاں کے تفویض کئے گئے۔ عمال ریاست کو ہدایت دی گئی کہ یہ سو قریے فی الفور دلاور خاں کے حوالے کئے جائیں۔

اسی سلسلہ میں اکثر امرا کی جاگیروں کو ضبط کرکے دلاور خاں نے اپنا قبضہ کر لیا کہ فوج کی کفالت کا سامان ہو چنانچہ بلال حبشی جو کچھ خیالات فاسدہ پیدا کر رہا تھا اسے قید کرکے اندھا کر دیا گیا اور جاگیر چھین لی۔ شرزہ خاں اور جلال نامی ایک شخص کی جاگیریں ضبط ہو کر دلاور خاں کے قبضہ میں آگئیں۔ غرض اس طریقہ سے اس نے استحکامی تدابیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمعصر مورخ رفیع الدین شیرازی نے اس کارروائی پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ نہایت بہتر ہے، وہ لکھتا ہے کہ "از عمل پنجہزار سوار از لشکر عالم پناہ کم شد۔ بر لشکر دلاور خاں افزود، غرض او ہمیں بود کہ خود را سنگین سازد، و عالم پناہ را سبک گرداند ہمیشہ مستولی

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] تحفۃ الملوک۔

باشندو تمدرت بر دفع او ندا شتہ باشند "ان جملوں سے صورت حال پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے،
وہ صاف طور پر لکھتا ہے کہ ان تمام افعال سے اس کا مقصد یہی تھا کہ خود اس قدر طاقتور اور با قوت ہو جائے کہ
اگر بادشاہ چاہے بھی تو اسے حکومت سے خارج نہ کر سکے، گو اس کا خیال بادشاہ کو الگ کرنے کا نہ تھا مگر
اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ وہ حکومت کا حریص تھا اور بادشاہ کو عضو معطل بنا کر خود حکومت
کرنا چاہتا تھا، اس لیے ان غیر معمولی استحکامی تدابیر پر عمل کر رہا تھا، دلاور خاں کے ہاتھ سے حکومت
جا کر دوبارہ آئی تھی، لہذا وہ اس کی حفاظت کو اپنا ایمان سمجھتا تھا، اپنے مزید استحکام کے لیے وہ
نظام شاہی ریاست کے معاملات میں دخل دیتا ہے تاکہ اپنا اقتدار اور رسوخ بڑھے۔

احمد نگر دلاور خاں کو جب پورا استحکام حاصل ہو گیا تو اس نے احمد نگر کی طرف توجہ کی کیونکہ یہاں کے
حالات اس امر کے متقاضی تھے، ابھی ان واقعات کو گذر کر بمشکل ایک سال ہوا ہوگا کہ میراں حسین نظام شاہ
قتل کر دیا گیا، احمد نگر میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے، دکنی اور غیر ملکی فریق میں وہ خوں ریزیاں ہوئیں کہ
الاماں والحفیظ غیر ملکی فریق کا رہبر مرزا خاں مارا گیا اور دکنی فریق کو فروغ حاصل ہوا جس کا رہبر اور لیڈر
جمال خاں مہدوی تھا اس نے اسمٰعیل کو (جو برہان کا بیٹا تھا) بادشاہ تسلیم کرا لیا جو ایک کم لڑکا تھا اور
خود معاملات سلطنت پر حاوی ہو کر مختار کل بن گیا آدمی قابل اور کار داں ضرور تھا مگر مہدوی ہونے
کی وجہ سے دوسرے طبقہ کے لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے، ان وجوہات کی بنا پر احمد نگر کی حالت خراب
ہوتی جا رہی تھی۔

جب احمد نگر میں یہ خرابیاں رونما ہوئیں تو دلاور خاں کو یہاں کے معاملات میں دخل اندازی کر کے
کچھ تو اپنی طاقت و رسوخ میں اضافہ کرنے اور کچھ نظام شاہی علاقے حاصل کر لینے کی سوجھی، جیسا کہ
احمد نگریوں نے اس سے پہلے بیجاپور کی اندرونی خرابیوں سے فائدہ اٹھا کر کیا تھا، چنانچہ ۹۹۷ھ مطابق
۱۵۸۸ء میں پھر دوبارہ بیجاپوری افواج نے احمد نگر کا رخ کیا، یہ فوجیں یہاں سے روانہ ہو کر شاہ درگ
پہنچیں اور وہاں فی الحال قیام گزیں ہو گئیں، اس غرض سے کہ بلبل خاں اپنی بھاری فوج کے ساتھ
دلاور خاں سے یہاں ملحق ہو جائے اور اس کے بعد متحدہ قوت سے احمد نگر پر دھاوا بول دے۔

لہ تحفۃ الملوک۔

مالابار کی دوسری مہم | اوپر لکھا گیا ہے کہ دلاور خاں نے بلبل خاں کے انتظار میں شاہ درگ میں اپنی فوجیں ٹھیرا دیں،
تو اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ بلبل خاں کہاں گیا ہوا تھا اور کس لیے جب ابراہیم اور دلاور خاں عین الملک کی
مدد کے لیے جا کر واپس آئے تو دلاور خاں نے بلبل خاں کو دوسری مرتبہ مالابار (کرناٹک) روانہ کیا کہ وہ
جا کر کئی سال کا وصول طلب خراج حاصل کرے، اور وہاں کے سرکش زمینداروں، راجاؤں کی اچھی طرح
سرکوبی کرے۔ تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال کا خراج وصول طلب تھا جو تقریباً "سی ویک لک و
پنجاہ ہزار ہون" تک بڑھ گیا تھا۔ یہ مالابار کی دوسری مہم تھی، پہلی مہم کا حال تو بالتفصیل دیا گیا اور
اس کی ناکامی کے وجوہ بھی بتا دئے گئے۔ بلبل خاں اسی وقت سے یہ چاہتا تھا کہ اسے موقع ملے تو وہاں کے
زمینداروں کی اور بالخصوص شنکر نائک کی تنبیہ کرے مگر دلاور خاں نے ایک عرصہ تک اس طرف توجہ
نہ کی تھی، کچھ تو اس وجہ سے کہ اسے دوسرے معاملات نے گھیر رکھا تھا، اور کچھ بلبل خاں کی حماقت کے
باعث وہ بگڑا ہوا تھا، لیکن جب احمد نگر سے فوجیں واپس ہوئیں اور اس کا کوئی خاص نتیجہ بھی برآمد نہ ہوا تو
اس نے بلبل خاں کو مالابار کی طرف روانہ کر دیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اتنا جلد پھر احمد نگر پر حملہ کرنے کی
ضرورت ہوگی اور فوجوں کی موجودگی لاحق ہوگی، لیکن زمانے نے ایسا جلد پلٹا کھایا کہ بلبل خاں کے مالابار
جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد احمد نگر کے حالات بگڑ گئے اور حملہ کا موقع ملا۔ چونکہ دلاور خاں کو جلدی تھی
اس لیے وہ بلبل خاں کے آنے کا انتظار کئے بغیر فوجوں سمیت شاہ درگ آ گیا، اور صبا رفتار قاصدوں کو
مالابار روانہ کیا کہ وہاں کے حالات جس رنگ پر ہوں انھیں ویسا ہی چھوڑ کر بلبل خاں اپنی ساری فوجوں
کے ساتھ شاہ درگ آ جائے۔ بلبل خاں کو دلاور خاں کا حکم تو ملا مگر وہاں کی صورت حال ایسی تھی کہ چھوڑ کر
نہیں آ سکتا تھا، اس لیے اس نے آنے میں تاخیر کی، ادھر دلاور خاں نے بلبل خاں کے انتظار میں ایک مہینہ
گذار دیا اور شاہ درگ ہی میں پڑا رہا، مگر جب دیکھا کہ دیر کرنے سے جمال خاں کی قوت بہت بڑھ جاتی
ہے تو توقف کو مناسب نہ جان کر احمد نگر کی طرف کوچ کر دیا۔ جمال خاں کو بھی ان حالات سے آگاہی تھی،
بیجاپور کی فوج حملہ پر آتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ دلاور خاں کے مقابلہ کو
نکلا۔ قصبۂ آشٹی پر دونوں افواج نے پڑاؤ کیا، چونکہ موسم بارش کا تھا اس لیے باقاعدہ جنگ شروع نہ ہوئی

لہ تاریخ فرشتہ

البتہ کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی، جب بیس روز یونہی گذر گئے تو جمال خاں نے کوشش کی کہ صلح ہو جائے، اور اکثر سفیر اور ذی اثر لوگوں کے ذریعہ گفت وشنید شروع کی کیونکہ ابھی وہ کمزور تھا اس لیے لڑنا نہیں چاہتا تھا ادھر دلاور خاں بھی بلبل خاں کے نہ آنے سے فوجوں کی کمی محسوس کر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ جمال خاں آمادۂ صلح ہے تو ان شرائط پر صلح کر لی کہ جنگ کا ہرجانہ ادا کیا جائے اور ابراہیم کی بہن خدیجہ کو مع جہیز کے واپس کر دیا جائے (جو میراں حسین مقتول کی بیوی تھی)، جمال خاں نے دونوں شرائط کی تکمیل کی "ہفتاد و پنجہزار ہون[1] نعل بہا (یا ہرجانہ جنگ) ادا کئے، جب ان شرائط کی تکمیل ہو گئی تو بیجاپوری افواج واپسی کی تیاریوں میں تھیں کہ بلبل خاں اپنی فوج لیکر بڑی شان وشوکت سے ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

بلبل خاں اور دلاور خاں کی مخالفت۔ اول الذکر کا مقید اور محروم البصارت ہونا

جب بلبل خاں واپس آیا تو دلاور خاں اس سے بہت کبیدہ خاطر ہو چکا تھا کیونکہ اس نے حکم کی تعمیل میں تساہل کیا تھا، اگرچہ بلبل خاں کی یہ مہم کامیاب رہی تھی لیکن دلاور خاں نے اس پر شاہی فرمان کی خلاف ورزی کا الزام لگایا اور بادشاہ کو بددل کرنے کے لیے جو کچھ نقد وجنس وہ مالابار سے بطور خراج کے وصول کر لایا تھا، اس کی گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی اور کہا کہ پوری رقم وصول نہیں ہوئی ہے لہٰذا بقیہ رقم کی تکمیل کی جائے، اس طریقہ سے یہ ثابت کرنا منظور تھا کہ نافرمانی اور تاخیر کے باوجود خاطر خواہ رقم وصول کر کے نہیں لایا۔ جب دربار میں دلاور خاں نے اس پر یہ الزامات دھرے تو بلبل خاں نے بیباکی سے جوابات دئے (کیونکہ جانتا تھا کہ بادشاہ اندرونی طور پر اس سے راضی ہے) اس نے حقیقت میں کوئی نافرمانی نہیں کی تھی، جس وقت شاہی فرامین پہنچے وہ تقریباً پوری مہم کو کامیاب بنا چکا تھا اب زمیندار اور راجہ مطیع ہو چکے تھے، اور اب صرف روپیہ ہی وصول کرنا تھا، اگر ایسی حالت میں وہ نکل آتا تو ساری کی کرائی محنت اکارت جاتی اور اس دوسری فوج کشی کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلتا۔ پھر جب کبھی ادھر توجہ کی جاتی تو اتنی ہی کارروائی از سر نو کرنی پڑتی، اس لیے اس نے پندرہ دن کی دیری کو کچھ مضائقہ نہ جانکر رقم وصول کرنے میں مصروف رہا، اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھا، اگر وہ ان زمینداروں پر یہ ظاہر کر دیتا کہ اسے واپسی کے احکام آ گئے ہیں تو ایک حبہ بھی وصول نہ ہوتا، فوج کی واپسی کو وہ لوگ مشکل کر دیتے اور شر و فساد پر اتر آتے، بغرض

[1] تاریخ فرشتہ۔

اس نے بڑی خوبی سے دلاور خاں کے الزامات کا جواب دیا اور اپنے آپ کو ہر طرح جرم سے بری ثابت کیا الٹا اس نے دلاور خاں پر الزام لگایا کہ اس کی اپنی جلد بازی نے بے وجہ معاملات کو خراب کر دیا ورنہ وہ اگر اور پندرہ روز شاہ درگ میں اس کا انتظار کر لیتا تو مالا بار کی فوجیں اس سے آملتیں اور اس احمد نگری حملہ کو ایک کامیاب حملہ بنا سکتے، بغیر فوج کے محض مٹھی بھر آدمیوں کے برتے پر اس نے بادشاہ کو اتنی تکلیف دی جس کا کوئی بہتر نتیجہ بھی نہ نکلا۔

غرض بلبل خاں کے استدلال کے سامنے دلاور خاں کی کچھ پیش نہ گئی اس لیے اس نے اپنی ناراضگی ظاہر نہ کی الٹے بادشاہ سے سفارش کر کے بلبل خاں کو ایک خلعت فاخرہ سے سرفراز کر دایا اور خود بھی بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا اور خانگی طور پر اس سے کہا کہ اس کی اپنی یہ نیتی محض مصلحت پر مبنی تھی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لوگ یہی کہتے کہ اپنا "آغوشی فرزند" ہونے کی وجہ سے رعایت کی۔ دلاور خاں کی ان چکنی چپڑی باتوں نے بلبل خاں کو غافل کر دیا، اس نے اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر نہ کی بالآخر دلاور خاں نے موقع پا کر اسے قید کر لیا اور بعد کو اپنے حکم سے اس کی آنکھیں بھی نکلوا دیں، حالانکہ دلاور خاں پر اس حبشی غلام کے بہت سے احسانات تھے، اس کی وجہ سے دلاور خاں نے اخلاص خاں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی تھی اور اس کو اپنا "آغوشی فرزند" بنا لیا تھا۔ بہر حال دلاور خاں سیاسیات کے میدان میں مروت و محبت کے اصول و آئین کا لحاظ نہیں رکھتا تھا۔

برہان کی مدد کے لیے احمد نگر پر حملہ۔

احمد نگر پر جو گذشتہ حملہ ہوا تھا وہ میران حسین کے مارے جانیکے بعد ہوا تھا، اس حملہ کا جو کچھ حشر ہوا اور جس طرح مالا بار کی مہم کی الجھن نے اسے پورا کامیاب نہ بنایا اسکی تفصیل دیدی گئی، اور اس کے علاوہ بلبل خاں کو جو اندھا کیا گیا اس کا بھی ذکر ہو چکا اب ۹۹۸ھ م ۱۵۸۹ء میں پھر ایک ایسا موقع پیش آیا کہ بیجاپور نے احمد نگر کے معاملات میں دخل اندازی مناسب سمجھی، اور بتایا گیا ہے کہ جمال خاں مہدوی، اسمٰعیل کو بادشاہ تسلیم کر کے احمد نگر میں حکومت کر رہا تھا، اسمٰعیل برہان کا بیٹا تھا اور برہان اس وقت اکبر کے دربار میں پناہ گزیں تھا، وہ اپنے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر سے فرار ہو کر بیجاپور آیا تھا، علی عادل شاہ کا زمانہ تھا، یہاں چند روز قیام کر کے وہ آگرہ چلا گیا اور

اکبر کے سلسلہ ملازمت میں داخل ہوگیا، اکبر نے اسے ایک جاگیر دے دی تھی اور مدد کا بھی وعدہ کیا تھا مگر اب تک اس کو کوئی ایسا موقع نہیں ملا، مرتضی نظام شاہ کے مرنے کے بعد احمد نگر میں جو طوائف الملوکی جاری رہی، اس سے برہان کے کچھ حوصلے بڑھ گئے، اور وہ اپنی موروثی سلطنت کے حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا جب اسے معلوم ہوا کہ جمال خاں مہدوی اسی کے بیٹے اسمٰعیل کو بادشاہ تسلیم کرکے حکومت کر رہا ہے تو اس نے ارادہ کر لیا کہ دکن آکر کچھ قسمت آزمائی کرے، اکبر نے مدد دینی چاہی مگر برہان نے مدد لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اگر وہ اکبر سے مدد لیگا تو پورا دکن اس کا مخالف ہو جائے گا، اور اس وقت تخت حاصل کرنے کی جو کچھ امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی لیکن اکبر کے حکم سے راجہ علی خاں نے مدد کا وعدہ کیا، برہان کی پہلی کوشش ناکام رہی، اس کے بعد راجہ علی خاں کی رائے[1] سے اس نے بیجاپور سے مدد طلب کی اور ایک خط محمد قاسم فرشتہ کو لکھا (جو کچھ دنوں سے بیجاپور آگیا تھا اور ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں داخل ہوگیا تھا) محمد قاسم فرشتہ نے یہ خط دلاور خاں کے روبرو پیش کیا، دلاور خاں نے بھی مدد دینے کا عزم کیا[2] اس سے دلاور خاں کے دو تین مقاصد تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ ایک بڑی سلطنت میں دخل اندازی کرکے کچھ فائدہ اٹھائے، مثلاً کچھ علاقے ملجائیں یا کچھ قلعے حاصل ہو جائیں اس کے علاوہ اگر کوشش کامیاب رہی تو برہان نظام شاہ بادشاہ ہونے کے بعد اس کا ممنون احسان ہو جائے گا ایک ریاست اور ایک بادشاہ کو مفت میں ممنون بنالینا کوئی بری بات نہ تھی نیز اس کا مقصد کچھ ذاتی استحکام بھی تھا۔ یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ جنگ اور حملہ کے وقت حاکم اعلیٰ کے اختیارات میں غیر معمولی وسعت ہو جاتی ہے خواہ وہ حاکم اعلیٰ بادشاہ ہو یا وزیر سلطنت یا کوئی اور عہدہ دار فوج براہ راست ماتحت اور تیار رہتی ہے، قانون اور آئین ایک حد تک معطل ہو جاتے ہیں اور صرف قانون جنگ پر عمل ہوتا ہے۔ غرض جنگ حکومت کرنیوالے کے لیے توسیع اختیارات کا باعث ہوتی ہے، دلاور خاں تو اپنے اختیارات اور قوت کو بڑھانے پر تلا ہوا تھا، اگر جنگ ہو تو وہ سپہ سالار رہے گا، بادشاہ اسکے

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] " "

تحت رہ سکتا ہے، اور دیگر ایسے انتظامات کئے جا سکتے ہیں جو معمولی حالات میں ممکن نہیں، پھر مزید یہ کہ اگر کامیابی ہوئی تو قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے، اور ملک پر اس کی عظمت و جلال کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

دلاور خاں نے ابراہیم سے بھی رسمی طور پر اس حملہ کی اجازت لے لی، اور فوجوں کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا، دو تین روز کے بعد ۹۹۸ھ م ۱۵۸۹ء میں دلاور خاں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب احمد نگر کی سرحد کا رُخ کیا۔ ادھر برہان راجہ علی خاں والی خاندیس کی مدد حاصل کرکے اُمرائے برار کی تالیف قلوب میں مصروف تھا اور عنقریب حملہ کرنا چاہتا تھا، تدبیر یہ تھی کہ دونوں طرف سے حملہ کرکے جمال خاں کو پیس دیا جائے۔ غرض بیجاپوری فوج نے شاہ درگ کا رُخ کیا، جمال خاں کو جب یہ معلوم اس نے ارادہ کیا کہ برہان اور راجہ علی خاں کے روکنے کے لیے برار کی طرف توجہ کرے اور برہان نے دلاور خاں کو یہ کہلا بھیجا کہ اگر بیجاپوری افواج شاہ درگ سے اور آگے بڑھ آئیں تو جمال خاں پہلے برار کی طرف رُخ کرنے کی ہمت نہ کرے گا، اس سے مزید فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اُمرائے برار جو جمال خاں کی قربت کی وجہ سے خائف ہیں، اور حلیفوں کا ساتھ دینے میں تساہل کر رہے ہیں اس وقت ملجائیں گے، جب جمال خاں بیجاپوری افواج کے مقابلہ کو آگے نکل جائے گا اس پر دلاور خاں شاہ درگ سے فوجیں بڑھا کر دھاریوں کی طرف لے چلا۔

جس وقت شاہی فوج شاہ درگ میں تھی بادشاہ کو یہ مقام اور یہاں کی آب و ہوا بہت پسند آئی اس لیے یہاں کچھ قیام کیا، اسی قیام کے عرصہ میں دلاور خاں نے ایک سیاسی اور شاطرانہ چال چلی جس سے اس کا مقصد اپنا ذاتی استحکام تھا، پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ اس حملہ سے منجملہ اور مقاصد کے دلاور خاں کا ایک یہ بھی مقصد تھا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے، اس کی تصدیق حسب ذیل واقعہ سے ہوتی ہے، اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خارجی معاملات میں اُلجھا ہوا تھا اندرونی طور پر وہ اپنے ذاتی استحکام کی تدبیر سے بے خبر نہ تھا، بلکہ خود ان واقعات کو اپنے استحکام کا ممد و معاون بنانا چاہتا تھا۔

جب بادشاہ اور دلاور خاں اپنی فوجوں سمیت بغرض جنگ شاہ درگ روانہ ہوئے ہیں تو

بیجاپور کی حکومت قدرتاً رومی خاں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو بیجاپور کا قلعہ دار تھا (اس کا ابراہیم سے کچھ دودھ کا رشتہ تھا) دلاور خاں کو یہ منظور نہ تھا کہ رومی خاں بیجاپور کا قلعہ دار رہے، کیونکہ وہ اس کا ہوا خواہ نہ تھا، اس کی مرضی تھی کہ قلعہ پر قابو رکھنے کے لیے کوئی ایسا آدمی ہو جس پر اعتماد کر سکے، اس لیے وہ رومی خاں کو نکال کر اپنے کسی عزیز یا ہوا خواہ کو قلعہ دار بنانا چاہتا تھا، اور موقع کی تاک میں تھا چنانچہ جب بادشاہ مع فوج کے شاہ درگ آ گیا تو اس نے رومی خاں کو نکالنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ یکایک شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں نے سر اٹھایا اور دن رات چوریاں ہونے لگیں، شہریوں کی جان تک کی خیر نہ رہی اور ملک کے امن و امان میں خلل پڑ گیا، رومی خاں پریشان ہو گیا، اس نے ہزار انتظام کئے مگر قزاقوں کی دلیری بڑھتی ہی گئی اور شہر میں مار پیٹ، لوٹ کھسوٹ روزانہ کا ایک معمولی مظاہرہ بن گئی (دراصل یہ چوروں کی شرارتیں، رومی خاں کو ہٹانے اور بدنام کرنے کے لیے دلاور خاں کی جدت طرازی کا نتیجہ تھیں، اسی نے چند لٹیروں کو جمع کر کے سکھایا، پڑھایا تھا جس کی وجہ سے شہر میں یہ بلڑ ہو گئی)۔

جب یہ لوٹ اور غارتگری ملک میں عام ہو گئی تو چاروں طرف سے بادشاہ کے حضور میں عرضیاں گذرائی گئیں اور بے شمار شکایتیں ملک کے انتظام کے متعلق بظاہر دلاور خاں تک بھی پہنچیں، دلاور خاں نے جب صورت حال کو دیکھا تو نہایت معصومانہ انداز میں بادشاہ سے اس امر کی اجازت چاہی کہ رومی خاں کو ہٹا کر اس کی جگہ کسی دوسرے قابل تر اور بہتر آدمی کو متعین کر دے تاکہ وہ چوری اور ڈکیتی کا انسداد کر سکے اور ملک میں امن و امان پیدا ہو جائے، چونکہ رومی خاں سے بادشاہ کو اک خاص قسم کی وابستگی تھی اور دودھ کا رشتہ بھی تھا اور اسے چاہتا بھی تھا اس لیے بادشاہ نے دلاور خاں کی تدبیر کا ساتھ نہ دیا اور صاف کہہ دیا کہ رومی خاں ایک نہایت وفادار، نمک حلال اور جاں نثار آدمی ہے اس کو اس منصب سے علٰحدہ کرنا سراسر ظلم ہوگا، وراس کے علاوہ وہ کچھ نااہل بھی نہیں، مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ اس مرتبہ اس کے انتظام کے متعلق اتنی شکایات وصول ہوئیں وہ ہمارے خانہ زادوں میں سے ہے، ہم جب تک مہم پر رہیں اس کو اسی منصب پر بحال رکھیں گے، البتہ اسے یہاں سے تاکید کر دی جائے کہ وہ ملک کے انتظام سے بے خبر نہ رہے اور ان دلیر اور جیوٹ ڈاکوؤں کا اچھی طرح انتظام کر دے۔ بادشاہ کے اس جواب سے

دلاور خاں کی آرزوؤں پر اوس سی پڑ گئی اور اس کی تمام شاطرانہ چالیں صرف "ایک نہیں" سے رد ہو گئیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابراہیم اب سن شعور کو پہنچ چکا تھا اور اچھے بُرے کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ دلاور خاں بہت حوصلہ مند ہے اور خود اُس کو ایک عضو معطل بنا کر آپ حکومت کرنا چاہتا ہے، وہ دل میں سمجھا ہوا تھا کہ حکومت اور سلطنت اس کی اپنی آبائی ہے نہ کہ دلاور خاں اور اس کے آباو اجداد کی، اس لیے شاہانہ ہمت روز بروز اس میں پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ تاریخوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابراہیم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ اس نے ریجنٹ کی صلاح کو ایک طرف رکھ کر اپنے احکام نافذ کئے اور دلاور خاں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے حکم پر عمل کرے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اب عزم کر لیا تھا کہ یا تو حکومت دلاور خاں ہی کرے یا وہ خود، اسی بنا پر دلاور خاں کو اس نے انتظام میں کوئی دخل نہ دینے دیا، دلاور خاں بلا کا ہوشیار اور فریبی تھا، وہ کب یہ ظاہر کرتا کہ بادشاہ کے اس حکم سے اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا یا رومی خاں کو ہٹانے میں بجز انتظام مملکت کے اس کی کوئی خاص ذاتی دلچسپی تھی، بلکہ اس نے یہی ظاہر کیا کہ ایک ذمہ دار وزیر کی طرح اس نے صلاح دی تھی، اب بادشاہ کی مرضی کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔

جب یہ دار خالی گیا تو دلاور خاں پست ہمت اور کمزور نہیں ہو گیا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ دوسرے داؤں پیچ چلنے لگا کم از کم ان کے ذریعہ اپنے حریف کو مغلوب کر لے۔

دلاور خاں کی اک زمانے سے خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس کی والدہ سے علیحدہ کر دیا جائے کیونکہ یہ عورت بہت فریس اور دانا تھی، بادشاہ کو وقت بے وقت اپنے بہترین مشوروں سے مستفید کرتی تھی اور اس ڈھنگ پر نے چلنی تھی کہ وہ پوری طرح ریجنٹ کے قبضہ میں نہیں رہتا تھا اس کا خیال تھا کہ اس ہشیار عورت کی علیحدگی سے بادشاہ پر اس کا قابو بڑھ جائے گا اور وہ من مانے حکومت کر سکے گا، یہ وہ تدبیر تھی جو اس سے پہلے بھی اکثر متولیان سلطنت اختیار کر چکے تھے، چنانچہ کامل خاں نے چاند بی بی کی طاقت اور قوت کو رفتہ رفتہ کم کر کے اسے حکومت کے معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا، اور کشور خاں نے اسے قید کر کے "ستارہ" روانہ کر دیا تھا اس زمانے میں چاند بی بی تو تھی نہیں کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جا سکے اور دلاور خاں نے ابراہیم کی والدہ کو پھر ابراہیم سے الگ کرنے کی کوشش کی، اس کا مقصد یہی تھا کہ بادشاہ کو جس کی وجہ سے قوت حاصل ہے جس کی فراست کی

بدولت وہ اس کے واروں کو خالی دیتا ہے، اسی کو ہٹا دیا جائے۔ یہ فکر تو اس کو روز اول ہی سے تھی مگر
جب رومی خاں والا معاملہ پیش آیا تو دلاور خاں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو بادشاہ نے اپنی والدہ کی رائے
اور مشورہ پر ہی عمل کیا ورنہ یہ کمسن اور کم عمر لڑکا اتنی گہری چال کیا جانے۔ وہ کھلم کھلا شاہی خاندان کی
اتنی ذی وقار عورت کو قید بھی نہ کر سکتا تھا، اور کشور خاں سا بیوقوف بھی نہ تھا کہ اپنی بیباکانہ حرکت سے
ایسی بدنامی کا ٹیکہ اپنے سر لے کہ سر بازار لوگ گالیاں دیں اور صلواتیں سنائیں، اس کے نام پر لاحول بھیجیں
اور اس پر ابلیس کی طرح لعنت کریں، لہٰذا یہاں اس نے ایک زبردست چال چلی۔ یہ تو بتلا دیا گیا ہے کہ آب و ہوا
کے خوش آنے سے بادشاہ فوجوں سمیت اس وقت شاہ درگ میں ٹھیرا ہوا تھا، اب تھوڑے اور قیام کے بعد
صلاح تھی کہ غنیم کے مقابلے کے لیے آگے بڑھیں، بادشاہ کے ساتھ اس کی والدہ بھی موجود تھی، بادشاہ کو کمزور
کرنے کے لیے دلاور خاں اس کی والدہ کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا، اسی غرض سے اس نے اپنے زنانے کو بھی
بیجاپور سے بلوا لیا۔ جب کوچ کا وقت آیا والدہ ابراہیم سے درخواست کی کہ اب فوجیں غنیم کے لیے جا رہی ہیں
شکست و فتح نصیبوں سے ہوتی ہے، میدان جنگ کا اپنے ہاتھ رہنا محض خدا کی دین اور عنایت ہے ورنہ
کسے یقین کہ کون جیتے اور کون ہارے، کون جیئے اور کون مرے، مارنے مرنے کے لیے تو جاتے ہیں ایسی صورت میں
شاہی محل بھی ساتھ ہو تو پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں، اس کی حفاظت کے لیے وقت، فوج، روپیہ سب ہی
لگتا ہے، اور پھر وہ اطمینان قلب بھی حاصل نہیں رہتا جو حرم محترم کے شہر میں محفوظ رہنے سے ہوتا ہے، لہٰذا
مناسب یہی ہے کہ سرکار یہیں آرام فرمائیں اور ہم مردانہ وار میدان میں نکلکر دشمن کو مار بھگا آتے ہیں،
والدہ ابراہیم کو یوں بھی اپنے بادشاہ بیٹے سے بڑی محبت تھی، اس سے قطع نظر وہ متولیان ریاست کے
رنگ ڈھنگ دیکھ چکی تھی، اور پھر دلاور خاں کے گرگٹ والے رنگوں سے تو خوب واقف تھی، بھلا وہ
اس قصاب کو کیوں پتیانے چلی، نہایت مستعدی سے کہا کہ جب میرا لڑکا میدان جنگ میں جا رہا ہے،
جب اس کی لاکھوں کی جان خطرے میں ہے تو مجھ بڑھیا کی زندگی اور موت کیا اہمیت رکھتی ہے،
میں ہر حال میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی اور جو کچھ اس پر پڑے گی میں سہونگی۔ دلاور خاں اپنا سا منہ
لیکر رہ گیا، سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ شاہی مستعدی کی تعریف کرے اور حکم بجا لائے غرض دل ہی دل میں

کرلہ کراس پر راضی ہوگیا اور مجبوراً اپنے زنانے کو یہیں چھوڑ کر کوچ کی تیاریاں کرنے لگا۔

احمدنگری افواج سے مقابلہ[1] پہلے فتح اور اسکے بعد شکست

جب جمال خاں کو اطلاع ہوئی کہ برہان دکن میں آگیا ہے اور راجہ علی خاں اس کی مدد کے لیے تیار ہے، اُمرائے برار جن میں اکثر شیعہ اور غیر ملکی ہیں، دکھنی سرگروہ پر دانت پیس رہے ہیں، اور جوق جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں، اور دلاور خاں بھی برہان کی حمایت پر فوجیں لیکر شاہ درگ آگیا ہے تو وہ پریشان ہوا کہ چاروں طرف سے نرغے میں گھر گیا ہے مگر چونکہ نہایت بہادر اور دلیر تھا اس لیے ہمت نہ ہاری بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے اور جان دینے کے لیے تیار ہوگیا (حقیقت یہ ہے کہ جس بہادری سے لڑ کر اس نے جان دی ہے اور آخر وقت تک کوشش کئے گیا ہے اس پر بے اختیارانہ زبان سے تعریف کے جملے نکل جاتے ہیں مختصر یہ کہ اس نے افغانی بہادری کے جوہر دکھا دئیے، اس سے بحث نہیں کہ وہ کس قدر حق بجانب تھا مگر جو کچھ بھی اس نے اپنا مقصد اور نصب العین بنا لیا تھا خواہ وہ غلط ہو کہ صحیح اس کی حمایت میں اس نے ذرا بھی کوتاہی نہیں کی اور مقدور بھر کوشش کرتا رہا حقیقی عظمت دراصل اسی کا نام ہے کہ انسان اپنا جو نصب العین بنالے اس پر آخر وقت تک کاربند رہے، خواہ اس میں کامیابی ہو کہ ناکامی) اور اپنی فوجوں کو آراستہ کرکے احمدنگر سے نکلا، اس وقت بیجاپوری لشکر اس سے بہت قریب تھا، اور اسی کے حملہ سے وہ ذرا خوفزدہ بھی تھا۔ لہٰذا پہلے اس نے اسی طرف توجہ کی، جب دونوں لشکر بالکل قریب ہو گئے تو موزوں اور مناسب موقعوں کو منتخب کرکے پڑاو کیا، اور لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں، دلاور خاں کی طرح جمال خاں اپنے ساتھ جنگ میں اپنے بادشاہ اسمٰعیل کو لایا تھا، چند روز تک تو یہ فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور آئے دن کچھ نہ کچھ جھڑپ ہو جاتی تھی مگر ابھی تک جنگ باقاعدہ طور پر شروع نہ ہوئی تھی، غالباً کچھ موسم ناموافق تھا، یا یہ کہ ایک فریق دوسرے فریق کی حرکتوں کا بغور مطالعہ کر رہا تھا کہ جہاں ذراسی غفلت ہو قابو پالے، آخر کار باقاعدہ طور پر جنگ شروع ہوگئی، خوب کشت و خون ہوا، ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہ ہونے

[1] یہ تفصیل بساتین اور تحفۃ الملوک سے لی گئی ہے۔

پایا کہ رات ہوگئی، رات بھی اندھیری گھپ، لہذا دونوں فوجوں نے مناسب سمجھا کہ رات کی رات جنگ موقوف کرکے کل صبحدم طبل جنگ بجا کر میدان میں کود پڑیں، دوسرے دن صبح صبح میدان کارزار گرم ہوا، دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں، جمال خاں نے اس جنگ میں اپنی دانائی اور خصوصیات کا زبردست اظہار کیا۔ ایک پختہ کار اور آزمودہ کار جرنیل کی طرح اس نے اس بیوقوفی کو اپنے نزدیک نہ آنے دیا کہ ایک ہی مرتبہ اپنی پوری فوج کو میدان میں اُلجھا دیا جائے، اور اگر اتفاق سے میدان ہاتھ سے جاتا رہے تو سوائے سر پر پاؤں رکھکر بھاگنے کے چارہ ہی نہ رہے۔ وہ ایک بہترین سپاہ کے دستے کے ساتھ اپنی اصلی فوج سے علیحدہ ہوگیا اور بادشاہ کو لیکر ایک موقع کی جگہ تلاش کرلی اور اسی میں چھپکر بیٹھ رہا، ادھر جنگ شروع ہوئی، دلاور خاں نے اپنی پوری فوج کو بیک وقت میدان میں مشغول کردیا، اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عادل شاہی افواج کامیاب و منصور میدان سے واپس ہوئیں، جب غنیم پر ان کو غلبہ حاصل ہوا اور نظام شاہی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ گئے تو یہ اپنی ساری جنگی تنظیم و ترتیب کو بالائے طاق رکھکر نہایت ناعاقبت اندیشانہ طور پر شکست خوردہ فوج پر لوٹ پڑی، نظام شاہی فوج تاب مقاومت نہ لاکر میدان سے بھاگ نکلی، اور اس کے ساتھ ہی عادل شاہی فوج لوٹ مار کی فکر میں چاروں طرف پھیل گئی، مال غنیمت کی تلاش روپیہ اور دولت کے لالچ میں فوج کا بیشتر حصہ دور دور تک نکل گیا، یہ فتحیاب فوج اس بدنظمی کے ساتھ تتر بتر ہوئی کہ شکست خوردہ فوج بھی نہ ہوئی ہوگی۔ نیز عادل شاہی فوج کا ایک بہترین دستہ جو نہایت بہادر، دلیر اور آزمودہ کار (۸۰۰) ہندوؤں پر مشتمل تھا جنکی بدولت فتح حاصل ہوئی تھی، اسی مال غنیمت کی دھُن میں میدان سے نکل کھڑا ہوا۔ جمال خاں ان سب حالات کا اپنی کمین گاہ سے مطالعہ کر رہا تھا، اور موقع کا طالب تھا جب میدان بالکل صاف نظر آیا اور دلاور خاں کے پاس معدودے چند سپاہی رہ گئے تو یہ اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ عین الملک اور آنکس خاں سے اس کا مقابلہ ہوگیا عین الملک اور آنکس خاں ابتداہی سے دلاور خاں سے ناراض تھے (اس لیے کہ جب دلاور خاں کی طاقت میں بیحد اضافہ ہوگیا اور ہر طرح وہ ریاست پر چھا گیا تو اس کے دشمن بنگئے) اس وقت شاہی فرمان کی تعمیل اور محض رسمی طور پر یہ اپنی فوجیں لیکر میدان میں

آئے تو تھے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو اپنے کو علٰحدہ ہی رکھا اور ایک طرف کو ہٹ گئے، لڑائی میں قطعاً حصہ
نہ لیا، بھلا ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جانفشانی سے لڑیں، خون بہائیں اور نام دلاور خاں کا ہو جو
ان کا رقیب، دشمن اور حریف تھا، ممکن ہے کہ انھی آپس کے جھگڑوں کی بنا پر دلاور خاں کو شکست
دلانے کے لیے انھوں نے جنگ میں حصہ نہ لیا ہو، مگر جب بادشاہ کی اقبالمندی سے بیجاپوری افواج کو
فتح حاصل ہوئی تو یہ ابراہیم کو اس کی اپنی کامیابی پر مبارکباد دینے کے لیے اپنے اپنے مقام سے نکلکر خراماں
خراماں چلے جارہے تھے کہ اتفاقاً ایک بلائے ناگہانی کی طرح جمال خاں سے مڈبھیڑ ہوگئی، دونوں فوجوں کی
حالت میں بڑا فرق تھا، ایک تو اپنی ہزیمت سے غضبناک اور انتقامی جوش میں چور دشمن کو تباہ و برباد
کرنے اور اپنی جان تک دینے کے لیے کمین گاہ سے نکلی تھی اور دوسری محض شادمانی اور کامیابی سے مسرور،
خنداں و فرحاں، جشن منانے کے لیے لاپرواہی سے انجان آگے بڑھ رہی تھی، لہذا اس مڈبھیڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ
عین الملک اور آنکس خاں جمال خاں کے حملے کی تاب نہ لاسکے اور دیوانہ وار جس طرف منھ اٹھا بھاگ نکلے،
جمال خاں کو اس کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی، اس کی کھوئی ہوئی دولت ہاتھ آگئی اور اجڑی ہوئی امیدیں
تازہ ہوگئیں، شاہی فوج کا یہ حصہ بڑی بدحواسی سے اپنی جانیں مٹھی میں لیکر بھاگا تھا، اس سراسیمگی میں
سازوسامان کی کس کو فکر تھی، جمال خانیوں نے اس خداداد مال غنیمت سے خوب فائدہ اٹھایا، تقریباً
پچاس ساٹھ ہاتھی اور کئی گھوڑے نظام شاہیوں کے حصے میں آئے، ان کی ہمت بندھ گئی اور حوصلے
بڑھ گئے، گو جمال خاں کو اس لڑائی میں کامیابی ہوئی مگر یہ معرکہ کچھ اس کی فوج کی بہادری سے سر نہیں ہوا تھا بلکہ
کہنا چاہیئے کہ محض اتفاقی تھا اور قسمت نے ساتھ دیا، البتہ حیلۂ جنگ کو اس میں بہت دخل ہے۔ دلاور خاں کو
جب اس اچانک حادثہ کی خبر لگی تو اس نے اپنی آس پاس نظر دوڑائی، دیکھا تو یہ دیکھا کہ جمال خاں ایک
سیلاب کی طرح امڈا چلا آرہا ہے اور یہاں بے سروسامانی کا یہ عالم کہ مدافعت تک ممکن نہیں، ساری فوج
دور دور بکھری ہوئی تھی، اب اسکو مجتمع کرنا اور منظم کرنا کچھ کھیل نہ تھا، جو کچھ باقی ہے وہ جمال خاں کی گرد کو
نہیں پہنچتی، ایسی حالت میں لڑنا عین حماقت تھی اور زبردستی دشمن کے ہاتھ میں پھنسنا تھا، دلاور خاں
اگر لڑتا تو شکست یقینی کھاتا اور خود یا تو مارا جاتا یا قید ہوجاتا، نیز بہت ممکن تھا کہ بادشاہ پر بھی کوئی

آفت آجاتی۔ اس وقت اس نے بہت حاضر دماغی سے کام لیا، فوراً باقیماندہ سپاہیوں کو لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام حال کہہ سنایا، اور صلاح دی کہ اب یہاں ٹھیرنا غلطی ہے جتنا جلد ممکن ہو کوچ کرنا چاہیئے، بادشاہ بھی راضی ہوگیا۔ دلاور خاں انتہائی سرعت اور تیزی کے ساتھ ابراہیم کو لیکر میدان جنگ سے گھوڑے اڑاتا ہوا نکل گیا، تھوڑی دور تک تو نظام شاہیوں نے پیچھا کیا مگر اسکے بعد ہمت نہ بڑی اور بے سود سمجھ کر تعاقب چھوڑ دیا۔ تمام رات اس تاریکی میں کہ منہ کو منہ دکھائی نہ دیتا تھا شاہی فوج پہاڑی علاقوں میں فرار ہونے میں مصروف تھی" ہژدہ فرسخ طے کرنے کے بعد دوسرے دن بارہ بجے شاہ درگ پہنچے اور بادشاہ کو آرام کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ زیادہ سامان دشمن کے ہاتھ نہ لگا تھا، مگر اس کوہستانی علاقے میں راتوں رات بھاگنے سے اور راستے کی ناہمواریوں سے مال واسباب کو خاصہ نقصان پہنچا، اس طریقہ سے یہ جنگ ختم ہوئی، اور فی الحال جمال خاں ہی کامیاب رہا۔ دلاور خاں کی یہ شکست دراصل اتفاقی تھی، اس سے دلاور خاں کی بہادری اور جرنیلانہ خصوصیات پر کچھ اثر نہیں پڑتا جمال خاں کی تدبیر درحقیقت نہایت غیر متوقع تھی اور ایسے اتفاقی واقعات سے بعض وقت بہتر سے بہتر جرنیل بھی مغلوب ہوجاتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ دلاور خاں کو ذرا ہشیاری اور دانائی سے کام لینا چاہیئے تھا، اور دشمن کو حقیر جاننا ایک اچھے جرنیل کے خصوصیات سے بعید ہے، اس نے یقیناً بہت بے پروائی کی جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، بالخصوص ان حالات کے مدنظر جو اس سے پہلے یا ابھی ابھی احمد نگر کی ریاست میں رونما ہوچکے تھے۔ اس جنگ کی تفصیلات فرشتہ بالکل دوسرے طریقہ سے دیتا ہے اور اکثر جگہ ان دونوں بیانات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ اختلاف اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی اس لیے فرشتہ کی تفصیلات کو من وعن درج کیا جاتا ہے۔

احمد نگری افواج سے مقابلہ شاہ درگ میں دلاور خاں نے اپنے ذاتی استحکام کے لیے جو تدبیریں کیں ان کے ناکام رہنے کے بعد وہ دھاراسیوں روانہ ہوا کیونکہ برہان کی جانب سے اس امر کی خواہش کی گئی تھی کہ برار کے اُمرا جو جمال خاں سے خائف ہیں، اس کے دوسری طرف متوجہ ہوجانے سے برہان سے ملجائیں گے جمال خاں نے بھی یہ دیکھا کہ بیجاپوری افواج یہاں تک بڑھ آئی ہیں تو وہ برار کا قصد ترک کر کے

ان کے مقابلے کو نکلا، پہلے اس نے سید امیر الملک مہدوی کو جو سرلشکر برار تھا لکھا کہ وہ برہان اور راجہ علی خاں کے حملوں کو روکے اور ممکن ہو تو برار کے اُمراء کو کسی صورت سے بھی ان حملہ آوروں سے ملحق نہ ہونے دے،' اور ادھر خود دلاور خاں کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ جمال خاں کا خیال تھا کہ کسی طرح ابراہیم اور دلاور خاں سے صلح کرلے جیسا کہ اس نے پہلے کی تھی' اور جب یہ خطرہ ٹل جائے تو پھر برہان اور راجہ علی خاں کا ایک ہی حملہ میں کام تمام کردے جمال خاں کو سب سے بڑا خوف بیجاپور کی جانب سے تھا، اس پر جب وہ دونوں طرف سے گھر گیا تو بہت پریشان ہوا، وہ کسی طرح بیجاپور کی بلا ٹالنا چاہتا تھا، مگر جمال خاں کے خلاف خود اس کی قسمت تھی، چنانچہ اس نے دھاراسیون پہنچتے ہی سب سے پہلے صلح کی گفت وشنید شروع کردی،' اپنے سفیروں کو روانہ کیا، چاپلوسی کی،' اور بہت کچھ دینے دلانے کا وعدہ بھی کیا، لیکن دلاور خاں نے ایک نہ سُنی یہ پہلی دفعہ جب اس نے جمال خاں کے مقابلہ میں منُھ موڑا تھا تو اسے بہت گراں گذرا تھا، اور بلبل خاں کی سُستی پر اپنی ناکامی کو محمول کرکے اس غریب کی آنکھیں نکلوادی تھیں، اب اس کو ہرگز ہرگز صلح منظور نہ تھی۔ جمال خاں کی موجودگی سے اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا تھا، البتہ برہان اگر تخت نشین ہو جائے تو احمد نگر کی ریاست اس کی ممنون ہو جاتی، اسی بنا پر اس نے صلح سے قطعاً انکار کیا! ادھر دلاور خاں کو یہ دھوکہ ہوا کہ اس کا حریف اور مدمقابل کمزور ہو گیا ہے اور لڑنے کی ہمت نہیں رکھتا! اسی اثنا میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ جس سے دلاور خاں مزید دھوکہ میں پڑ گیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ نظام شاہی فوج کا ایک حبشی سردار آہنگ خاں' جمال خاں کی کسی بات پر ناراض ہو کر دلاور خاں کے لشکر سے آملا جس سے جمال خاں کی قوت کو کاری ضرب لگی۔ جب جمال خاں نے دیکھا کہ صلح کی کوشش میں وقت گذرتا جارہا ہے اور فوج اس سے بددل ہو کر ساتھ چھوڑ رہی ہے تو اس نے لڑائی کا عزم مصمم کرلیا، اور راہ کی جگہ چھوڑ ایک بہتر مضبوط اور اونچے مقام پر کیمپ ڈال دیا تاکہ دشمن پر قابو رہ سکے۔ دلاور خاں کے جاسوس اور خوشامدیوں نے جمال خاں کی اس حرکت کو یوں سمجھایا کہ وہ میدان سے فرار ہونا چاہتا ہے،' اور ناگ دوں کے جنگل کی راہ اختیار کرنے کی فکر میں ہے! ان خبروں سے دلاور خاں کو جمال خاں کی کمزوری کا یقین واثق ہو گیا۔ لہٰذا فوراً تیس ہزار کی فوج کے ساتھ بلا سوچے سمجھے اور

ابراہیم سے بغیر اجازت لیے وہ روانہ ہو گیا تاکہ دو چار ہاتھ مار کر جمال خاں کو گرفتار کر لے۔ یہاں اس نے بڑی بیوقوفی کی، جب وہ دشمن کے لشکر سے دو تین کروہ کے فاصلہ پر آ گیا تو اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ یہ سامنے والی فوج جمال خاں کی ہے یا ابراہیم کی جس سے کچھ عرصہ پہلے وہ جدا ہو چکا تھا! اتنے میں جاسوسوں نے یہ تحقیقی خبر پہنچائی کہ جمال خاں مقابلہ کے لیے تیار اپنی فوجیں لیے ہوئے پڑا ہے۔ یہ سنتے ہی دلاور خاں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اس کو خیال نہ تھا کہ جمال خاں لڑنے کے لیے تیار ہو گا۔ دلاور خاں کی فوج بے ترتیب ہو گئی تھی، سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ راستہ کے نشیب و فراز اور وادیوں اور گھاٹیوں کی ناہمواریوں نے اس کے لشکر کو پریشان کر دیا تھا، صورت حال ایسی نہ تھی کہ دلاور خاں، جمال خاں سے لڑتا، لیکن اب واپس ہونا بھی باعث ننگ تھا، اس سے اس کی بزدلی اور نامردی ظاہر ہوتی، وہ عجیب کشمکش میں تھا کہ اسی اثنا میں بادشاہ کی طرف سے کچھ سواروں نے آ کر کہا کہ ابراہیم کی مرضی آج جنگ موقوف رکھنے کی ہے کیونکہ سپاہ بہت بدنظم ہو گئی ہو گی، اور ایسے میں لڑنا ہزیمت اٹھانا ہے، مگر دلاور خاں نے یہ لکھکر بھیجا کہ فدوی جمال خاں کو ابھی ہتکڑی اور بیڑی پہنا کر حاضر خدمت کرتا ہے اور دو ایک حملوں میں دشمن کو تباہ و تاراج کر دیتا ہے۔ غرض دلاور خاں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، پانچ چھ ہزار امرائے برگی کو اپنی فوج سے علٰحدہ کر کے اس کام پر مامور کیا کہ عقب سے دشمن کو تنگ کریں اور کسی کو راہ فرار اختیار کرنے نہ دیں، اور خود ۵ جمادی الاول کو میدان کارزار میں جم گیا، عالم خاں، آنکس خاں اور عین الملک یوں تو پہلے ہی سے دلاور خاں کے مخالف تھے، اب یہ دیکھ کر کہ شاہی احکام کے خلاف یہ آمادۂ جنگ ہے[1] شکست کی صورت بنا کر میدان سے الگ ہو گئے اور سیدھے داراسنگ کی راہ لی کہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو جائیں۔ اس طرح دلاور خاں اکیلا رہ گیا، مگر باوجود اس کے نہایت بہادری سے مقابلہ کرتا رہا۔ اور ایسے زبردست حملے کئے کہ جمال خاں کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ جب عادل شاہیوں کو کامیابی ہوئی تو فوج کا اکثر حصہ مال غنیمت کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گیا اور میدان کی فکر کو چھوڑ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئے، دلاور خاں صرف دو سو سپاہیوں کے ساتھ میدان میں رہ گیا۔

جمال خاں مع اپنے داماد خداوند خاں کے اسمٰعیل نظام شاہ کے ہمرکاب ایک بہترین فوجی دستہ

[1] "دولتیست" فرشتہ۔

بیٹے ہوئے کمین گاہ میں چھپکر بیٹھا تھا، جب اس نے میدان کا یہ رنگ دیکھا اور دلاور خاں کو بھی تنہا پایا تو اپنی کمین گاہ سے نکلکر دلاور خاں پر ٹوٹ پڑا، دلاور خاں کو اس اچانک حملے کا گمان بھی نہ تھا، وہ یہ سمجھا تھا کہ میں نے میدان مار لیا ہے، مگر جب یہ نئی آفت سر پر آئی تو پریشان ہو کر صرف سات آدمیوں کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا، کیونکہ اس وقت مقابلہ کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، انھیں سات ساتھیوں میں ہمارا مورخ فرشتہ بھی تھا، راستہ میں دلاور خاں کو معلوم ہوا کہ عالم خاں آکس خاں اور عین الملک پہلے ہی بادشاہ کے پاس چلے گئے ہیں، ان سے دلاور خاں کو خطرہ تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اس سے پہلے پہنچکر بہت کچھ زہر اُگلیں گے۔ اس کی ہزیمت و نافرمانی، اس کے غرور و تکبر کو بدترین رنگ اور پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کیجائے گی۔ اس لیے اس نے اپنی رفتار کو تیز کر کے ان لوگوں سے پہلے ہی تین ہزار سپاہ کے ساتھ داراسنگ پہنچا (راستہ میں اس کی ہزیمت خوردہ فوج اس سے ملحق ہو کر تین ہزار تک تعداد پہنچ گئی تھی) داراسنگ پہنچکر دلاور خاں نے اس خوف سے کہ کہیں جمال خاں تعاقب نہ کرے بادشاہ کو یہاں سے چلنے کی رائے دی۔ اس طرح بیجاپوری افواج اپنی تباہی کے بعد شاہ درگ روانہ ہوئیں جمال خاں کو اس غیر متوقع کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی اور اس کی مردہ تمناؤں میں جان سی آگئی، اس نے داراسنگ تک مفرور فوج کا تعاقب کیا، لیکن جب یہ لوگ یہاں سے بھی بھاگ نکلے تو ان کا پیچھا چھوڑ برار کی طرف متوجہ ہوا، جہاں برہان اور راجہ علی خاں پاؤں پھیلا رہے تھے، بے حساب مال غنیمت اور تین سو ہاتھی اور بے شمار اسلحہ جات جمال خاں کے ہاتھ لگے۔

برہان کی مدد کے لیے دلاور خاں کا فوج روانہ کرنا

جب دلاور خاں اس بے سروسامانی سے شاہ درگ واپس پہنچا تو اسے بڑی خفت ہوئی، اس داغ ناکامی کو دور کرنے اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے افواج کی درستگی و آراستگی میں ہمہ تن مشغول ہو گیا، اور چند دنوں کی محنت و مشقت سے ایک زبردست فوج تیار کر لی جب یہ دس ہزار کی فوج تیار ہو گئی تو دلاور خاں نے ایک لایق سپہ سالار کے زیر کمان اس کو شاہ درگ سے روانہ کر دیا تاکہ جلد از جلد وہ برہان نظام شاہ کی فوج سے ملحق ہو جائے، جس میں راجہ علی خاں اور دیگر ذی اثر اُمرائے برار بھی شریک ہیں۔

جمال خاں بھی اس عرصہ میں بیکار نہ رہا، اس کے لیے یہ جنگ موت وحیات کی اہمیت رکھتی تھی،
اس کی اس کے خاندان کی آبرو اور اس کے فریق کی خیر اسی میں تھی کہ وہ اس جنگ کو کامیاب بنائے،
ورنہ جس طرح اس دکھنی فریق نے غیرملکی فریق پر غلبہ پاکر مرزا خاں اور اس کے ساتھیوں پر مظالم توڑے تھے،
جس بیدردی سے ان کا خون بہایا تھا، جس بیباکی سے انھیں سر بازار رسوا کیا تھا اور جس سنگدلی سے
انھیں امان نہ دی تھی، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ظلم وستم غیرملکی فریق کے ہاتھوں دکھنیوں پر ڈھائے
جائیں گے اگر اسمٰعیل کی بجائے برہان احمد نگر کے تخت کا مالک بن گیا۔ ان وجوہات کی بنا پر جمال خاں
اور اس کا فریق مرنے اور مارنے پر تُلا ہوا تھا، جس وقت جمال خاں نے بیجاپوری افواج کو شکست دی
اور دلاور خاں ابراہیم کو لیکر میدان سے بھاگا اور سیدھے شاہ درگ کی راہ لی تو جمال خاں نے یہ معلوم کرکے
وہ درمیان میں کہیں وقفہ نہیں لیگا، اس کے تعاقب میں وقت اور محنت صرف کرنے کی بجائے اپنے
دوسرے دشمن کے مقابلے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس وقت جمال خاں کا اک اک لمحہ قیمتی اور
نہایت اہم تھا۔ اگر وہ تعاقب ہی میں وقت گزار دیتا تو ممکن تھا کہ برہان راجہ علی خاں سمیت
احمد نگر میں گھُس آتا اور جمال خاں محض صورت دیکھتا رہ جاتا۔ اس احساس نے جمال خاں کو مجبور
کیا کہ وہ دلاور خاں اور ابراہیم کو اپنے حال پر چھوڑ کر احمد نگر لوٹے اور وہاں جاکر سستا لینے کے بعد از سر نو
فوجوں کی ترتیب وتنظیم کرلے۔ نیز دارالسلطنت احمد نگر کے انتظامات ٹھیک کرکے اور کسی معتمد امیر کو
حاکم بناکر برہان کے مقابلہ کے لیے پھر احمد نگر سے باہر نکلے قبل اس کے کہ بیجاپوری افواج برہان کی مدد کو
پہنچیں، اس کا خاتمہ کردے، اور اس طرح یہ فتنہ دب جائے۔ غرض جمال خاں احمد نگر میں چند دن ٹھیر کر
تازہ دم ہوگیا، اور اپنی فوجوں کو لیکر برار روانہ ہوگیا جس طرف سے کہ برہان کے حملہ کا اندیشہ تھا۔
حقیقت میں جمال خاں نے نہایت تیزی اور خوبصورتی سے تمام انتظامات ٹھیک ٹھاک کرلیے
جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک بہادر جرنیل ہی تھا بلکہ ایک منتظم مدبر بھی۔ یہ اس کی
بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا اور پورا دکن اس کے خلاف ہوگیا۔ اگر حالات
اتنے ناموافق نہ ہوتے تو یقیناً جمال خاں کو شاندار کامیابی نصیب ہوتی اور وہ اپنے آپ کو دکن کی

عظیم الشان شخصیت بنا کر دکھاتا جب وہ احمد نگر سے برار کا ارادہ کرکے نکلا اس وقت اس کو اطلاع ہوئی کہ دلاور خاں اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے اور برہان کی مدد کے لیے دس ہزار سوار کی ایک جرار فوج روانہ کر رہا ہے۔

اس خبر وحشت اثر کے سنتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اب کامیابی دشوار ہے۔ کامیابی خواہ حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس مقصد میں جس کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، مرنا دشوار نہیں تھا! وہی حقیقی جوہر کی پہچان ہے اگر جمال خاں کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا نہ معلوم ان پریشان کن حالات میں کیا کر بیٹھتا۔ اس قدر خوف و ہراس اس پر طاری ہو جاتا کہ کچھ کرتے دھرتے نہ بنتی اور ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لیکن وہ تو صرف جمال خاں ہی تھا کہ پیشانی ہمت پر شکن نہ پڑی، اور برابر برار کی طرف بڑھا چلا گیا! اس نے برار پہنچنے میں انتہائی تیزی کی اور بالخصوص اس وجہ سے کہ پہنچنے سے عادل شاہی افواج کا سیلاب امڈا چلا آرہا تھا۔ پانچ چھ روز کے عرصہ میں بڑی کوشش کے بعد برہان کے لشکر کے قریب عادل شاہی افواج سے پہلے جمال خاں پہنچ گیا۔ یہاں آنکے بعد معلوم ہوا کہ تھوڑی بہت مدد کی توقع جو بعض اُمرائے برار سے تھی وہ بھی جاتی رہی اور تمام اُمراء و شرفاء برہان کیساتھ لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں! ابھی برہان کے ساتھ راجہ علی خاں ملحق نہ ہوا تھا بلکہ برہان نے یہاں آکر خود اپنی ایک فوج تیار کر لی تھی جس میں زیادہ تر اُمرائے احمد نگر شریک تھے اور راجہ علی خاں کا انتظار تھا۔ اسی حال میں اس نے جمال خاں کی آمد کی خبر سُنی تو لڑائی کے لیے تیار ہو گیا۔ جمال خاں آتے ہی بغیر کسی پس و پیش کے بجلی کی طرح برہان کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ یہ پہلی یورش ہی ایسی زبردست تھی کہ برہان کا لشکر متزلزل ہو گیا غرض آثار یہ کہہ رہے تھے کہ برہان کو شکست ہو گی، جمال خاں یلغار کرکے فوج کے اندر تک گھس گیا اور میمنہ و میسرہ کو تتر بتر کر دیا! اگر ایک آدھ گھنٹہ کی مہلت ملتی تو برہان ختم تھا، اور اگر برہان ختم ہو جاتا تو ایک کیا دس راجہ علی خاں اور بیس دلاور خاں بھی جمال خاں کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ مگر مشیت ایزدی اس کے خلاف تھی۔ عین اس وقت دلاور خاں کا لشکر ہوا کے پر لگائے ہوئے آدھمکا، اور ادھر راجہ علی خاں طبل جنگ بجا کر میدان میں اُتر گیا! اس قیمتی امداد سے برہان کی

فوج میں جان آگئی، اس کے پاؤں جم گئے، امیدیں بڑھ گئیں، حوصلے جو پست ہو چکے تھے ایک لمحہ میں بلند ہو گئے، اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ جم کے ساتھ لڑنے لگے جب جمال خاں کی فوج تین طرف سے شکنجہ میں جکڑ دی گئی تو سوائے اس کے کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لڑ کر جان دیدے جمال خاں نے اس بہادری سے ان تینوں کا مقابلہ کیا کہ دشمنوں کے بھی چھکے چھوٹ گئے اور وہ اس کی جانبازی کا لوہا مان گئے اس حالت میں خواہ کوئی کتنا ہی بہادر اور جانباز کیوں نہ ہو فوج کو اپنے قابو میں لانا بڑا مشکل کام ہے اول تو مخالفین کی فوج کی تعداد بڑھ گئی تھی اور دوسرے وہ لوگ تازہ دم تھے، جمال خانی لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، مگر آفریں ہے کہ انھوں نے پست ہمتی اور بزدلی سے کام نہیں لیا، جنگ نہایت زور و شور سے جاری تھی کہ اسی اثناء میں ایک تیر جمال خاں کے آ لگا، اور وہیں اس کا خاتمہ ہو گیا خداوند خاں جو جمال خاں کا داماد تھا، وہ بھی اسی معرکہ میں کام آیا جب ان دونوں سرداروں کی موت دفعتاً واقع ہو گئی تو لشکر جو محض اُنہی کے بل بوتے پر لڑ رہا تھا بھلا غنیم کا کیا مقابلہ کر سکتا۔ رہا ان کا بادشاہ اسمٰعیل سو وہ ابھی ایک کمسن بچہ تھا، ایسی حالت میں میدان کے رنگ کو بدلنے کی قابلیت اس میں کہاں سے آئی، جب فوج اپنے سردار سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کو سوائے بھاگنے کے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ غرض ان کو مکمل اور فاش شکست ہوئی، اسمٰعیل کو قیدیوں کی طرح باپ کے سامنے لایا گیا، محبت پدری کو جوش آیا، برہان نے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو سینہ سے لپٹا لیا، اور اس کے بعد وہ منصور و کامیاب احمد نگر کے طرف متوجہ ہوا۔ برہان کے حلیف اس سے وہیں رخصت ہوئے، راجہ علی خاں نے تھوڑی دور تک برہان کا ساتھ دیا اور پھر مع اپنی مال غنیمت کے جس میں دو ہزار گھوڑے اور کئی ہاتھی اور بہت کچھ متفرق مال تھا، خاندیس روانہ ہوا۔[1]

[1] - فرشتہ نے اس دوسری جنگ میں بھی تھوڑا بہت اختلاف کیا ہے جو بساتین اور تحفۃ الملوک کے بیانات سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جمال خاں دشمن کی فوج سے مقابل ہونے سے پہلے بہت لمبا چوڑا راستہ قطع کر کے آیا تھا، راستہ میں کہیں پانی کا نام و نشان نہ تھا، اس کی فوج بہت پیاسی تھی اور تشنگی سے ہر ایک کا

دلاور خاں کے پنجہ سے ابراہیم کی رہائی

یہ تو بار بار لکھا جا چکا ہے اور خود واقعات کے مطالعہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دلاور خاں اس وقت ملک کے تمام امور سیاسی و انتظامی پر حاوی تھا، حتیٰ کہ بادشاہ پر بھی اس کو پورا پورا اختیار تھا، وہ جیسا چاہتا حکومت کرتا تھا، اس نے ابراہیم کو ایک طرف کر رکھا تھا، ہمیشہ اسی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ اپنے اختیارات میں مزید وسعت ہو اور کوئی اس کی حکومت میں دخل اندازی نہ کر سکے مختصر یہ کہ اس وقت وہ ریاست بیجاپور کا مطلق العنان حاکم تھا۔ ابراہیم کو یہ چیزیں اور دلاور خاں کے یہ افعال ناگوار تھے، وہ جس طرف نظر ڈالتا دلاور خاں کے ہی آدمی نظر آتے تھے، اب وہ جوان ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ خود حکومت کرے مگر دلاور خاں نے ایسا جکڑ دیا تھا کہ کچھ کرتے بن نہ پڑتی تھی، سوائے جشن و آرام کرنے اور رسمی طور پر اجازت نامہ دینے کے اسے کوئی کام ہی نہ رہا تھا، جس طریقہ سے اکبر کے سن بلوغ کو پہنچ جانیکے بعد بھی زمام سلطنت بیرم خاں کے ہاتھ میں تھی، تقریباً یہی حال دلاور خاں کا تھا جس طرح اکبر بیرم خاں کی سخت نگرانیوں اور عملی قیود سے تنگ آگیا تھا بالکل یہی عالم ابراہیم کا تھا کہ اس کے سر پر چڑھے ہوئے نوکر کی گستاخیوں سے وہ زچ ہوگیا تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دلاور خاں اور بیرم خاں نمکحرام نہ ہوں، وہ اپنے بادشاہ یا ملک کے بدخواہ نہ ہوں، ان کے ارادے اپنے آقائے ولی نعمت کی موروثی حکومت غصب کرنیکے نہ ہوں، وہ ظالم و سفاک نہ ہوں، مگر وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے، ان کی فطرت میں حکومت کرنیکا شوق تھا، جب ایک مرتبہ انھوں نے حکومت کا مزہ چکھ لیا تھا تو وہ نہیں چاہتے کہ یہ نعمت ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بُرا حال تھا قریب تھا کہ پیاس سے ہی بہت ہلاک ہو جائیں لیکن بڑی مشکلوں کے بعد ان لوگوں کو اتنا پانی ملگیا کہ جانیں بچ گئیں۔ ایک تو فوج تھکی ماندی تھی، دوسرے تشنگی سے اس کا بُرا حال ہو چکا تھا اور ایک لمبا سفر طے کر چکی تھی، ان حالات میں دشمن سے مقابلہ ہوا، جمال خاں کیساتھ دس ہزار مہدوی تھے، انھوں نے بہادری سے اپنے سردار کی ماتحتی میں لڑکر جان دی (فرشتہ)۔

(متن میں جو تفصیل دی گئی ہے وہ تحفۃ الملوک اور بساتین سے لی گئی ہے)۔

چھین لیجائے، یا یہ کہ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہوں کہ شہزادوں کی عمریں ابھی ایسی نہیں کہ امور مملکت و معاملات سلطنت کو بالکلیہ ان کے تفویض کر دیا جائے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان دونوں کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو نمکحرامی کی بُو تک بھی ان کے افعال سے نہیں آتی، بلکہ تھوڑی بہت سختی اور سخت گیری نے ان کی اکثر اچھائیوں پر بھی پردہ ڈال دیا ہے، ورنہ اگر یہ ذرا سی سمجھ سے کام لیتے تو غالباً زیادہ عرصہ تک حکومت ان کے ہاتھ میں رہتی، اور بادشاہ بھی ان سے خوش رہتے، ملک کو ان کی قابلیتوں سے زیادہ عرصہ تک مستفید ہونے کا موقع ملتا، صرف ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ بادشاہ کی ذہنیت کا اندازہ کرکے اسے اس کے پورے اختیارات پر بحال کر دیتے اور پھر خود بحیثیت ایک ملازم کے اس سے اپنے اختیارات حاصل کرتے، کیونکہ بادشاہ چاہے وہ کتنا ہی حکومت کا شائق کیوں نہ ہو اسے کسی نہ کسی وزیر یا وکیل کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ہاتھ میں تقریباً ملک کے تمام انتظامات ہوتے ہیں اور جو ملک کا سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا ہے۔ بہرحال ابراہیم اب دلاور خاں کے ضرورت سے زیادہ حاوی آجانے سے بیزار سا ہو گیا تھا، اور چاہتا تھا کہ جہاں تک جلد ہو سکے دلاور خاں کو نکال کر رہے، اب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا وہ محض موقع اور وقت کا منتظر تھا۔

دلاور خاں کے مکمل زوال کے بیان کرنے سے پہلے ان دو ایک باتوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے جو خصوصیت کے ساتھ اس عرصہ میں بادشاہ کو ناگوار گذریں، چنانچہ تاریخ فرشتہ سے واضح ہے کہ جب فوجیں جمال خاں کے مقابلہ سے ہزیمت خوردہ واپس ہوئیں اور اس کے بعد پھر ایک جرار فوج برہان کی امداد کے لیے شاہ درگ سے روانہ کر دی گئی تو اس وقت بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ کچھ دن اور یہاں قیام کرے، کیونکہ اس کو یہاں کی دلفریب آب و ہوا، خوبصورت اور حسین قدرتی مناظر، میوہ دار اور گھنے درختوں کے مسحور کن جھنڈ، صاف و شفاف پانی نہریں اور ندیاں، اونچے نیچے ٹیلے، غیر ہموار لیکن خوبصورت گھاٹیاں اور حسین وادیاں نہایت پسند آگئی تھیں۔ اس سے بحث نہیں کہ اس وقت یہاں ٹھہرنا قرین مصلحت تھا یا نہ تھا، لیکن چونکہ بادشاہ کی خواہش تھی اس لیے دلاور خاں کا فرض تھا کہ کم از کم وہ اس کی خوشنودی کے لیے شاہی حکم کی تعمیل کرتا، دلاور خاں کو تو صرف یہ فکر تھی کہ

جلد سے جلد یہاں سے کوچ کردے۔ لہٰذا دوسرے ہی روز بادشاہ کی مرضی کے بالکل خلاف اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔ (دوسرے جمال خاں سے جو جنگ ہوئی اس میں بادشاہ کی یہ مرضی تھی کہ فی الحال جمال خاں پر حملہ نہ کیا جائے، اور اس نے دلاور خاں کو خصوصیت کے ساتھ کہلا بھیجا کہ آج جنگ موقوف رکھی جائے، مگر بادشاہ کے صریح احکام کے خلاف اس نے جمال خاں سے جنگ چھیڑ دی اور شکست کھائی یہ شکست اور عدول حکمی ابراہیم کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ نیز بلبل خاں کے قتل کا واقعہ بھی اسے سخت ناگوار گذرا تھا۔ ان تینوں واقعات کو اس کے زوال کے فوری اسباب سمجھا جا سکتا ہے) بہرحال ابراہیم اب دلاور خاں سے متنفر ہو گیا تھا، اور چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی اس کے پنجے سے چھٹکارا ملے۔

ابراہیم نے اپنی نجات کے توڑ جوڑ یوں شروع کیے کہ عین الملک کنعانی، آنکس خاں اور علی خاں (جن میں ہر ایک ذی مرتبت اور پایہ کا امیر تھا) کے پاس اپنے ایک دو آدمی روانہ کر کے ان سے اس معاملہ میں گفت وشنید کی، بادشاہ نے جن لوگوں کو ان کے یہاں بھیجنے کے لیے منتخب کیا تھا، وہ دو ہندو ادنیٰ درجہ کے ملازمین تھے، جن پر یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بادشاہ کے اتنے بڑے معاملہ میں رازدار ہوں گے۔ اسی بنا پر ابراہیم نے اتنی ہشیاری سے اس کام کے لیے ان لوگوں کو منتخب کیا کہ سوائے ان کے جتنے با اثر اور اس کے اپنے مقرب تھے، وہ سب دلاور خاں کے حکم میں تھے۔ بادشاہ ان لوگوں پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا اس کارروائی میں ابراہیم کی والدہ بھی شریک تھی، ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ دلاور خاں کے غرور و تکبر اور طاقت و اقتدار کے باعث عین الملک اور آنکس خاں اس سے نفرت کرتے تھے، اور دل سے چاہتے تھے کہ بادشاہ اس کے پنجے سے چھٹکر ہمارے زیر اثر آجائے، ابراہیم اور اُس کی والدہ کو بھی معلوم تھا کہ دلاور خاں سے ان امیروں کو کتنی نفرت ہے جس کا کافی ثبوت گذشتہ جنگ ہی میں ملگیا تھا، اسی وجہ سے ابراہیم نے بالخصوص ان سے گفت وشنید شروع کی، جب یہ دونوں ہندو بادشاہ کا یہ پیغام لیکر گئے کہ وہ دلاور خاں کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ان کی امان میں آنا چاہتا ہے اور ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی مدد کریں گے اور دلاور خاں سے نجات دلائیں گے (بالخصوص

اس وجہ سے کہ ان کے آبا و اجداد میں شاہی خاندان کے واسطے کیا کیا خون فشانیاں اور جاں نثاریاں کی ہیں اور کس قدر خوشگوار تعلقات رہے ہیں) عین الملک اور آنکس خاں نے جب یہ خبر سنی تو خوشی سے پھولے نہیں سمانے لگے، اس کے معنی یہ تھے کہ آیندہ دلاور خاں ذلیل وخوار ہوگا اور حکومت میں ان کا اپنا بول بالا رہے گا۔ غرض انھوں نے بادشاہ سے وعدہ کر لیا کہ وہ ہر طریقہ سے اس کی مدد کے لیے تیار ہیں' اور تدبیر یہ بتائی کہ ابراہیم مع اپنے چند ساتھیوں اور رازداروں کے ٹھیک آدھی رات کو جب تمام لشکر غافل پڑا سوتا رہے گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی کیمپ سے نکلے اور عین الملک اور آنکس خاں کے کیمپ میں آجائے' جو شاہی کیمپ سے قریب ایک آدھ کوس کے فاصلہ پر ڈالا گیا تھا، بادشاہ کو یہ تدبیر پسند آئی اور اس نے کسی کو اس کی خبر نہ کی، جب رات ہوگئی تو دلاور خاں جس کا ڈیرہ شاہی ڈیرہ کے بالکل قریب تھا، بادشاہ کو اپنی خواب گاہ میں پہنچا کر خود اپنے ڈیرہ میں شب بسری کے لیے آگیا بیان کیا جاتا ہے کہ دلاور خاں اسی رات اپنی بد قسمتی سے ایک حسین و مہجبین کے وصال کے مزے لوٹ رہا تھا، جس پر وہ ایک زمانے سے عاشق تھا، اس لیے اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کسی صورت میں بھی آج رات کوئی اس کے آرام میں خلل انداز نہ ہو۔ یہ واقعہ من گھڑت یا صحیح، ابراہیم کے لیے تو اچھا ہی ہوا کہ وہ بآسانی دلاور خاں کی قید سے چھوٹ گیا۔ غرض جب آدھی رات ہوگئی تو ابراہیم خاموشی کے ساتھ اپنے ڈیرہ سے نکلا اور ایک جاں نثار ملازم سے (جو شاہی غلام تھا اور جس کا نام کفشدار خاں تھا) کہا کہ ایک گھوڑا حاضر کرے، یہ شخص سیدھے شاہی اصطبل گیا، اور جلودار شاہی سے ایک گھوڑا شاہی سواری کے لیے حاضر کرنے کو کہا، جلودار نے کچھ پس و پیش کیا اور پھر دلاور خاں کے حکم کے بغیر گھوڑا دینے سے قطعاً انکار کر دیا، جب اس وفادار ملازم نے دیکھا کہ اس کور نمک کی شرارت سے سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے تو غصہ سے بیتاب ہو کر وہیں اس کے ایک ایسا زبردست تھپڑ رسید کیا کہ وہ چکرا کر گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ دوسرے جلودار نے جب یہ رنگ دیکھا تو فوراً حکم کی تعمیل کی گھوڑا حاضر کیا گیا اور بادشاہ چپ چاپ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا، الیاس خاں راستہ میں ملا اور اس بے وقت روانگی کے متعلق کچھ استفسار کیا، ابراہیم نے کہا کہ یہ وقت باتوں میں گنوانے کا نہیں بلکہ ہر ہر لحمہ قیمتی ہے اگر تو چاہتا ہے تو ہمارے ساتھ ہولے۔ بادشاہ کا اشارہ

پاتے ہی یہ بھی مع ایک سو ساتھیوں کے ہمراہ ہو گیا تھوڑے ہی عرصے میں بادشاہ کی سواری مین الملک اور آنکس خاں کے کیمپ میں پہنچ گئی یہ لوگ تو چشم براہ بیٹھے ہوئے تھے، جب بادشاہ آن پہنچا تو انکی جان میں جان آگئی، فی الحال بادشاہ کے آرام کا انتظام کر دیا اور خود دلاور خاں کے مقابلہ کیلیے تیاریاں کرنے لگے. بادشاہ کی فراری کی خبر پھیلتے پھیلتے پھیل گئی، جو وفادار تھے اس کے جھنڈے کے نیچے جوق جوق آکر جمع ہو گئے، جن میں رفیع الدین شیرازی اور قاسم فرشتہ (مورضین) بھی تھے۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں تین ہزار سپاہیوں کی ایک اچھی فوج تیار ہو گئی، اور چند ہاتھیوں کی ایک قطار سامنے لگا دی گئی کہ اگر دلاور خاں ہمت کر کے لڑنے کے لیے آئے تو اسے ہاتھیوں سے کچلوا دیں۔ ادھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر دلاور خاں اپنی معشوقۂ دلنواز کے وصال سے لطف اندوز ہو رہا تھا، خدا خدا کر کے جب صبح ہوئی تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا منہ ہاتھ صاف کر کے غسل خانہ سے بادشاہ کے سلام کی غرض سے باہر نکلا تو دیکھا کہ شاہی کیمپ کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہر طرف ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہے۔ جسے دیکھو سرگوشیاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دلاور خاں یہ حال دیکھ کر تاڑ گیا کہ معاملات کچھ ٹھیک نہیں، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ سونے کی چڑیا جسے قفس میں بند رکھ کر خود حکومت کے مزے لوٹ رہا تھا، گذشتہ شب ذراسی غفلت کے باعث ہاتھ سے نکل گئی، دلاور خاں ہاتھ ملتا رہ گیا، عمر بھر وہ ہمیشہ مستعد، تیار اور ہشیار رہا، مگر شومئی قسمت سے آج ہی اسے غافل ہونا تھا، یہ بھی زمانے کی ستم ظرفی ہے، وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا، اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا، اور سمجھ گیا ہوگا کہ اب جو کچھ کارروائی کیجائے گی وہ بعد از وقت ہوگی، مگر انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے اور آخر وقت تک کوشش کرنی چاہیئے، دلاور خاں ایسی ہی مستقل طبیعت رکھنے والا آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کی ترقی کا آفتاب رو بہ زوال ہے اور غروب ہوا ہی چاہتا ہے، چلو ایک آخری کوشش اور سہی کہیں بعد کو یہ خلش نہ رہ جائے کہ کاش یوں کیا ہوتا تو کام بن جاتا، تدبیر اور ہمت تو اس کے غلام تھے ہی اب ان دونوں سے وہ کام لینا چاہتا تھا، گو بادشاہ کو پھر سے اپنے قبضہ میں لانا دلاور خاں کے بس کی بات نہ تھی، اس نے خیال کیا کہ اب جو کچھ کوشش وہ کرے گا محض اسکی اپنی قسمت آزمائی ہوگی، اگر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کے رعب و داب سے جو لوگوں کے دلوں پر ابتک

چھایا ہوا تھا کام نکل جائے تو ٹھیک ہے، اور نہ نکلے تو وہی ہوگا جو ہونا ہے۔ غرض خدا کا نام لیکر وہ اپنی فوج کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے عین الملک کیمپ کی طرف بڑھا اور اپنے ساتھ اپنے بیٹوں کو بھی لے لیا، جب بادشاہ کا کیمپ بالکل تھوڑے سے فاصلہ پر رہ گیا (یعنی ایک تیر کے فاصلہ پر) تو اپنی بیشتر فوج وہاں چھوڑ دی اور صرف پانچسو سوار اور چند ہاتھیوں کے ساتھ سیدھے کیمپ کی راہ لی۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ دلاور خاں اس پر جبر کرنے کے لیے آرہا ہے تو عین الملک کو دلاور خاں کے روکنے کے لیے مقرر کیا، عین الملک اور آنکس خاں نے وعدہ کرتے وقت تو بڑی کشادہ دلی سے کام لیا تھا، لیکن جب کام کا وقت آپڑا تو ان کا بھرم کھل گیا، وہ دلاور خاں کے دشمن تھے، نفرت کرتے تھے مگر اس کی عظمت و شوکت کے آگے ان کی روح پرواز کر جاتی تھی، ان کی ہمت نہ پڑی کہ اس کا مقابلہ کریں، اس وقت عین الملک نے ایسی بزدلی کا ثبوت دیا ہے کہ شاید ہی کسی نے دیا ہو، جب دلاور خاں قریب پہنچا تو بجائے اس کی مدافعت کے اسے کہلا بھیجا کہ بادشاہ بے بلائے آپ ہی آپ ہمارے کیمپ میں چلے آئے ہیں، چونکہ شاہی سواری کو روکنا خلاف آداب ہے اس لیے ہم نے ان کو ٹھیرالیا ہے، آپ آکر بخوشی بادشاہ سلامت کو لیجا سکتے ہیں۔ دلاور خاں نے جب یہ سُنا تو سمجھا کہ کام بنگیا، ابراہیم کو جن پر ناز تھا وہی ایسے نکلے، مدعی سُست اور گواہ چُست کا مضمون تھا، اس لیے دلاور خاں اپنی پیشانی پر بل ڈال کر اور غضب آلود ہو کر بادشاہ کے حضور میں پہنچا، سامنے جو ہاتھیوں کی قطار تھی وہ بھی ہٹادی گئی اور کسی نے روکا ٹوکا تک نہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا بادشاہ تک پہنچ گیا اور نہایت درشت اور تحکمانہ لہجہ میں گویا ہوا کہ "آدھی رات کو یوں یکایک تبدیل مقام کرنا سخت نامناسب تھا، اب حضور کو چاہیئے کہ اپنے اصلی کیمپ کو میرے ہمراہ چلیں"۔ بادشاہ نے جو اس کے طور دیکھے تو آگ ہو گیا، آج وہ دن تھا کہ اس کا نوکر اس سے تحکمانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا، بلکہ حکم دے رہا تھا، ابراہیم نہایت سنجیدہ مزاج تھا، غصہ کو پی گیا اور اپنی حقیقی شان و شوکت کا لحاظ رکھکر بجائے دلاور خاں کے اس جملہ کا جواب دینے کے صرف اتنا کہا کہ "کوئی نہیں جو اس نمکحرام کی گستاخیوں کا بدلہ لے، اور مجھے اس سے نجات دلائے"۔ اسکی زبان سے اتنا نکلنا تھا کہ ایک جاں نثار غلام جس کا نام ادب خاں تھا، برق کی مانند کوندا، اور دوسرے ہی لمحے

دلاور خاں پر تھا، ایک ایسا زبردست تلوار کا وار کیا کہ اگر دلاور خاں ذرہ سی غفلت کرتا اور اس وار کو خالی دینے کی کوشش نہ کرتا تو وہیں ڈھیر تھا لیکن دلاور خاں بھی بہادر، مستعد اور کئی معرکہ مارا ہوا آدمی تھا، اسی لیے تو اتنا دل بھی کیا تھا، وہ ان تمام پیش آنیوالے واقعات کو سمجھتا تھا اور سمجھ کر ہی اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالا تھا، اس نے بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح بچ نہ سکا، اس کے تلوار لگی پر اچٹتی ہوئی، اس کے گھوڑے سے نیچے گرتے ہی قریب تھا کہ کام تمام ہو جائے مگر بعض دلاور خاں کے ہمدرد بھی وہاں موجود تھے، چنانچہ ایک فیلبان نے اپنا ہاتھی درمیان کر دیا اتنی مہلت ملی تھی کہ دلاور خاں اٹھا اور اپنے داماد کے پیش کئے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ بھاگا، یوں اس کی جان تو بچ گئی مگر اس کی شوکت وعظمت کا آفتاب اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، اس کا بھاگنا تھا کہ اُس کے بیٹے محمد خاں اور حیرت خاں بھی اس کے ساتھ ہو لیے، شاہی فوج نے اس کا تعاقب مناسب نہ سمجھا، جب اس کی فوج نے اپنے افسر کی یہ حالت دیکھی تو خود پریشان ومنتشر ہو گئی اور بادشاہ کو اس "آمر مطلق" سے ہمیشہ کے لیے نجات ملگئی۔ جس وقت دلاور خاں وہاں سے بھاگا اسی وقت سے ابراہیم عادلشاہ ثانی، حقیقی معنی میں بادشاہ بیجاپور کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا، اب تک وہ متولیان ریاست کے ہاتھ میں گویا ایک بے جان مورت تھا کہ جس طرف چاہو موڑ لو، ابراہیم اور دلاور خاں کا یہ سین بالکل اس سین کے مماثل ہے جو کسی زمانے میں انگلستان کے ایک بادشاہ اور ایک سرکش امیر کلیسا کے درمیان واقع ہوا تھا، ہنری بھی بیکٹ کی سرکشیوں اور نافرمانیوں سے بیزار ہو گیا تھا، بالآخر بادشاہ اور اس امیر کلیسا کی کشمکشوں کا خاتمہ یوں ہوا کہ ایک وقت بادشاہ اس کی نافرمانیوں اور شرارتوں سے بہ تنگ آکر پکار اٹھا کہ "کیا کوئی نہیں جو مجھے اس غدار کی غداریوں سے نجات دلائے"، بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک جاں نثار نے ادب خاں کی طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں دلاور خاں اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور وہاں بیکٹ کٹ کر ڈھیر ہو گیا۔

دلاور خاں نے سیدھے بیدر پہنچکر پناہ لی مگر یہاں ٹھیرنا بھی بے سود سمجھ کر اس نے پھر احمد نگر کا رُخ کیا، جہاں اس وقت برہان تخت نشین ہو چکا تھا، یہاں پہنچتے ہی اس نے دربار میں رسائی

حاصل کرلی اور تھوڑے ہی دنوں میں برہان کی ناک کا بال بنگیا۔ یہاں رہ کر اس نے ان دو ریاستوں کے درمیان لڑائیوں اور فتنہ و فساد برپا کئے جن کی تفصیل آگے آئیگی دلاور خاں اپنے دو بیٹوں محمد خاں اور حیرت خاں سمیت بھاگ نکلا مگر اس کا ایک لڑکا کمال خاں جو داراسنگ کی طرف فرار ہوا تھا بہت جلد پکڑا گیا اور شاہی سپاہیوں کے ہاتھ اس کا خاتمہ ہوا۔

دور وکالت پر ایک عام نظر | دلاور خاں کے بھاگ جانیکے بعد "عہد ابراہیم" کا چونکہ ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جبکہ خود ابراہیم بہ نفس نفیس مہمات و انتظامات ملکی میں مشغول ہو جاتا ہے اور چونکہ یہیں اس طویل زمانے کا اختتام ہوتا ہے جسے "عہد ربجنسی" اگر کہا جائے تو مناسب ہے، جو ابراہیم کی تخت نشینی یا علی عادل شاہ کی موت سے لیکر ابتک جاری تھا، علی عادل شاہ کی موت تقریباً ۹۸۰ھ میں ہوئی اور دلاور خاں کی فراری ۹۹۰ھ کا واقعہ ہے، اس طریقے سے تقریباً دس سال کا طویل زمانہ گذرچکا ہے، یہ یاد ہوگا کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت نو سال کچھ مہینے یا قریب قریب دس سال کا تھا، تخت نشینی کے بعد سے ابتک دس سال گذرچکے ہیں تو گویا اس طرح اس کی عمر اس وقت تقریباً بیس سال کی تھی تخت نشینی کے بعد سے یہ دس برس تو ایسے گذرے ہیں جس میں بادشاہ محض عضو معطل رہا، اور یکے بعد دیگرے متولیان سلطنت غالب آتے رہے اور اپنی اپنی قابلیت و لیاقت کے اعتبار سے اچھا یا برا انتظام مملکت انجام دیتے رہے، اس طویل زمانے کی تاریخ گذشتہ صفحات میں پیش کردیگئی ہے حقیقت میں یہ زمانہ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے بیجاپور کے لیے ایک پُر آشوب زمانہ تھا ایک طرف بادشاہ کم عمر تھا تو دوسری طرف کوئی نمک حلال، وفادار اور سچا خادم ملک نہ ملنے کی وجہ سے ملک میں ایک عام خرابیوں کا سلسلہ پیدا ہو گیا تھا جس میں کچھ وقفہ سے کمی اور زیادتی ہوتی رہی، چونکہ اُمرائے ملک ایک طاقتور عنصر سلطنت تھے اور جب کوئی ان کو اپنے قابو میں رکھنے والا نہ رہا تو انھوں نے ملک میں ایک شور مچا دیا اور ہر ایک کو زیادہ تر یہی فکر تھی کہ اپنا ذاتی فائدہ ہو ملک کے بڑے بڑے عہدے اپنے اور اپنے عزیز و اقارب اور ہمنواؤں کے ہاتھوں میں رہیں اور دوسرے اپنے رقیب حکومت کے دائرے سے خارج ہو جائیں کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اسٹیٹ ایک پبلک ٹرسٹ ہے اس کا انتظام یوں ہونا چاہیئے کہ

ریاست بھی قائم رہے اور ملک کے امن و امان میں بھی خلل نہ پڑے اگر اتنا احساس بھی اس وقت کسی امیر کو ہوتا تو یہ خانہ جنگیاں ہی برپا نہ ہوتیں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کی کشمکش میں جو گولہ باری ہوئی تھی اس میں کئی معصوم جانیں تلف ہوگئیں، جو متولی سلطنت مقرر ہوتا وہ پہلے چاند بی بی کے اختیارات سلب کرنے کی کوشش کرتا، کیونکہ اس کی موجودگی اس کی اپنی من مانی حکومت میں روڑے اٹکاتی تھی، کورنمکی اور باہمی مخالفتوں کا یہ عالم تھا کہ یہ چیزیں ملک اور وطن فروشی کی حد تک پہنچ چکی تھیں چنانچہ اخلاص خاں کے زمانے میں قطب شاہی اور احمد نگری حملے کے وقت جبکہ بیجاپور کا محاصرہ ہو چکا تھا بجائے اس کے کہ متحدہ و متفقہ طور پر ان غیر ملکی دشمنوں کو مار نکالتے صرف اخلاص خاں سے مخالفت کی بنا پر بعض اُمرائے سلطنت انھیں سے مل چکے تھے، بدنظمی کی یہ حالت کہ جس کا موقع ملتا وہ اپنے حریف کو گرفتار کر لیتا، قید کر دیتا اور خود اس کی جگہ پر مامور ہو جاتا جب بڑے بڑے اُمرا کا یہ حال ہو اور جب انکی کشمکش کی یہ کیفیت ہو تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک کا اندرونی انتظام کس قدر درہم برہم ہو رہا ہوگا، کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا حتیٰ کہ جن کے سپرد انتظام مملکت اور امن و امان قائم کرنا تھا، جن کے ذمے عدل و انصاف کا پھیلانا، اہل ملک کو جابروں اور ظالموں کے دست ستم سے محفوظ رکھنا تھا وہی اپنے ذاتی اغراض کے لیے ملک میں غارتگری اور لوٹ مار کی دھوم مچا دینے سے پیچھے نہ ہٹتے تھے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملکی ہمدردی اور سچی وفاداری کا جذبہ کہاں تک ان امیران وطن فروش کے سینوں میں اس وقت موجزن تھا، غرض امن عامہ کا کوئی صحیح طور پر ضامن اور محافظ نہ تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ان امیروں کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ کئی مرتبہ یہ تحریکیں انھیں اُمرا کے جلسوں میں پیش ہوئیں کہ بادشاہ کو معزول کر دیا جائے، قید کر دیا جائے اور دوسرے کو تخت پر بٹھا دیا جائے، یہ اس وجہ سے نہیں کہ بادشاہ نااہل ہے، نالایق ہے، بیوقوف ہے اور عیش پسند ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ایک اچھے قابل اور ہونہار لڑکے کو بادشاہ بنا کر یہ زیادہ عرصہ تک اندھیر نگری نہیں چلا سکتے تھے، اور اگر اس کی جگہ کسی نااہل کو تخت نشین کر دیں تو پھر دل کھول کر اپنی دراز دستیوں سے کام لے سکیں گے! اس کے علاوہ چونکہ اس وقت اُمرا کا ایک فریق

بادشاہ کی طرفداری کر رہا تھا اس لیے فقط اس کو کمزور کرنے کے لیے یہ اپنا ایک نیا دعویدار پیش کرنے سے نہیں جھجکتے تھے، یہ تدبیریں محض اس واسطے عملی صورت اختیار نہ کر سکیں کہ دوسروں نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اگر کسی اور کو بادشاہ بنا دیا جائے تو بادشاہ بنانیوالا فریق زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ غرض ملک میں اس طویل زمانے میں برابر کشمکش جاری رہی، کبھی علی الاعلان، کبھی اندرونی سازشوں کے ذریعہ، کبھی ریشہ دوانیوں اور دیگر طریقوں سے، بہرحال جب تک ابراہیم کے ہاتھ میں حکومت نہیں آئی اس وقت تک خود اس کو بھی یقین نہ ہوگا کہ کسی روز وہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح بادشاہ کہلائے گا، اور ان ظالموں کے پنجہ سے صحیح و سلامت بچکر نکل جائے گا، مگر چونکہ وہ ایک اقبالمند بادشاہ تھا اور ساتھ ہی صاحب تدبیر بھی، اس لیے ان سازشوں کی اس کے آگے کچھ پیش نہ گئی اور وہی کامیاب نکلا

دلاور خاں کا کیرکٹر

دلاور خاں کے عروج، ترقی اور زوال کا اس قدر مطالعہ کیا جا چکا ہے جس سے بآسانی اس کے کیرکٹر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دلاور خاں سب سے پہلے تو ایک حبشی تھا اور ان تین میں کا ایک تھا جو کچھ عرصہ تک بیجاپور میں "اتحاد ثلاثہ حبشیان" قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی کے بعد اس کی ترقی شروع ہوتی ہے، وہ اپنی فطری فراست، دانائی، چالبازی اور بہادری کے باعث ان دونوں پر غالب آکر آخرکار تنہا مختار السلطنت بن بیٹھتا ہے۔ دلاور خاں چونکہ حبشی تھا اس لیے اس کی فطرت میں بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، عموماً حبشی اچھے جنرل اور عمدہ سپاہی ہوتے ہیں، انھیں کی طرح وہ موت سے بالکل خائف نہ تھا، اس کے لیے اپنی ترقی و عروج کی خاطر جان پر کھیل جانا معمولی بات تھی، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بیوقوفوں کی طرح اپنی زندگی کی کوئی قدر نہ کرتا ہوا اور اس میں وہ بہادری نہ تھی جس کو "بیوقوفانہ بہادری" کہتے ہیں، بلکہ وہ ایک حقیقی بہادر جنرل کی طرح بعض اوقات اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ غرض دلاور خاں کی بہادری میں کچھ کلام نہیں۔ اس کا آخر وقت بادشاہ کے سامنے سے بھاگ جانا بزدلی اور حماقت نہیں بلکہ ایک دانشمندانہ فعل تھا، ایسے موقع پر جبکہ بادشاہ کا پلہ قطعی طور پر بھاری ہو چکا تھا اور اُس کے اردگرد اُسی کے حامی و ہمنوا تھے، دلاور خاں کا ٹھیرنا خلاف مصلحت تھا اگر وہ اس وقت ٹھیرتا اور بیوقوفانہ بہادری دکھلانے کی کوشش کرتا تو سوائے

مارے جانیکے اور کیا ہوسکتا تھا، اس لحاظ سے اس کے بھاگ جانے کو ہم بزدلی سے تعبیر نہیں کرسکتے،
بلکہ یہ چیز اس کے تدبر، مستعدی اور حاضر دماغی پر دال ہے، ایسے موقعوں پر جبکہ دوسروں کے حواس باختہ
ہوجاتے ہیں وہ نہایت اطمینان اور سنجیدگی سے کام کرتا تھا، ہمت اور استقلال اس میں بہت کافی
تھا، وہ جس بات کے پیچھے پڑتا اسے پورا ہی کرکے چھوڑتا تھا، اور آخر وقت تک برابر کوشش کئے جاتا تھا
اور بڑی مشکل سے اپنی ہار ماننے کے لیے تیار ہوتا، اس کی یہ خصوصیت اس کو ہمیشہ دوسروں کے مقابلہ میں کامیاب
بنادیتی تھی، جہاں دوسرے لوگوں کو ناامیدی اور یاس گھیر لیتی ہے وہاں دلاور خاں اور بھی جری و بہادر
ہوجاتا تھا، اگر احمدنگری فوج کے مقابلہ میں وہ ذرا بھی مایوس ہوکر عدم مستعدی سے کام لیتا اور اپنی حاضر دماغی کو
کھودیتا تو جمال خاں وہیں اس کا کام تمام کردیتا، مگر ایسے نازک وقت میں وہ اپنے حواس کو قابو میں
رکھکر برق کی مانند بادشاہ کو لے اُڑا کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی، یہی خصوصیات تھیں جو اسے بادشاہ کے سامنے
سے صحیح و سلامت لے گئیں، ورنہ اس کے مارے جانے میں کوئی بات باقی نہ رہی تھی۔

اس کا تدبر اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سازشی اور غدار کی سفاکیوں تک پہنچ گیا تھا، گو اندرونی
سازشوں سے ایسا کام لینا غالباً ایک مذموم فعل ہے مگر میکاولی کا اس باب میں فتوٰی ہے کہ ایک سیاس
کے لیے ہر بات روا اور ہر چیز جائز ہے، اس کی اس خصوصیت کی مثال اس سے ملتی ہے کہ اس نے اخلاص خاں
اور حمید خاں کو اشتعال دیکر لڑا دیا اور خود تماشا دیکھنے لگا، ادھر یہ آپس میں لڑکر کمزور ہو رہے تھے
اور ادھر وہ اپنے کو طاقتور کئے جارہا تھا، اپنی انھی شاطرانہ چالوں سے اس نے ترقی کی۔ غرض اس کا
تدبر ایک حد تک مبتذل طریقہ کا تھا، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ مذموم سے مذموم طریقہ اختیار
کرنے سے پیچھے نہ ہٹتا تھا (چوروں والا واقعہ اس کی کافی دلیل ہے) انتقام کا مادہ بھی اس میں ضرورت
سے زیادہ تھا، بلبل خاں کو اندھا کرنا، اپنے ساتھیوں اخلاص خاں اور حمید خاں سے اس کا سلوک،
اور ابراہیم سے بدلہ لینے کے لیے برہان کو ترغیب دے کر بیجاپور پر چڑھا لانا، یہ سب اس کی مثالیں ہیں،
فریب کاری اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا چنانچہ بلبل خاں کو اس نے دھوکے ہی سے اندھا کیا تھا۔
اس کے ساتھ ہی اس میں بعض ایسی خوبیاں بھی تھیں جو حقیقت میں قابل تعریف ہیں وہ خود

ایک اچھا خاصا عالم و فاضل آدمی تھا! اس نے اپنی اولاد کو بڑی اچھی تعلیم دلائی تھی چنانچہ اس کا ایک لڑکا اپنے زمانے کے قابل ترین اشخاص میں شمار ہوتا تھا جس کو بادشاہ کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، دلاور خاں اکثر علماء و فضلاء کی صحبت کو پسند کرتا تھا اور بیشتر علماء اور قابل لوگوں کی اس نے قدر و منزلت کی، گجرات اور دیگر علاقوں سے اکثر قابل لوگوں کو اس نے جمع کر لیا، بیجاپور میں اس کے زمانے میں علمی سرپرستی کافی ہوئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم نواز اور ایک روشن طبیعت رکھنے والا انسان تھا، انتظام مملکت میں بھی وہ کچھ بُرا نہ تھا گو اپنی حوصلہ مندی سے اس نے پوری حکومت اپنے قبضہ میں کر رکھی تھی، مگر لگے ہاتھوں ملک کا ایسا ٹھیک انتظام کیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سب امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگ گئے تھے! اخلاص خاں کے دور میں یہ چیز ناپید تھی، اور ملک میں چاروں طرف ہنگامے برپا نظر آتے تھے، اس کی کاردانی، بہادری اور جرنیلانہ قابلیتوں کی وجہ سے ملک کو بہت جلد ہمسایہ دشمنوں سے نجات ملگئی، اس نے احمد نگر کو ایسی موقتی امداد دی کہ اس ریاست کو اپنا ممنون بنا لیا، اس نے ملک کی فوجی طاقت میں اضافہ کر دیا، اس وقت بیجاپور پر حملہ کرنا تو بڑی بات تھی خود دوسری ریاستیں بیجاپور کی امداد کی طلبگار رہتی تھیں، مالابار اور کرناٹک کے علاقوں پر مہمیں بھیجکر وہاں کا انتظام ٹھیک کروا دیا، اور یہ وہ کام تھا جس کی طرف اگلے متولیان ریاست نے توجہ تک نہ کی تھی، اور مصطفےٰ خاں کے مرنیکے بعد خراج آنا موقوف ہو چکا تھا! اسی کے عہد میں ابراہیم اور اس کی بہن کی شادیاں ہوئیں جس کی بدولت قطب شاہی علاقہ سے مکمل صلح ہو گئی لیکن گوناگوں وجوہات کی بناء پر احمد نگر سے لڑنا پڑا جس میں بیشتر بیجاپور کو فتح حاصل ہوئی، اس کے دور میں سب سے پہلے مغلوں سے تعلقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کیونکہ دلاور خاں ہی کے نام اکبر کا فرمان آیا تھا کہ برہان کی مدد کی جائے[1]۔ یہ فرمان خود دلاور خاں کی مرضی سے آیا تھا، اس کا مقصد ہمیشہ یہ رہتا تھا کہ دوسری ریاستوں سے خوشگوار تعلقات پیدا کر کے اپنے حالات درست کر لے، اور اپنی ریاست کو اس ڈھنگ پہ رکھے کہ دوسرے اس سے خائف رہیں، مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دلاور خاں اپنی خارجہ پالیسی میں نہایت کامیاب رہا اور اندرونی انتظام بھی

[1] تحفۃ الملوک۔

اس کا ٹھیک رہا، مگر اس کی یہ مسلسل کوشش کہ ابراہیم کو عضو معطل بنا کر خود کاروبار سلطنت چلائے اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ تذکرۃ الملوک سے واضح ہے کہ اس نے یہاں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو معزول کر دے، مگر جب یہ تدبیر الٹی پڑی تو قسمیں کھا کر اس نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کیا۔[1]

غرض دلاور خاں اپنی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے انتظام مملکت کے لیے غیر موزوں آدمی نہ تھا، بالکل بیرم خاں کی طرح وہ دشمنوں کا سر کچلنا ملک کا انتظام کرنا اور امن و امان پیدا کرنا خوب جانتا تھا مگر ساتھ ہی ضرورت سے زیادہ بیرم خاں کی طرح حوصلہ مند اور حکومت کا خواہاں بھی تھا، اسی مناسبت نے دونوں کو اس پر مجبور کیا کہ اپنے اپنے بادشاہوں کو عضو معطل بنا رکھیں، اور اس کا نتیجہ دونوں کے حق میں بُرا ہوا کہ دونوں باغی سمجھے جا کر ملک سے نکالے گئے۔ بیرم خاں کی طرح یہ بھی بہت سخت گیر اور تند مزاج تھا، ماتحتین سے نہایت سختی کے ساتھ اپنے حکم کی تعمیل چاہتا تھا غرض یہ عجیب بات ہے کہ دلاور خاں اور بیرم خاں میں جو قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اور دو ہمعصر بادشاہوں کے ریجنٹ رہ چکے ہیں، چند خاص فطری مناسبتیں پائی جاتی ہیں اور بعض جگہ تو دونوں کے حالات اور افعال و اعمال میں بھی یکسانی پائی جاتی ہے، جس طرح بیرم خاں اپنی ریجنٹی کے زمانے تک آمر مطلق رہا، اسی طرح دلاور خاں بھی حکمرانی کے مزے لوٹتا رہا، آخر میں دلاور خاں کی ساری کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بلا شک و شبہ اپنے زمانے کی بڑی شخصیتوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، اس کی ترقی ذاتی قابلیت کی بدولت ہوئی، اگر دلاور خاں میں خصوصاً وہ کمزوری نہ ہوتی (یعنی بادشاہ کو عضو معطل کر دینے کی خواہش) جس کے معنی قریب قریب سلطنت کے غصب کرنے کے ہیں تو واقعی وہ ہر حیثیت سے ایک قابل تعریف شخص ہوتا۔ اس چیز سے قطع نظر دلاور خاں کے عہد حکومت پر نظر ڈال کر اس کے تدبر،

[1] ۔ مگر اپنی جگہ یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ محض افواہ تھی اور اس کی کوئی اصلیت نہ تھی، اگرچہ تحفۃ الملوک نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

انتظام، بہادری اور اس کے غیر ممالک سے تعلقات وغیرہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیجا پور کے متولیوں اور وزیران سلطنت میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ قابل ریجنٹ تھا۔

بابِ ہفتم

احمد نگر سے جنگ اور دلاور خاں کا خاتمہ

احمد نگر سے جنگ

دلاور خاں کی فراری کے بعد سے ہی ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اور متولیوں کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے چونکہ ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کا زمانہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لیے یہاں پر اس سے یا اس کی حکومت سے متعلق کسی کارروائی پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس باب میں اس جنگ کا تذکرہ بالتفصیل کیا جائے گا جو ابراہیم کے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کرنی پڑی کیونکہ اس کا تعلق براہ راست دلاور خاں سے ہے، اور اس جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی دلاور خاں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔

دلاور خاں کی فراری کے ساتھ ہی بیجاپور کو احمد نگر سے اک اور جنگ کا سابقہ پڑا! اگر دیکھا جائے تو یہ جنگ دراصل پچھلی جنگ اور دلاور خاں کی فراری کے واقعات کا تتمہ ہے۔ اوپر لکھا گیا ہے کہ دلاور خاں بیجاپور سے بھاگ کر احمد نگر میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ جب وہ احمد نگر پہنچا تو وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، اور برہان نظام شاہ جس کی مدد کے لیے بیجاپور کی سلطنت نے اتنا کچھ کیا تھا ان تمام احسانات کو یک لخت بھلا بیٹھا، اور ایک دوست ہمسایہ ریاست کے مفرور اور معتوب ملازم کو اپنے ہاں جگہ دی۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ برہان کے ارادے بیجاپور کی نسبت کچھ ٹھیک نہیں تھے، ورنہ یہ طریقہ تو ہمسایہ ریاستوں میں مذموم قرار دیا گیا تھا کہ جب ایک ریاست کا معتوب شخص دوسری ریاست میں آئے تو اسے پناہ دی جائے۔ یہاں نہ صرف پناہ دی گئی بلکہ اس شخص کو اپنا مشیر خاص بنا لیا گیا اور اس کی رائے پر بیرونی تعلقات کا سانچہ ڈھالا جانے لگا! ابراہیم نے جب سُنا کہ دلاور خاں بچکر صحیح وسلامت احمد نگر پہنچ گیا ہے تو اسی وقت وہ کھٹک گیا کہ اب کچھ نہ کچھ گل ضرور کھِلے گا۔ دلاور خاں گھر کا بھیدی تھا، اس کا ایک ایسی ریاست میں جا کر پناہ لینا جو ہمیشہ سے بیجاپور کی رقیب رہی ہو کچھ معمولی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

غرض روز اول ہی سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ احمد نگر سے زیادہ عرصہ تک تعلقات اچھے نہیں رہ سکتے۔ اگر برہان کی جگہ کوئی اور بادشاہ ہوتا تو غالباً یہ جنگ واقع نہ ہوتی کیونکہ جس ریاست نے ابھی ابھی اس کو تخت نشین کرانے میں اتنی جان ہار کوشش کی ہو اسی ریاست کے خلاف جارحانہ کارروائی کسی احساس رکھنے والے سے ممکن نہ تھی۔ لیکن برہان نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور دلاور خاں نے اسے کچھ اس طرح ابھارا اور ورغلایا کہ وہ آمادۂ جنگ ہو گیا۔ دلاور خاں نے اسے یقین دلایا کہ اس وقت بادشاہ کم عمری کی وجہ سے کاروبار سلطنت سنبھالنے کے قابل نہیں ہے اور قطعاً نااہل ہے، اور دوسرے جو کچھ اُمراء اور عہدہ دار ہیں وہ آپس کی خانہ جنگیوں اور خود غرضیوں میں اتنے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اگر ایسے میں سرحد پر حملہ کر دیا جائے تو بہت سارے سرحدی علاقے جو دست اختیار سے نکل گئے ہیں پھر قبضہ میں آ جا سکتے ہیں۔ بالخصوص علاقہ شولاپور جس کے لیے احمد نگر ہمیشہ بیجاپور پر دانت پیستا رہتا تھا، دلاور خاں کی ان ترغیبوں سے برہان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ اسی اثنا میں جبکہ تعلقات کچھ کشیدہ ہوتے جا رہے تھے، ابراہیم کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش پر اسے چاروں طرف سے تہنیت نامے اور مبارکبادیاں آنے لگیں، اور بالخصوص لڑکے کے ماموں قلی قطب شاہ نے تو بیش بہا تحائف بھجوائے جس میں ایک مرصع زرنگار گہوارہ بھی تھا، اور تہنیت و مبارکباد کے لیے ایک سفارت خاص طور پر بیجاپور روانہ کی سلاطین دکن کے باہمی تعلقات کی یہ اک خصوصیت رہی ہے کہ ایسے موقعوں پر تہنیتی سفارتیں بھیجی جاتی ہیں، اور جب کوئی ریاست معمول کے خلاف رسوم کے ادا کرنے میں پہلوتہی کرے تو دوسری ریاست اس کو کشیدگی اور رنجش پر محمول کرتی تھی، اور اسے اپنی ایک تحقیر سمجھتی تھی۔ چنانچہ اب یہی ہوا کہ احمد نگر کی جانب سے کوئی تہنیت نامہ یا مبارکباد نہیں آئی۔ ابراہیم کو یہ بات سخت ناگوار گذری، اس پر طرہ یہ ہوا کہ دو ماہ کے اندر اندر ہی لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ احمد نگر کی ریاست کم از کم اس وقت تعزیت کی رسم ادا کر کے ابراہیم کے اس رنج میں شریک ہو کر اپنی گذشتہ نازیبا حرکت کو بھلا دے سکتی تھی، اگر وہ حقیقت میں بیجاپور کی دوستی کی کچھ قدر کرتی۔ مگر وہاں دلاور خاں موجود تھا۔ اور وہ تو یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں ریاستوں کے تعلقات خراب ہو جائیں، اور ان دونوں کی لڑائی میں وہ خود کامیاب ہو جائے۔ برہان اس کی رائے پر

عمل کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد نگر کی اس پہلوتہی کا باعث بھی وہی ہوا۔ ابراہیم کو اپنے لڑکے کے مرنے کا بہت رنج ہوا، اور کیوں نہ ہوتا آخر اولاد تھی، وہ بھی پہلی حسب معمول اس حادثہ پر دوسری ریاستوں نے تعزیت نامے بھیجے اور اظہار ہمدردی کیا مگر احمد نگر اس دفعہ بھی بالکل خاموش رہا، گویا کچھ جانتا ہی نہیں۔ احمد نگر کا یہ سکوت ابراہیم کو پہلے سے بھی زیادہ بُرا معلوم ہوا۔ اب اس نے دل میں ٹھان لیا کہ اس احسان فراموش ریاست اور اسکے بادشاہ دونوں کو ان کے غرور کا مزہ چکھا دے۔ چنانچہ ایک سفارت ملا عنایت اللہ کی سرکردگی میں بیجاپور سے روانہ کی گئی اور کہلا بھیجا کہ دلاور خاں یہاں کا ایک مفرور اور معتوب خانہ زاد ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ احمد نگر کی ریاست ازخود اسے اپنی پناہ میں نہ لیتی، اور آپس کے تعلقات کی خوشگواری کو ناخوشگواری سے بدلنے کا موقع نہ دیتی۔ لیکن احمد نگر نے اپنا اک رسمی فرض ادا کرنے سے پہلوتہی کی ہے۔ اس پر بھی درگذر کیا جاتا ہے، اور یاددہانی کے طور پر احمد نگر کو یہ لوگ روانہ کئے گئے ہیں کہ دلاور خاں جو یہاں سے سرکشی اور بغاوت کرکے بھاگا ہے اس کو ہمارے حوالے کردیا جائے تو بیجاپور احمد نگر سے اس وقت بھی اچھے تعلقات رکھنے پر تیار ہے۔ مگر احمد نگر کی ریاست تو اس امر کے لیے تیار ہی نہ تھی، اس نے اس سفارت کا کچھ بھی اثر نہ لیا اور دلاور خاں کو واپس دینے سے قطعاً انکار کردیا۔ نہ صرف انکار ہی کیا بلکہ بیجاپور پر حملے کے لیے تیاریاں شروع کردیں۔

جب برہان نظام شاہ ایک زبردست فوج تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا تو مع اُمرائے دولت اور دلاور خاں کے عازم بیجاپور ہوا۔ ابراہیم کو جب ان کارروائیوں کی خبر لگی تو اس نے بھی چپکے چپکے ایک فوج تیار تو کرلی مگر بظاہر اس حملہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب نظام شاہی لشکر عادلشاہی سرحدوں تک پہنچ گیا تب بھی یہاں سے ان کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج روانہ نہیں کی گئی، اور برہان برابر لوٹ مار کرتا ہوا بیجاپور کی طرف چلا آرہا تھا۔ جب فوجیں منگل وارے (منگلیسرا)[1] تک پہنچ گئیں اور دیکھا کہ مدافعت کے لیے بیجاپور کی طرف سے ذرا بھی کوشش نہیں ہورہی ہے تو برہان پریشان ہوا، اور خیال کیا کہ کہیں یہ سب دھوکا تو نہیں دیا جارہا ہو، اور اس طرح غافل کرکے بیجاپور والے چاہتے ہوں کہ وہ انکی

[1] فرشتہ۔

ریاست کے اندر چلا آئے اور جب چاروں طرف سے گھر جائے تو اس کا اور اس کی فوج کا قلع قمع کردیں،
اس لیے وہ چاہتا تھا کہ یہیں سے واپس ہوجائے، لیکن دلاور خاں گرگ باراں دیدہ تھا اس نے
سمجھایا کہ بھلا اس وقت بیجاپور میں ایسا کون بڑا جرنل یا بڑا آدمی ہے جو اس عاقلانہ تدبیر پر
عمل پیرا ہو کر ہم کو گھیر لے گا، ایک بادشاہ ہے سو وہ بھی کم عمر اور عیش و نشاط میں مشغول، ہم کو بلا خوف وخطر
آگے بڑھے چلے جانا چاہیئے اور کسی اچھے موقع پر قبضہ کر کے عادل شاہی فوج کا انتظار کرنا چاہیئے کہ
جب وہ مقابلہ کو آئے تو کاٹ کر رکھدیں، پھر شولاپور اور شاہ درک ہی کیا چیز ہیں، بیجاپور کی
ریاست بھی ہماری ہے۔ یہ بات برہان نظام شاہ کی بھی سمجھ میں آگئی اور وہ اپنے خیال کو بدل کر
آگے بڑھا اور دریائے بیورہ[1] (بھیما[2]) تک پہنچ گیا، اب بیجاپور سے وہ "سی کروہ" کا فاصلہ رہ گیا،
یہاں ایک پرانا قلعہ تھا جو کسی ہندو راجہ کے عہد کا بنایا ہوا تھا، مگر اب خستہ اور اجڑی ہوئی حالت میں
تھا بلکہ زمین کے برابر ہوچکا تھا۔ دلاور خاں کی رائے سے اس کی تعمیر شروع کی گئی اور راتوں رات اس کے
بنانے کی طرف تمام احمدنگری لشکر متوجہ ہوگیا، بہت جلد یہ قلعہ بنکر اس قابل ہوگیا کہ فوجوں کو پناہ دیسکے
اور اس کے اندر رہ کر دشمن کا اچھی طرح مقابلہ کرسکیں قلعہ کی تیاری کی خبر بھی ابراہیم کو ملی مگر ابراہیم نے
قطعاً اس سے بے پروائی ظاہر کی، اور کہا کہ برہان نظام شاہ اس مہم میں کامیاب نہیں ہوگا، جو قلعہ
وہ تیار کررہا ہے اس کی کیفیت بچوں کے گھروندے کی سی ہوگی۔ درحقیقت اس مہم میں برہان نظام شاہ کو
جتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تقریباً اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ابراہیم نے بے اعتنائی برتی، اور خود
بہ اطمینان کلّی محو عیش و عشرت رہا، موسم بارش کا تھا، چار طرف کیچڑ اور پانی تھا، عموماً اس زمانے میں
فوجکشیاں جاری بھی ہوں تو روک دیجاتی ہیں، کیونکہ نقل و حمل میں بڑی مصیبتیں پیش آتی ہیں، مگر باوجود
ان تمام موسمی تکالیف کے برہان نے اپنی فوجی تیاریاں برابر جاری رکھیں، اسی دھواں دار بارش کے

[1] ۔ فرشتہ۔

[2] ۔ برگس۔

موسم میں قلعہ کی تیاری کچھ آسان کام نہ تھا، لیکن اس نے قلعہ بھی تعمیر کر لیا، افسوس تو اس کا ہے کہ غریب کی ساری محنتیں اکارت گئیں، نقصان بھی اٹھانا پڑا اور جو ذلت ورسوائی اس کو اس حملے میں ہوئی وہ گویا اس مہم کا "نفع خالص" تھا) ادھر یہ بیچارے کیمپوں میں پڑے مصیبت اٹھا رہے تھے اور ادھر بیجاپور میں رنگ رلیاں ہو رہی تھیں، برہان متعجب تھا اور اہل احمد نگر بھی حیران تھے کہ آخر اتنی بے پروائی کیا معنی رکھتی ہے۔

باقاعدہ ایک مجلس مشورت میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ابراہیم کیوں اتنی لاپروائی کر رہا ہے بعضوں نے کہا کہ کم عمری اور ناتجربہ کاری ہے، بعضوں نے نااہلی اور تساہل پر محمول کیا، بعضوں نے اندرونی خرابیوں، اُمراء اور فوج کا اختیار سے باہر ہونا ظاہر کیا، بعضوں نے اس کی نوجوانی کے مدنظر عیش و عشرت کو اس کا باعث گردانا۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں، مگر کسی کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا، دلاور خاں بھی یہی خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے بیجاپور میں اتنی ہمت نہ رہی کہ جو فوج سرحدوں کے اندر تک آکر اس قدر لوٹ مار مچا رہی ہے اس کی مدافعت کر سکے چنانچہ اس نے ایک تدبیر کی، وہ تو دل سے چاہتا تھا کہ ممکن ہو تو پھر بیجاپور چلا جائے اور بادشاہ پر قابو پا کر اسی طرح حکومت کرے۔ دلاور خاں کا برہان کو اس جنگ پر آمادہ کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ابراہیم مجبور ہو کر پھر اسے اپنے پاس بلائے اس لیے اس نے خفیہ طور پر ابراہیم کے پاس چند آدمی روانہ کئے کہ فدوی ہمیشہ ملک و مالک کا وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے، اعلیٰحضرت کی خفگی اور عتاب نے مجبور کیا کہ جان بچا کر بھاگ نکلے اس وقت دشمن زبردستی حملہ آور ہے اور اس کی مدافعت کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، اگر اب بھی اس غلام کی خطا معاف کر کے پھر مہمات ملکی پر سرفراز فرما دیا جائے تو ان احمد نگریوں کو مار بھگاتا ہوں۔ جب ابراہیم کو یہ پیام پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا، کیونکہ جس خیال سے وہ یہ چالیں چل رہا تھا بالکل صحیح نکلا، اور اس کا جادو چل گیا، اس نے بھی کہلا بھیجا کہ حقیقت میں اس وقت مجھے وفادار اور نمک حلال ملازمین کا صحیح اندازہ نہ تھا، اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں، اور خوب سمجھنے لگا ہوں کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا جلد بازی اور تیزی سے کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، اب اگر کچھ دل میں رنجش ہے تو دور کر کے سیدھے ہمارے حضور میں چلے آؤ۔ دلاور خاں

یہ خبر سُنکر باغ باغ ہوگیا، کیونکہ اس کی منھ مانگی مراد پوری ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ابراہیم کے پاس چند اور آدمیوں کو بھیجکر یہ شرط منظور کرالی کہ اس کے اپنے جان و مال کو کوئی گزند نہ پہنچایا جائے گا، بادشاہ نے اسے بھی قبول کرلیا، پھر تو فوراً دلاور خاں نے میدان جنگ سے اپنے بیٹے محمد خاں اور چند ساتھیوں سمیت بیجاپور کی راہ لی (بیان کیا جاتا ہے کہ برہان سے اجازت لیکر وہ روانہ ہوا، مگر عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی کیونکہ برہان نے محض اس کے بل بوتے اور مشورے پر حملہ کیا تھا، دلاور خاں اُس حملے کی روح رواں تھا اگر برہان کو یہ معلوم ہوتا کہ دلاور خاں اس طرح خفیہ طور پر بیجاپور سے خط وکتابت کر رہا ہے تو اسے جاسوس سمجھ کر موت کے گھاٹ اُتار دیتا اور واپس جانیکی اجازت کبھی نہ دیتا) جب وہ بیجاپور پہنچا تو پہلے آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا، اس وقت ابراہیم "دوازدہ امام باغ" گیا ہوا تھا، عصر کا وقت ہو چکا تھا کہ اس کی سواری قلعہ ارک کی طرف جانے لگی اسی وقت دلاور خاں حاضر درگاہ ہوا، بادشاہ نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اور ان سب کے ہمراہ قلعہ کی راہ لی، الیاس خاں کو حکم ہوا کہ دلاور خاں کو سوار کر کے قلعہ کے اندر لائے، جب وہ قلعہ کے اندر پہنچا تو دلاور خاں کا ماتھا ٹھنکا اور انداز و فضا سے وہ تاڑ گیا کہ اس کے ساتھ دغا کی گئی ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دلاور خاں کو پکڑ کر اس کی آنکھیں نکال دیجائیں۔ دلاور خاں پریشان ہوا اور الیاس خاں کے ذریعہ سفارش کروانی چاہی اور بادشاہ کو یاد دلایا کہ وہ اپنی جان بخشی اور حفاظت مال کے وعدہ پر بیجاپور آیا ہے، ایسے میں وعدہ خلافی کرنا بادشاہوں کے شان کے خلاف ہے مگر ابراہیم نے ایک نہ سُنی وہیں اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں (بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اس کے جواب میں کہا کہ "بیشک میں نے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، لیکن آنکھ نکلوانے سے نہ جان جاتی ہے نہ مال ہی ضبط ہوتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں عذر لنگ ہیں جب وعدہ کی اسپرٹ پر غور کیا جائے اور محض الفاظ پر نہیں تو بے کم وکاست کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ نے وعدہ خلافی کی گو اخلاقی اعتبار سے ابراہیم کا یہ فعل قابل تعریف تو کیا ایک حد تک مذموم ہے مگر اخلاقیات کو اس طرح سیاسیات سے ملا دیا جائے تو سلطنت کے کاروبار نہیں چل سکیں گے، دلاور خاں کا

پکڑا جانا اور اس کو معذور کر دیا جانا بیجاپور کی سلامتی اور امن کے لیے ضروری تھا ورنہ وہ جب تک دشمن کے کیمپ میں رہتا بیجاپور اور ابراہیم کو چین نہ لینے دیتا، اور قطع نظر اس سے خود دلاور خاں نے اپنے زمانے میں دوسروں کے ساتھ جو سلوک کئے تھے وہ اس سے کم نہ تھے۔ جیسا کرے، ویسا بھرے۔ جو چیز اس نے دوسروں کے لیے جائز رکھی تھی وہ اس پر روا ہوئی اگر اسوقت ابراہیم اپنے وعدہ کا لحاظ کر کے اسے چھوڑ دیتا تو خود اس کی خیر نہ تھی چند ہی دنوں میں وہ رنگ دکھاتا کہ سب کے ہوش اُڑ جاتے، اب تو اس کو ابراہیم سے کاوش بھی ہو گئی تھی، کچھ تعجب کا مقام نہیں کہ وہ ابراہیم کو سرے سے معزول کر کے اس کے بھائی کو تخت نشیں کر دیتا، اور اپنے پُرانے عہد حکومت کو تازہ کر لیتا، غرض دلاور خاں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اچھا کیا گیا، مگر یہ ساری چیزیں ملکر بھی اخلاقی نقطہ نظر سے ابراہیم کے اس فعل کی کمزوری اور بُرائی کو نہیں چھپا سکتیں) اس کے بعد وہ "قلعہ کھلکنہ" میں قید کر دیا گیا اور تقریباً دس سال مزید زندگی کے بعد اسی قید کی حالت میں فطری موت سے مرا۔

اس وقت نظام فوج اپنی رات دن کی کوششوں سے بہترین موقع پر پڑاو ڈالے ہوئے تھی۔ قلعہ بھی تیار ہو گیا تھا، غلّہ اور آذوقہ کافی جمع کیا جا چکا تھا، غرض وہ آمادۂ پیکار تھے، بیکار نہ بیٹھ سکتے تھے اس لیے اطراف واکناف میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ دلاور خاں سے فراغت پاتے ہی ابراہیم نے فوج کے اجتماع کا حکم دیا اور جلد سے جلد ایک زبردست فوج تیار کر لی گئی، سب سے پہلے کوئی سات یا آٹھ ہزار کی "برگی" فوج برہان کے مقابلہ کو روانہ کی گئی کہ وہ برہان نظام شاہ کی فوج کے اطراف گھیرا ڈال کر اسے تنگ کرنا شروع کرے اور رسد بند کر دے۔ برگی فوج کی خصوصیت یہ تھی کہ قزاقانہ جنگ وہ خوب کر سکتی تھی جو فوجیں میدانوں میں لڑنے کی عادی ہوتی ہیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں اس فوج کے سپاہی نہایت تیز گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح آتے اور غفلت کے کسی موقع میں خوب قتل و غارت کر کے ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی گھاٹیوں اور پہاڑیوں میں غائب ہو جاتے۔ بیجاپور اس قسم کی فوج کی ایک زمانے سے سرپرستی کر رہا تھا اور ایسی ایک زبردست فوج جمع کر لی تھی جو ہمیشہ دشمن کو دوران جنگ میں تنگ کرنے کے لیے متعین کی جاتی تھی، اس کے بعد

اصلی فوج پریشان شدہ دشمن کا خاتمہ کر دیتی تھی، چنانچہ اس جنگ میں یہی ہوا کہ جب برہان نظام شاہ کی فوج کو برکی فوج نے پریشان کر دیا اور ان کی رسد بند کر دی تو اس کے بعد رومی خاں کو سپہ سالار بنا کر دس ہزار کی فوج کے ساتھ بھیجا گیا، اور ایک ہراول تین ہزار سواروں پر مشتمل الیاس خاں سرنوبت کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ اس وقت نظام شاہی فوج بیورہ کے کنارے ٹھیری ہوئی تھی برکی فوج کے مقابلہ میں برہان نظام شاہ نے اپنے کئی دستے روانہ کئے مگر سب مغلوب ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ برکی فوج ندی کو عبور کر کے جس طرف برہان کی اصلی فوج تھی وہاں تک پہنچ گئی برہان نظام شاہ اب خود ان کے مقابلہ کے لیے آیا اس وقت یہ برکی فوج ذرا غافل تھی حملہ سے پریشان ہو گئی اور بیورہ کو عبور کرنے لگی اسی اثنا میں الیاس خاں اور رومی خاں بھی آچکے تھے، برکی فوج نے دریا کو عبور کر لیا اور اصلی شاہی فوج سے ملحق ہو گئی، مگر جب برہان نظام شاہ نے ان کے تعاقب میں بیورہ کو عبور کرنا چاہا تو یکایک طوفان ہوا اور پانی چڑھ آیا۔ برہان نظام شاہ کی فوج پریشان ہو گئی اور وہ اپنے کیمپ واپس ہو گیا۔

اسی دوران میں برہان نظام شاہ کے لشکر میں سخت قحط کی وجہ سے ایک عام پریشانی پھیل گئی، اس قحط کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلہ اور آذوقہ کی کمی اور چارہ کی قلت و کمیابی سے انسانوں اور جانوروں کی شرح اموات بہت بڑھ گئی، رسد بالکل بند ہو گئی، فاقوں سے فوج بیزار اور تنگدل ہونے لگی، یہ بلائے آسمانی یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ فوج میں اک عام وبا پھیل گئی جس کی وجہ سے فوج کی تعداد گھٹنے لگی اور حالت ابتر سے ابتر ہو گئی، برہان ہکا بکا ہو گیا اور اس سے کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی بالآخر اس امر پر مجبور ہوا کہ قحط اور وبا سے نجات پانے کے لیے دو تین منزل اپنی سرحد کی طرف پیچھے ہٹے اور وہاں ٹھیر کر غلہ وغیرہ حاصل کرے اور فوج کو از سرنو ترتیب دیکر تازہ دم ہو کر پھر میدان میں آئے، اس تدبیر پر عمل کر کے وہ میدان جنگ سے ہٹ گیا، اور اپنی فوج کی حالت درست کرنے میں مشغول ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد جب ان دونوں مصائب سے نجات ملی اور تھوڑا بہت اطمینان نصیب ہوا تو وہ پھر عادل شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا مگر اب اس نے حملہ کا مرکز بدل دیا

اور شولاپور کا رُخ کیا کہ اس کا محاصرہ کرکے اپنا قبضہ کرلے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے جنرلوں کو حکم دیا کہ وہ دریائے بیورہ کو عبور کرکے آگے بڑھیں اور برہان نظام شاہ کو راستہ ہی میں روک دیں تاکہ وہ شولاپور کا محاصرہ نہ کرسکے۔ غرض بجلی کی طرح الیاس خاں و رومی خاں اس کے حکم کی تعمیل کے لیے نکلے اور راستہ ہی میں برہان کو جالیا، جب نظام شاہیوں نے دیکھا کہ راستہ بند ہے اور شولاپور پہنچنے کے لیے سوائے جنگ کے چارہ ہی نہیں تو انھوں نے جنگ کی تیاری شروع کردی اس وقت نظام شاہی فوج کی کمان نُورنگ خاں دکنی امیرالامرائے براڑ کے ہاتھ میں تھی، گو میدان بیجاپور کے ہاتھ میں رہا مگر مقابلہ اتنا زبردست ہوا کہ آخر وقت تک نظام شاہی فوج میدان میں ڈٹی رہی بیجاپوری فوج کو فتح حاصل کرنے کے لیے کافی خونریزی اور خونفشانی سے کام لینا پڑا، جب نورنگ خاں[1] یا نور خاں مارا گیا تو نظام شاہی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے اور تتر بتر ہوگئی اور اس طرح ہزیمت خوردہ باحال تباہ خستہ و مجروح برہان نظام شاہ سے جاملی جو ایک "کروہ" کے فاصلہ پر جنگ سے ہٹ کر ٹھیرا ہوا تھا، اس جنگ میں بہت کچھ مال غنیمت بیجاپور کے ہاتھ لگا جس میں "یکصد و شصت فیل ہزار اسپ و اسلحہ بیشمار"[2] اور فرشتہ کی روایت کے بموجب "صد فیل بزرگ کوہ تمثال و چہار صد سوار"[3] تھے ایک فتح نامہ بادشاہ کے پاس روانہ کیا گیا جس میں اس پتہ کی تفصیلی کیفیت تھی، بادشاہ نے خوش ہوکر رومی خاں و الیاس خاں کو بیش قیمت خلعت عطا کئے۔

اگرچہ بیجاپوریوں کو اس جنگ میں ایک زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور نظام شاہی فوج نے اس بری طرح شکست کھائی تھی کہ اب مقابلہ کی تاب نہ لاسکتی تھی مگر اس پر بھی پوری طرح عاجز نہ ہوئی تھی، اس لیے بیجاپوریوں نے اپنے فوجی کارروائیاں جاری رکھیں اور نظام شاہی فوج کو

---

[1] ۔ فرشتہ، بساتین میں اس نام کو نورخاں لکھا گیا ہے۔ برگس نے بھی اس کو قبول کیا ہے۔

[2] ۔ بساتین، صفحہ ۲۲۰۔

[3] ۔ فرشتہ۔

وقتاً فوقتاً تنگ کرنے لگے، گو وہ پیچھے ہٹے جا رہے تھے مگر ان کا تعاقب کیا جا رہا تھا، فوج کی بد حالی اور خستگی ہی برہان نظام شاہ کے لیے کیا کم تھی لیکن ایک پرانی مثل کے بمصداق کہ "مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی" اس کی اندرونی پریشانیاں اس واقعہ سے اور بھی بڑھ گئیں کہ بعض سربرآوردہ اُمرا جن میں دکنی اور حبشی عنصر زیادہ تھا اس کوشش میں تھے کہ برہان کو معزول کرکے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت نشیں کر دیں، یہ سازش ابھی پوری طرح مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ برہان کو اس کا علم ہو گیا، اور وہ عادل شاہی افواج کو بالائے طاق رکھکر اب اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح احمد نگر جلد سے جلد پہنچ جائے، تاکہ یہ سازش فرو ہو سکے، سازشیوں اور غداروں کو سزا دیجائے اور اپنے استحکام کی فکر کرے، اس غرض سے وہاں سے کوچ کرکے وہ "قصبہ کرور ما لیان" کی طرف بڑھا جو حدود احمد نگر میں تھا۔ رومی خاں اور الیاس کو جب یہ خبر ملی تو بُری طرح اس کا تعاقب کرنے لگے، ایسی حالت میں برہان کو اتنا ہوش کہاں رہا تھا کہ ان کے مقابلہ کی تدبیر کرتا اس لیے آمادۂ صلح ہو گیا، اور سمجھ گیا کہ بیجاپوری فوج سے اس وقت خلاصی نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ باقاعدہ صلح نہ کر لی جائے، اور صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ جب ابراہیم کو برہان کی ان پریشانیوں اور صلح کی درخواست کی خبر ہوئی وہ جان کر بھی انجان ہو گیا اور اس درخواست کی جانب سے بے التفاتی برتی، اور عمداً اس کارروائی کو ڈال رکھا تاکہ احمد نگر کی ریاست اور برہان کو اس کا پورا پورا احساس ہو کہ وہ بیجاپوری دربار کے آگے جبہ سائی کر رہے ہیں، ایک مہینے کے بعد کہیں ابراہیم عادل شاہ نے اس درخواست کی طرف توجہ کی اور وہ بھی اسوقت جبکہ برہان نے دیگر سلاطین دکن سے اس معاملہ میں مدد چاہی۔ قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کیجانب سے مصطفےٰ خاں استرآبادیؒ اور راجہ علی خاں و عبدالسلام نے اس صلح کے مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی۔ جب ابراہیم کو معلوم ہو گیا کہ برہان بالکل عاجز آگیا ہے اور اسے اپنے کردار کی کافی سزا مل چکی ہے تو

ؒ امیر زنبیل کو مصطفےٰ خاں کا خطاب دیا گیا تھا اور یہ شخص بھی استرآبادی تھا جس کا ذکر اس سے پہلے آگیا ہے۔

سلسلۂ گفت وشنید جاری کیا۔صلح کی درخواست پر بادشاہ نے یہ بتایا کہ برہان نظام شاہ سے بیجاپور کی جانب سے کبھی کچھ تعرض نہ کیا گیا، الٹا وقتاً فوقتاً مدد دی گئی، لیکن اس نے ان احسانات کو بھلا کر سرحد بیجاپور میں قدم رکھکر لوٹ اور غارتگری شروع کردی! اور تمام جارحانہ کارروائیوں کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی ہے، بیجاپور نے محض اپنی مدافعت کی ہے اس طرح سارا الزام احمد نگر کی ریاست پر عائد ہوتا ہے، لہذا احمد نگر کو اس جارحانہ کارروائی کا ہرجانہ ادا کرنا چاہیئے، اوراس ہرجانہ کی تفصیل یہ ہے کہ برہان نے جو قلعہ حدود عادل شاہی میں تعمیر کیا ہے اسے وہ خود اپنے ہاتھ سے مسمار کرے' اس صلح کی گفت وشنید اوراس کے شرائط کے طے کرنے کے لیے جو شخص بحیثیت نمایندہ کے بیجاپور کی جانب سے مقرر کیا گیا تھا، وہ شاہ نواز خاں تھا، شاہ نواز عالی مرتبت خدام عادل شاہی سے تھا، اوراس خاندان کا بڑا وفادار اور جاں نثار تھا بیجاپور سے غیر معمولی وابستگی تھی اور ساتھ ہی بڑا راستباز تھا سچی بات کہنے میں بہت بیباک تھا، تاریخ فرشتہ میں اس صلح کی نسبت ایک واقعہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خان ذیشان نے اپنی بیباکانہ گفتگو سے بیجاپور کی شان رکھ لی اور احمد نگر کو یہ محسوس کرایا کہ وہ بیجاپور کے در پر جبیں سائی کر رہا ہے۔صلح کی گفت وشنید کے لیے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی تھی، جب اس کارروائی کی تکمیل کے لیے شاہ نواز خاں نظام شاہی لشکر میں گیا تو اس کی بڑی تعظیم وتکریم ہوئی، اس مجلس میں اکثر ریاستوں کے ایلچی اور حکام دکن موجود تھے' یہ مجلس اپنے رعب وداب کے اعتبار سے بہت بڑی مجلس تھی جس وقت گفتگو شروع ہوئی تو برہان نظام شاہ نے خاموشی اختیار کی اور اپنے منھ سے صلح کی بابت پہلے ایک لفظ نہ کہا اس کا مقصد یہ تھا کہ یوں تھوڑی دیر خاموش ہوجائے تو خود شاہ نواز خاں ہی صلح کی گفتگو چھیڑے گا اور اس طرح حکام دکن اور سلاطین دکن کے ذیشان ایلچیوں پر یہ ظاہر ہوگا کہ صلح کی خواہش خود بیجاپور کی طرف سے کیجارہی ہے اور احمد نگر محض اسے قبول کر رہا ہے۔شاہ نواز خاں ایک ذہین اور معاملہ فہم آدمی تھا، برہان کا مطلب آنکھوں میں تاڑ گیا اور خود مہر بلب ہوگیا حتیٰ کہ وقت گذرنے لگا دونوں طرف سے

اصل معاملہ کی جانب اشارہ تک ہوتا نظر نہیں آتا تھا، آخر کار مصطفےٰ خاں اور عبدالسلام نے از خود مجلس پر یہ ظاہر کیا کہ برہان نظام شاہ کی یہ خواہش ہے کہ ابراہیم عادل شاہ سے صلح ہو جائے، اور یہ اسی کے متعلق گفت وشنید کرنا چاہتے ہیں، تب شاہ نواز خاں بیباکی سے یہ کہہ اٹھا کہ "بر عالمیان ظاہر و روشن است کہ دوستی عالم پناہ نہالے است ثمرش بجز راحت و کامرانی نیست، و انحراف از صراط مستقیم محبت و ولائے شاہ، الت دستگاہ شجریست کہ برش غیر محنت و کلفت سے نے دوستان جانی را دشمن تصور کردن و دشمنان نہانی را دوست داشتن و بگفتہ سیاہ رویان کور باطن لشکر کشیدن از حزم و اندیشہ دور است" ان الفاظ سے برہان نظام شاہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، اور ابراہیم عادل شاہ کی عظمت اور اس کے مقربین درگاہ کی جاں نثاری اور وفاداری کا ایک زبردست ثبوت ملا۔ غرض صلاح اس شرط پر ٹھیری کہ برہان نظام شاہ اپنے ہاتھ سے اس قلعہ کو برباد و مسمار کر دے، گو برہان جانتا تھا کہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت نہیں ہو سکتی، مگر اس وقت ایسا مجبور تھا کہ سوائے اس شرط پر راضی ہونے کے چارہ ہی نہ تھا، چنانچہ وہ قلعہ گیا اور خود اپنے ہاتھ سے اس کا ایک پتھر نکالا اسکے بعد وہ قلعہ ڈھا دیا گیا، اس طرح اس "دلاور خانی جنگ" کا نتیجہ احمد نگر کے حق میں بجز ذلت و رسوائی اور کچھ نہ ہوا، لیکن بیجاپور کے لیے یہ جنگ ایک زبردست کامیابی ثابت ہوئی اور بالخصوص اس جنگ کے واقعات سے ابراہیم کی مستقل مزاجی دانائی اور دور اندیشی کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر ابراہیم نا اہل اور ناسمجھ ہوتا تو یقیناً یہ جنگ اور یہ حملہ بیجاپور کی کایا ہی پلٹ دیتا، لیکن باوجود اپنی کم عمری کے ابراہیم نے اس جنگ میں ایسی مستعدی ہوشیاری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا ہے کہ اچھے اچھے مدبر اس کے سامنے سر ٹیک دیتے ہیں۔ دلاور خاں جیسا گرم و سرد زمانہ چشیدہ شخص جس نے زندگی کے (۸۰) منازل طے کئے ہوں جو کئی ایسے انقلابات دیکھ چکا ہو، یوں عاجز ہو جائے اس کی ساری تدبیریں رائیگاں جائے اور الٹا وہ خود اس جال میں پھنس جائے جس میں ابراہیم کو گرفتار کرنا چاہتا تھا، کس قدر تعجب خیز امر ہے! ابراہیم کا فطری تدبر

۶۔ دوصد سالہ جنتری۔

۷۔ سلیس کہانیاں بچوں کیلیے۔

سید معین الدین قریشی ام اے

۱۔ غالب ڈاکٹر عبداللطیف کی انگریزی کتاب غالب کا ترجمہ۔ ۸؍

محمد منیر الدین ام اے ڈپ ایڈ (اڈنبرا)

۱۔ تکمیل ہندسہ عملی طلبائے عثمانیہ میٹرک کیلیے

۲۔ حل پرچہ جات ریاضی امتحانات عثمانیہ میٹرک۔

میر حسن الدین بی اے ال ال بی

۱۔ مبادی فلسفہ فلسفہ پر عام فہم کتاب۔ ۱۲؍

۲۔ فلسفہ عجم ڈاکٹر اقبال کے مشہور مقالے کا ترجمہ۔

۳۔ برگسان مشہور فلسفی برگسان کے اصول و نظریات۔

۴۔ وفاق اور ریاستیں۔ ۱۲؍

سید وقار احمد ام اے ال ال بی

۱۔ براوننگ براوننگ کی بعض نظموں کا نفیس ترجمہ اور ان پر تبصرہ

۲۔ ہنری چہارم سکسپیر کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ۔

گرو داس بی اے ال ال بی

۱۔ جیون چرتر۔ راجہ رنجیت راے بہادر کی سوانحعمری۔

میر حسن ام اے

۱۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری۔ ۸؍

۲۔ ہوش کے ناخن۔ (ڈراما) ۸؍

مخدوم محی الدین ام اے

۱۔ ٹیگور اور انکی شاعری۔

نبی الحسن شمیم بی اے

۱۔ شعاع امید مصنف کی نظموں کا مجموعہ۔

۲۔ شمیم سخن۔ ‹‹ غزلیات کا مجموعہ۔

۳۔ عالم حسیات۔ ‹‹ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔

احمد بن عبداللہ بی اے

۱۔ کیفی تشریح۔ طلبائے انٹر سائنس کیلیے۔ ۲؍

۲۔ عملی کیمیا طلبائے انٹرمیڈیٹ کیلیے۔ ۲؍

اعظم خاں ام اے

۱۔ اسید الانبیا کارلائل کے مشہور لکچر ہیرو ورشپ کا اردو ترجمہ۔

۲۔ رہنمائے صحت مہاتما گاندھی کی کتاب گائیڈ ٹو ہیلتھ کا ترجمہ۔

بنکٹ پرشاد بی اے ال ال بی

۱۔ حیدرآباد اور ہندو مسلم زندگی۔

ڈاکٹر سید جعفر حسن پی ایچ ڈی (لندن)

۱۔ منتخبات کلام ہندی ہندی کلام اسکی تشریح و تبصرہ

ڈاکٹر حمید اللہ ام اے ال ال بی پی ایچ ڈی (جرمنی) ڈی لٹ (پیرس)

۱۔ نیلگری نیلگری کے متعلق عام معلومات۔

سید رشن راج ام ایس سی

۱۔ طبعیات مکمل عثمانیہ میٹرک کے طلبا سائنس کیلیے

سردار خاں

۱۔ جدید نصاب طبعیات (دو جلدیں) عثمانیہ میٹرک کیلیے

۲۔ جدید نصاب کیمیا۔ ‹‹

عباس حسین لطفی بی اے

۱۔ مصنوعی بیوی ایک دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ۔

محمد عبدالرحمن مدیر وقت

۱۔ قواعد اردو طلبائے مدارس وسطانیہ کیلیے۔

۲۔ سیرت و کردار بچوں کے لیے اخلاق کی کتاب۔

محمد عبدالحفیظ بی اے بی ٹی ام اے (اڈنبرا) ایف ایس سی (لندن)

۱۔ مبادیات سائنس حصہ اول و دوم عثمانیہ میٹرک کیلیے۔

۲۔ حفظ صحت۔ طلبائے مدارس کیلیے۔

محمد عبدالسلام ذکی بی اے بی ٹی

۱۔ شہادت نامہ حضرت امام حسین کے واقعات شہادت

۲۔ گلزار اطفال بچوں کیلیے نظمیں۔

۳۔ چمن زار حکایات بچوں کیلیے۔

۴۔ جذبات عالیہ حمد اور قومی نظموں کا مجموعہ۔

سید نور الحسین بی اے

۱۔ جبر و مقابلہ مدارس وسطانیہ کیلیے۔

۲۔ جغرافیہ طبعی۔ ‹‹

محمد عبدالشکور بی اے

۱۔ التدبیر۔ ایک معاشرتی ناول۔

عبدالقادر وفا (عثمانیہ)

۱۔ خواب راحت۔ فلمی ڈراما

۲۔ دیوان وفا۔

احمد عبداللہ المسدوسی بی اے ال ال بی

۱۔ اسوۂ حسنہ آنحضرت صلعم کے اخلاق و عادات کا مرقع۔

عبداللطیف بی۔ اے

۱۔ عملی ہندسہ۔ عثمانیہ میٹرک کیلیے۔

۲۔ علم مساحت۔ ‹‹ ‹‹

محمد عبدالوہاب بی اے بی ای

۱۔ جداول ریاضیہ طلبائے مدارس کیلیے۔

عزیز احمد بی اے

۱۔ فرانسیسی افسانے فرانسیسی افسانوں کا ترجمہ۔

غلام طیب بی اے

۱۔ دیسی کہانیاں۔ بچوں کیلیے۔

محسن بن شبیر بی اے

۱۔ یوسف ہندی قید فرنگ میں۔

محشر عابدی بی اے

۱۔ محشرستان مصنف کے افسانوں کا مجموعہ۔

محمد احمد عثمانی بی اے ام ایس سی

۱۔ طبعیات عملی۔ انٹرمیڈیٹ سائنس کیلیے۔ ۸؍

۲۔ مبادی سائنس طبعیات کا ابتدائی رسالہ۔

نجم الغنی (عثمانیہ)

۱۔ انجیا الاشلیہ ارسن اور دوسرے مصنفین کے مضامین کا ترجمہ

ندیم اختر تانیتری بی اے

۱۔ اردو کی نوعیت۔ زبان کی سرگزشت۔

نوراللہ محمد نوری

۱۔ شرح انتخاب دیوان غالب۔ ۱۲؍

میر محمود علی ام اے

۱۔ آصف جاہ ثانی میر نظام علیخاں کی سوانحعمری۔ ۱؍

۲۔ گلدستہ تاریخ عثمانیہ میٹرک کیلیے ۱۲؍

ملنے کے پتے: ۱۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن ۲۔ محمد علی احمد حسین تاجر کتب حیدرآباد دکن ۳۔ سید عبدالقادر تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن۔ ۴۔ مکتبہ علمیہ حیدرآباد دکن۔ ۵۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی ۶۔ دفتر مجلس علمیہ بازار گھانسی حیدرآباد دکن۔

مجلّۂ طیلسانئین

۱۔ مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شائع ہوگا۔

۲۔ اس رسالہ میں طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں، اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شائع ہونگے جو جامعہ عثمانیہ کی ام، اے اور ام یس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کیے گئے ہیں۔ نیز انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روئداد بھی پیش کی جائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابل اشاعت متصور نہ ہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریداران بلدہ حیدرآباد اور خریداران اضلاع سے ۱۲/ بشمول محصول ٹپہ۔

۶۔ زر چندہ اور تمام مضامین ناظم و نشر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلئے ناظم اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مطبوعات مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ

۱۔ اردو ادب بیسویں صدی میں

تالیف مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ایم اے

موجودہ صدی کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ .... قیمت ۱۲ار

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست

تالیف مولوی سید علی محسن صاحب ام، اے ری سرچ اسکالر (جامعہ عثمانیہ)۔ عادل شاہی ریاست کے دورِ تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ .... قیمت عاں

(ملنے کے پتے)

(۱) دفتر مجلس علمیہ گھانسی بازار حیدر آباد دکن۔

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ "

(۳) بک اسٹال جامعۂ عثمانیہ۔ "

(۴) مکتبہ علمیہ چار مینار۔ "

(۵) مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دھلی

(۶) صدیق بک ڈپو لکھنو۔

مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد دکن

صدر

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو ادبیات جامعۂ

۲۔ عبدالمجید صدیقی ام، اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ — رکن

۳۔ غلام دستگیر رشیدؔ ام، اے (عثمانیہ) لکچرار فارسی نظام کالج — 〃

۴۔ سید محمد ام، اے (عثمانیہ) لکچرار اردو و فارسی گورنمنٹ سٹی کالج — معت

جلد اول — نمبر ۴
اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء — آبان سنہ ۱۳۴۶ف

ناشر مجلس علمیہ طیلسانین جامعہ عثمانیہ، گھانسی بازار حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

اداریہ

اس نمبر کی اشاعت پر "مجلۂ طیلسانئین" کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اس نمبر میں دکن کی تاریخ سے متعلق ایک اور دلچسپ و تحقیقی مقالہ "سلطان احمد شاہ ولی بہمنی" پر مولوی ظہیرالدین صاحب ام۔اے کے قلم سے شایع ہو رہا ہے۔ سلطان احمد شاہ کو سلطنت بہمنیہ کے نہ صرف ایک بڑے فرمانروا کی حیثیت سے بلکہ دکن کے مشہور شہر بیدر کے آباد کرنے اور اس کو دکنی مملکت کا پایہ تخت بنانے، نیز ایک صاحب کشف و کرامت بزرگ ہونے کے لحاظ سے تاریخ دکن میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کے مد نظر یہ مقالہ بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ مقالہ نگار خود بھی بیدر کے رہنے والے اور "درگاہ سلطان" سے متعلق خاندان کے ایک رکن ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں، بلکہ بعض نایاب مخطوطات اور اہم اسنادات کی مدد سے یہ مقالہ تیار کیا ہے۔

سال نو سے مجلۂ ہذا کی مجلس ادارت میں ایک اور مستعد نوجوان رکن کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہماری جامعہ کے ایک ہونہار سپوت مہندر راج سکسینہ صاحب ام۔ایس سی ہیں۔ آپ کو حیاتیات کے علاوہ جس میں آپ نے بدرجۂ اوّل ام۔ایس سی کی ڈگری حاصل کی ہے! ادبیات سے بھی بہت دلچسپی اور ذوق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی ادبی خدمت گزاری کا بھی شوق رکھتے ہیں۔

مجلے کی آیندہ اشاعتوں میں معاشیات اور تعلیم عامہ کے مسایلِ حاضرہ پر کارآمد اور عمدہ مضامین کا بطور خاص اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں "دبستانِ معاشیات" قایم ہو جانے کی وجہ سے ملک میں بہت جلد ایسے ہونہار ماہرین معاشیات پیدا ہو جائیں گے جو ہماری سماجی زندگی کے مختلف معاشی مسایل پر نظری و عملی دونوں

حیثیتوں سے غور و فکر کرنیکے علاوہ معاشی ترقی اور دیہات سدھار کے کاروبار میں حکومت اور پبلک دونوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔ دورِ حاضر میں سیاسی کشمکش سے معاشی کشمکش ہی زیادہ بڑھی ہوئی ہے اسی کے دانشمندانہ حل پر بہت سی سیاسی گتھیاں سلجھ جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔

اس سال "کل ہند معاشی کانفرنس" بھی جامعہ عثمانیہ کے زیر سرپرستی حیدرآباد میں منعقد ہو رہی ہے نیز یہاں کی مقامی "انجمن معاشیات" جس کے ارکان میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ ملک کے بہت سے حضرات بھی جن کو اس اہم موضوع سے دلچسپی ہے شریک ہیں، تقاریر وغیرہ کے ذریعے اہل ملک میں معاشی بیداری پیدا کرنے میں کوشاں ہے۔

دو سال قبل تعلیم کی تنظیم جدید کے لیے ڈاکٹر سیکنزی آنجہانی اور خان فضل محمد خاں صاحب سابق ناظم تعلیمات کی جو کمیٹی حکومت سرکار عالی نے مقرر فرمائی تھی اس نے اپنا کام ختم کر دیا اور مجملاً حسب ذیل امور کی سفارش کی ہے

۱۔ تعلیم عامہ کو ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی، اور جامعاتی چار مختلف مدارج میں تقسیم کر دیا جائے۔ ابتدائی درجے کی مدت تعلیم پانچ سال، ثانوی کی چار سال، اور اعلیٰ ثانوی و جامعاتی کی تین تین سال ہونی چاہیئے۔

۲۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے انتظام و نگرانی کے لیے ناظم صاحب تعلیمات کی صدارت میں ایک مجلس قایم کی جائے جس میں جامعہ اور سررشتۂ تعلیمات کے نمایندوں کے ساتھ ساتھ مختلف متعلق تعلیم سررشتہ جات اور پبلک کے نمایندے رکن ہوں گے۔

۳۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارج کے ختم پر اس مجلس کی طرف سے دو پبلک امتحان منعقد کر کے اسنادات دیئے جائیں۔

۴۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی مدارج میں ادبی تعلیم کے ساتھ صنعتی اور زراعتی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے، تاکہ طلبہ میں عام طور پر ان مدارج کی تکمیل کے بعد جامعاتی تعلیم پانے کا جو میلان پایا جاتا ہے کم ہو جائے، اور ان کے لیے ایسی تعلیمی راہیں کھلی رہیں جن سے وہ مختلف کارآمد فنون کی تحصیل کر سکیں۔

حکومت سرکار عالی نے ان تجاویز کو قبول فرما کر ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے احکام بھی صادر فرما دیئے ہیں۔ "مجلس تعلیم ثانویہ" کی تشکیل بھی عمل میں آچکی ہے، اور اس کا پہلا اجلاس بھی منعقد ہو چکا ہے، جس میں تعلیم ثانویہ کے

صدر اعلیٰ عالیجناب مرشد زادہ نواب بسالت جاہ بہادر، اور ہمارے ماہر وزیر تعلیمات نواب مہدی یار جنگ بہادر نے بصیرت افروز افتتاحی تقریریں فرمائیں۔ سررشتۂ تعلیمات نے مولوی سید محمد اعظم صاحب ام اے، بی ایس سی پرنسپل سٹی کالج کی صدارت میں ایک ذیلی کمیٹی بھی اس غرض سے مقرر کی علمی نقطۂ نظر سے میکنزی رپورٹ پر غور کر کے ان کے نفاذ کی تجاویز پیش کی جائیں۔ اب اس کمیٹی کی عملی تجاویز صدر مجلس کے زیر غور ہیں۔

اگرچہ بادی النظر میں میکنزی کمیٹی کی تجاویز بہت سلیس اور صاف معلوم ہوتی ہیں لیکن عملی نقطہ نظر سے ان کے نفاذ میں گوناگوں دشواریاں ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت صنعتی تعلیم نفی کے برابر ہے صنعتی تعلیم کا ایسا بندوبست کہ صنعتی مدارس کے تعلیم یافتہ اپنی تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی روزگار سے لگ جائیں اور بے روزگاری کے احتمالات باقی نہ رہیں، کچھ آسان کام نہیں بعض لوگ موجودہ تعلیم یافتہ بے روزگاری کو تشویشناک نظروں سے دیکھ کر بہت شدومد سے صنعتی تعلیم کی حمایت کرنے لگتے ہیں لیکن تاوقتیکہ ملک میں صنعتی ترقی کے مواقع پیدا نہ ہوں اور ملک کو حقیقی معنوں میں صنعتی نہ بنایا جائے صنعتی تعلیم کا خیال ایک خوشنما تخیل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا صنعتی تعلیم کے رواج و نفاذ کے لیے جو کثیر رقم درکار ہوگی اس سے قطع نظر ان مدارس کے تعلیم یافتوں کی کھپت کا سوال بھی کچھ کم اہم نہیں غرض یہ مسئلہ مختلف وجوہ سے ایک خارزار سے کم نہیں۔ لیکن اس کی توقع رکھنی چاہیے کہ ہمارے ماہر تعلیم عہدہ داران سررشتہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر ان تجاویز اور خصوصاً ذیلی کمیٹی کی عملی تجاویز کی روشنی میں ہمارے ملک کی تعلیمی کشتی کو ہر طرح خطروں سے بچا کر سلامتی کے ساحل پر لے جائیں گے۔

ابتدائی تعلیم کو ممالک متمدن کی طرح ہمارے ملک میں عام لازمی اور جبری بنانے اور اس کے لیے ضروری قوانین کی ترتیب و تدوین کا خیال، کیا حکومت، اور کیا پبلک دونوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ یہ امر ہر ترقی پسند باشندۂ ملک کے لیے یقیناً موجب مسرت ہوگا کہ حکومت عنقریب اس بارے میں ملک کی مجلس مقننہ میں مسودۂ قانون پیش کرنے والی ہے۔ پبلک کی طرف سے دو مسودے قبل ازیں پیش کیے جا چکے ہیں۔ ایک آنجہانی پنڈت وامن نایک کا مرتبہ ہے، اور دوسرا انجمن طیلسانیین کے صدر نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کا۔ حیدرآباد میں اگرچہ تعلیم کا چرچا بہت دنوں سے ہے لیکن اب تک ابتدائی تعلیم کی طرف ایسی توجہ منعطف نہ کی جا سکی جس کی وہ مستحق ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ کے قیام اور اس کے ماتحت مختلف شعبوں کے افتتاح و توسیع سے

ایک گونہ ترقی کرلی ہے، اس کا لازمی نتیجہ ایک عام تعلیمی بیداری کی صورت میں یوں ظاہر ہوا کہ پبلک ابتدائی تعلیم کو جبری بنانے کی خود بخود طالب ہو رہی ہے، اور جیسا کہ مسودات قانون کے مرتب بتاتے ہیں وہ اس سلسلے میں مزید محصول تعلیم بھی ادا کرنے کے لیے آمادہ ہے لیکن ہماری فیاض حکومت خود ہی اس بارے میں پیشقدمی فرما رہی ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ماہر وزیر تعلیمات کی قیادت میں بہت جلد یہ قوم ساز تحریک عملی صورت اختیار کرلے گی۔

---

۲۹ رمہر ۱۳۴۶ف کو بلدیۂ حیدرآباد کے سہ سالہ انتخابات عمل میں آئے عثمانیہ بلدی جماعت نے اس موقعے پر مختلف حلقوں سے گیارہ امیدوار کھڑے کیے تھے، بحمداللہ حسب ذیل نو امیدوار کامیاب ہوئے، جن میں ایک بلا مقابلہ منتخب ہوئے:۔

۱۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب ام اے ال ال بی۔

۲۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب ام اے۔

۳۔ مولوی شاہ عالم خاں صاحب (بلا مقابلہ)۔

۴۔ پنڈت گنڈے راؤ صاحب ہروالکر بی اے۔

۵۔ پریم جی لال جی صاحب۔

۶۔ حکیم نارائن داس صاحب۔

۷۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب۔

۸۔ مولوی امراللہ صاحب بیرسٹر۔

۹۔ کرشنا سوامی مدیراج صاحب۔

طیلسانیوں کی نشست کے لیے ہماری انجمن کے صدر نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر امیدوار ہیں، اور توقع ہے کہ وہ بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

ہم ان تمام کامیاب امیدواران جماعت کو مبارک باد دیتے ہوئے متوقع ہیں کہ عثمانیہ بلدی جماعت جن اعلیٰ اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر قایم کی گئی ہے ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے یہ تمام ارکان بلدیہ صحیح اجتماعی روح عمل کو کام میں لائیں گے، اور اپنی متحدہ کوشش سے بلدۂ حیدرآباد کی

شہری ضروریات کی بہ احسن الوجوہ تکمیل کریں گے۔ عثمانیہ بلدی جماعت، ایک ایسا بلدی ادارہ ہے جو طیلسانیوں اور دیگر ترقی پسند شہریوں کے اتحاد عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اس کا نصب العین بلا لحاظ مذہب و ملت محض شہر کی بلدی خدمتگزاری ہے۔ ایک ایسے ادارے کے نمایندوں میں خود یا سپرٹ ہونی چاہیئے کہ شخصی مفاد کے مقابلے میں جماعتی مفاد کو ترجیح دی جائے۔

اس سال آذر کے دوسرے ہفتے میں حسب معمول طیلسانیین عثمانیہ کی کانفرنس منعقد ہوگی۔ یہ کانفرنس انجمن طیلسانیین کا سالانہ جلسہ ہونے کے علاوہ، بلدہ و اضلاع کے طیلسانیین کا ایک سالانہ اجتماع اور مختلف مسائل پر باہمی بحث و گفتگو کی ایک دلچسپ تقریب ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کانفرنس کے لیے باضابطہ قواعد بنے ہوئے نہیں تھے اس دفعہ کابینۂ انجمن نے خاص اس غرض کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی، جس نے ضروری قواعد ترتیب دے کر پیش کیے، اور انجمن کے ایک جلسۂ عام میں یہ قواعد منظور ہوکر سال حال سے نافذ ہو گئے ہیں۔ ان قواعد کے بموجب ہر سال کانفرنس کا صدر وہی ہوگا جو انجمن کے لیے بہ غلبۂ آرا صدر منتخب ہو۔ چنانچہ اس سال طیلسانی برادری کے ایک پُرجوش رُکن مولوی کلیم الدین انصاری صاحب بی، اے، ال، ال، بی وکیل ہائیکورٹ صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے انتخاب پر مبارک باد دیتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ آپ کے جوش عمل اور جذبۂ خلوص سے انجمن مثل سابق اس سال بھی غیر معمولی ترقی حاصل کرے گی، اور کانفرنس بھی مفید تجربات، تقاریر کے علاوہ عملی کام کی طرف قدم بڑھائے گی۔

اُدارۂ ادبیۂ نے جو ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ کی نگرانی و ادارت عمومی میں کئی سال سے اُردو ادب کی خدمت کر رہا ہے، دکن کے قدیم و جدید اساتذۂ سخن کے دلکش انتخابات کا ایک سلسلہ شایع کرنا شروع کیا ہے۔ عہد قطب شاہی و عادل شاہی کے قدیم شعرائے دکن کے بعد صرف ولی اورنگ آبادی ہی ایک ایسا شاعر اعظم گذرا ہے جس کا کلام سارے ہندوستان میں مشہور اور مقبول ہوا۔ اس کے بعد کے زمانے اور عہد آصف جاہی کے شعراء کا کلام عام طور پر قلمی دیوانوں کی صورت ہی میں رہا، اور سوائے چند

خاص خاص شعراء کے جن کا ذکر اردو کے تذکروں میں ملتا ہے، اس دور کے بہت کم شاعر مشہور ہوئے۔ اب "ادارۂ ادبیہ" نے ان شاعروں کے منتخب کلام کی اشاعت کا انتظام کرکے نہ صرف ملک کے لایق قدر شاعروں کو روشناسِ عوام کرایا ہے، بلکہ اردو ادب میں بھی ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس وقت تک اس سلسلے میں حسب ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں اور ہر کتاب میں اس خاص شاعر کے حالات اور اس کے کلام پر تبصرے کے علاوہ دکن کی اردو شاعری پر ایک مختصر مقدمہ ہے: ۔

۱۔ کیفِ سخن ؍ کلام سید رضی الدین حسن کیفی

۲۔ بادۂ سخن ؍ ڈاکٹر احمد حسین مائل

۳۔ متاعِ سخن ؍ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

۴۔ سراجِ سخن ؍ شاہ سراج اورنگ آبادی

۵۔ ایمانِ سخن ؍ شبیر محمد خاں ایمان

۶۔ فیضِ سخن ؍ حضرت شمس الدین فیض

اُردو ڈرامے کا آغاز

اُردو میں بڑے بڑے باکمال شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے تمام اصنافِ سخن سے زبان کو مالا مال کیا۔ غزلیں، واسوخت، مرثیے اور مثنویاں لکھیں مگر ایک عرصہ تک کسی نے ڈراما نہ لکھا۔ واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے عہد تک اُردو زبان ڈرامے کے عنصر سے ناآشنا ہی رہی۔ امانت پہلا شخص ہے جس نے "اندر سبھا" کے نام سے ایک اُپیرا لکھا اور ڈرامے کی صنف کو مقبول بنایا۔ امانت کی "اندر سبھا" کا اُردو میں وہی درجہ ہے جو نکولس اوڈل کے طربیہ "رالف رائسٹر ڈائسٹر" کا انگریزی ادب میں ہے اس لیے ہم امانت کو اُردو ڈرامے کا ابوالآبا کہہ سکتے ہیں۔

یونانی اور ہندی ڈرامے کی طرح اُردو ڈرامے کا آغاز معبدوں اور مذہبی تہواروں سے نہیں ہوا بلکہ اس نے اودھ کے نشاط آفریں دربار میں جنم لیا، اور عیش و عشرت، شعر و موسیقی کے ماحول میں آنکھ کھولی یہی وجہ ہے کہ پہلا ہی ڈراما غنائیہ نکلا، جو یکسر اپنے زمانہ کے عیش پرستانہ واقعات کا سچا مرقع ہے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ کیوں ایک طویل عرصہ تک ڈرامے سے اُردو کا دامن خالی رہا، ہمیں زبان اُردو کی ترکیب اور اس کی دوسری سرپرست زبانوں کے ادب پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ہندوستان میں مسلمان حملہ آوروں اور فاتحین کی زبان بعد اسلامی فارسی تھی جس میں عربی کا جز شامل تھا، اور مفتوح ہندوؤں کی زبان مختلف پراکرتوں پر مشتمل تھی۔ دو قوموں کے تصادم نے باہمی اجنبیت اور گونگے پن کو دور کرنے کے لیے ایک درمیانی راہ نکال لی۔ ہر فریق اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے مجبور تھا کہ فریق ثانی کی زبان سے تعلق پیدا کرے اور اس سے کچھ لے چنانچہ ضرورت کے اسی دباؤ نے ایک نئی زبان کی بنیاد ڈالی جس میں فارسی اور مقامی بولی برج بھاشا کی آمیزش تھی، اور اسی نے رفتہ رفتہ اُردو کی شکل اختیار کر لی۔ عربی آمیز فارسی اور کسی قدر سنسکرت آمیز برج بھاشا اُردو کے اجزائے ترکیبی بن گئے۔

بہ نسبت سنسکرت اور ہندی کے عربی اور فارسی اُردو کے زیادہ معاون رہے ہیں اسی وابستگی کا نتیجہ ہے کہ اُردو شاعری اب تک فارسی سانچوں اور فارسی روایات سے خود کو علٰحدہ نہ کر سکی چونکہ فارسی کے خون میں ڈراما کا عنصر تھا ہی نہیں اس لیے اُردو بھی جو بالکل فارسی کے قدم بہ قدم چل رہی تھی اس صنفِ ادب سے بیگانہ ہی رہی۔

عربی ڈراما | اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں عربی اور فارسی ادب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

عربی ادب کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں ڈراما نہایت ہی ابتدائی مدارج سے آگے بڑھ نہ سکا۔ چنانچہ اب تک بھی ڈراما کا یہ قحط موجود ہے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ پیدا ہو گیا ہے اس کی نوعیت مغربی تراجم یا زیادہ سے زیادہ مغربی نمونوں کی تقلید میں لکھے ہوئے ڈراموں سے بڑھ کر نہیں۔ ہاں اس سے پہلے ان کی بجائے مقامات یا چھوٹے چھوٹے افسانے اور مکالمے رائج تھے جن پر شکل سے ڈراما کا اطلاق ہوتا ہے۔

راوی | عرب میں زمانۂ قدیم میں راویوں کا گروہ تھا جو بازاروں، میلوں اور خاص خاص تقریبوں کے موقع پر "الف لیلا" کے قصے بیان کرتا جیسا کہ خود ان قصوں سے واضح ہوتا ہے ان میں خاصی ڈرامائیت موجود ہے۔ راوی انھیں قصوں کو ڈرامائی شان سے بیان کرتے تھے۔ زبان کی مطابقت کے لحاظ سے چہرے کا اُتار چڑھاو، آواز اور لہجے کا تغیر و تبدل۔ ہاتھ پاؤں اور جسم کے دیگر اعضا کی موزوں و متناسب حرکتیں۔ بیان میں قوت اور ڈرامائیت پیدا کرتی تھیں اس قسم کے عوامی ادب (فوک لور) کو "مقامات" کی صورت میں حریری، ہمدانی اور دیگر شعرا نے بامِ کمال پر پہنچایا۔ مقامات میں گداگروں، سیاحوں، عالموں اور قومی جاں بازوں کی تقریریں اور ان کے کارنامے نہایت واضح اور پُر اثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ جواہر پارے اب بھی عربی ادب کے ناقابلِ فراموش اجزا ہیں۔

خیال الظل | ڈرامائی فن کی ایک شکل کو جسے عربوں نے ترقی دی وہ پتلیوں کے تماشے ہیں جسے "خیال الظل" کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ فن خود عربوں کی اختراع نہیں بلکہ دوسروں سے ماخوذ ہے۔ ان تماشوں کے متعلق جتنی بھی معلومات ہیں وہ علامہ جیکب[1] کی مرہونِ منت ہیں۔ انھوں اس موضوع پر تحقیق کی۔ انھیں تحقیقات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے یہ فن مشرق بعید سے حاصل کیا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن جلد ۴ "عربی ڈراما"

یہ کہ کس دور کے اور کہاں کے مسلمانوں نے اس عجیب و غریب ناٹکی فن کو ترقی دی، کہنا مشکل امر ہے۔ مگر آثار اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب مسلمانوں نے اس فن کو حاصل کیا۔ ابن حاجر کی روایت ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں سلطان صلاح الدین کے سامنے قاہرہ میں اس قسم کے تماشے دکھائے گئے۔

مقلدی یا حاکی ہدرووِی ٹ[1] کے قول کے مطابق عربوں میں اداکاری کا قدیم ترین نمونہ ان کے فن "مقلدی" میں ملتا ہے۔ حاکی یا مقلد اس شخص کو کہتے تھے جو مختلف قبیلوں کی زبان ان کے تلفظ اور مخرج کے علاوہ مختلف جانوروں اور پرندوں کی بولیوں کی نقل کیا کرتا تھا۔ جدید مصر میں اب بھی اس قسم کی دلچسپی پیدا کر کے روزی کمانے والے افراد پائے جاتے ہیں گو اب وہ مقلد نہیں رہے۔

غرض ایسی ابتدائی شکلیں ہر ملک اور زبان میں موجود ہوتی ہیں مگر ہم انھیں حقیقی معنوں میں ڈراما نہیں کہہ سکتے۔ باوجود ان ابتدائی ڈرامائی عناصر کے عربوں نے جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے باضابطہ ڈرامے کی صورت نہ دیکھی، اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عرب کسی زمانہ میں بھی قومی اسٹیج کے مالک رہے ہوں۔ ڈرامے کا یہ افلاس پوری سامی اقوام پر مسلط ہے۔ واقعات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما سامی مزاج کے موافق ہی نہیں تھا۔

اسلام نے عربوں کی بت پرستانہ اور توہمانہ ذہنیت کا سد باب کر کے توحید کا ایسا اعلیٰ اور مکمل تخیل پیش کیا کہ زندگی کا سنگین سے سنگین واقعہ مشیت ایزدی کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے افراد کی جذباتی آوارگی اور ذہنی بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ محرکات فنا ہو گئے جس کی وجہ سے ڈراما یا اور کوئی تخلیقی ادب پیدا ہوتا ہے۔ اسلام عمل کا مکمل نمونہ بنکر طلوع ہوا، اور عرب اس نئے نظام زندگی کو لیکر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تاکہ دنیا کو اس کا عامل بنائیں۔ ان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو گرنے نہ دیا۔ اسی انفرادیت، احساس خودی، مسلسل کشمکش اور رزم آرائی نے انھیں فرصت نہ دی کہ وہ غیروں کے اصناف ادب پر توجہ کرتے اور یوں بھی اسلام کا رجحان فنون لطیفہ کے مقابلہ میں ہمیشہ معاندانہ ہی رہا۔ اسلام کی اسی افادیت پسندی نے جمالیاتی پہلو کو اس درجہ معطل کر دیا کہ اب تک یہ کمی پوری نہ ہو سکی پہلے تو عربوں میں ڈراما تھا ہی نہیں، اور اگر مفتوح اقوام سے تعلق پیدا ہونے کے بعد اس صنف ادب سے

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد ۴ "عربی ڈراما"

آشنائی ہوئی بھی تو اسے لہو و لعب اور اپنے مسلک کے خلاف تعبیر کر کے درخور اعتنا نہ سمجھا۔

ایران | علامہ دوزی کا بیان ہے کہ ایران میں ڈراما قدیم الایام سے ہے۔ ممکن ہے ناٹک کی ابتدائی شکلوں کے آثار عہد عتیق میں پائے جاتے ہوں مگر بعد اسلامی فارسی میں عربی تمدن اور معاشرت کی بدولت ایک مدت تک ڈرامے کا وجود کالعدم رہا۔ ایرانی ایک زمانہ تک عربوں ہی کی سنت پر کاربند رہے مگر جب سولھویں صدی عیسوی میں ایران میں شیعیت کو فروغ ہوا تو اہل فارس نے شہدائے کربلا سے عقیدت کا اظہار کر کے ثواب دارین حاصل کرنے اور محبت اہل بیت کو مستحکم کرنے کے لیے تعزیہ ایجاد کیا۔

یہ مجالس تعزیہ محرم کے ابتدائی دس دن میں منعقد ہوتی ہیں جس میں شہدائے کربلا کی مصیبتوں کو تمثیل کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایران میں "ڈرامے" کو "تمثیل" کہتے ہیں جس کے لغوی معنے "صورت بستن کسے را" کے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک انفرادی اور دوسرے مجلسی۔ انفرادی تمثیل مغرب کے مونولوگ ہند کے بھاؤ نا اور عرب کے راوی اور مقلد کی مترادف ہے۔ مجلسی کی دو قسمیں ہیں، ایک تماشہ (طربیہ یا فارس) دوسرے تعزیہ (ٹریجڈی حزنیہ)

تماشا کرنے والوں کو لوطی یا تماشچی کہا جاتا ہے جن کی حیثیت مداریوں، داستان گویوں سے زیادہ نہیں مگر جو لوگ محرم میں مصائب کربلا بیان کرتے ہیں انھیں روضہ خواں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ گروہ ایرانی سوسائٹی کے لوازمات سے ہے۔

تعزیہ | سولھویں صدی سے انیسویں صدی تک تعزیہ میں صرف مرثیہ خوانی ہوا کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ تعزیوں نے تمثیلی رنگ اختیار کیا۔ ان تعزیوں کے لکھنے والے کون تھے نہیں بتایا جا سکتا عموماً ہوتا یہ تھا کہ اداکاروں کو واقعات سمجھا دیئے جاتے تھے اور ہر اداکار اپنا اپنا مکالمہ برجستہ اور فی البدیہہ خود ہی بنا لیتا تھا۔

تعزیئے عموماً کھلی ہوا میں پیش کیے جاتے تھے۔ باقاعدہ مستقل اسٹیج اور پردوں[1] سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ ایک معمولی اور عارضی چبوترہ اسٹیج (مصطبہ) کا کام دیتا۔ ایکٹروں کے آنے جانے کے لیے اس کے گرد کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چبوترے سے باہر تماشائیوں کی نشستوں کا انتظام ہوتا ہے۔ تمثیل شروع

---

[1] ناٹک ساگر سے ماخوذ۔

ہونے کے اعلان کے لیے بندوق یا توپ سرکی جاتی۔ اصل تمثیل شروع ہونے سے پہلے پردلوگ یا گلمہ کے طور پر تعارفی تمثیلچہ ہوتا ہے تاکہ آیندہ واقعات کے لیے فضا پیدا ہو جائے، مثلاً امیر تیمور اسٹیج پر آکر حضرت حسینؑ کی شہادت کا ماتم کرتا ہے۔ خوارج کے خلاف انتقام اور غصے کے جذبات بھڑکاتا ہے۔ یا برادران یوسفؑ کی بے وفائی کا نظارہ دکھا کر اُمتِ محمدیہ کی آلِ رسولؐ سے برسرِ پیکار ہونے کا امکان ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر خود حضرت امام تشریف لا کر دعا کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کی شفاعت ہو۔ آخر میں ایک منظر دکھایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعا مستجاب ہو گئی، اور ان لوگوں کے لیے جنت کے دروازے کھُل گئے، جنھوں نے سیدالشہدا کی مدد کی یا ان کی یاد میں ایک آنسو بھی بہایا۔ اس کے بعد اصل تعزیہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سقوں کی ایک جماعت مشکیزے اُٹھائے "بیادِ تشنہ لبِ کربلا" کے نعرے لگاتی ہوئی داخل ہوتی ہے، یہیں سے ماتم شروع ہوتا ہے۔ اسکے بعد تعزیے کے دوسرے ارکان داخل ہوتے ہیں جن میں رسول اللہؐ، دیگر انبیا، فرشتے، پنجتن پاک، دیگر اہل بیت، اصحاب ثلاثہ، حُر، معاویہ، یزید اور شمر، ابن سعد شامل ہوتے ہیں۔ احتراماً پیغمبروں، فرشتوں اور عورتوں کے کردار چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ مکالمے بہت پُراثر اور دلدوز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حاضرین کے جذبات میں انتہائی ہیجان پیدا ہوتا ہے اور انتقام کے جذبے کی فراوانی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ شمر اور یزید کے ایکٹروں پر زبانی لعن طعن کی بارش ہوتی ہے اور آخر میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے یہ کام قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے رام لیلا کرشن لیلا یورپ کے جذباتی ڈرامے (پیشن پلیز) اور ایران کے تعزیوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔ جس طرح ہندو اور عیسائی ڈراموں میں پنڈت برہمن اور کلیسا کے پادری ہی اداکاری کی خدمات انجام دیتے تھے اسی طرح تعزیوں میں بھی شرفا اور معززین ہی کام کرتے تھے۔ ایسا کرنا حصول برکت اور ثواب دارین کا وسیلہ خیال کیا جاتا تھا غرض یہ طرز تمثیل پورے اسلامی تمدن میں آپ اپنی مثال ہے جو سراپا عجمی ہے۔ افسوس کہ ان روایات کی بنیادوں پر ادبی ڈرامے کی مستقل عمارت کھڑی نہ ہو سکی۔

تعزیے اودھ میں | جب مذہبی اعتبار سے اودھ کی سلطنت، دولت صفویہ کی جانشین قرار پائی اور حکومت کا مذہب تشیع ہو گیا تو وہ تمام مراسم جو شیعہ تمدن کے جزو تھے لکھنؤ میں بھی منتقل ہو گئے۔ چنانچہ ایران کا تعزیہ بھی ہندوستان میں آیا جس میں اُمرا کی جدت طراز طبیعتوں نے بہت کچھ اضافے کیے۔

جب شیعیت کو شاہی سرپرستی نصیب ہوئی تو لکھنؤ کے امام باڑے مذہبی اسٹیجوں کا مرکز بن گئے۔ شرر کا بیان ہے کہ "غفراں مآب[1] کے امام باڑے میں نویں محرم کو جو مجلس ہوتی تھی وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی تھی جس میں شریک ہونے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے، اثنائے بیان میں حاضرین کے سامنے اونٹ لائے جاتے تھے جن پر سیاہ پوش کجاوے اور محملیں ہوتیں اور مومنین کو وہ منظر یاد آجاتا کہ دشت کربلا میں اہل بیت کا لٹا ہوا اور تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی اور ستم زدگی کی شان سے شام کی طرف چلا تھا۔ مجلس پر اس المناک منظر کا ایسا اثر پڑتا کہ ہزارہا حاضرین میں سے دس بیس کو غش ضرور آجاتا جو بڑی مشکلوں سے اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچائے جاتے تھے"۔ محرم کی مجلسوں میں اسی ڈرامائی عنصر کے شامل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے ذریعے واقعات کربلا کے پُرالم مناظر پیش نظر کر دیے جاتے۔ زنانی اور مردانی مجلسوں میں ذاکروں کی حدیث خوانی کی بجائے اسٹیج پر کربلا کے واقعات کو تمثیل کے ذریعے دکھلایا جاتا تھا۔

تعزیہ اور دکن | ہندوستان میں ان تعزیوں کا ایک اور بڑا اہم اور قدیم مرکز قطب شاہیوں کا دکن ہے۔ تاجداران قطب شاہی کی سرپرستی میں مراسم عزا نے بھی خاص ترقی کی۔ غلامی، ہاشم، قادر، وجہی جیسے عدیم المثال مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے اور محرم نے اتنی اہمیت حاصل کرلی کہ یہ کسی خاص فرقے کا تہوار نہ رہا، بلکہ اس میں ہندو، شیعہ، سنی سب برابر کے حصہ دار بن گئے۔ سب علم استاد کرتے ہیں، مرثیے پڑھتے ہیں، علموں پر منتیں چڑھاتے ہیں۔ ان مراسم کے ساتھ ساتھ دکن میں ایرانی تعزیے کی صورت بھی برابر جاری رہی۔ پندرہ سال پہلے تک حیدرآباد میں ایسی مجلسیں ہوتی تھیں جن میں واقعات کربلا کو تمثیل کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا جس میں باضابطہ اسٹیج اور پردے استعمال کیے جاتے۔ خوش اعتقادی کیساتھ شرفا اداکار بنتے۔ چنانچہ عون عباس کے ہاں محرم میں دسویں تک اسٹیج اور پردوں کے ساتھ روزانہ واقعات کربلا اداکاری کے ذریعے پیش کیے جاتے تھے۔ مناظر ایسے دردناک ہوتے اور ان کا اثر حاضرین پر ایسا ہوتا کہ ماتم میں اداکاروں اور مجلسیوں کا امتیاز اٹھ جاتا جس کی وجہ سے منظر حد درجہ دل ہلا دینے والا بن جاتا۔

---

[1] "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"

اعلیٰحضرت حضور نظام میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے اپنی اصلاحات کے سلسلہ میں اس قسم کی مجلسوں کو موقوف فرمادیا۔

اداکارانہ مظاہروں کے سلسلے میں محرم بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سانگ اور رنگ ڈرامے کی ابتدائی شکلیں کچھ عرصہ پہلے تک عوام میں رائج تھیں جن کے مظاہرے لیلیٰ مجنوں اور گوپن کے ناچ کی صورت میں محرم کے دنوں میں سڑکوں پر ہوا کرتے تھے۔ ان واقعات پر آیندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف ایرانی ڈرامے پر تبصرہ کرنا مقصود تھا مگر تعزیے کے سلسلے میں ضمناً ہندوستان کا ذکر بھی ناگزیر ہو گیا۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قدیم ایران میں باضابطہ ڈرامے کا وجود نہیں ہے! البتہ تعزیوں کا وجود ملتا ہے جن کا دائرۂ عمل واقعات کربلا اور مصائب اہل بیت تک ہی محدود ہے۔ یہ تعزیے انیسویں صدی کی پیداوار ہیں جن کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ روایتی اور صرف تمثیلی ہے اگر موضوع کو بدلا جاتا تو انہیں بنیادوں پر مستقل قومی ڈرامے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اور زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کو تمثیل اور اداکاری کے ذریعے پیش کیا جا سکتا تھا یورپ کے تمدن اور تہذیب کے زیر اثر ہندوستان، مصر، ترکی اور ایشیا کے دیگر نو پیدا ممالک کی طرح اب ایران نے بھی یورپی ادب سے خوشہ چینی شروع کی ہے۔ اپنی زبان کو مغربی ادبیات کے تراجم سے مالا مال کر رہا ہے۔ جدید ایران میں طبعزاد ڈرامے لکھنے والے بھی موجود ہیں جو فنی اعتبار سے مغرب کے پیرو ہیں۔

ہندی ڈراما عربی اور فارسی ڈرامے کے ذکر کے بعد ہندی ڈرامے کا ذکر لازمی ہے۔ اردو ڈرامے کی تعمیر میں اس کو بہت خاص دخل ہے۔ ہندی ڈراما قدیم الایام سے نہایت مدون اور ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے ہندوستان میں فن ڈراما کی ابتدا چوتھی صدی قبل مسیح سے ہوتی ہے۔ مرچھ کٹک (مٹی کی رتھ) قدیم ترین ہندی ڈراما ہے جس کی تصنیف دو سو سال قبل مسیح بتلائی جاتی ہے۔ بکرماجیت کے زمانے میں کالی داس نے اعلیٰ پایہ کے ڈرامے لکھے۔ کالی داس کے ڈراموں میں شکنتلا اور وکرم اروسی مشہور ڈرامے ہیں، جو اپنی شاعرانہ اور نفسیاتی نزاکتوں اور رفعت خیال کی وجہ سے عدیم المثال ہیں۔

فرخ سیر کے زمانے میں نواز نامی ایک درباری شاعر نے شکنتلا کا ترجمہ فارسی آمیز برج بھاکا میں کیا تھا جس کو بعد میں فورٹ ولیم کالج کے صدر گلکرسٹ نے اردو میں ترجمہ کرایا۔ مترجمین کاظم علی جوان اور للولال کوی ہیں۔ نواز کا ترجمہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا البتہ فورٹ ولیم کالج کا ترجمہ اردو نثر کی

صورت میں اب بھی موجود ہے۔[1]

وکرم اردسی کو عزیز مرزا نے اُردو میں منتقل کیا ہے جس کے ساتھ ہندو ڈرامے پر ایک پُر از معلومات مقدمہ بھی ہے۔

بعد میں سری ہرش دیو، بھو بھوتی دکھنی، ہنومان بھٹ کیخن اچاریہ مراری، د شکادت اکرشن جیسے اعلیٰ ڈراما نگار پیدا ہوئے۔

ہندووں نے اور فنون لطیفہ کی طرح ڈرامے کو بھی دیوتاؤں سے منسوب کرکے اسے مذہبی رنگ دیا ہے۔ چنانچہ بھرت نامی ایک رشی اس فن کے باوا آدم بتائے جاتے ہیں جنھوں نے بھرت شاستر کے نام سے فن ڈراما پر ایک کتاب لکھی۔

ہندووں[2] نے شاعری (موسیقی) کی دو قسمیں کی ہیں، ایک درسبا سنگتا (وزی بل میوزک) دوسرے سردیا سنگتا (آڈی بل میوزک) درسبا سنگتا کا تعلق بصارت اور سماعت دونوں سے ہے، جس میں ابھی نایا (اداکاری) کے ذریعے اعلیٰ اور اسفل کردار موزوں بھیس میں اسٹیج پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کی دو قسمیں ہیں: ایک روپک دوسرے اپ روپک، پھر روپک کی دس اور اپ روپک کی اٹھارہ قسمیں کی گئی ہیں۔

ہندو واضعان قوانین ڈراما نے نہ صرف پلاٹ قصہ، کردار، موضوع اور جذبات کی رنگارنگی کی مناسبت سے اس فن کو تقسیم کیا ہے بلکہ اداکارانہ پہلو کو بھی علم کا مرتبہ بخشا۔

زندگی کے مختلف واقعات کے تحت انسانی جذبات کے تغیرات اور ان کے اداکارانہ اظہار کو بالکل نفسیاتی طور پر مجوز کر دیا تاکہ جذبات اور حرکات میں نفسیاتی یگانگت اور واقعیت پیدا ہو، اور تماشائیوں پر ڈرامے کا وہی اثر ہو جس کا اظہار مدنظر ہے۔ نظریہ رسا (جذبہ) کے تحت بھاؤ اور "انا بھاؤ" کی تقسیم کی گئی۔

بھاؤ سے مراد قلبی کیفیت ہے اور انا بھاؤ اس کا اظہار ہے یعنی وہ ظاہری علامت جو بھاؤ سے

---

[1] "اُرباب نثر اُردو" مصنفہ سید محمد ایم اے عثمانیہ۔

[2]

پیدا ہوتے ہیں۔ غرض ہندوؤں نے ناٹک، ابھی نایا، روپ، سنگت سال، یا رنگ بھومی (اسٹیج) کے ہر جزدی اور فروعی متعلقات کو بھی قواعد وضوابط کے احاطہ میں لاکر نہایت اعلیٰ قسم کی مدون اور منظم صورت میں پیش کیا اور ہندو راجاؤں نے اس فن کو اپنی سرپرستی میں لیکر اسے ترقی کے انتہائی اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا۔

ہندو ڈرامے کی خصوصیات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ ڈرامے میں مذہب کے بنیادی معتقدات کو پیش کیا جاتا تھا۔ اکثر ڈراموں میں کرما (اعمال) اور آواگون (تناسخ) کے نظریے کی تبلیغ ہے۔

۲۔ بہ شکل ڈراما موسیقی اور شاعری کا امتزاج کیا جاتا تھا۔

۳۔ کردار کا تنوع۔ ڈرامے کے کردار سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے مرد اور عورتوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ناٹک (ہیرو) اور نایکہ (ہیروین) کی صورت، سیرت اور سماجی مرتبے کے لحاظ سے اعلیٰ اور بلند ہونا ضروری تھا، کیونکہ وہ تماشائیوں کے لیے نمونہ بنا کر پیش کیے جاتے تھے۔ بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کے علاوہ ادنیٰ طبقے کے لوگ نوکر چاکر بھی ڈرامے کے عناصر ہوتے تھے۔ ہندو ڈرامے کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے یونانی ڈرامے سے ممیز کرتی ہے۔

۴۔ ہندو دیو مالا کے کردار اور ان کے مافوق الفطرت اعمال خوارق عادات بھی ہندو ڈرامے کے جزو تھے۔

۵۔ کردار کے سماجی مرتبے کے لحاظ سے اس کی زبان بھی ویسی ہی ہوتی تھی، تاکہ واقعیت پیدا ہو۔ شاہزادے اور برہمن سنسکرت، اور عورتیں عموماً پراکرت بولتی تھیں۔ دوسرے اسفل کردار اپنے اپنے مفروضہ صوبوں کی بولی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح سے لیکر بارھویں صدی عیسوی تک ہندو ڈرامے نے راجاؤں کی سرپرستی میں برہمنوں کے ہاتھوں خوب ترقی کی۔ گو جین اور بدھ مت کے آغاز نے ہندو ڈرامے کو نقصان پہنچایا، مگر ان مذاہب کے پیشواؤں نے ڈرامے کی اہمیت اور افادیت کو بہت جلد ہی پہچان لیا اور اس کو تبلیغ کا آلہ بنایا۔ بدھ مت کے عروج کے ساتھ ساتھ ڈرامے نے بھی ترقی کی، جس کا ثبوت اجنتا کی مصوری سے بھی ملتا ہے۔ مگر جب بدھ مت کو زوال ہوا اور برہمنوں کا ستارہ پھر چمکا تو انھوں نے

بدھ ڈراموں کو ہٹا کر رام اور کرشن کی زندگیوں کو پیش کر کے اپنے ڈرامے کو زندہ کیا! ابھی برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کشمکش سے ہندو ڈراما سنبھلنے ہی نہ پایا تھا کہ بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوؤں کو مسلمان حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے حملوں کے سیلاب نے ہندوؤں کے تمدن اور معاشرت میں وہ پراگندگی پیدا کر دی کہ ہندوؤں کی پوری توجہ اپنے سیاسی تحفظ اور دفاع پر مرتکز ہو گئی! اسی زمانے میں ہندو ڈرامے نے بھی اپنی رفعت کھوئی اور بلندی سے گر کر اس نے بھان اور پراہسن کی شکل اختیار کر لی یہی وہ دور ہے جب ہندو ڈراما پنڈتوں اور برہمنوں کے پنجے سے چھٹکارا پاکر عوام میں داخل ہوا، اور ہندو کلاسکل ڈرامے کی شایستگی، نزاکت آفرینی، شاعرانہ صنعت گری، رفعت موضوع، دل نواز تغزل، پلاٹ کی چستی اور بے عیب سیرت کشی غائب ہو گئی۔

ہندو دیہی ڈرامے سے اُردو ڈرامے کا تعلق

مسلمانوں نے ہر جگہ دوسری زبانوں سے علوم و فنون کو لینے میں کبھی عار نہیں کیا، مگر غیر زبانوں کے ادبی ذخیروں سے بے رُخی ہی برتی، اور اس میدان میں غیر معمولی احساس برتری سے کام لیا، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ باوجود اختلاط اور اشتراک کے ہندوستان کے اسلامی دور میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ہندو ادبیات عالیہ سے مسلمانوں نے استفادہ کیا ہو، اِلّا فرخ سیر کی واحد مثال کے۔

جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے، ملک گیری اور جنگ و جدال سے انھیں فرصت ملی اور زیادہ قیام کی وجہ سے ایک حد تک غیر شعوری طور پر ہندو تمدن سے انھیں یگانگت پیدا ہونے لگی تو انھوں نے بھی ہندوؤں سے اپنے مفید مزاج اجزا کو اخذ کیا، اور ایک مشترک تمدن کی بنیاد ڈالی جس کی ابتدا اکبر کے زمانے سے ہو چکی تھی فیضی کی گیتا۔ دارا شکوہ کے اپنشد اور ابراہیم عادل شاہ کی نورس اس امر کی شہادتیں ہیں کہ مسلمانوں نے ہندو مذہب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی طرف توجہ کی ہندو رقص موسیقی اور شاعری کے علاوہ جب ہندو رانیاں مسلمانوں کے حرم میں داخل ہوئیں تو شاہی روایتوں کے اثر کے تحت شادی و غم کی تمام ہندو رسمیں بھی مسلمانوں کی معاشرت کا جزو بن گئیں جس کے اثرات

باوجود ملاؤں کی چیخ پکار کے اب تک موجود ہیں۔ کچھ سال پہلے تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی عیدوں اور تہواروں میں بڑے خلوص سے حصہ لیتے تھے مسلمان دیوالی اور بسنت مناتے، ہولی کھیلتے، رامائن کی کتھائیں، رام لیلا اور کرشن لیلا میں شامل ہوتے، اور ہندو عیدوں میں شریک رہتے اور محرم میں حصہ لیتے۔ تمدنی اتحاد اور اتفاق کے ایسے مناظر اب بھی حیدرآباد دکن میں دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

جب دلی اجڑی اور لکھنؤ آباد ہوا تو دلی کا پورا سرمایہ لکھنؤ میں منتقل ہوا۔ گذشتہ دور میں دلی کے بعد لکھنؤ ہی وہ مقام تھا جو ہند اسلامی تمدن کا مرکز بن گیا۔ تاجداران اودھ کی علم نوازی نے شاعری اور نثر نگاری کو خوب ترقی دی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جب اودھ کا دربار عیش و طرب کا گہوارہ بن گیا تو لکھنؤ نے واجد علی شاہ جیسے رنگین مزاج نوجوان تاجدار کو پیدا کیا جس کی زندگی مجسم عیش اور جس کا دربار راجہ اندر کے افسانوی اکھاڑے کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ گانا، بجانا وظیفۂ حیات اور ناچ رنگ جس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ واجد علی شاہ خود اچھے ماہر مغنی اور رقاص تھے، اور اپنے محل میں انھوں نے اچھی گانے اور ناچنے والی نوخیز پری جمالوں کو چن چن کر جمع کیا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں عوام میں رہس بہت مقبول تھے۔ واجد علی شاہ کو یہ چیز بہت پسند آئی۔ رادھا کرشن کی داستان حسن و عشق سے یہ جدت پسند تاجدار اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود رہس لکھے جو قیصر باغ میں کھیلے جاتے تھے جس میں وہ کبھی کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ واجد علی شاہ کے طباع اور حسن پسند مزاج نے ہندوستان کے عوامی ڈرامے یعنی رہس کو اپنے رنگ میں اس خوبصورتی سے ڈھالا اور اس میں شعر و موسیقی اور نسوانی حسن و شباب کا ایسا رنگ بھرا کہ اختری رہس مستقل مصدر نشاط بن گئے جس سے متاثر ہو کر اسی عہد کے ایک کہنہ مشق شاعر امانت نے اندر سبھا لکھی جو اردو کا پہلا ڈراما ہے۔

اندر سبھا کا تعلق ہندی ڈرامے سے

رہس | اندر سبھا اور اس کے اثرات پر کچھ لکھنے سے پہلے ہمیں ہندوستانی عوامی تھیٹر کا سرسری مطالعہ کر لینا ضروری ہے تاکہ آیندہ تنقید کے وقت اندر سبھا کے ملکی اور غیر ملکی عناصر اور اس کے ماخذ کا کھوج لگانے میں دشواری نہ ہو۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی بیان کیا جائے گا اس کی نوعیت اندر سبھا کے پس منظر (بیاک گراونڈ) کی بھی ہوگی۔

ہندو کلاسکل ڈرامے کے زوال کے بعد جیسا کہ بیان کیا گیا بھان اور براہسن نے عوام کے دلوں پر اپنا سکہ جمایا۔ بھان اور براہسن ہندو ڈرامے کی اسفل قسموں میں سے دو قسمیں ہیں۔ بھان اس شکل ڈراما کا نام ہے جس میں ایک ہی شخص محبت، جنگ اور دوسرے واقعات کو ساز اور رقص کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اس کی حیثیت عرب کے راوی اور ایران کے روضہ خواں کی سی ہے۔ براہسن پورب (فارس) کے ہجویہ نقل کے مماثل ہے جس میں سماج اور زندگی کے واقعات پر ہجو کے انداز میں تنقید ہوتی ہے۔ اس کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہے۔ یہ خدمت عموماً بدوشک (مسخرا) انجام دیتا ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں بھانڈ اور بہروپیوں کے نام سے جن گروہوں نے فروغ پایا وہ اسی بھان سے مشتق ہیں۔ بھانڈ اس وقت معاشرت کا اہم جزو تھے۔ ان کے بغیر دربار سونے اور خوشی کی تقریبیں بے رونق رہتی تھیں۔ یہ گروہ ناچ گانے کے ساتھ نقل بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ یہ جس کے ہاں جا کر ناچتے اس کی نقل ضرور اتارتے اور ممکن نہ تھا کہ اس پر چوٹ نہ کریں۔ اُمراء اور روساء کو ان کی لغزشوں پر متنبہ کرنے میں بھانڈوں کا بہت حصہ تھا۔ بھانڈوں اور بہروپیوں کو نقالی میں ایسا کمال تھا کہ جس کی نقل اُتارتے اس کا ایسا مکمل بہروپ بھرتے کہ سچا اور واقعی کیرکٹر پیش نظر ہو جاتا۔[لہ]

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بظاہر مختلف قسم کے تماشے ہوتے ہیں جن کا تعلق عوامی ڈراما سے ہے جو ہر جگہ ایک دوسرے ہی نام سے مشہور ہیں۔ مگر تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ آپس میں بہت کچھ مشابہت اور یگانگت رکھتے ہیں۔ انھیں پورانی ڈراما بھی کہا جاتا ہے جو رامائن مہابھارت اور سری کرشن کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔

مشرقی ہند میں جاترا،[لہ] جنوبی ہند میں بھاگوت۔ مہاراشٹر میں دساوتار اور شمالی ہند میں رسادھاری اور رام لیلا کے نام سے گاؤں اور شہروں میں تماشے ہوتے ہیں جن میں مہابھارت کے قصوں اور سری کرشن اور دس اوتار کی زندگیوں کو ناچ گانے اور دیہی شاعری کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

رسادھاری | سری کرشن کی شخصیت قدیم الایام سے ہندو زندگی کی مہتم بالشان اور ذی اثر

لہ۔ شرر "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"۔

لہ۔ "دی انڈین تھیٹر" مولفہ آر۔ کے یاژنک۔

شخصیت ہے، ان کی رومان آفریں زندگی، ان کا فلسفہ، ان کی رزم اور بزم آرائیوں کی داستانیں ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ ان کی رنگین اور شاعرانہ زندگی کے مقابلے میں رام جی کا کردار بہت پھیکا اور سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زندگی میں کرشن نے جتنا اثر اور مقبولیت پیدا کی وہ کسی اور قومی ہیرو کو نصیب نہ ہوئی۔ رسا دھاری اسی مقبولیت کا نتیجہ ہے جس سے متاثر ہو کر نظیر اکبر آبادی نے کرشن نامہ لکھا۔ رسا دھاری ڈرامے کی اس بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے جس میں عوام کی ذہنی سطح کی مناسبت سے کرشن کی داستان طفلی اور حُسن و عشق کو تمثیل کیا جاتا ہے۔

ان تماشوں میں دو نو عمر بچے رادھا اور کرشن کا بھیس بھرتے ہیں باقی گوالے اور گولنیں بنتے ہیں، کرشن کے سر پر تاج ہوتا ہے جسے مور کے پروں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ رادھا اور بنسی والے کرشن کو حلقے میں لیکر گولنیں اور گوالے گاتے ہوئے ناچتے ہیں۔ تماشائیوں پر ان تماشوں کا بہت اثر ہوتا ہے۔ اس ارضی رقص و سرود میں ایسا کچھ تقدس پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ حقیقی کرشن سمجھ کر نو عمر بچے کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ متھرا اور بندرابن ان تماشوں کے بڑے مرکز ہیں، جہاں کے برہمن ٹولیاں بنا کر ہندوستان کے کونے کونے میں گشت لگا کر تماشے کرتے اور پیسے کماتے ہیں۔ (دکن میں محرم کے زمانے میں گولن کا ناچ اسی کرشن لیلا کی ٹوٹی ہوئی کڑی ہے)۔

ان تماشوں کی اثر نوازی کا یہ عالم ہے کہ جہاں یہ ٹولیاں جاتی ہیں، وہاں کے مقامی عوام اپنے حوصلے کے مطابق ان تماشوں کی نقل کرتے اور جلسے ترتیب دیتے ہیں جس میں گانوں، ناچ رنگ کے ساتھ ساتھ سری کرشن کی زندگی کے مختلف حصوں کو روپ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے جو "رہس" کہلاتے ہیں جس کی زبان صوبوں کی مناسبت سے مختلف پراکرتوں پر مشتمل ہے۔

گاؤں کے چند جوشیلے نوجوان شاعرانہ لطافتوں اور فنی نزاکتوں سے بے نیاز ہو کر خود ہی گانے اور مکالمے بنا لیتے ہیں، اور راتوں میں مشعلوں کی روشنی میں تماشے کرتے ہیں۔ گاؤں کے دھوبی سے مستعار لیے ہوئے کپڑے ناٹک کے لباس کا، اور سیندور، تیل، چکسا اور ہلدی سے روپ سازی اور چہرے کی آرائش کا کام لیا جاتا ہے۔ مُلّا غنیمت کُنجاہی نے اپنی مشہور مثنوی نیرنگ عشق میں جو شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی ان تماشوں کی کیفیت کو بیان کیا ہے، اور اس گروہ کو مقلد پیشہ اور بھگت باز کے نام سے

موسوم کیا ہے

امانت نے "اندر سبھا" کی شرح میں ان تماشوں کا اس طرح ذکر کیا ہے "الحمداللہ کہ بھگت کا کوئی نام نہیں لیتا ہے، زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر سبھا سے پہلے بھگت کے نام سے شمال میں تماشے ہوا کرتے تھے۔

جب یہ رہس اپنی مقبولیت کی بنا پر عوام سے گذر کر لکھنؤ کے شاہی محلوں میں داخل ہوئے تو اس کے سوقیانہ اجزا دور ہو کر اس میں بہت شائستگی اور شاعرانہ پن پیدا ہو گیا۔ قیصر باغ کے دروازے عوام الناس کے لیے کھل گئے اور شہر کے شوقینوں میں ڈراما (رہس) کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا۔ چند ہی دن میں اس شوق کو اس قدر فروغ ہوا کہ بڑے بڑے شعرا نے بھی توجہ کی چنانچہ میاں امانت نے ۱۲۶۸ھ میں "اندر سبھا" لکھی۔ یہ ایسی مقبول ہوئی کہ اور لوگوں نے بھی امانت کے زیر اثر بہت سی اندر سبھائیں لکھیں جن میں مداری لال کی اندر سبھا، مچھندر سبھا، جشن پرستان، بزم سلیمان، بہت مشہور ہیں۔ اردو مثنویوں کو بھی ڈرامے کا جامہ پہنایا گیا۔ مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت مثنوی "زہر عشق" اسٹیج کی گئی تو بعض بعض موقعوں پر مجمع میں کہرام مچ گیا تھا۔ واجد علی شاہ نے مثنوی کی شکل میں جو رہس لکھے ہیں وہ ناپید ہیں اس لیے اس کی ادبی قدر و قیمت پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا، مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اندر سبھا کے پیدا کرنے والے یہی رہس تھے۔

امانت کی اندر سبھا

سید آغا حسن، نام امانت تخلص لکھنؤ کے رہنے والے ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے انھیں دلگیر سے تلمذ حاصل تھا۔ ابتدا میں نوحہ اور سلام کہتے تھے۔ بعد میں غزل کی طرف توجہ کی۔ پھر واسوخت لکھ کر شہرت حاصل کی۔ انھیں رعایت لفظی میں کمال حاصل تھا جس کی مثال ان کا واسوخت ہے۔ اندر سبھا میں بھی اس صنعت کی کہیں کہیں جھلک نظر آتی ہے جس سے اس عہد کی شاعری اور زندگی کے رجحانات کا

پتہ چلتا ہے۔

امانت کے چھوٹے بیٹے سید عباس حسن فصاحت کی روایت ہے کہ "چھتر منزل[1] کے قریب بارہ اماموں کی درگاہ تھی، اس درگاہ سے سادات کو وظیفے ملتے تھے، امانت مرحوم کا نام بھی وہاں تھا اوران کا وظیفہ تیس چالیس روپیے ماہوار تھا۔ اس کے علاوہ ان کو کبھی کسی شاہی محکمہ یا شاہی دربار سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

بیس سال کی عمر میں کسی عارضے کی وجہہ سے ان کی قوت گفتار سلب ہوگئی تھی۔ واسوخت کے بعد خانہ نشیں ہوگئے۔ ان کے دوستوں اور شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا۔ ۲۸ رجمادی الاول ۱۲۷۵ھ کو ۴۴ سال کی عمر میں بمرض استسقا انتقال کیا۔ امام باڑہ آغا باقر لکھنؤ میں دفن ہیں۔

جب تک اردو زبان زندہ ہے اس وقت تک امانت اپنی "اندر سبھا" کی وجہہ سے زندہ رہیں گے۔ جن صوبوں میں اردو کا رواج ہے وہاں کوئی ایسا گاؤں نہ ہوگا جہاں اب بھی اندر سبھا کھیلی نہ جاتی ہو۔ کسی کو بھی اور خود امانت کو کیا معلوم تھا کہ "اندر سبھا" ایسی شہرت دوام حاصل کرکے ان کے نام کو اردو زبان اور ادب کی زندگی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ کردے گی۔

امانت نے شرح میں "اندر سبھا" کی تصنیف کا سبب یوں بیان کیا ہے: "زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا، ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی عبادت ... نے ازراہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے، ایسا کوئی جلسہ (بہ معنی ناٹک) کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیئے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہوئے، خلق میں شہرت ہوئے۔ آخر الامر موافق ان کی فرمائش کے بندہ اس کے کہنے پر آمادہ ہوا چونکہ یہ جلسہ کہنا سب کو مرغوب تھا، مگر اپنے نزدیک معیوب تھا، اس لحاظ سے اپنا تخلص بدل کر اس میں استاد تخلص کیا ... غرض چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں "اندر سبھا" اس جلسے کا نام لکھ کر بجائے چار باب، چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔" (شرح "اندر سبھا")۔

اردو ڈرامہ کے سلسلے میں "اندر سبھا" پر سب سے پہلے علمی اور تاریخی روشنی ڈالنے والے ناٹک ساگر کے مصنفین محمد عمر اور نور الہٰی صاحبان ہیں۔ قابل مصنفین نے "اندر سبھا" کے متعلق جن خیالات کا اظہار

---

[1] مضمون مسعود حسن رضوی، رسالہ اردو، اپریل ۱۹۲۷ء۔

کیا تھا اس میں سے بعض ایسے تھے جس پر مولانا شرر نے اپنی معلومات کی بنا پر تنقید کر کے انھیں غلط ٹھہرایا۔

وہ معرکتہ الارا مسائل یہ ہیں:۔

۱۔ لبیک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے بادشاہ (واجد علی شاہ) کو یورپ کے مروجہ ڈرامے کی طرف توجہ دلائی۔

۲۔ حکم ہوا کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو، قرعۂ فال امانت کے نام پڑا۔

۳۔ اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوا۔

۴۔ واجد علی شاہ اودھ کے تخت پر راجہ اندر بنے۔

۵۔ باقی پارٹ اہل دربار کو ملے۔

مصنفین ناٹک ساگر نے کچھ خورشید جی کی روایت کی بنا پر اور کچھ اپنی قیاس آرائی کی مدد سے اپنے مخترعہ مابہ النزاع مسائل کی صداقت منوانے کی کوشش کی مگر اس سلسلے میں مولانا شرر کے مقابلے میں اور کسی کی شہادت اس وجہ سے ناقابل قبول ہے کہ کسی اور کو مولانا شرر کی طرح لکھنؤ کے پرانے بزرگوں کی صحبت اتنی طویل مدت تک نصیب نہیں ہوئی، اور نہ کسی کو واجد علی شاہ کے دامن سے وابستہ ہو کر برسوں مٹیا برج میں رہنے۔ بادشاہ کے مصاحبوں، جلیسوں، درباریوں، درباری گویوں، سازندوں، ایکٹروں وغیرہ سے ملنے جلنے کا ہزار ہا مرتبہ اتفاق ہوا ہے، اور نہ کوئی اودھ کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پر اتنا عبور رکھتا ہے جتنا کہ شرر کو حاصل تھا۔

باوجود اس کے شرر کا غیر قطعی طرز بیان ڈرامے کے طالب علم کو تذبذب میں ڈال سکتا ہے مگر ان تمام فرضی اور قیاسی اختلافات کا واحد مسکت جواب خود امانت کی لکھی ہوئی شرح "اندر سبھا" ہے جس کے مطالعہ سے متذکرہ بالا تمام اختلافات دور ہو جاتے ہیں۔

امانت نے شرح میں اسٹیج کے ساز و سامان، ایکٹروں کے لباس، پریوں کے ناچ وغیرہ کی کیفیتیں اس تفصیل اور حسن سے بیان کی ہیں کہ "اندر سبھا" کے کھیل کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اور ایسی نادر تشبیہیں اور استعارے استعمال کیے ہیں کہ نثر میں شاعری کا مزہ آتا ہے۔ شرح کی ابتدا میں واجد علی شاہ کے رہس کی کیفیت، "اندر سبھا" کا سبب تالیف، اس کا زمانۂ تصنیف، اس کے جلسے کی تیاری وغیرہ کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ گویا "اندر سبھا" کی تاریخ خود مصنف کی لکھی ہوئی ہے، اور کوئی قیاس، کوئی قرینہ اور کسی کی شہادت اس سے زیادہ معتبر نہیں ہو سکتی۔

مسعود حسن رضوی ایم اے لکھنوی نے شرح کو ایک مضمون کے ساتھ "رسالۂ اردو" اپریل ۱۹۲۷ء میں شائع کروایا ہے۔ جن ذرایع سے صاحب موصوف نے اس شرح کو حاصل کیا اس کے متعلق ان کا بیان یہ ہے کہ:-

"اندر سبھا" کے جو ایڈیشن آج کل بازاروں میں مل سکتے ہیں ان میں شرح "اندر سبھا" موجود نہیں۔ "اندر سبھا" کے جس نسخے سے میں نے یہ شرح نقل کی ہے وہ شیخ رجب علی تاجر کتب کی فرمائش پر کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا مہدی علی خاں بہادر ثابت جنگ کے اہتمام میں سلطان المطابع کی اجازت سے مطبع محمدی لکھنؤ میں ۱۲۷۰ھ میں چھپا تھا۔ غالباً "اندر سبھا" کا یہ پہلا ایڈیشن ہے جس کو مصنف نے ۱۲۶۸ھ میں مرتب کر کے مطبع کو دیا اور کچھ زمانے میں ۱۲۷۰ھ میں چھپ کر تیار ہوا۔

"اندر سبھا" کی منظوم شکل سے یہ شبہ پیدا کیا گیا تھا کہ یہ یورپی اوپیرا کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایسا قیاس غلطی پر مبنی ہے۔ امانت کے عہد میں نظم ہی تخلیقی افکار کے اظہار کا واحد ذریعہ اور موسیقی زندگی کا ضروری جزو تھی۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ شاعر معاشرے کا اہم جزو ہونے کی حیثیت سے اپنے عہد کے رجحانات، معتقدات اور رسم و رواج سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے تخلیقی کارناموں میں ان اثرات کی تصویر کا نظر آنا ہی اس کے احساس اور بیان کی صداقت کی دلیل ہے۔ شعر و موسیقی چونکہ اس عہد کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے اس لیے اگر کسی نے ڈرامائی صورت میں وفادارانہ طور پر اس عہد کی تصویر کھینچنے کے لیے موثر دھنوں میں گانے نظم کیے اور منظوم مکالمے لکھے تو اس شخص پر اغیار کی خوشہ چینی کا الزام دینا زیادتی ہے۔ امانت کی "اندر سبھا" کا شعر و موسیقی کی آمیزش سے پیدا ہونا دراصل بادشاہ وقت کے درباری شعر آفریں اور موسیقی نواز فضا کی اثر اندازی کا نتیجہ ہے۔

گو امانت کو دربار اودھ سے راست تعلق نہیں رہا مگر وہ بادشاہ وقت اور وہ بھی واجد علی شاہ جیسے رنگین مزاج بادشاہ کی عیش پرستیوں سے ناواقف نہ تھا۔ شرح میں جس انداز میں تفصیل کے ساتھ "رہس مبارک" کا ذکر کیا گیا ہے اس کے دیکھنے کے بعد کون انکار کر سکتا ہے کہ امانت نے شاہی رہس نہیں دیکھے تھے۔ "اندر سبھا" کی داخلی شہادتیں یعنی اس کا موضوع، قصہ، پلاٹ، کردار، جائے وقوع اس امر کی شہادتیں ہیں کہ مصنف نے ہند دیو مالا، دیو پریوں کی مروجہ کہانیوں، مثنوی بدر منیر اور خود واجد علی شاہ کی افسانوی زندگی کو نمونہ بنا کر ان سب عناصر کے امتزاج سے ایک نئی چیز پیش کی۔ "اندر سبھا" کا قصہ بیان کرنے کے بعد اس کے ماخذ پر فرداً فرداً بحث کی جائے گی۔

قصہ: راجہ اندر سنگلدیپ کا حکمران ہے جس کا تخت پورا پرستان ہے۔ کالا دیو اور لال دیو دربار کے محافظ اور کارندے ہیں۔ گلفام ہی ایک ایسا کردار ہے جس کا تعلق اس دنیائے آب و گل سے ہے۔ وہ ہندوستان کے اختر نگر (لکھنؤ) کا باشندہ ہے جو لال محل (واجد علی شاہ کے ایک محل کا نام) میں رہتا ہے۔

تماشہ گیارہ، بارہ بجے سے شروع ہوکر صبح ہوتے ہوتے ختم ہوتا تھا جب لوگ جمع ہو جاتے اور اشتیاق و انتظار بڑھ جاتا تو ایک تخت بچھا کر اس کے سامنے کرسیاں رکھی جاتیں، جو اسٹیج کی قایم مقام تھیں۔ سازندے آکر کھڑے ہوکر ساز ملانے کے بعد ایک سُرخ پردہ تانا جاتا جسے موجودہ تھیٹر کا ڈراپ سمجھنا چاہیئے۔ پورے ڈرامے میں یہی ایک پردہ استعمال کیا جاتا تھا جو تبدیلی منظر کے وقت تان دیا جاتا۔ راجہ اندر پردے کے پیچھے آکے ٹھہر ٹھہر کر گھنگرو بجاتا تو آمد اس طرح گائی جاتی:۔

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے ۔۔۔ پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

آمد گائی جانے کے بعد پردہ اٹھتا، مہتاب چھیتی اور راجہ لال دیو اور کالے دیو کی معیت داخل ہوتا جو بولا دکھا کر گھنگرو تال پر بجاتا اور صاحب محفل کو سلام کرکے تخت پر بیٹھ جاتا۔

پھر باری باری سے پریاں بلائی جاتیں۔ ہر پری اپنے نام کی مناسبت سے اسی رنگ کا موزوں جوڑا پہنے زیور اور آرایش سے مزین ہوکر گاتی، ناچتی، بھاؤ بتاتی اسٹیج پر آتی۔

سب سے پہلے پکھراج پری آتی۔ پھر نیلم پری، پھر لال پری۔ سب پریاں اپنے حسب حال چوبولے، چھند اور غزلیں گاتیں۔ راجہ اندر خوش ہوکر انھیں اپنے پہلو میں جگہ دیتا۔

ایک چاندنی رات کا ذکر ہے کہ سبز پری سنگلدیپ جاتے ہوئے اتفاقاً ہندوستان کی طرف اُڑتی ہوئی آنکلی تو اختر نگر کے لال محل کی بارہ دری میں ایک چودہ پندرہ برس کے سن کے نوخیز حسین شہزادے کو سوتا دیکھا جس کا نام گلفام ہے (مثنوی بدر منیر میں بالکل اسی کے مماثل ایک منظر ہے جس کی ابتدا ایسے ہوتی ہے:۔

قضا را ہوا اک پری کا گذر ۔۔۔ پڑی شاہزادے کی اس پر نظر
بھبوکا سا دیکھا جو اس کا بدن ۔۔۔ جلا آتشِ عشق سے اس کا تن)

سبز پری گلفام پر بے اختیار عاشق ہو جاتی ہے اپنے ہاتھ سے زمرد کا چھلّہ اُتار کر سوتے ہوئے شہزادے گلفام کی انگلی میں پہنا دیتی ہے۔ صبح ہو جانے اور راجہ اندر کے عتاب کے خیال سے سبز پری چار وناچار

گلفام کو کوٹھے پر سوتا چھوڑ کر اکھاڑے کی طرف روانہ ہو جاتی ہے۔ اندر کے دربار میں سبز پری کی آمد اس طرح گائی جاتی ہے:۔

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے
لب سرخ ہیں پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے

سبز پری راجہ اندر کی بڑی محبوب پری ہے۔ وہ گت ناچتی ہوئی بڑے ناز و انداز کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ رقص کا کمال دکھانے کے بعد اپنے حسب حال یہ شعر گاتی ہے:۔

مملو ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہوں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں

شعر خوانی ختم کر کے غزل گاتی ہے، پلٹ کر جو دیکھتی ہے تو راجہ سوتا رہتا ہے بطور طعن ایک چوبولا گا کر اپنے باغ میں چلی جاتی ہے۔ کالے دیو کو اپنے عشق کا حال سنا کر اس سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ گلفام کو لال محل سے اٹھا لائے گا، کالا دیو وعدہ کرتا ہے اور شہزادے کا پتہ پوچھتا ہے، سبز پری پتہ اس طرح دیتی ہے:۔

جانو سنگلدیپ سے اختر نگر میں ہاں
سوتا ہے اک ماہرو لال محل پر واں

کالا دیو شہزادہ گلفام کو لیکر آتا ہے۔ سبز پری جو اپنے باغ میں مسند بچھائے شہزادے کی راہ دیکھ رہی تھی اس کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی ہے۔ وہ سویا ہوا رہتا ہے، اسے جگاتی ہے شہزادہ جاگنے کے بعد خود کو غیر جگہ پا کر بہت پریشان ہوتا ہے۔ گلفام کی اس وقت وہی حالت ہے جو بے نظیر کی پری کے پاس جانے کے بعد ہوتی ہے، ادھر ادھر بھاگتا ہے، گرتا ہے، روتا ہے، نہایت درد ناک دھن میں گاتا ہے۔ سبز پری اپنے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ لیکر اس کا دل بہلاتی ہے، باتوں میں لگاتی ہے۔ شہزادے کے پوچھنے پر سبز پری تمام واقعات بیان کرتی ہے کہ کیسے اس نے پہلی ہی نظر میں اپنا دل اس کی نذر کیا، اور کس طرح کالے دیو کی مدد سے اسے یہاں لایا گیا، بالآخر شہزادہ اس شرط پر پری کے ساتھ رہنے کا وعدہ کرتا ہے کہ اسے راجہ اندر کا دربار دکھلایا جائے جس کا ذکر اس نے کہانیوں میں سنا ہے۔ پری مجبوراً اس پر راضی ہو جاتی ہے۔ سبز پری شہزادے کو اپنے پیچھے پیچھے رکھ کر راجہ اندر کے دربار کی سیر کراتی ہے اور پھر ایک شمشاد کے درخت کے نیچے شہزادے کو لا کھڑا کرتی ہے۔ لال دیو شہزادے کو دیکھ لیتا ہے اور "مانس گند، مانس گند" پکارتا ہے۔ اس کی اطلاع راجہ کو دیتا ہے۔ سبز پری پر راجہ کا عتاب ہوتا ہے کہ سنگلدیپ میں کیسے ایک آدم زاد کو لایا گیا۔ اس کی پاداش میں شہزادہ ایک کنوئیں میں قید کر دیا جاتا ہے اور سبز پری کے پر نوچ کر اسے اکھاڑے سے نکال دیا جاتا ہے۔

سبز پری فراق گلفام میں کفنی پہنے جوگن بن کر گاتی پھرتی ہے، اور ایک عالم کو اپنے حسن اور خوش گلوئی سے

متاثر کرتی ہے۔ یہ جوگن وضع قطع، رنگ، روپ میں بالکل میر حسن کی جوگن معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ خود امانت نے شرح "اندر سبھا" میں جوگن کے ذکر کے موقع پر میر حسن کی مثنوی بدر منیر ہی کے اشعار نقل کیے ہیں۔

کالا دیو جوگن کے حُسن و جمال سے متاثر ہو کر راجہ اندر کو مطلع کرتا ہے کہ ایک جوگن پھر رہی ہے جس نے اپنے حُسن کی وجہ سے ایک دنیا کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ راجہ اندر جوگن کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے۔ جوگن دربار میں حاضر کی جاتی ہے۔ راجہ اندر کی فرمایش پر جوگن بھروپ میں ایک ٹھمری، ایک ہولی اور ایک غزل گاتی ہے، مگر اس سوگوارانہ انداز میں کہ خود راجہ اندر کے آنسو نکل آتے ہیں۔ راجہ اس صلے میں سبز پری کو پان دیتا ہے۔ پری انکار کرتی ہے، پھر راجہ اندر کہتا ہے "مانگ کیا مانگتی ہے"۔ جوگن کہتی ہے "کیا میں جو مانگوں گی پاؤں گی" راجہ "ہاں" کہتا ہے۔ پری تین مرتبہ راجہ سے قول لینے کے بعد دلی مطلب کا اس طرح اظہار کرتی ہے:۔

ہوتا ہے کوئی آن میں اب کام ہمارا | انعام دیجیے ہمیں گلفام ہمارا

جوگن کی زبان سے گلفام کا نام سُنکر راجہ اندر کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، راجہ پہچان لیتا ہے کہ جوگن کے بھیس میں یہ سبز پری ہے، راجہ کہتا ہے:۔

ارے لال دیو اس طرف جلد آ | بڑا مجھ کو جوگن نے دھوکا دیا

بالآخر اپنے وعدے کے مطابق راجہ اندر گلفام کو کنوئیں میں سے رہا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ سبز پری جھک کر آداب بجا لاتی ہے۔ لال دیو گلفام کو گود میں اٹھا کر لاتا ہے اور پری کے حوالے کرتا ہے۔ سبز پری اور گلفام خوب دل کھولکر آپس میں گلے ملتے ہیں، پھر یہ مبارکبادی گائی جاتی ہے:۔

شادیٔ جلوۂ گلفام مبارک ہوئے | عیش و عشرت کا انجام مبارک ہوئے

اس مقطع پر مبارکبادی اور ڈرامے کا اختتام ہوتا ہے:۔

چھینئے شہزادے کو اب ہم سے نہ راجہ استاد | یہ امانت سحر و شام مبارک ہوئے

اندر سبھا کے ماخذ اور اسکے ایرانی اور ہندی عناصر

"اندر سبھا" کے تین ماخذ ہیں جن سے امانت نے اپنے ڈرامے کی تشکیل میں مدد لی:۔

ا۔ خود واجد علی شاہ کے رہس اور ان کی زندگی۔

۲۔مثنوی بدرِ منیر۔

۳۔ہندو اور ایرانی دیو مالا۔

واجد علی شاہی رہس شعر، رقص و موسیقی کا مجموعہ ہوتے تھے جن کا تمثیلی اظہار پریوں کے ذریعے ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ عفریت، غربت، رام جیرا، سامز بھی ان رہس کے کردار تھے۔مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کی ایک کتاب "بنی" کا ذکر کیا ہے کہ اس میں جلسوں (رہس) ایکٹروں کی پوشاک تنخواہ، ان کے نام اور رہس کھیلنے کی تفصیلی ہدایات درج ہیں، امانت نے بھی اپنی "شرح" میں ان رہسوں کی الفاظ میں تصویر کھینچی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین نازنینانِ حرم، پریاں بن کر واجد علی شاہ کی بنائی ہوئی چیزیں گاتیں اور رقص کا انداز دکھاتیں، جن کے بازوؤں پر جواہر نگار پر ہوتے اور سر پر مرصع چوٹیاں، کانوں میں جڑاؤ بالیاں، یاقوتی بندے، بازو پر جڑاؤ کنگن، ہیرے کے کڑے، جن کے بوجھ سے نازنینوں کی کلائیاں رقص کے وقت لچک جاتی تھیں۔پوشاک میں گوکھرو، چیتکی، کرن، چمکی، سلما ستارا کھپا ہوا، پاؤں میں سونے چاندی کے گھنگرو ہوتے، پریاں ہاتھ میں ہاتھ لیکر ہالۂ مہتاب کی صورت میں گلدستہ لیے ہوئے ناچتیں اور واجد علی شاہ کے حضور میں جو اس بزم پرستان کے اندر تھے تمام پریاں اپنی اداؤں اور عشوہ گریوں کا سرمایہ پیش کرتیں۔ان جلسوں میں سرخ پردہ تنا تھا جس کے پیچھے سے ہر پری آتی اور ناچ گا کر چلی جاتی۔گانے میں عموماً واجد علی شاہ کی مثنویاں ہوتیں۔ان جلسوں کی روشنی میں "اندر سبھا" کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ امانت واجد علی شاہ کے دربار کی دلچسپیوں اور ان کے رہس سے کس درجہ متاثر تھا۔کردار، انکی پوشاک، موضوع اور اسٹیج کے ساز و سامان میں کتنی مماثلت ہے۔

امانت نے اپنی شرح میں جا بجا زورِ بیان اور منظر کشی میں واقعیت پیدا کرنے کے لیے مثنوی بدرِ منیر سے استفادہ کیا ہے، جس کے کچھ نمونے "اندر سبھا" کے قصے کے ضمن میں دیے گئے ہیں۔

سبز پری کا اڑتے ہوئے اختر نگر کے لال محل میں شہزادہ گلفام کو سوتے ہوئے دیکھنا اور اس پر جان دینا۔چاندنی کا منظر، جوگن کا بھیس، من و عن میر حسن سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔گلفام کا کردار سن و سال، صورت شکل، عادات و اطوار کے لحاظ سے بالکل بے نظیر ہے۔مثنوی بدرِ منیر میں جوگن کا کردار جس وضع قطع سے میر حسن نے پیش کیا ہے بالکل اسی طرح کی جوگن امانت کی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ بدرِ منیر میں ہیروئن نہیں بلکہ سہیلی نجم النساء جوگن کا بھیس لیتی ہے اور "اندر سبھا" میں خود ہیروئن یعنی سبز پری اس کام کو انجام دیتی ہے۔

جوگن کی ہیئت اور حلیہ بیان کرنے میں امانت آزاد اور ایچی نہیں بلکہ مقلد ہے اس اثر کا ثبوت بھی ہمیں شرح اندر سبھا سے ملتا ہے جہاں امانت نے میر حسن کی مثنوی کے وہ تمام اشعار نقل کیے ہیں جس سے جوگن کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

غرض "اندر سبھا" اپنے زمانے کے رنگ کی پوری پوری نمایندگی کرتی ہے۔ ایرانی اور ہندی روایات کو جس حسن سے ملایا گیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ امانت کی "اندر سبھا" میں:۔

۱۔ فارسی پریوں، دیووں کو ہندو دیو مالا کے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔

۲۔ راجہ اندر ہندوؤں کا ایک بڑا دیوتا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے وضع و لباس میں ایرانی تاج پہنے دربار کے تخت پر بیٹھتا ہے اور ہندو دیو مالا کے مطابق پریوں کا ناچ دیکھتا ہے۔

۳۔ ایران کے دیووں نے راکشسوں کا حلیہ اختیار کر لیا۔

۴۔ ایران کی پکھراج، لال، نیلم اور سبز پریاں پر لگائے مسلمان امیرزادیوں کا لباس پہنے ہندی اڑن کھٹولوں میں بیٹھ کر آتی ہیں، ہندی دھنوں میں گاتی ہیں، ہندی گتوں پر ناچتی ہیں۔

۵۔ شہزادہ گلفام اپنے نام سے ایرانی اور اپنی وضع قطع سے اودھ کے خاندان شاہی اور لکھنؤ کی شیعہ سوسائٹی کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ اس کا لال محل لکھنؤ کی سرخ عمارت ہے جس میں شاہان اودھ کا تخت ہوتا تھا، جس میں اب عجائب خانہ ہے۔ اس کا شہر اختر نگر لکھنؤ ہے جس کو واجد علی شاہ کی شاعرانہ خیال آفرینی نے اس نام سے موسوم کر دیا ہے۔

۷۔ راجہ اندر برہم ہو کر گلفام کو کنوئیں میں قید کر دیتا ہے جو اگلے زمانے میں ہندوؤں کا نہیں بلکہ کیانیوں اور زابلستانیوں کا قید خانہ تھا۔

۸۔ سبز پری فراق گلفام میں ہندوستانی جوگن بنتی ہے۔

۹۔ سر پر ہندوستانی انداز سے زلفیں ہندوستانی جوگیوں کی جٹائیں ہیں، کندھے پر ہندوستان کا پرانا باجا "بین" ہے اس کے نغموں میں فارسی شاعری ہندوستانی موسیقی، لکھنؤ کی ٹھمریاں، ہندوؤں کی ہولیاں، اردو اور بھاشا زبانیں ہیں۔

مخدوم محی الدین ایم اے (عثمانیہ)

حیدرآبادی نوجوان سے!

دیر سے لہرا رہی ہیں بجلیاں سوئے وطن
ہوشیار اے خالقِ مستقبلِ ملکِ دکن

اب اگر سویا تو اُڑ جائیں گی غافل! دھجیاں
گھات میں طوفان ہیں در تاک میں ہیں آندھیاں

کارنامے لوحِ ہستی سے مٹائے جائیں گے
دیکھ! چن چن کر ترے آثار ڈھائے جائیں گے

لہلہاتے کھیت پامالِ خزاں ہو جائیں گے
تیرے کوہستان سب آتش فشاں ہو جائیں گے

جاگ! ماضی کو نہ رو یہ بھی گھڑی ٹل جائے گی
سامنے آنکھوں کے کشتِ آرزو جل جائے گی

قافلے منزل پہ ہیں مصروفِ عیشِ جاوداں
تا بہ کے گم گشتگی اے یوسفِ بے کارواں!

حیف ہے اب تک ترا سازِ عمل خاموش ہے!
اہلِ محفل میں پریشاں کچھ تجھے بھی ہوش ہے!

برق کے مانند سیرت زندگی بر دوش ہو
زورِ طوفانوں کا ہو، زلزلوں کا جوش ہو

اپنے ہی ہاتھوں سے یوں تذلیلِ ہستی تا بہ کے
اے بلندی کے مکیں! یہ وہمِ پستی تا بہ کے

خود شناسی تیری سیرت میں جھلکتی کیوں نہیں
تیرے ساغر سے مئے عرفاں چھلکتی کیوں نہیں

کیا بگاڑے گا جو دشمن درپئے آزار ہے
اس کا رونا ہے کہ تو اپنی نظر میں خوار ہے

یہ تری محرومیوں کا راز ہے اے بے خبر!
ہے ترے ہر اک عمل سے بے یقینی جلوہ گر

وار تیرے اس لیے دشمن کو تڑپاتے نہیں
تجھ کو اپنی تیغ کے جوہر نظر آتے نہیں

رہبروں کی جستجو میں کس لیے حیراں ہے تو!
اے خودی نا آشنا خود رہبرِ دوراں ہے تو!

اس تڑپ سے ہو شریکِ زمرۂ اہلِ کمال
سب کی آنکھیں خیرہ کر دے شوقِ صداقت کا جلال

دُر فشاں ہو جا! کہ ابرِ رحمتِ یزداں ہے تو
ساحلوں کو توڑ موجِ بحرِ پایاں ہے تو

ابر آسا جھومتا جا تیغ کی جھنکار میں
برق بن کر کوندتا جا آتشِ پیکار میں

زلزلہ ہو تیری ضربت سے دلِ کہسار میں
تھرتھری پڑ جائے قلبِ قلزمِ ذخّار میں

جھونک دے شعلوں میں فرسودہ نظامِ زندگی — اے مسیحا! عام کر تازہ پیامِ زندگی
جاں نثاروں میں سرِ فہرست تیرا نام ہو — سر کٹا دینا "درِ آصف" پہ تیرا کام ہے

فکر کر لے ابتدائے کار سے انجام کی
اے وطن پرور! قسم تجھکو وطن کے نام کی

سید سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس

جذباتِ امیر

جوانی کی سرمستیاں جب تلک ہیں — خطا جان کر بھی خطا کیجیئے گا
نہ وقفِ سکوں ہو سکے یہ سمندر — اگر دل میں طوفاں بپا کیجیئے گا
رگِ جاں سے نزدیک جانِ آفریں ہے — ذرا اپنی ہمت رسا کیجیئے گا
ملے گر سزائے معاصی میں لذت — تو پھر لے کے جنت کو کیا کیجیئے گا
کیا صرفِ مطلب نے موسیٰ کو رسوا — نہ ظاہر کبھی مدعا کیجیئے گا
فرشتوں کو اپنی سعادت مبارک — مجھے آدمیت عطا کیجیئے گا
انا کو فریبِ انا الحق نہ دیجیئے — خودی کو نہ اپنی فنا کیجیئے گا

جو اٹھے تو بیٹھے نہ دردِ محبت
دوا کیجیئے نہ دعا کیجیئے گا

محمد امیر بی اے بی ٹی (عثمانیہ)

اسلامی جغرافیہ و تجارت کا اثر یورپ پر

[ترجمہ ہے جامعہ لیڈن کے استاد جے ایچ کرے مر کے مقالے کا جو انھوں نے لی گسی آف اسلام کیلیے سپرد قلم کیا تھا ۱۲]

اگر یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا کا ایک نقشہ کھینچا جائے جس میں قریباً دسویں صدی (چوتھی[۱]) کے سیاسی حالات واضح کئے جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس زمانے میں دنیائے معمور کے (جس کو یونانی آئی کومین کہا کرتے تھے) ایک بہت بڑے حصے پر وہ ممالک پھیلے ہوئے تھے جن پر اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب کا قبضہ تھا، اس زمانے میں ان میں کوئی مضبوط سیاسی اتحاد باقی نہیں رہا تھا تاہم یہ سب ایک مشترکہ مذہب اور مشترکہ تمدن کی مضبوط کڑیوں میں اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ ان ملکوں کے باشندے، جن میں محض مسلمان ہی نہیں تھے، اپنے آپ کو اس وسیع مملکت کی رعایا تصور کرتے تھے جس کا مکہ مذہبی اور بغداد تمدنی و سیاسی مرکز تھا۔ اس مملکت کا ارتقاء گذشتہ تین صدیوں سے مسلسل فتوحات کے ذریعے ہوا تھا جس کی ابتداء اصلاً المدینہ سے ہوئی تھی۔ عرب اس کا مرکز تھا۔ اس مملکت کے مغرب میں مصر اور افریقہ کا تمام شمالی ساحل داخل تھا جس میں ماوراء کوہ اطلس تک کا ساحل بحر اوقیانوس بھی شامل تھا۔ اس سے آگے سوائے اس ٹوریہ کے قریباً پورا اسپین نیز جزائر صقلیہ اور راق ری طش بھی اسلامی مملکت کے اجزاء تھے۔ سردانیہ و قبرص بھی مسلمانوں کے متواتر حملوں کے لیے کھلے رہتے تھے، یہی حال جنوبی اطالوی ساحل کا تھا جہاں کے بعض شہر جیسے باری، حقیقتاً اسلامی حکومت کے زیر فرمان تھے اور بعض شہر جیسے اسالفی اس کے حلقۂ اثر میں داخل تھے۔ عرب کے شمال میں الشام اور ارمینیہ پر نیز قفقاز کے جنوب مغربی علاقے پر بھی مسلمانوں کا مستقل قبضہ تھا، مغربی جانب مسوپوتامیہ

---

[۱] ۔ قوسین میں عیسوی سنہ کی مطابق ہجری سنہ دیا گیا ہے ۱۲ مترجم

اور العراق کے علاوہ موجودہ ایران کا تمام علاقہ مع افغانستان مستقلاً اسلام کے زیرِ نگیں تھا۔ ان ممالک کے شمال میں ماوراء النہر پر بھی اسلامی حکومت تھی جس کے مغرب میں خوارزم کا مثلثی حصہ اور مشرق میں فرغانہ کی وادی اور پہاڑ بھی اسی میں شامل تھے۔ دریائے سندھ کو آٹھویں صدی (دوسری) ہی میں عبور کر لیا گیا تھا، جس کے پیش گذرگاہ کا علاقہ بھی مع سندھ اسلامی مملکت سے متعلق تھا، صرف جنوبی جانب یعنی افریقہ میں اسلامی علاقے کا پھیلاؤ اسوان واقع مصر سے آگے بمشکل بڑھ سکا۔

ہمارے زمانے میں اسلامی مملکت کا طول فرغانہ کے حدود سے شروع ہو کر خراسان، الجبال، العراق اور عرب سے گذرتے ہوئے یمن کے ساحل تک پہنچتا ہے یہ کل مسافت قریباً چار مہینے میں طے ہوتی ہے۔ اس کا عرض ملک روم یعنی بازنطینی شہنشاہیت سے شروع ہوتا ہے جو الشام، مسوپوتامیہ، العراق، فارس اور کرمان سے ہوتے ہوئے بحیرۂ فارس (بحرِ ہند) کے کنارے المنصورہ کی حد تک پہنچتا ہے۔ یہ پورا فاصلہ چار مہینے میں طے ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کے طول کے متعلق میں نے اپنے پچھلے بیان میں المغرب یعنی شمالی افریقہ اور اندلس کی سرحد کا ذکر چھوڑ دیا تھا کیوں کہ اس کی شکل لبادے کی آستین جیسی ہے۔ المغرب کے مشرق و مغرب میں اسلام نہیں ہے اگر کوئی مصر سے آگے ملک المغرب جائے تو علاقہ سوڈان مغرب میں پڑتا ہے جس کے شمال میں بحیرۂ روم اور اس کے بعد ہی روم کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

یہ بیان مشہور جغرافیہ داں ابن حوقل کا ہے جس نے یہ تحریر ۹۷۵ء کے قریب لکھی تھی۔

اگرچہ وہ علاقے جن کی تفصیل گذر چکی ہے اُن ممالک کے بالکلیہ مطابق نہیں ہیں بلکہ ان سے نسبتاً چھوٹے ہیں جہاں اس وقت اسلامی آبادی بستی ہے تاہم یہ سب نہ صرف ایک ہی مذہب کے پابند تھے بلکہ وہ ایک ایسی سیاسی طاقت در سند بھی بنے ہوئے تھے جن کو بزور شمشیر مجتمع کر کے قائم کیا گیا تھا۔ اسی حقیقت نے اُس زمانے کی دنیائے معلوم میں مسلمانوں کو ایک مضبوط مرکزی قوت کا موقف قائم کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔

دوسری طرف اگر ہم اس زمانے کی عیسائی یورپی دنیا کے جغرافیائی و سیاسی حالات پر غور کریں تو ہم فوراً تسلیم کریں گے کہ وہ عظیم الشان اسلامی سلطنت کی کہاں تک محتاج ہوگی۔ جنوب میں بحیرۂ روم ایک ناقابلِ عبور سرحد بنا ہوا تھا کیوں کہ اس زمانے میں یہ اسلامی ساحل کے حکمرانوں کے زیرِ اقتدار رہتا تھا؛

مغربی جانب آرمینیہ میں بازنطینی شہنشاہیت اسلام کے بالکل مدمقابل تھی، شمالی قفقاز اور مغربی یورپ نیم مہذب قوموں کا وطن تھا جو اسلام کے بھی قریباً اتنے ہی زیر اثر تھے جتنے کہ عیسائیت کے، صرف یورپ کے شمال میں بت پرست شمالی اقوام ہی ایسی تھیں جنھوں نے بارھویں صدی (چھٹی) میں اپنی پُرقوت وسعت کے آغاز میں اسلام کی سیاسی و معاشی برتری کو مٹانے میں بہت بڑا کام کیا۔

دو رقیب مذاہب کی دینی زیارت کے مرکز جغرافیائی موقف کے لحاظ سے نسبتاً بالکل جُدا تھے۔ عیسائی یورپ کا انتہائی مذہبی مرکز بیت المقدس ۶۳۸ء (۱۷ھ) سے مسلمانوں کے زیر حکومت تھا، لیکن اسلامی فتح نے مزار مقدس کی زیارتوں کو نہیں روکا جو یورپی عیسائی کیا کرتے تھے۔ جن ابتدائی زائرین کے حالات سفر ہم تک پہنچے ہیں ان میں فرانسیس آرکلف (۶۸۰ء / ۶۰ھ) ولی بالڈ ٹیکسنی (۷۲۵ء / ۱۰۷ھ) اور برنارڈ نامی کوئی شخص ہے جو ۸۷۰ء (۲۵۷ھ) روما سے زیارت کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے فتح کئے ہوئے ملکوں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے رہنے میں تنہا ان ہی لوگوں کی خدمات نہیں ہیں۔ بلکہ اس سلسلے میں بازنطینی شہنشاہیت کے عیسائیوں کے تعلقات اپنے ہم مذہبوں سے جو مصر، الشام اور مسوپوتامیہ میں موجود تھے، نہایت ہی اہم ہوں گے۔

اسلامی دنیا میں حالات بالکل جدا تھے۔ حج کا مرکز مکہ جغرافیائی موقف کے لحاظ سے بجائے خود مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ مقدس قانون کی رو سے بیت اللہ کی زیارت یعنی حج اسلام کے ارکان خمسہ سے ہے، اس لئے اسلامی مملکت کے ہر حصے سے مسلمان اس مقام پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس طرح حج صرف دینی اُخوت کو ترقی دینے کا ایک زبردست عنصر ہی نہیں رہتا بلکہ وہ تمام اسلامی ممالک کے تجارتی تعلقات کو مضبوط کرنے میں مادی طور پر مدد دیتا اور دنیا کے ہر حصے کے متعلق تمام مسلمانوں میں کافی معلومات کی اشاعت کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ متعدد سفرناموں کی تکمیل حج ہی کی مرہون منت ہے، جن میں مختلف ممالک سے مکہ کو جانے والی راہوں کی منزلوں اور مرحلوں کا ذکر بھی ہوتا ہے، لیکن ان سب میں دنیائے معلوم کے غیر مسلم علاقوں سے انتہائی ناواقفیت اور دلچسپی کا فقدان پایا جاتا ہے۔

قریباً ایک ہزار سال کا زمانہ ہوتا ہے کہ عیسائی یورپ کا تمدنی اُفق قریباً ہر جانب اسلام سے گھرا ہوا تھا۔ اس دوران میں یورپ نے دنیا کے گرد بحری سفر کئے اور ان سرحدوں میں بھی داخل ہو گئے جنھوں نے یورپ کو دنیائے نامعلوم سے تو نہیں البتہ دنیائے معلوم کے جنوبی و مشرقی حصوں سے جُدا

کر دیا تھا۔ اس معاملے میں یورپ بہت کچھ اپنی ہی قوت وہمت کا رہین منت ہے لیکن اس نے ان لوگوں کے علم اور تجربات سے بہت بڑا فائدہ اٹھایا جو کسی زمانے میں ساری دنیا کے مالک تھے۔ اس لیے یورپ کا فرض ہے کہ وہ جغرافیائی علوم کی قلم رو میں، انکشافات کے میدان میں اور عالمی تجارت کی دنیا میں ان کو اپنا مربی تمدن تصور کرے۔ جدوجہد کے ان شعبوں میں اسلام نے تمام موجودہ تہذیب پر جو اثر ڈالا ہے وہ ان متعدد عربی الاصل اصطلاحوں میں نظر آسکتا ہے جو بحریات وتجارت کی لغت میں پائے جاتے ہیں۔ اس اثر کی وسعت ان گوشوں کے تاریخی ارتقاء کے مطالعہ کرنے ہی سے ثابت کی جا سکتی ہے جن پر ہمارا اصلی جغرافیائی علم پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ جغرافیہ اتنا اثباتی اور روایات سے اس قدر آزاد علم ہے کہ وہ قدیم زمانے کی کم وبیش چند صحیح رایوں کو بھی صرف نظر کر دیتا ہے۔ میں نے صرف "چند" کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے یہاں صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ جب جیوبرٹ نے ۱۸۴۰ء (۱۲۵۶ھ) میں الادریسی کا فرانسیسی ترجمہ مرتب کیا تو اس وقت یہ ناممکن نہیں خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی اشاعت سے کرۂ ارض خصوصاً افریقہ کے متعلق جغرافیائی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

کرۂ ارض کے متعلق موجودہ معلومات پر ہمارے اسلامی تمدنی اسلاف کے تاریخی اثرات کا مطالعہ مشکلات سے خالی نہیں ہے، کیوں کہ اکثر اس بات کا یقین حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کا جغرافیائی علم کس حد تک شخصی مشاہدات پر مبنی تھا، کہاں تک انھوں نے واقعی سفر کیا تھا اور ان کے تجارتی تعلقات کی وسعت کیا تھی۔ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ نویں صدی (تیسری) چودھویں (آٹھویں) صدی تک عربی میں قابل لحاظ اور اہم جغرافیائی ادب پیدا ہو چکا تھا تو یہ بیان استعجاب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اس ادب کا بہت بڑا حصہ جو کچھ ہم کو پیش کرتا ہے وہ صرف عالموں، و رادیبوں کے درباری معلومات ہیں۔ یہ محررین خواہ کتنے ہی تیز نظر ہوں، اور وہ ان سیاحوں اور ملاحوں کی باتوں کو چاہے کتنی ہی زیادہ دلچسپی سے سنے ہوں جن سے یہ اپنے معلومات اخذ کرتے تھے، مگر پھر بھی اپنے دیکھے ہوئے ملکوں اور قوموں کی بابت وہ کم وبیش مذہبی تخیلی نیز روایاتی نظریوں کے پابند ضرور تھے۔ یہی چیز بعض حقائق کو صحیح روشنی میں دیکھنے سے ان کے مانع تھی، خواہ ان کی یہ رائیں قرون مظلمہ کے عیسائی عالموں سے کم تعصب آمیز ہی کیوں نہ ہوں۔ ان سرکاری وادبی معلومات کے علاوہ ملاحوں اور تاجروں کے بہت سے بحری وجغرافیائی

تجربات بھی تھے۔ علماء نے یقیناً اُن لوگوں کے معلومات سے فائدہ اٹھایا ہوگا لیکن بعض اوقات انھیں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کم دعوے کرنے والے تاجر و ملاح ہی خود اِن عالموں سے زیادہ صحیح معلومات رکھتے تھے۔ اسلام اور باعتبار زمانۂ وسطی یورپ کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں نسبتاً ادنیٰ درجے کے انھی لوگوں کو اصل استاد اور بڑا وسیلہ سمجھنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہیئتی جغرافیہ کے علاوہ عربی زبان کی ضخیم جغرافیائی کتابوں نے قرونِ وسطیٰ کے جغرافیائی نظریات پر عملاً کوئی فوری اثر نہیں ڈالا۔

یہاں ہم کو مسلمانوں کے ان وسیع جغرافیائی معلومات کی مساحت کرنے سے گریز کرنا چاہیئے جو عربی ادبیات میں پائے جاتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی ڈیڑھ سو سال تک جغرافیہ بحیثیت تجرباتی علم کے یقیناً ان معلومات سے آگے نہ بڑھ سکا جو اس وقت کی عیسائی دنیا میں ہم کو ملتے ہیں۔ زمین اور اس کے مختلف حصوں کے طول نیز دریائے نیل کے منبع وغیرہ کے متعلق آنحضرت صلعم کے صحابہؓ کے استناد سے عجیب و غریب رائیں بیان کی جاتی تھیں۔ انھیں میں یہ رائے بھی ملتی ہے کہ زمین کی شکل ایک پرندے کی سی ہے جس کا سر چین اور دم شمالی آفریقہ ہے۔ خود قرآن میں حسب ذیل دو مقاموں پر جغرافیائی اشارے موجود ہیں وہ یہ ہیں:۔ والذی مرج البحرین ھذا عذبٌ فراتٌ و ھذا ملحٌ اجاجٌ و جعل بینھما برزخاً و حجراً محجوراً[1] دوسری جگہ یہ ہے:۔ مَرَجَ البحرَینِ یلتقیٰنِ ۵ بینھما برزخٌ لا یبغیٰنِ[2] ان الفاظ کی مفسرین نے یہ تشریح کی ہے کہ اِن کا اشارہ بحیرۂ روم اور بشمول بحیرۂ احمر بحر ہند کی طرف ہے۔ یہ تفسیر غالباً صحیح بھی ہے۔ اس بات میں شاید ہی شبہ کیا جا سکے کہ بحرین والا نظریہ اصلاً ایرانی ہے اور قرآن میں اس کے ذکر نے نظریے کو وہ وقعت پہنچا دیا جو بہت بڑی حد تک اسلامی جغرافیائی ادب اور فنِ نقشہ کشی پر حاوی رہا۔

مسلمانوں میں جغرافیہ کا علمی مطالعہ یونانی اثر کے تحت شروع ہوا۔ نویں صدی (تیسری کے آغاز) خصوصاً خلیفہ مامون کے دور حکومت سے (۸۱۳ - ۸۳۳ء / ۱۹۷ - ۲۱۸ھ) یونانی علوم کا ترجمہ کرنے کی وسیع جد و جہد نے مسلمانوں کو یونانیات کا روحانی وارث بنا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بطلیموس کے جغرافیائی تصنیفات سے واقف ہو گئے۔ بطلیموس کا یہ نظریہ کہ آفریقہ کا مغربی کنارہ انتہائے مغرب تک چلا گیا ہے بحرین والے

---

[1] الفرقان۔ آیت ۵۳۔

[2] الرحمٰن آیت ۱۹ و ۲۰۔

نظریے کے بالکل مطابق تھا۔ ہمارے پاس بطلی موس کی تصنیف کے ترجمے کا کوئی ابتدائی نسخہ موجود نہیں ہے البتہ اُس کا ایک خلاصہ موجود ہے جو ۸۳۰ء (۲۱۵ھ) کے قریب مشہور ہیئت داں الخوارزمی نے کیا تھا؛ متن کے ساتھ لازماً جو نقشہ ہوگا وہ اب مفقود ہے۔ الخوارزمی کے دئیے ہوئے طول البلد و عرض البلد بڑی حد تک بطلی موس کے قریب قریب ہیں لیکن اس کتاب میں ایسے مقامات کا بھی جغرافیائی موقف دیا گیا ہے جو اسلامی فتح کے بعد وجود میں آئے تھے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بعد کے اشارے جدید ہیئتی مشاہدات پر مبنی تھے یا کیا؛ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ خلیفہ مامون نے صحرائے شام میں جغرافیائی درجوں کی ساحت کا حکم دیا تھا اور اسی خلیفہ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ ستّر علما کی مدد سے جن میں الخوارزمی بھی شامل تھا، کرۂ ارض کی ایک شکل تیار کی جائے، جس کا تذکرہ نسبتاً بعد کی ایک کتاب میں اب بھی موجود ہے۔ اس لیے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ الخوارزمی کی کتاب میں اسلامی عالموں کی تحقیقات کے نتائج موجود ہوں گے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں دوسرے اثرات بھی نمایاں ہیں جیسے آباد دنیا کی سات منطقوں یا اقلیموں میں تقسیم جو بطلی موس میں موجود نہیں ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ نظریہ ہفت اقلیم کا کچھ نہ کچھ سراغ یونانی عالموں کے وہاں بھی ملتا ہے، شاید اراٹس تھین کے زمانے سے۔ ممکن ہے کہ آباد دنیا کی تقسیم کا نظریہ اصلاً ایرانی یا بابلی ہو۔ اس نظریے نے اسلامی جغرافیائی ادب کے بڑے حصے میں نمایاں جگہ حاصل کرلی ہے، کیونکہ مسلمان مشرقی روایات کے بہ نسبت یونانی روایات کو زیادہ قبول کرتے تھے۔

کرۂ ارض کی وہ شکل جو بطلی موس کے تراجم کے ساتھ اسلامی دنیائے علم میں داخل ہوگئی تھی، جدید دنیائے اسلام کے باشندوں کے اُس تخیل سے پوری پوری مناسبت نہیں رکھتی تھی جو انھوں نے کرۂ ارض کے متعلق قایم کی ہوگی۔ زمین کی شکل گول ماننے پر ان کو کوئی اعتراض نہیں تھا حالانکہ اس زمانے کے اکثر عیسائی مولوی زمین کی گولائی کے منکر تھے، لیکن زمین کو گول تسلیم کرنے کی بھی مسلمانوں کو کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ یہی چیز اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ اسلامی جغرافیہ اور اسلامی ہیئت علیحدہ علیحدہ ترقی کرتے رہے۔ متعدد علمائے ہیئت جیسے الفرغانی (۸۶۰ء / ۲۴۶ھ) البتّانی (۹۰۰ء / ۲۸۷ھ) ابن یونس ([illegible]) اور البیرونیِ اعظم (۱۰۳۰ء / ۴۲۲ھ) طول بلد و عرضِ بلد کی تقویمیں پیش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں وہ ہفت اقلیم کی تقسیم کو تسلیم کرتے رہے، لیکن ملکوں کے متعلق جغرافیائی معلومات میں انھوں نے کچھ اضافہ نہیں کیا اور کچھ کیا بھی تو بہت ہی معمولی۔ ایسے معلومات ملکوں کے عام حالات اور سفرناموں سے اخذ کئے جاتے تھے،

ہو سلطنت کے نظم ونسق کے لیۓ نہایت کارآمد ہوتے تھے۔ مکّہ کے سفرناموں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس طرح نویں (تیسری) صدی کے دوران میں مختلف ملکوں کے بہت سے حالات "کتاب الممالک" یا "کتاب الممالک والمسالک" جیسے عنوانوں کی تحت وجود میں آگئے تھے۔ اس زمانے کے خاص لکھنے والے ابن خردابہ (۸۷۰ء/۲۵۷ھ)، الیعقوبی (۸۹۰ء/۲۷۷ھ)، ابن الفقیہ (۹۳۰ء/۳۱۸ھ) اور ابن رسطہ (۹۱۰ء/۲۹۸ھ) ہیں۔ یہ مولفین اسلام سے تعلق رکھنے والے مختلف ممالک کے نظم ونسق اور طول البلد و عرض البلد (ٹوپوگرافی) وغیرہ کا ذکر کم وبیش باقاعدہ طور پر کرتے ہیں جن میں عموماً سیاحت نامے نمایاں جگہ گھیرے رہتے ہیں۔ اِن تالیفوں میں ایک طرف تو اسلامی ممالک جیسے مشرق بعیدہ کے ممالک وجزائر بلکہ بازنطینی شہنشاہیت پر بھی قابل لحاظ توجہ کی جانے لگی تھی؛ دوسری طرف ہر قسم کے بے بنیاد قصوں کو بھی بڑی جگہ دی جاتی تھی۔ امیر البحر سلیمان ایرانی کے ہندی وچینی سیاحتوں کے حالات بھی اس دور سے متعلق ہیں۔

دسویں (چوتھی) صدی میں ہم کو ایک جدید اَدبی جغرافیائی دبستان کا ارتقا دنظر آتا ہے، جس نے مسلمانوں کے جغرافیائی نظریات پر زبردست اور دیرپا اثر ڈالا۔ ان کتابوں کے مضامین بڑی حد تک ابتدائی تالیفات پر مبنی ہیں لیکن یہ کتابیں اسلامی ممالک کے ان معلومات سے مالامال ہیں جو اس دوران میں حاصل کیۓ گئے تھے۔ اس عہد کے اکثر مولفین خود بڑے سیاح تھے۔ پچھلے عہد سے یہ جدید دبستان دو حیثیتوں سے ممتاز تھا۔ پہلی یہ کہ اس میں اُن ممالک پر بہت کم توجہ کی گئی جو اسلام سے متعلق نہیں تھے۔ دوسری یہ کہ اس میں جغرافیائی مواد کو پورے نظم وترتیب سے استعمال کیا گیا جس کے ساتھ نقشے بھی لگائے گئے، اور متن گویا انھیں کی تفصیل وتشریح کے لیے تھا۔ ان نقشوں میں پہلا نقشہ پوری دنیا کا ہے جس کی شکل مدور اور مکّہ اس کا مرکز ہے۔ دنیا کے اطراف "بحر محیط" ہے جس سے دو خلیجیں بر اعظم میں داخل ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے قریب قریب ملے ہوئے چل کر ایک دوسرے نقطے یعنی فاکنائے سوئز تک پہنچتی ہیں۔ یہ خلیجیں قرآنی روایت کے مطابق بحیرۂ متوسط اور بحر ہند یعنی باصطلاح قدیم بحیرۂ روم وبحر فارس ہیں۔ دنیا کے نقشے کے بعد عرب کا ذکر بحیثیت دنیا کے مرکز کے ہے۔ اس کے بعد شمالی آفریقہ، اسلامی اسپین، مصر اور الشام ہیں؛ بحیرۂ متوسط کے حالات کے بعد یہ حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جغرافیائی حالات کا دوسرا حصہ مشرقی اسلامی علاقے سے بحث کرتا ہے جو مسوپوٹامیہ سے شروع ہو کر ماوراء النہر پر ختم ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا مولف جس نے اس قسم کے جغرافیائی رسالے لکھے ابو زید البلخی (۳۲۲ھ/۹۳۴ء) ہے، جو خاندان سامانیہ یعنی اُمرائے خراسان و ماوراء النہر کے دربار کا مشہور عالم تھا۔ البلخی پر وزیر الجیہانی بہت ہی مہربان تھا۔ اس وزیر نے خود بھی جغرافیہ پر ایک ضخیم رسالہ سپرد قلم کیا تھا جس کا یورپ میں اب تک کوئی متن دریافت نہیں ہوا۔ خود البلخی کی کتاب بھی اس وقت موجود نہیں ہے، لیکن بعض اہم جغرافیائی کتابیں اس کے قائم کئے ہوئے نظام کے نکملے ہیں۔ یہ کتابیں اصطخری (۳۳۹ھ/۹۵۰ء) ابن حوقل (۳۶۵ھ/۹۷۵ء) اور ایک حد تک دوسروں سے بے نیاز المقدسی (۳۷۵ھ/۹۸۵ء) کی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس جغرافیائی دبستان کا کچھ حصہ ساسانی دور سے چلی آنیوالی قدیم ایرانی روایات کا وارث ہو، چنانچہ یہ بات بحر ہند کو بحر فارس موسوم کرنے سے ظاہر ہے یقیناً یہ نقشے جغرافیائی حقایق کے تصورات کو ان قیاسات سے زیادہ صحیح ظاہر کرتے ہیں جو اس زمانے میں یورپ میں رائج تھے، جن کا سارا انحصار اسپینی راہب بی طس (۷۳۰-۷۹۸ء/۱۱۲-۱۸۲ھ) کے نقشے پر تھا۔ بلاشبہ جاندار وں کی تصویروں سے وضاحت کرنے کی ممانعت کی وجہ سے ہم کو اسلامی نقشوں میں انسانوں یا جانوروں کی تصویریں نہیں ملتیں۔ تصویروں کے اضافے کی وجہ سے اکثر یورپی نقشے واہمہ کی خلاقی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ہیرفورڈ کا مشہور نقشہ۔ اس کے برخلاف دسویں (چوتھی) صدی کے اسلامی نقشوں میں بحری ساحل اور دریاؤں کو متفقہ تجرباتی اصول پر ظاہر کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے؛ اس طرح اصطخری کے بہت سے نقشوں میں بحیرۂ متوسط کو بیضوی یا مستطیل شکل میں دکھایا گیا ہے۔

اس عہد میں جغرافیہ پر جو دوسری کتابیں لکھی گئیں ان میں خاص طور پر صرف ایک ہی علاقے کا ذکر کیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف الہمدانی اور البیرونی ہیں۔ اول الذکر نے جزیرہ نمائے عرب اور ثانی الذکر نے ہندوستان کے حالات تحریر کئے ہیں۔ اس قسم کی متعدد تالیفیں ہم تک صحیح سالم نہیں پہنچیں بلکہ ان کا علم بعد کی تالیفوں سے ہوا ہے۔ جیسے ابن فضلان کی اس سفارت کی روداد جو خلیفہ المقتدر نے ۳۱۰ھ/۹۲۱ء میں وال گا بل گرے ربن؟ کو روانہ کی تھی المسعودی کی تالیفات کو اسلامی جغرافیہ میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔ المسعودی اسلامی دنیا کا جہاں گرد ہے، جس نے اپنے دوران سیاحت میں جغرافیہ اور انسانی نسلیات (اتھنوگرافی) کا عظیم الشان ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ۳۴۵ھ/۹۵۶ء کی لکھی ہوئی صرف دو کتابیں اب بھی محفوظ ہیں؛ مگر وہ اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جغرافیہ اور سیاحوں یا ملاحوں کے آزاد جغرافیائی معلومات میں بڑا فرق ہے؛ اس طرح ایک مقام پر بحر ہند کی

وسعت کے متعلق اسلامی عالموں کی عام رایوں کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد المسعودی اپنی یہ تنقیدی رائے دینے سے نہیں رکتا کہ خلیج فارس کی بندرگاہوں کے کھیویے، جو ان سمندروں سے بخوبی واقف ہیں، عالموں کی بیان کی ہوئی پیمائشوں سے بالکل اتفاق نہیں کرتے۔ اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ بعض سمتوں میں ان سمندروں کا کوئی کنارہ ہی نہیں ہے۔ یہ بات اس رائج الوقت دعوے کے بالکل خلاف تھی کہ "بحیرۂ فارس" "بحر محاط" کی ایک خلیج ہے اور بحرۂ متوسط کی طرح اس میں داخل ہونے کے لیے بھی نسبتاً ایک تنگ گذرگاہ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس طرح مولف مذکور المقدسی بھی بحر ہند کی شکل پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بعض لوگ اس کو طیلسان (ایک قسم کا بیضوی ایرانی لباس) کے جیسا بتاتے ہیں اور بعض پرندے کی طرح، لیکن ایک شیخ نے، جو اس فن میں ماہر تھا، طویل تحقیقات کے بعد مجھے ریت پر اس سمندر کی شکل کھینچ کر دکھائی، یہ شکل طیلسان سے مشابہ تھی نہ کسی پرندے سے بلکہ کھاڑیوں اور جزیرہ نماؤں کی شکلوں کی وجہ سے بالکل بے ترتیب تھی معلوم ہوتا ہے کہ المسعودی چین بھی گیا تھا اور آفریقہ کے مغربی ساحل سے تو وہ کافی واقف تھا۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہئیتی جغرافیہ سے کچھ یوں ہی واقف تھا، کیوں کہ اس کی کتاب میں یہ عجیب رائے ملتی ہے کہ ایک ہی منطقے میں تمام اہم شہر لازماً ایک ہی طول بلد پر واقع ہوں گے۔

گیارھویں (پانچویں) صدی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر اسی طرح چلتی رہتی ہے لیکن نسبتاً مدھم روشنی میں:۔ اس زمانے کا سب سے مشہور مولف محمد البکری الاسپینی ہے (زمانۂ تحریر ۱۰۶۷ء / ۴۵۹ھ) جس کی ضخیم تالیفات میں سے اب تک صرف آفریقہ سے متعلقہ حصہ مرتب ہوا ہے۔ یہاں ہم کو سیاحتوں کا زیادہ تفصیلی علم ہوتا ہے خصوصاً ساحلی علاقے کا جن پر مختلف قسم کی بندرگاہیں اور کھاڑیاں تھیں۔ اسی زمانے کے لگ بھگ ایرانی ناصر خسرو کی سیاحتوں کے حالات ملتے ہیں۔ خراسان سے نکل کر اس نے مصر اور مکّہ کی زیارت کی، یہ شخص اپنے آپ کو بڑا ہی تیز نظر ظاہر کرنے کے باوصف دنیا کے عام ڈھانچے کے متعلق انتہائی غلط نظریوں کا قائل تھا۔

گیارھویں (پانچویں) صدی نے ایسے واقعات دیکھے جنھوں نے اسلامی دنیا کے معیاری اتحاد پر سخت ضربیں لگائیں نصف مشرقی حصے کو سلجوقی ترکوں نے ۱۰۵۰ء / ۴۴۲ھ میں روندا، اور مغربی مسیحی حکمرانوں نے جزیرۂ صقلیہ، اسپین کا کافی وسیع حصہ، بلکہ آفریقہ کے بعض ساحلی مقامات بھی فتح کر لیے۔ اسی زمانے میں یورپ محاربات صلیبی کی تیاریاں کر رہا تھا یہی وہ زمانہ تھا جب کہ عالم اسلام اور عیسائی دنیا کے

درمیان کا پردۂ مغایرت چاک ہونا شروع ہوا۔ افتراق کی وجہ سے عالم اسلام نے اپنی قوت کھودی۔ یہ سیاسی قوت صرف تھوڑی سی مدت کے لیے ان ہی سلجوقیوں اور ایوبیوں کی قیادت میں دوبارہ ظاہر ہوئی جب کہ یہ دونوں خاندان صلیبیوں کے مقابلے میں ایک خوں ریز کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان واقعات نے مسلمانوں کے مُسلّمہ جغرافیائی نظریات پر کوئی اثر نہیں ڈالا؛ البتہ اس وقت حقیقی جغرافیہ تک پہنچنے کی صرف معمولی سی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ابن حوقل کے ۱۱۲۴ء / ۵۲۰ھ والے جغرافیائی رسالے کے بعد کے ایک خلاصے میں دنیا کا نقشہ بالکل گول نہیں بلکہ بیضوی ہے جو از روئے ہیئت آباد دنیا کی شکل کے مطابق ہے۔

اس زمانے کا سب سے زیادہ روشن خیال مولف الادریسی ہے۔ تمام اسلامی جغرافیہ دانوں میں سب سے زیادہ الادریسی ہی ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ پہلے تو اس وجہ سے کہ الادریسی نے ایک مسیحی حکمران یعنی صقلیہ کے نارمن بادشاہ روجر دوم (۱۱۰۱ تا ۱۱۵۴ء / ۴۹۵ تا ۵۴۹ھ) کے دربار میں اپنا علمی کام انجام دیا اور یہ خطۂ زمین دو بڑے تمدنی علاقوں کا خاص مقام اتصال تھا؛ دوسری وجہ یہ کہ یہی شخص مدت دراز تک اسلامی جغرافیائی علوم کی تنہا نمایندگی کرتا رہا۔ جغرافیہ کی ابتدائی عربی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ الادریسی بڑی حد تک اپنے پیشرؤں کا دست نگر ہے۔ لیکن یہ حقیقت — کہ شاہ روجر نے دنیائے معلوم کے حالات مرتب کرنے کا کام ایک مسلمان عالم کے سپرد کیا تھا — صاف ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے میں اسلامی علوم کی فوقیت کا اعتراف کس حد تک کیا جاتا تھا۔

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ صقلیہ کا نارمن دربار نیم مشرقی تھا؛ روجر کی یہ خواہش کہ اس کے لیے ایک جغرافیہ تیار کیا جائے بجائے خود مشرقی چیز ہے۔ اپنے زیر اقتدار خطۂ زمین کے حالات کا اجمالی خاکہ تیار کروا کر رکھنا بڑے بڑے بادشاہوں جیسے سکندر یا بعض ایرانی شہنشاہوں کا قدیم الایام سے شاہی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ المامون کی جغرافیائی دلچسپی کی تہ میں بھی اسی قسم کا خیال کارفرما تھا، اور یہی حال دسویں (چوتھی) صدی کے جغرافیائی دبستان کا ہے جس کی ابتدا سامانیوں کے دربار سے ہوئی تھی۔ الادریسی کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ روجر نے معلومات اکٹھا کرنے کے لئے لوگوں کو ہر طرف روانہ کیا تھا تاکہ وہ سب اس کی کتاب میں جمع کئے جائیں؛ اور المامون کی طرح اس نے بھی دنیا کے ایک بڑے نقشے کی تیاری کا حکم دیا تھا۔ الادریسی کی تالیفات میں بھی نقشے موجود ہیں بلکہ ایک

لحاظ سے ان تالیفات کا زیادہ تر حصہ ان ہی نقشوں پر مشتمل ہے کیوں کہ متن میں انھی کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور دو کتابوں میں ستر نقشے ہیں (دراصل تمام مخطوطات میں سے ایک ایک نقشہ غائب ہے) الادریسی اسلامی ہیئت دانوں کے طریقے پر دنیا کو سات اقلیموں میں تقسیم کرتا ہے، ہر نقشہ ایک اقلیم کے دسویں حصے کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو بطلیموسی نمونے کے بالکل مطابق ستر نقشوں سے ایک ذو اربعۃ الاضلاع مستطیل بنتا ہے۔ ان نقشوں میں بحر بند والے مخصوص اسلامی تصور کو باقی رکھا گیا ہے لیکن ساتھ ہی تفصیلات اور خصوصاً بحیرۂ متوسط کے ساحلی خط کو حقیقت کے مطابق ظاہر کرنے میں یہ تمام پچھلے اسلامی نقشوں سے بہتر ہے۔

الادریسی کی کتاب سے ظاہر ہے کہ مولف گذشتہ جغرافیہ نویسوں کا کتنا مرہون منت ہے۔ بہرطور یہ تمام تالیفات بحیثیت مجموعی بیانی اور ہیئتی جغرافیہ کے تطابق و توافق کی نہایت اچھی مثالیں ہیں۔ البتہ یہ بات ذرا مشکوک ہے کہ آیا البیرونی جیسے بڑے علمائے ہیئت کی مساحت کے نتائج بھی کام میں لائے گئے، کیوں کہ الادریسی کی کتاب کے دوسرے نسخے میں جو "الادریسی الاصغر" کہلاتا ہے، سات اقلیموں کے علاوہ خط استوا کے جنوب میں ہم کو ایک آٹھویں اقلیم بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ "الادریسی الاکبر" میں دوسرے نقشوں سے پہلے دنیا کا جو نقشہ لگایا گیا ہے وہ حسب رواج قدیم گول ہے۔ چوں کہ الادریسی نے اپنی تالیفوں میں وقائع نگاری و جغرافیہ کے وہی مضامین جمع کئے ہیں جو اسلامی و عیسائی دونوں تہذیبوں کے درمیان متفق علیہ تھے اس لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ صقلیہ و اطالیہ یا دوسرے مسیحی ممالک کے عیسائی عالم الادریسی کی تالیفوں سے بالکل ناواقف محض رہے ہوں لیکن موجودہ زمانے میں اس کے اثر کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ الادریسی کے معلومہ ترجموں میں سب سے پہلا ۱۰۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں روما سے شائع ہوا جو اس کی تالیف کے ایک نامکمل خلاصے سے کیا گیا تھا؛ لطف یہ کہ مترجم کو مولف کا نام تک معلوم نہیں تھا۔

الادریسی کے بعد، سیاحوں کے بیانات کے سوا، جو اس زمانے میں بہت زیادہ ہو گئے تھے، جغرافیائی ادب میں کوئی بڑی اپج نہیں پائی جاتی۔ مشہور ترین سیاحوں میں ابن جبیر ہے جس نے ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں مکہ اور مسوپوتامیہ کا سفر کیا تھا؛ اس کے ایک صدی سے زیادہ عرصے بعد ابن بطوطہ گزرا ہے جو مراکو کا باشندہ تھا۔ اس نے تمام دنیائے اسلام کی سیاحت کی، یہ مغربی جانب لنکا اور مالدیو پہنچا اور پھر قسطنطنیہ کی بھی سیر کی۔ ۷۵۴ھ/۱۳۵۳ء تک آخری سیاحتیں اس کو افریقہ کے انتہائی اندرونی حصے تک پہنچا دیتی ہیں۔ دوسرا سیاح

ابن فاطمہ ہے جس نے ۶۴۸ھ؍۱۲۵۰ء میں دنیا کے اس حصے کا بیش بہا تذکرہ یادگار چھوڑا ہے؛ ہمارے پاس اس کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے لیکن ۶۷۳ھ؍۱۲۷۴ء کے قریب ابن سعید نے اس سے استفادہ کیا تھا۔ اس آخر الذکر مولف کی کتابیں بڑے کام کی ہیں، اس لیے کہ یہ بھی اپنے مضمون کو الادریسی کی طرح استعمال کرتا ہے۔ گو اسکے بیانات مختصر ہیں لیکن ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آفریقہ کے متعلق مسلمانوں کا علم کتنا زیادہ ترقی کرگیا تھا! اسکے علاوہ ابن سعید کے بیانات منہیتی جغرافیہ سے اس اعتبار سے زیادہ قریب ہیں کہ ان میں بڑے بڑے شہروں اور مقاموں کے جغرافیائی موقف کو نہایت صحت سے متعین کیا گیا ہے۔ حماہ واقع الشام کے حکمران ابوالفداء کے خاص ماخذوں میں ابن سعید بھی ہے۔ قریباً سو سال تک الادریسی کے بعد ابوالفداکی جغرافیائی کتاب تقویم البلدان بھی عربی زبان میں سب سے زیادہ مشہور تھی؛ جو ابتدائی ماخذوں کا ایک معمولی مجموعہ ہے۔

ہمارے مقصد کے لیے بہت زیادہ قیمتی تالیف یاقوت (۶۲۶ھ؍۱۲۲۹ء) کی بڑی جغرافیائی قاموس ہے۔ اس میں تمام جغرافیائی اسماء بہ ترتیب حروف تہجی مذکور ہیں۔ اس کتاب کا وجود جغرافیائی دلچسپی کا اتنا ہی رہین منت ہے جتنا کہ سوانحی شوق، کیوں کہ مولف کا مقصد مشہور اشخاص کے القابوں کی تشریح کرنا ہے۔ جو ان کی جائے ولادت یا مقام مسکونہ پر پڑ گئے تھے۔ دوسری قسم کی تالیف القزوینی (۶۷۴ھ؍۱۲۷۵ء) کی ہے۔ اس محرر کو عربی ادبیات کا پلینی کہا جاتا ہے؛ اس نے ترکیب کائنات (کاس موگرافی) اور جغرافیہ پر الگ الگ کتابیں لکھی ہیں؛ آخر الذکر میں اس نے اپنے بیان کردہ مقاموں کے متعلق بہت سی عجیب وغریب فسانوی تفصیلات بھی دی ہیں۔ اس شخص کو جرمن ممالک کا بھی کچھ نہ کچھ علم ضرور تھا! ایک بہتر اور زیادہ یکجی جغرافیہ نویس الدمشقی (۷۲۶ھ؍۱۳۲۵ء) ہے، اگرچہ اس کا عام رجحان بھی القزوینی کی طرح ہے۔

الادریسی کے بعد بہت سارے اسلامی جغرافیہ نویسوں کے وجود سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی جغرافیائی حالات کا علم بڑی وسعت پر پھیلا ہوا تھا، لیکن اب ہم جغرافیہ نویسوں کے مخصوص اسلامی دبستان کا ذکر نہیں کرسکتے۔ مغلوں کے حملے کے بعد اسلامی دنیا نے ہمیشہ کے لیے اپنی انتہائی اخوت بلکہ تمدنی ہم آہنگی بھی کھودی۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں دین اسلام نے نئی راہیں نکالیں ــــ وسط ایشیا اور ایشیائے کوچک میں ترکی حملوں کے ذریعے اور اندرونی آفریقہ میں تبلیغ وتجارت کے سکوت پسند طریقے سے۔ بعد کے عربی وفارسی دونوں ادبیات میں ہم کو ان ملکوں کے متعلق مزید معلومات ملتے رہتے ہیں؛

مگر عیسائی قومیں خود بھی اس وقت سیاحت و انکشافات میں سرگرم ہو چکی تھیں جن میں سب سے مقدم اطالوی تھے۔ چودویں (آٹھویں) صدی کا ایک مولف العماری ایشیائے کوچک کا بیان کرتے ہوئے جنوا کے ایک شخص کو اپنی سند میں پیش کرتا ہے۔ اس زمانے میں ہم کو زیادہ تخصیص سے ایک ہی ملک کے جغرافیائی حالات اور وہاں کے اداروں کے متعلق بیانات ملتے ہیں۔ اس طرح ابتدائی دور کے حالاتِ مصر کو متعدد مولفوں نے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے؛ مصر کے حالات میں مشہور ترین اور نہایت تفصیلی بیان المقریزی (سنہ ۱۴۴۲ء؍ ۸۴۴ھ) کا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا قرونِ وسطیٰ میں ادبی اسلامی جغرافیہ کا یورپی خیالات پر زیادہ راست اثر ڈالنا معلوم نہیں ہوتا۔ عیسائی محرروں نے جو اسلامی جغرافیائی نظریات قبول کئے اس کے ثبوت میں دنیا کا وہ نقشہ ہے جو ''اُوپس ٹراسیا لینکٹو'' نامی کتاب میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کی مَیارِی نُوسَیا نُو ٹُو نے سنہ ۱۳۲۱ء؍ ۷۲۱ھ میں تکمیل کی اور پوپ کے نام معنون کیا۔ یہ نقشہ گول ہے جس کا مرکز بیت المقدس مانا گیا ہے۔ اس نقشے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دو بڑی دریائیں سمندر سے نکلی ہیں اور آفریقی ساحل انتہائے مغرب تک چلا گیا ہے۔ اس طرح صلیبی محاربات کی روح کو مستعدی سے زندہ کرنے والے نے اپنے کو اس قوم کے علم و فن کا ایک معمولی خوشہ چیں بتایا ہے جس کو وہ خود ہی تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔

مسلمان ہیئت دانوں کے جغرافیائی تالیفات کا پہلے بھی کچھ ذکر آ چکا ہے۔ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے علوم پر بہ نسبت جغرافیہ کے اسی کا بہت زیادہ راست اثر پڑا ہے۔ ان کی بعض تالیفوں کا ابتداہی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ مثلاً افلاطون تِوالوی نے سنہ ۱۱۵۰ء؍ ۵۴۵ھ میں البطانی کی (زمانۂ تحریر سنہ ۹۰۰ء؍ ۲۸۷ھ) زیچ کا ترجمہ کیا تھا۔ الفانسو سابع کے ''طولے دو'' کو فتح کر لینے کے بعد یہی مقام وہ خاص مرکز بن گیا تھا جہاں ہر ملک کے عیسائی علماء عربی کے حکمیاتی ادب سے روشناس ہوتے تھے جہاں تک جغرافیہ کا تعلق ہے ان علمی کوششوں نے سب سے پہلے تو زمین کی کرویت کے اصول کو زندہ رکھا، جو قرونِ مظلمہ میں ابتدا ہی سے قریباً بھلا دیا گیا تھا اور جس کے بغیر امریکہ کی دریافت لازماً ناممکن ہوتی۔ تمام اسلامی ہیئت داں جغرافیہ کا ذکر بعض مقامات کے طول البلد اور عرض البلد کو متعین کرنے کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ نقشہ کھینچنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ انھوں نے طول البلد اور عرض البلد کی جدولیں سات منطقوں کے حساب سے ترتیب دی ہیں۔

اس علم کی زیادہ عمومی حیثیت ہونے کی وجہ سے مسیحی عالموں نے خالص اسلامی جغرافیہ سے زیادہ اس میں دلچسپی لی؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارھویں (چھٹی) صدی میں ہیئتی تقویمیں لاطینی زبان میں شائع ہونا شروع ہوگئیں تھیں جن کے ساتھ بعض اوقات جغرافیائی جدولیں بھی ہوتی تھیں بلکہ بعض مسیحی عالموں نے ہفت اقلیم کی تقسیم بھی تسلیم کرلی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ اہم خدمت مسلمانوں کا یہ تخیل تھا کہ دنیائے معلومہ کے نصف کرۂ ارض کا ایک مرکز یا "اوج عالم" ہے جس کا فاصلہ مشرق، مغرب، شمال اور جنوب سے بالکل مساوی ہے۔ البطانی اس "گنبد ارضی" کا مقام ایک جزیرہ بتاتا ہے لیکن اس کا ہم عصر ایک دوسرا مصنف ابن رسطہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ "گنبد ارین" ہے[1] لفظ ازین کی یہ غلط صورت ہندوستانی شہر اُجین (بطلیموس کے جغرافیہ میں یہ لفظ "اُزین" ہی ہے) کے نام کو عربی رسم خط میں نقل کرنے کی وجہ سے قائم ہوگئی۔ کسی وقت اُجین میں ایک رصدگاہ بھی اور اسی شہر کے سمت الرأس پر اوج عالم کا ہونا فرض کیا جاتا تھا جو اصلاً ایک ہندی تخیل ہے۔ اسلامی ہیئت دانوں کی طرح اُن کے عیسائی شاگرد بھی اس اصول کو انتہائی اہمیت دیتے تھے۔ ان مسیحی عالموں میں اڈی لارڈ باتھوی، جس نے ۱۱۲۶ء (۵۲۰ھ) میں الخوارزمی کی مثلثیاتی جدولوں کا ترجمہ کیا، جی رارڈ کریمونوی (۱۱۱۴-۱۱۸۷ء؛ ۵۰۸-۵۸۳ھ) اور تیرھویں (ساتویں) صدی میں روجر بیکن اور البرطوس میاگ نس میں یہ نظریہ ازین بعد میں بھی کارڈی نل پی ئر اولی کی کتاب "اِساگو منڈی" میں بھی پایا جاتا ہے جو ۱۴۱۰ء (۸۱۳ھ) میں شائع ہوئی تھی کرس ٹوفر کولم بس نے اس کتاب سے مذکورہ بالا اصول معلوم کیا تھا، جو اس دوران میں اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ کولم بس کو یقین ہو گیا کہ زمین کی شکل ناشپاتی کی سی ہے اور یہ کہ نصف کرۂ مغربی میں "اوج ازین" کے عین مقابل ایک دوسرا مرکز بھی ہے جو مشرقی جانب کے اوج سے بہت زیادہ ابھرا ہوا ہے ــــ اس طرح کہ ناشپاتی کے نصف حصۂ زیریں کی شکل مکمل ہو جائے۔ اس طرح اسلامی جغرافیائی نظریہ دنیائے جدید کے انکشاف میں اپنے حصے کا بھی دعویٰ کرسکتا ہے! اس نظریہ کا اثر ہم کو ایک دوسرے دائرے میں بھی ملتا ہے۔ یہ بالکل اغلب ہے کہ اس نقطۂ نے دانتے کو ــــ جس کا اسلامی روایات کا رہین منت ہونا متعدد حیثیتوں سے ثابت ہو چکا ہے۔ آمادہ کیا کہ

---

[1] انگریزی میں "ارین" ہی لکھا ہے یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ عربی رسم کتابت میں صرف ایک نقطے کے ہونے نہ ہونے سے "ز" کا "ر" یا "ظ" کا "ط" وغیرہ آسانی سے ہوجاتا ہے؛ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ ازین ہی ہو اور کاتب کی چوک سے "ز" پر نقطہ نہ لگا ہو اور بعد کو "ازین" کی شکل "ارین" ہو گئی ہو ۱۲ مترجم

وہ اپنی جہنم کو ایک پہاڑ کی صورت میں مغربی نصف کرۂ ارض میں متعین کرے؛ اس شاعر نے نظریہ ارین کو اس قدیم عیسائی عقیدے میں نہایت خوب صورتی سے سمو دیا ہے جس کے مطابق جنت ارضی ماوراء بحر دنیا کے انتہائی مشرقی سرحد پر واقع ہے، جیسا کہ دنیا کے ان مختلف نقشوں پر دکھایا گیا ہے جن کو بی ٹس نے تیار کیا تھا۔

اسلامی جہازرانی نویں (تیسری) صدی میں اپنے انتہائی حدود تک پہنچ گئی تھی لیکن اگر ایک طرف بحر ہند میں جہازرانی کی خاص اہمیت ایشیا اور آفریقہ کے غیر اسلامی ساحلوں سے تجارتی تعلقات پر منحصر تھی تو دوسری طرف بحیرۂ متوسط کی تجارتی جہازرانی صرف اُن حصوں تک محدود تھی جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے؛ عیسائی بندرگاہوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت غارت گرانہ اور فوجی تھی۔

اس طرح نتیجتاً صرف بحر ہند ہی سمندری اولوالعزمیوں کا تنہا اکھاڑا تھا جس کا قاعدہ خلیج فارس تھا؛ یہاں کے بندرگاہ جیسے سیراف و البصرہ اور اس کے نواح میں الابلّہ نیز عمان کے بندرگاہ زمانہ قبل اسلام میں بھی تجارت و جہازرانی کے اہم مرکز تھے۔ اسلام کی آمد خصوصاً عراق میں اسلامی سیاسی مرکز کے قیام نے مہم پسند جذبات کی ہمت افزائی کی۔ تقریباً وسط دسویں (چوتھی) صدی میں اسلامی جہاز چینی شہر کن فو-تاک جو اب کیان ٹن کہلاتا ہے پہنچ گئے تھے جہاں اس زمانے میں قابل لحاظ اسلامی نوآبادی موجود تھی اور چین سے جو تجارت ہوتی تھی اس کی منڈی بھی یہی شہر بن گیا تھا۔ بعض مسلمان تاجر و سیاح اس مقام سے اور آگے شمال کی طرف بھی گئے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کوریا اور جاپان سے بھی واقف ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تجارتی گرم بازاری ۸۷۸ء/۲۶۵ھ میں کسی فتنے کی وجہ سے ختم ہو گئی جس میں بندرگاہ کن فو برباد ہو گیا۔ اس زمانے سے باقاعدہ جہازرانی اس شہر سے آگے نہیں بڑھ سکی جس کو عربی مولف کالا کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو خاص طور پر ٹین کی کانوں کے لئے شہرت رکھتا تھا؛ اس کا محل وقوع ملاکا کے مغربی ساحل پر تلاش کرنا چاہیئے۔ کالا سیاسی حیثیت سے رئیس زاباج کا محکوم تھا؛ یا ابتدائی عربی میں جاوا کے لیے آیا ہے لیکن اس زمانے میں زاباج سب سے پہلے سوماترہ کا طرفدار تھا خصوصاً اس زمانے کی مرفہ الحال سلطنت شری وجایا کے مرکز کا؛ ان تمام علاقوں سے بھی تجارتی تعلقات موجود تھے۔ ابن رستہ (۹۰۰ء/۲۸۷ھ) سلیمان (۸۵۱ء/۲۳۶ھ) اور اس کے جانشین ابوزید (۹۵۰ء/۳۳۹ھ) جیسے مولفین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سمندروں میں مسلمان جہازراں بالکل بے تکلف آتے جاتے تھے اگرچہ یہ کتابیں اُن بحری راستوں کے نہایت واضح حالات نہیں بیان کرتیں جو اس وقت اختیار کئے جاتے تھے۔ اسلامی جہاز سرندیپ یعنی لنکا کی بندرگاہوں اور ہندوستان کے مشرقی ساحل سے بھی ویسے ہی سرگرم تجارتی کاروبار قائم کئے ہوئے تھے۔

نواح بمبئی کے سیمورؔ نامی شہر میں ایک مرفہ الحال عربی نو آبادی بسی ہوئی تھی۔ ان علاقوں کی تجارت کے لئے سندھ میں اسلامی سرحد پر دیبل ایک اہم تجارت گاہ تھی۔ آفریقہ کے مغربی ساحل پر — جہاں بحیثیت مجموعی تجارت کی اہمیت کم تھی — مسلمان دسویں (چوتھی) صدی کی ابتدا میں ملک سُفالا تک پہنچ گئے تھے، جو سونے کی کانوں کے لیے مشہور تھا۔ یہ خطہ مدغاسکر کے بالمقابل آفریقی ساحل پر واقع تھا اور خود اس جزیرے کو بھی مسلمان وَق وَق کے نام سے جانتے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے وَق وَق سے بھی واقف تھے جو چین کے بالمقابل تھا، اس کے حالات جاپان سے بالکل مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ جغرافیائی کتابوں میں ان مقاموں کے حالات میں جو بے انتہا خلط ملط پایا جاتا ہے یقیناً اسی کا نتیجہ ہے اور بلاشبہ اس کا سبب وہ بے بنیاد جغرافیائی ادعا تھا کہ آفریقہ کا مغربی ساحل مغربی جانب چین کے مضافات میں کسی مقام یعنی بحیرۂ فارس کے دہانے تک چلا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا اُمرائے بحر کا علم رواجی نظریات کا پابند نہیں تھا۔ اِن لوگوں کی سیاحت کے قصے عربی ادبیات میں بہت مقبول تھے اور بہت جلد ان کو رومانی رنگ کا لباس پہنا دیا گیا، جن میں سے الف لیلہ و لیلۃ میں سندباد جہازی کے مشہور زمان قصے باقی رہ گئے ہیں۔

زمانۂ دراز سے خلیج فارس کے متعلق جو بحری روایتیں وابستہ تھیں انھوں نے ان قوموں کے لئے راستہ تیار کیا جو بعد کو انھیں سمندروں پر جہاز رانی اور حکومت کرنے لگے یعنی پرتگالی، ترک، انگریز اور ولندیزی۔ ۱۴۹۸ء (۹۰۴ھ) میں آفریقہ کے گرد چکر لگا کر واسکو ڈی گاما آفریقہ کے مغربی ساحل پر بمقام مالندی پہنچا تو ایک عرب ناخدا ہی نے اس کو ہندوستان کا راستہ دکھایا۔ پرتگیزی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرب ناخدا کے قبضے میں سمندروں کا ایک نہایت ہی عمدہ نقشہ اور دوسرے بحری آلات تھے۔ اُس زمانے کے عربی مصادر میں بھی اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ عرب ناخدا (جس کو وہ احمد ابن ماجد کے نام سے جانتے تھے) صرف خوب شراب پلائے جانے کے بعد ہی پرتگیزوں کی راہ نمائی کرنے کی طرف آمادہ کیا جا سکا۔ اس قصے سے، جو شاید بے بنیاد ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان پرتگیزوں کی آمد کے دور رس نتائج کو پوری طرح سمجھے ہوئے تھے۔ ابن ماجد اس حیثیت سے بھی مشہور ہے کہ اس نے بحر ہند، بحیرۂ احمر، خلیج فارس، بحیرۂ جنوبی چین اور مغربی ہندی مجمع الجزائر کے متعلق جہاز رانی کی مبادیات پر ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا۔ آر، ایف، برٹن کے ایک بیان سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ گذشتہ صدی تک آفریقی سواحل پر قطب نما کا موجد ہونے کی حیثیت سے ابن ماجد کا احترام کیا جاتا تھا۔

خاکنائے سوئز کو کھولنے کا خیال کسی ابتدائی عباسی خلیفہ سے منسوب کیا جاتا ہے[1] اس خیال کو عمل کا جامہ نہیں پہنایا گیا اور محاربات صلیبی کے بعد سے تو ایسا اہم کام کو بجا طور پر مسلمانوں کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھا گیا اس لیے بحیرۂ متوسط کی اسلامی جہازرانی ہمیشہ مغربی سمندروں سے الگ تھلگ رہی بحیرۂ ہند میں تجارت اسلامی بندرگاہوں تک محدود رہی عیسائی ممالک سے تجارتی تعلقات کی اسلامی (حضرت عمرؓ کے زمانے سے) و عیسائی دونوں جانب سے بشدت مخالفت کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکندریہ تباہ ہو گیا اور بہت سی قدیم بندرگاہیں اجڑ گئیں اس زمانے میں تونس شمالی آفریقہ اور اسپینی بندرگاہوں کی قابل لحاظ تجارت کا نیا مرکز بن گیا عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمان ملاحوں کی حالت اکثر اوقات بحری قزاقوں سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن یہی بات عیسائی ملاحوں کے متعلق کہنا بھی اتنا ہی صحیح ہے۔

صلیبی محاربات کے آغاز سے بحیرۂ متوسط کی اسلامی جہازرانی کا قریباً تنہا دائرۂ عمل بنا رہنا، باقی نہیں رہا۔ اس وقت اسلام نے اسپین کا بڑا حصہ، جزیرۂ صقلیہ اور اطالوی ساحل پر سے اپنا قبضہ کھو دیا! اسی زمانے میں اطالیہ کے بندرگاہ "جےنوآ" اور "پی سا" نے ترقی کرنی شروع کی۔ ۵۸۸ھ /۱۱۹۲ء میں سیاح ابن جبیر سیوتا سے اسکندریہ جانے کے لیے ایک عیسائی جہاز ہی کو کام میں لایا تھا بحری غلبے کی یہ تبدیلی عملاً بہت کم شدید تھی اس کے معنی صرف یہ تھے کہ وہ عیسائی جو پہلے کھیویوں یا غلاموں کی حیثیت میں اسلامی اقتدار کے تحت جہازرانی کرتے تھے اس وقت اپنے آپ کو اس سے رہائی دلا چکے تھے اور خود اپنے طور پر جہازرانی اور تجارت کرنے لگے موجودہ زمانے کی بین الاقوامی بحری لغت صرف چند ہی عربی الاصل الفاظ پر مشتمل نہیں ہے، جو سمندروں پر مسلمانوں کے پچھلے اقتدار کو ظاہر کرتی ہے مثلاً اڈمائی رل کےبل اے وریج، شالپ، سلوپ، بارق، ٹائلٹ، الماڈیا، اور بحر ہند کی سمندری اصطلاح مان سون۔[2]

ناخدا ابن ماجد کے سلسلے میں قطب نما کا ذکر پہلے آ چکا ہے خود یہ شخص اپنی تالیفات میں قطب نما کا موجد داؤد علیہ السلام کو مانتا ہے لیکن یہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان عیسائیوں سے قبل اس آلے سے روشناس تھے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو کہ چینی دوسری صدی میں قطب نما اور اس کے استعمال سے واقف ہوں اور بعد کو انہی لوگوں نے اسے مغرب پہنچا دیا ہو۔ لیکن اس بات کا سب سے پہلا صریحی ثبوت کہ اسلامی اُمرا بحر قطب نما سے واقف تھے

---

[1] بحیرۂ متوسط اور بحیرۂ قلزم کو ملا دینے کی تجویز اسلام کے مشہور و معروف مدبر عمرو بن العاص نے کی تھی نہ کہ کسی عباسی خلیفہ نے۔ ملاحظہ ہو تقویم البلدان از ابو الفدا صفحہ ۱۰۶۔ مترجم

[2] ان الفاظ کی عربی اصلیں علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔ (مترجم) امیر البحر، حبل، اعوار، سیلاب، برقہ، طریدہ، المعدیہ اور موسم۔

۱۲۰۲ء (۶۹۹ھ) کے ایک مولف کے ہاں ملتا ہے اور ٹھیک اسی زمانے میں فرانس اور اطالیہ میں اس کے معلوم ہونے کا سراغ لگ سکتا ہے۔ قطب نما سے متعلق اصطلاحیات میں بعض مشرقی الاصل نہ کہ مغربی الاصل اصطلاحات کے پائے جانے سے احتمال ہوتا ہے کہ مقناطیسی سوئی کی خصوصیات کا علم یورپ نے مشرق سے حاصل کیا ہو۔ لیکن یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ مسلمان اس معاملے میں عیسائیوں کے پیشرو تھے بلکہ مسلمانوں کے متعدد حیثیتوں سے پیچیدہ علم نقشہ کشی کی بنا پر ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ ان کے جہاز صرف ساحل کے کنارے کنارے ہی سفر کر سکتے تھے خواہ قطب نما سے مسلمانوں کی واقفیت یورپی عیسائیوں سے پیشتر ہی کیوں نہ ہو، تاہم زیادہ احتیاط یہی تسلیم کرنے میں ہے کہ ایک تو اس آلے سے ان کی واقفیت سنہ ۱۲۰۲ء (۶۹۹ھ) سے پہلے نہیں معلوم ہوتی، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو قطب نما کا علم ہونے کے بعد ہی وہ عیسائی ملاحوں کو منتقل ہو گیا۔

تیرویں (ساتویں) صدی کے اختتام پر بحیرۂ متوسط کے اولین بحری نقشے کی ابتداء کے مسئلے سے قطب نما کا مسئلہ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ قدیم ترین معلومہ بحری راہ نما "پورٹولان" غالباً جینوا والوں کا بنایا ہوا ہے۔ تمام گذشتہ نقشوں سے بحری راہ نما ساحلوں اور جزیروں کے محل وقوع کی شکلوں کا بہت زیادہ صحیح صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان بحری راہ نماؤں کی تیاری قطب نما کے استعمال ہی سے ممکن ہو سکی۔ بحری راہ نما ساحلی خطوں کو بھی نہایت تفصیل سے دکھاتے ہیں اور یہ تفصیلات مشکل ہی سے ایک نسل کا کام ہو سکتی ہیں۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ اسلامی جہاز رانوں کے تجربات نے ــــ جن کی جھلکیاں مذکورہ کتابوں میں نمایاں ہیں ــــ قدیم بحری راہ نماؤں کی تیاری میں، جو موجودہ فن نقشہ کشی کے لیے نمونہ تھے، قابل لحاظ خدمت انجام دی ہوگی صرف الادریسی اور اس کے پیشرو ابن حوقل نیز البکری کی تالیفوں میں دیئے ہوئے افریقی ساحل کے مطابق واقعہ بیانات کو پیش نظر رکھنا کافی ہوگا۔

میسوپوٹامیہ کے بڑے دریائی راستوں کے ذریعے خلیج فارس کو اسلامی سلطنت کے مرکز بغداد سے ملا دیا گیا تھا۔ اس کی وساطت سے بحر ہند کی جہاز رانی عالمی تجارت کا ذریعہ بن گئی۔ اسی راستے سے بغداد کے بڑے بڑے تاجر چین کا ریشم، ہندوستان کے مسالے اور عطریات، مختلف قسم کی لکڑیاں، ناریل، سپاری، اور لنکا کا ٹین حاصل کرتے تھے۔ یہ تمام اشیا اسلامی ممالک سے یورپ پہنچتی تھیں کیونکہ اس زمانے میں یورپ کو ان تمام ممالک سے راست تجارت کرنے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بحری تجارت کا ایک حصہ خلیج فارس میں داخل نہیں ہوتا تھا بلکہ پیداوار عدن نیز بحیرۂ احمر کے بندرگاہ جدہ اور القلزم پر (سویز کے قریب قدیم کلزما) لائی جاتی تھی اور محاربات صلیبی کے

زمانے میں عیذاب پر، جو جدّہ کے قریباً بالمقابل کاروانی حاجیوں کی قدیم بندرگاہ تھی اس مقام سے اسلامی دنیا کیلیے مغربی پیداوار کی سربراہی کی جاتی تھی، اسی راستے سے افریقی پیداوار بھی آتی تھی جیسے ہاتھی دانت؛ یہ چیزیں عدن کے بالمقابل حبش کی بندرگاہ زیلع سے جہاز پر بار کی جاتی تھیں۔

اسلامی تجارتی جہازرانی سے زیادہ عجیب "صحرائی جہاز" کے ذریعے ہونے والی بری تجارت ہے۔ اگرچہ رسالت پناہ علیہ تحیۃ والسلام کی بعثت کے بہت پہلے سے تجارتی کاروان ایشیا اور افریقہ کے میدان طے کیا کرتے تھے لیکن ہم کاروانی تجارت کو اسلام سے متعلق کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں تک بھی صحراؤں میں نقل وحرکت کے معاملے میں اسلامی قوموں کے طریقوں سے مغربی تہذیب آگے نہیں بڑھ سکی تھی، صحرائے الشام، عرب، ایران اور صحرائے اعظم میں حالیہ جاری کی ہوئی موٹری تجارت، وسط ایشیا میں چند آہنی راہیں اور جدید قائم شدہ ہوائی خدمات ان سب نے اونٹ ہی کے ناقابل یاد قدیم راستوں ہی پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ ان تمام صدیوں کے دوران میں جبکہ اسلامی سلطنت عروج پر تھی مختلف اسلامی ممالک کے درمیان سوداگری و سیاحت خصوصاً مکے کو حاجیوں کے سفر کا سب سے زیادہ عام ذریعہ تجارتی کاروان ہی تھے اس کے ساتھ ساتھ بعض اہم سڑکیں اور بھی تھیں جو اسلامی حدود کے باہر تک جاتی تھیں ان سڑکوں کا ایک سلسلہ ہندوستان و چین تک جاتا تھا، دوسرا جنوبی و وسطی روس کو اور تیسرا سلسلہ افریقہ کی تجارتی راہیں تھیں۔ ہندوستان و چین کو بحری راستے سے بھی پہنچ سکتے تھے اسی وجہ سے اس جانب کاروانی تجارت اتنی اہم نہیں تھی جتنی کہ دوسری سمتوں میں۔ اس کے علاوہ، افغانستان کے پہاڑوں کی دشوار گذار سڑکوں کی وجہ سے ہندوستان کا راستہ پرپیچ تھا چین سے تجارت کرنے کے لیے ان علاقوں سے گذرنا ضروری تھا جن پر ترک قبائل قابض تھے؛ مزید برآں چین کی خاص پیداوار ریشم ایران میں بھی ایک مدت پہلے سے پیدا کیا جانے لگا تھا گیارھویں (پانچویں) صدی میں سامانی سلطنت کے زوال کے بعد چین کی بری تجارت کے لیے حالات اور زیادہ ناموافق ہو گئے تھے تیرھویں (ساتویں) صدی میں ایشیائی تجارتی راہوں کا عظیم الشان احیاء مغلوں کا کام ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔

شمالی جانب اسلامی تجارتی وسعت کا اثر معلوم کرنے کے لیے ہم نہ صرف تحریری مصادر پر بھروسہ کر سکتے ہیں بلکہ ان اسلامی سکوں کی بہت بڑی تعداد پر بھی جو روس، فنلستان، سویڈن، اور ناروے کے مختلف حصوں میں پائے گئے ہیں، جزائر برطانیہ اور انگلستان (آئیس لینڈ) کی بعض علیحدہ دریافتوں کا یہاں ذکر نہیں ہے، صوبۂ بحازان میں والگا کے درمیانی راستوں پر اس قسم کے سکوں کی بڑی تعداد پائی گئی ہے؛ لیکن ان سے ان عربی سکوں کی تعداد

بڑھ گئی ہے جو بالٹسک کے صوبوں میں پائے گئے ہیں" اِس کن ڈی نیویا کی خاص دریافتیں سویڈن کے جنوب مغربی ساحل اور ناروے کے جنوبی کونے پر ہوئی ہیں۔ اِن سکوں کا تعلق ساتویں (پہلی) صدی کے اختتام سے لیکر گیارویں (پانچویں) صدی کے آغاز تک کے دَور سے ہے۔ یہ بہت غیر اغلب ہے کہ خود اسلامی تاجر شمال میں اِن مقامات تک بڑھ آئے ہوں کیونکہ تحریری عربی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک والگا بُرگس سے اسی نام کی ندی کے وسطی گذرگاہ پر ـــ اُن کی تجارتی مہموں اور سفیروں کی آخری منزل تھی؛ دینِ اسلام بھی ابتدائی زمانے ہی میں ان علاقوں کو پار کر چکا تھا تجارت کے لیے جو راستہ اختیار کیا جاتا تھا وہ عموماً ماوراء النہر سے شروع ہوکر دریائے آموں کے دہانے پر (خیوا) خوارزم کے شلشی علاقے تک پہنچتا تھا؛ والگا کے دہانے کے اوپر کا راستہ کم استعمال ہوتا تھا۔ بہرطور سکوں کے اس قدر وسیع رقبے پر پائے جانے کا واقعہ تمدنی اثرات کی علامت ہے اور ثابت کرتا ہے کہ مسلمان شمال مغرب میں رہنے والی قوموں سے بہت سی چیزیں خریدتے تھے اِن قوموں میں اس کن ڈی نے وُیا کے روسی سب سے زیادہ اہم تھے جغرافیائی تالیفوں خصوصاً المقدسی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاجر اس طرح کون کون سی چیزیں حاصل کرتے تھے: "سمور، قاقم، لومڑی کے بال، سنجاب، چھٹیلے خرگوش اور بکرے، نیز موم، تیر، بید کی چھال، بالوں کی اونچی ٹوپیاں، مچھلی کا سریش، ماہی دانت، ارنڈی تیل، عنبر، گھوڑے کی تیار ادھوڑی، شہد، اخروٹ، شاہین، تلوار، زرہ، جیبی لکڑی، غلام اور چھوٹے بڑے مویشی"۔ اکثر غلام سالوانی قوم کے ہوتے تھے۔ ان غلاموں نے مہذب دنیا خصوصاً اسلامی ممالک میں جو کام کیا ہے اس کی شہادت اب بھی اُن کے ناموں سے ملتی ہے۔ غلاموں کو لیجانے کا دوسرا مقام اسپین تھا، جہاں سے وہ المغرب اور مصر آتے تھے۔ یہ کھیپ خاص خواجہ سراؤں کی ہوتی تھی جن کی سرنوشت میں اسلامی حرم لکھا ہوتا تھا۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مختلف نسلوں کے اسی طرح دساور کئے ہوئے غلاموں نے اسلامی تمدنی کمالات کو یورپ میں پھیلانے میں کچھ کم خدمت نہیں کی۔ علاوہ اس دوررس اسلامی بلغاروی تجارت کے جس کے آثار جرمنی میں بھی پائے گئے ہیں، بحیرۂ خزر اور والگا کے دہانوں پر خزر کا دارالسلطنت آتیل یا اِتِل واقع تھا۔ تجارتی اشیا کے تبادلے کے لیے یہاں کی تجارت کم اہم تھی لیکن سلطنتِ خزر نے، جو اسلام اور بازنطینی شہنشاہیت کے درمیان ایک قسم کی حجابی سلطنت بنی ہوئی تھی، بہت سی ایسی اسلامی و مشرقی پیداواروں کے مبادلے کو آگے بڑھایا جو عیسائی ممالک میں بھی پہنچ گئے تھے۔

آفریقہ کی بڑی تجارت مشرقی و مغربی رقبے میں تقسیم ہوگئی تھی، دونوں جانب کا خاص دساور سُونا تھا۔ اسلامی سرحد سے آگے اسوان کی جانب مغربِ ملک بُوجا میں العلاقی واقع ہے جو سونے کی کانوں کے علاقے کا

بڑا تجارتی مرکز اور قدیم مصری زمانے سے مشہور ہے۔ مشرقی آفریقہ میں زرخیز ملک، غانہ سے خوب تجارت ہوتی تھی جس کا صدر مقام دریائے نائجر پر ہوگا۔ ان علاقوں کی تجارتی اہمیت کے ثبوت میں جغرافیہ نویس ابن حوقل (۹۷۵ء / ۳۶۵ھ) یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس نے آغرا وشت میں ایک ہنڈی رقمی بیالیس ہزار دیکھی تھی (ہنڈی کے لیے عربی لفظ شق یعنی اعتبار استعمال کیا گیا ہے جس سے موجودہ لفظ چیک بنایا گیا ہے)۔ جو جنوبی مراکو کے شہر سجلماسا کے ایک تاجر کے نام تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس صدی سے پہلے یعنی نویں (تیسری) صدی میں تجارت کی وسعت اس سے بھی زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے میں مصر اور مغربی علاقے ایک سڑک کے ذریعے ملا دیئے گئے تھے۔ لیکن بعد کو غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے اس سڑک کو ترک کر دیا گیا۔

بعد کی صدیوں میں آفریقہ ایسا میدان بنا رہا جہاں اسلامی تجارتی اولوالعزمی اور تبلیغی جوش بلا مسابقت اپنی جد و جہد کا مظاہرہ کرتے رہے۔ تیرویں (ساتویں) صدی میں مولف ابن سعید ابن فاطمہ کے سفرناموں کے ذریعے سنی گل تک کے ساحل اوقیانوس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس علاقے کے متعلق خیال تھا کہ اس کو دریائے نائجر سے ملا دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا تعلق بھی دریائے نیل کی طرح جوہڑی طریقے سے تھا۔ ابن سعید جھیل چاڈ کے اطراف رہنے والی وحشی قوم سے بھی واقف تھا؛ تاہم مسلمان دریائے نیل کے منبع سے کبھی واقف نہیں ہوئے کیونکہ اس معاملے میں وہ بطلی موس کی روایت ہی کو دہراتے رہے۔ بایں ہمہ اس تاریک براعظم کے اندرونی حصے کے متعلق نشاۃ جدیدہ کے یورپ کو بجز اسلامی ذرایع کے کوئی معلومات نہیں تھے، اس لیے کہ ۱۵۲۶ء / ۹۳۳ھ اور اس کے بعد عرصہ دراز تک ان کے پاس آفریقہ کے حالات میں نیم عیسائی مسلمان کی کتاب الآفریقہ (لیو افریکنس) ہی معلومات کا تنہا ذریعہ تھی۔ انیسویں (تیرویں) صدی کے نصف اول تک الادریسی کی، جو قدر و قیمت تھی اس کا ذکر گذر چکا ہے۔

ابتدائی بیان کردہ وسیع تجارتی ترقی اور بعد کی اسلامی و عیسائی یورپ کی باہمی تجارت میں پہلے پہل بڑا فرق محسوس ہوتا ہے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کوئی راست تجارتی تعلق ہی نہیں ہے۔ جو کچھ تجارت تھی وہ صرف یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں یہودی ہی تنہا تجارتی قوم تھی اور تہذیب کے دونوں خطوں میں صرف یہی آزادی سے تجارت کر سکتے تھے۔ ابن خرداذبہ لکھتا ہے کہ یہودی تاجر فرانس کے جنوب سے سمندر پار کر کے مصر پہنچتے ہیں، خاکنائے سویز تک پیدل جاتے ہیں اور جہازوں میں سوار ہو کر ہندوستان کا سفر کرتے ہیں۔ دوسرے یہودی خشکی پر سیوٹا سے مصر اور الشام سے سندھ تک کے سیٹے مارتے ہیں اور اکثر تو قسطنطنیہ بھی ہو آتے ہیں۔ اس طرح اسلامی ممالک یورپ سے غلام (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے) ریشم (بازنطینی شہنشاہیت سے) اور ہتھیار

خریدتے تھے یہ سب چیزیں بھی روسی راستے سے آتی تھیں یہی تاجر یورپ میں مشک، ایلوہ، کافور، دارچینی اور اسی قسم کی پیداوار لیجاتے تھے، جن کے نام ان کی اصلیت کی غمازی کرتے ہیں۔ دوسرے ذریعے جن سے مشرقی پیداوار یورپ میں داخل ہو سکتی تھی بازنطینیہ اور بحیرۂ خزر کے درمیان کی سلطنتِ خزر تھی، اور روس کی دوسری نیم مہذب قومیں تھیں جو وسطی یورپ سے خوب تجارت کرتی تھیں دسویں (چوتھی) صدی میں بازنطینی سرحد پر شہر طرابزون اسلامی یونانی تجارت کی نہایت اہم منڈی تھا۔ وہاں مسلمان تاجروں کی کافی تعداد بستی تھی اور بازنطینی حکومت محصول لگا کر ان سے بہت فائدہ اٹھاتی تھی۔ ہسپانی سرحد پر بھی کچھ نہ کچھ راست تجارت ہوتی تھی۔

اس طرح ہم اسلامی و عیسائی دنیا کے درمیان ایک ارادی تجارتی علٰحدگی کی حالت کا ذکر کرسکتے ہیں یہ صحیح ہے کہ آٹھویں (دوسری) صدی سے مسلمان تاجر اور سیاح اطالوی شہروں اور قسطنطنیہ میں پائے جانے لگے تھے لیکن یہ تعلقات صرف اس سرگرم تجارتی میل ملاپ کا پیش خیمہ تھے جو گیارھویں (پانچویں) صدی میں ترقی پذیر ہونا شروع ہوئے محاربات صلیبی کے پہلے دور میں یہ تعلقات تھوڑے عرصے کے لیے منقطع ہو گئے تھے۔ قدیم زمانے کی رکاوٹیں دُور ہو گئیں تو بعد کو خود تجارت یورپی قوموں کے لیے تمدنی قدروں کی منتقلی کو ترقی دینے والے نہایت ہی زبردست عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہو گئی؛ اس زمانے میں یورپی اقوام، جن کو ان کے حکمرانوں کی حمایت حاصل تھی۔ جیسے صقلیہ کا روجر ـــــ ان قدروں سے فائدہ اٹھانے کے شوق سے متلاشی تھے۔

وہ گوناگوں طریقے جن سے تجارتی تعلقات نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان قریبی تعاون پیدا کیا یہاں تفصیل سے نہیں بیان کئے جا سکتے جیسے اتحادی حصہ داری کا طریقہ اور تجارتی عہدنامے۔ اسلامی دنیا کی قریباً پانچ صدیوں سے جمع شدہ مادی تمدنی دولت کی یورپ میں فراوانی ہو گئی۔ یہ مال و دولت صرف چینی، ہندوستانی اور آفریقی پیداوار ہی پر مشتمل نہیں تھی جس کو اسلامی مہم پسند دُور دراز ملکوں سے لائے تھے؛ سب سے پہلے تو خود اسلامی ممالک میں جو قدرتی و صنعتی پیداواریں ہوتی تھیں وہی روانہ کی جاتی تھیں اسلامی ممالک میں صنعتی پیداوار نے ایک خاص طریقے سے نشوونما پائی تھی؛ اصل کی کمی اور صناعوں کے پیشہ ورانہ جماعتی نظام کی وجہ سے ان صنعتوں کی خاص خصوصیت حکمرانوں کے بالکلیہ ماتحت رہنا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب یورپی صنعتوں سے معاشی مسابقہ ہونے لگی تو صنعتی ارتقاء کا یہ مخصوص طریقہ مسلمانوں کے لیے بہت غیر مفید ثابت ہوا؛ لیکن مسلمانوں کے زمانۂ مرفہ الحالی میں اس طریقے نے صنعتی مہارت کی نشوونما کو ممکن بنا دیا اور اسی مہارت نے صنعتوں کی فنی قدروں کو بے نظیر بلندی تک پہنچا دیا۔ سب سے پہلے صنعت پارچہ بافی کا ذکر آتا ہے: اس وقت عام طور پر مستعملہ متعدد الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ

کون سے کپڑے ابتداً اسلامی ممالک سے یورپ جاتے تھے۔ مزلن، ڈمسک، بولڈیکین (ایک قسم کا کپڑا جو ابتداً بغداد میں تیار ہوتا تھا) اور دوسرے بنے ہوئے کپڑے جن کے نام عربی یا فارسی ہیں جیسے: گاز، کاٹن، ساٹن، باکین وغیرہ[1]۔ مشرقی شالوں کی قدامت بھی قرون وسطیٰ کے برابر ہے۔ یہ بیان کرنا بھی تعجب خیز ہوگا کہ قرون وسطیٰ کے جرمن شہنشاہوں کے درباری خلعتوں پر عربی عبارتیں کڑھی ہوئی ہوتی تھیں، ان خلعتوں کی فرمائش اور ان کی تکمیل غالباً صقلیہ ہی میں ہوتی تھی، جہاں عیسائیوں کی دوبارہ فتح کے بہت مدت بعد تک بھی اسلامی فنون اور صنائع جاری رہے۔ قدرتی پیداوار جن کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی درآمد ابتداً اسلامی ممالک سے ہوئی تھی ان میں سے کچھ پھل ہیں جیسے:۔ آرنج، لیمن، ایپریکاٹ[2]، اور بعض ترکاریاں ہیں جیسے:۔ اپی ناک، ارٹی چوس، زعفران اور آج کل کی اہم چیز اینی لائین ہے[3]، اسی طرح قیمتی پتھر۔ لے پی لازوی اور آلات موسیقی لیوٹ، گٹار وغیرہ[4] ہیں۔ اگرچہ یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان ناموں کا مستعار لینا راست تجارتی میل جول کے زمانے ہی میں ہوا ہو، یہی بات کاغذ جیسی اہم چیز کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے، جس کی تیاری یورپ نے بارھویں (چھٹی صدی) میں اسلامی قوموں سے سیکھی۔

خود ہماری تجارتی لغت نے اس حقیقت کے بعض ناقابل انکار ثبوت محفوظ رکھے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جبکہ اسلامی تجارت اور تجارتی اصول نے عیسائی ممالک کے تجارتی نشوونما پر گہرا اثر ڈالا۔ مثال کے طور پر لفظ اسٹرلنگ میں قدیم یونانی لفظ ساٹر پوشیدہ ہے۔ یہ صرف عربی ذریعے ہی سے انگریزی زبان میں داخل ہوا ہے۔ خود لفظ ٹرافک بھی غالباً عربی لفظ "تفریق" سے نکالا گیا ہے جس کے معنی تقسیم کے ہیں۔ اور ٹاریف جیسا مشہور لفظ عربی لفظ تعریف ہی سے نکالا گیا ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں۔ رزک، ٹیرا اور

---

[1] یہ الفاظ حسب ذیل عربی الفاظ سے بنائے گئے ہیں:۔ موصل، دمشق، غازا (واقع فلسطین) قطن، زیتون، اور برکان (اونٹ کے بالوں کا لباس)۔

[2] ان کی اصلیں نارنج، لیمو، اور البرقوق ہیں۔

[3] یہ الفاظ عربی میں اسفناخ، ارضی شوکی، زعفران اور النیل ہیں۔

[4] یہ عود اور قیثار کی انگریزی صورت ہے اس سلسلے میں ٹارٹار، الباکور، اور النے نایر وغیرہ الفاظ بھی ہیں جو عربی میں طرثا (ایک قسم کا گوند) بکرات (ایک قسم کی مچھلی) اور النانید (سفید شکر) ہیں۔ اس قسم کے بیسوں الفاظ عربی سے انگریزی میں بہ تغیر خفیف لے لیے گئے ہیں۔ یہاں مصنف نے صرف چند الفاظ بطور نمونہ ذکر کئے ہیں ۱۲ مترجم۔

کیاآلی بر[1] جیسے الفاظ کی اصل بھی عربی ہی ہے۔ نیز روزمرہ کا لفظ میگزین عربی لفظ مخزن سے لیا گیا ہے جس کے معنی ذخیرے کے ہیں۔ فرانسیسی کا ماگزین اب بھی دکان کے لیے عام لفظ ہے۔ آفریقی تجارتی حالات کے سلسلے میں چیک کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح چیک کے لیے جرمنی اور ولندیزی لفظ وکسیل اور وزبل بھی عربی الاصل ہیں یہی حال موجودہ اصطلاح اوال کا ہے۔ ہنڈی کا علم ہونے کے بعد اسلامی اور عیسائی اطالوی تاجروں کے اشتراک سے مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کا خیال پیدا ہوا۔ اسلامی تجارتی قانون صرف نظری طور پر مقدس قانون پر منحصر تھا جو قرآن اور حدیث سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن عملاً اس پر تجارتی قوانین کے ترقی شدہ نظام کی حکومت تھی جس کے لیے اوپر کی مثالیں شاہد ہیں۔ تجارتی شکلوں کی ایک صورت حیلے کی تجارت ہے جس کو موہاترا کہتے ہیں۔ یہ لفظ عربی ہی سے یورپی زبانوں میں داخل ہوا ہے۔ ڈوناجیسا کثیر الاستعمال لفظ اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جبکہ بحیرۂ متوسط کی مختلف بندرگاہوں سے باقاعدہ تجارتی میل جول کا نشو و نما ہو چکا تھا۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مغربی قوموں کی تجارتی تنظیم پر اس میل جول نے بڑا رد عمل کیا۔ مسلمان حکمرانوں سے عیسائی تاجروں نے جو معاہدے کئے اور مشرقی بندرگاہوں پر کونسلی نمایندگی کا ادارہ دونوں ان قوانین کے ارتقاء کے اہم زینے تھے جو آج کل کی بین قومی تجارت پر مسلط ہیں۔

مذکورہ بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یورپ نے اسلامی دنیا سے جغرافیہ اور تجارت کے سلسلے میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ کسی مختصر زمانے کے ثمرات نہیں ہیں، بلکہ اس کی بنیاد ان باہمی تعلقات پر تھی جو گیارویں (پانچویں) صدی سے شروع ہوتے ہیں اور جو خصوصیت سے تیرویں (ساتویں) صدی یعنی عہد مغلیہ میں بہت زیادہ قریبی ہو گئے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تہذیب اور اس کی ذیلی ترقیوں کو کئی مملکتوں نے جیسے ترکیہ، ایران، ہندوستان، اور جزائر مغربی ہند کے مسلمانوں نے جاری رکھا جس کی وجہ سے بہت سارے اسلامی نظریات و قوانین شہرت پائے اور یورپی ممالک نے ان پر عمل بھی کیا لیکن کسی زمانے میں اسلامی قوموں کی عیسائی دنیا پر اس قدر غیر معمولی فوقیت کا واضح اظہار نہیں ہوا جیسا کہ دسویں (چوتھی) صدی میں جبکہ آفتاب اسلام اپنی تمدنی ترقیوں کے نصف النہار پر تھا اور عیسائی یورپ پر بظاہر مایوس کن جمود طاری تھا۔

ابو نصر محمد الخالدی (عثمانیہ)

---

[1] ان الفاظ کی عربی اصلیں رائج، قافلہ، اور طرحۃ ہیں ۱۲ مترجم۔

باقیات فانی پر ایک تنقیدی نظر

از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

(۳)

۱۳۶ ندرِ دردِ دل غمِ دنیا کیا — اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

ظاہر ہے کہ شاعر نے غمِ دنیا کو ندرِ دردِ دل کر دیا، یعنی عشق میں دنیا کے غم کو بھلا دیا، گویا دنیا کا غم جو ایک داغ سا تھا وہ مٹ گیا، اس لحاظ سے دوسرے مصرع میں "اک پیدا کیا" بے معنی ہے۔

۱۳۷ سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا

لفظ کوئی کی تکرار مفید معنی نہیں، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نام سنکر آنکھیں کھول دینے والا اور ہے اور نام لیکر غافل ہونے والا اور ہے!!

۱۳۸ مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

"کوئی" کا لفظ جب شخص نامعلوم کے معنی پر مستعمل ہو تو اس کے ساتھ "آپ" کا لفظ استعمال کرنا خلاف قاعدہ ہے۔

۱۳۹ تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر — بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

دوسرے مصرع میں الفاظِ ماسبق کے لحاظ ردیف "نہیں ملتا" صحیح نہیں، یہ مقام "نہیں ملا" کا ہے۔

۱۴۰ بتائیے نہ حالِ دل نہ حال پوچھتا ہوں میں — تأمل پوچھتا ہوں میں دلِ وفا خراب کا

مصرع اول کی ترکیب درست نہیں "نہ حال پوچھتا ہوں" کی بجائے "حال نہیں پوچھتا ہوں" چاہیئے۔

۱۴۱ جز داغ نہیں کوئی چراغِ سرِ تربت — سینہ ہے مرا گورِ غریبانِ تمنا

"گورِ غریباں" مطلق گورستان کے معنی میں صحیح نہیں، "گورِ غریباں" یعنی وہ جگہ جہاں مسافروں یا غریبوں کی ٹوٹی پھوٹی قبریں ہوں، اس لحاظ سے گورِ غریباں کو "تمنا" کی طرف مضاف کرنا غلط ہے اور شعر بے معنی۔

۱۴۲ وہ قیامت اٹھائے پھرتے ہیں — آسماں آج زیرِ پا نہ ہوا

"قیامت اٹھانا" تو صحیح ہے لیکن قیامت اٹھائے پھرنا صحیح نہیں۔

خدا دشمن کو بھی یہ خوابِ محرومی نہ دکھلائے — ادھر ایمائے پرسش اور ادھر خاموش ہو جانا — ۱۴۳

"ایمائے پرسش" یعنی وہ اشارہ جو کسی شخص کو کسی شخص کی احوال پرسی کے لیے کیا جائے جیسے ایمائے قتل، لیکن شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اشارہ سے مزاج پرسی ہو رہی ہے، یہ صحیح نہیں۔

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں، فانی — ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا — ۱۴۴

"بے نشاں نہ ہوا" کس کی خبر ہے؟ یہ واضح نہیں اس لیے مصرع ثانی میں "بے نشاں نہ ہوا" سے پہلے ضمیر مخاطب "تو" لانا چاہیے۔

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی — زمانہ ایک فسانہ ہے مرنے والوں کا — ۱۴۵

مصرعوں میں معنوی ربط نہیں ہے پہلے مصرع میں بجائے کسی کے" غم والم لایا جاتا تو یہ نقص رفع ہو جاتا۔

آپ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے — آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا — ۱۴۶

"پرائی آگ میں پڑنا" تو اردو میں مستعمل ہے یعنی دوسرے کی مصیبت اپنے سر لینا لیکن "اپنی آگ" کہہ کر اپنی مصیبت مراد لینا صحیح نہیں اس کے علاوہ "آپ ہم" ہم خود کے معنی پر خلافِ محاورہ ہے "ہم آپ" چاہیے جیسے بہک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیسا تھ "غالب"

اُف اے گناہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف — آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا — ۱۴۷

دُکھ بمعنی درد، صدمہ لہٰذا دوسرے مصرع کا یہ ٹکڑا "درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا" ٹھیک نہیں۔

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی — یعنی جمالِ یار کا صدقہ اتر گیا — ۱۴۸

"صدقہ اترنا" یعنی کسی چیز کا کسی کے گرد پھرا کر دیا جانا، صدقہ اُتر جانا محاورہ نہیں ہے اس لیے "صدقہ اُتر گیا" درست نہیں۔

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض — وہ ایک لمحۂ ہستی جو صرف خواب ہوا — ۱۴۹

پہلے مصرع میں لفظ "مجھے" ہوتے ہوئے "میری" کا، ضرورت نہیں یا "مجھے" رہے یا "میری"۔

کہاں تک کچھ نہ کہیئے اب تو نوبت جان تک آئی — تکلف برطرف اے ضبطِ نالہ دل سے نکلے گا — ۱۵۰

"نوبت جان تک آئی" یہ جملہ بے معنی ہے۔

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے — اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا — ۱۵۱

"کہاں تک نہ روئیے" کی فصاحت سے قطع نظر "ایک عمر" مدت العمر کے معنی میں صحیح نہیں "اک عمر چاہیئے"، جیسے:-

ع آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک (غالب)

۱۵۲ دل پہ جب تیری نگاہیں تم گئیں دل ہوگیا — مژدۂ تسکیں سے بیتابی کا قاتل ہوگیا

دوسرے مصرع میں قافیہ "دل" کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اگر بیتابی کی مناسبت سے دل کے عوض کوئی لفظ از قبیل برق وغیرہ لایا جاتا تو مصرع بامعنی ہوتا۔

۱۵۳ تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا — برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت

لفظ "محشر" کو سکوت کی طرف مضاف کرنا اور اس کے ساتھ "برپا" استعمال کرنا مہمل ہے۔

۱۵۴ نالوں پہ انحصار پیامِ سروش تھا — محرومیاں ذریعۂ الہامِ ذکر تھیں

پہلے مصرع میں لفظ "ذکر" زاید ہے "محرومیاں ذریعۂ الہام تھیں" سے مطلب ادا ہو جاتا ہے۔

۱۵۵ وہ ان کا دیکھتے ہی دیکھتے خاموش ہو جانا — مرقع تھا کسی کی ہستیِ موہوم کا فانی

"دیکھتے ہی دیکھتے" صحیح نہیں، دیکھتے ہی یعنی نظر ڈالتے ہی محاورہ ہے۔

۱۵۶ بے نیازِ نطق گویا ہے زبانِ اضطراب — اضطرابِ دل کے شکووں نے کیا اُلٹا اثر

پہلے مصرع کا مطلب تو صاف ہے یعنی شکووں کا اُلٹا اثر ہوا، لیکن اس اثر کو بے زبانی کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں بلکہ یہ نتیجہ زبانِ اضطراب کی کج مج بیانی کا ہے اس لیے مصرع ثانی میں لفظ بے نیاز مخل معنی ہے، "بے نیاز" کی جگہ ناآشنا ہوتا تو شعر بامعنی ہوتا۔

۱۵۷ رفتہ رفتہ مٹ گیا نام و نشانِ اضطراب — اشک اک اک کر کے سب آوارۂ دامن ہوئے

پہلے مصرع میں لفظ "سب" زاید ہے "اک اک" رہے یا "سب"۔

۱۵۸ زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زبانِ صیاد — نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہو کر

خون ہونا، قتل ہونا، مارا جانا، یا مجازاً رنجیدہ ہونا، نالوں کا خون ہونا درست نہیں۔

۱۵۹ کیا یاد آ گیا مجھے زنجیر دیکھ کر — حیراں ہوں رنگِ عالمِ تصویر دیکھ کر

"عالمِ تصویر" یعنی منظرِ حیرت، اس کو زنجیر سے کیا ربط؟ البتہ وحشت کا منظر دیکھ کر زنجیر یاد آ سکتی ہے۔

۱۶۰ زندگی نئی پائی آپ سے جُدا ہو کر — عمرِ خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں

"انداز" کو عمر کی طرف مضاف کرنا بے معنی ہے۔

۱۶۱ خاک میں ملا دو گے دیر آشنا ہو کر — عاشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی

"حد دیکھی" صحیح نہیں، اردو میں حد ہوگئی مستعمل ہے۔

۱۶۲ تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہوکر — اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے

پہلے مصرع میں "اور بندے ہیں" صحیح نہیں، ایسے موقعے پر اُردو میں وہ بندے اور ہیں بولتے ہیں۔

۱۶۳ کرنہ آب و ہوائے غم سے ساز — راس آئے ہیں اشک و آہ کسے

"ساز کرنا" بمعنی میل جول کرنا، سازش کرنا، لہٰذا آب و ہوا کے ساتھ ساز کا لفظ استعمال کرنا مضحکہ خیز ہے۔

۱۶۴ رہ گئی دُور طاقتِ پرواز — ہم ہیں اور عزم آشیاں یعنی

"طاقت دُور رہ جانا" بے معنی ہے، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں طاقت کا جواب دینا، طاقت جاتی رہنا یا طاقت طاق ہونا مستعمل ہے۔

۱۶۵ راز ہے بے نیاز محرم راز — ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہیئے

مصرع اول کی ترکیب درست نہیں اس لیے کہ "نہیں ہے" کا مبتدا فانی واقع ہوا ہے حالانکہ فانی مسندالیہ ہے اور "راز" مبتدا۔

۱۶۶ پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش — گلشن صلائے عام اسیری ہے سربسر

"دام پھیلانا" صحیح نہیں، اُردو میں دام بچھانا مستعمل ہے۔

۱۶۷ پھر آخری نگاہ سے سُن داستانِ داغ — پہلے اجل کو رخصتِ تلقینِ صبر دے

"رخصت" بمعنی مہلت، اجازت، لہٰذا لفظ رخصت مصرع اول میں مخلِ معنی ہے، اس لیے کہ اگر اجل کو تلقین کی اجازت دی گئی تو تلقین پانے والا کون؟ حالانکہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ اجل کو نصیحت کرتا کہ قبضِ روح میں تامل ہو اور شاعر جو عالمِ نزع میں ہے داستانِ داغ سُنا سکے!!

۱۶۸ آنکھ ہے اور فریبِ گردشِ رنگ — دل ہے اور سحر سازیِ ادراک

"گردشِ رنگ" مطلق رنگ کا تغیر، گردشِ رنگ کہہ کر تغیرِ رنگ روزمرہ مُراد لینا صحیح نہیں۔

۱۶۹ جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم — ہو غمِ ہستیٔ جاوید گوارا کیونکر

"جان سے بیزار ہونا" جان نہ دینے کی علت کیونکر ہو سکتا ہے؟

۱۷۰ کاش اتنا ہی وہ کہہ دیں کہ جفاکار ہیں ہم — میں نے گویا صلۂ مہر و وفا بھر پایا

"بھر پانا" عموماً اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز کسی شخص کو دی جائے اور بعد میں کل وصول ہو جائے "صلہ" تو ایسی چیز نہیں ہے جو کسی کو دی جائے اور پھر کوڑی کوڑی وصول ہو جائے۔

کوئی گھڑی اے بیخودیِ غم دم لینے دے سنبھلنے دے   آ کوئی دم اے ہوش کہ تجھ سے پوچھیں گے اپنی خبر ہم   ۱۷۱

پہلے مصرع کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں "پوچھیں گے" (مستقبل) صحیح نہیں، "پوچھیں" (مضارع) چاہیئے۔

دعا تو خیر دعا ہے امیدِ خیر بھی ہے   یہ مدعا ہے تو انجامِ مدعا معلوم   ۱۷۲

مصرع ثانی سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مدعا کیا ہے؟ شاید اسی کو "المعنی فی بطن الشاعر" کہتے ہیں۔

تیرے گھر کی زمیں ارے، توبہ   ذرّہ ذرّہ ہے آسماں انجام   ۱۷۳

"آسماں انجام" یعنی وہ جس کا انجام آسماں ہو یا آسمان کے انجام والا، دونوں صورتوں میں مصرع بے معنی ہے۔

کم نہ تھی عمر اک نظر کے لیے   عشق تھا مرگِ ناگہاں انجام   ۱۷۴

عشق مرگِ ناگہاں انجام تھا، بے معنی ترکیب ہے۔

قرباں اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار   وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں   ۱۷۵

"صرف شدہ زندگی" یعنی عمرِ رفتہ، اب کیونکر ادائے تغافل پر قربان ہوسکتی ہے؟

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں   زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں   ۱۷۶

"زخم پیدا کرنا" گھایل کرنا، کے معنی میں صحیح نہیں، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اردو میں "زخم لگانا" مستعمل ہے۔

ظرف ویرانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں   لاؤ ہر ذرّے میں پیدا وسعتِ صحرا کریں   ۱۷۷

"ظرف" کے حقیقی معنی "برتن" مجازی معنی "حوصلہ" دونوں صورتوں میں "ظرف" کو "ویرانہ" کی طرف مضاف کرنا بے معنی ہے۔

ہائے دنیا وہ تری سرمہ تقاضا آنکھیں   کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں   ۱۷۸

"سرمہ تقاضا" بمعنی متقاضی سرمہ استعمال کرنا درست نہیں۔

جلوۂ اختیار سے نسبتِ جبر ہے مجھے   شعلۂ آرمیدہ ہوں وادیِ برقِ ناز میں   ۱۷۹

"ناز" کو برق سے تعبیر کرنا درست سہی! لیکن وادیِ برقِ ناز اور خود کو وادیِ برقِ ناز کا شعلہ کہنا مضحکہ خیز ہے۔

فانیِ زار کا ہوا خیر سے خاتمہ بخیر   عمر تمام ہو گئی عشق کے سوز و ساز میں   ۱۸۰

"خیر سے" دو معنی میں مستعمل ہے، ایک خیر و عافیت کے ساتھ، دوسرے طنزاً ماشاءاللہ یعنی خیر سے۔

اگر پہلے معنی مراد ہیں یعنی خیر و عافیت کے ساتھ، تو لفظ "بخیر" بے معنی ہو جاتا ہے اگر دوسرے معنی مراد ہیں یعنی ماشاء اللہ، تو شعر کا حُسن دو بالا ہو جاتا ہے!

۱۸۱ ساز ہستی کو بس اب قم کے اشارے سے نہ چھیڑ — اس میں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

"قم" صیغۂ امر ہے، یعنی اُٹھ کھڑا ہو۔ قم کا اشارہ مضحکہ خیز ہے۔

۱۸۲ کسی کی بزم طرب میں کچھ ایک شمع نہیں — حریف گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں

مصرع اول میں لفظ "کچھ" زاید ہے، دوسرے مصرع میں چونکہ "بھی" کا لفظ آگیا ہے اس لیے پہلے مصرع میں لفظ "شمع" کے بعد "ہی" کلمہ حصر لانا چاہیئے۔

۱۸۳ حجاب ہوش اُٹھا اب کوئی حجاب نہیں — خیال یار سے اب ہمکنار ہم بھی ہیں

دوسرے مصرع میں ردیف "ہم بھی ہیں" مفید معنی نہیں، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یار ہمکنار کوئی اور بھی ہے؟

۱۸۴ مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں — ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

"مر کر" یعنی فوت ہو کر دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں کہنا عجیب بات ہے۔

۱۸۵ زندہ موسم گُل جب دلِ دیوانہ جیتا تھا — جواب آنے تو یار آگ لگائے بیاباں کو

زندہ دل، مردہ دل تو متعارف ہے، لیکن یہ جیتا دل کیا چیز ہے؟

۱۸۶ چھُٹے جب قید ہستی سے تو آئے کنج تربت میں — رہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو

پہلے مصرع میں کہا گیا ہے کہ جب قید ہستی سے چھُٹے تو تربت میں آئے، دوسرے مصرع میں یہ کہنا کہ رہا ہوتے نہیں بدل دیتے ہیں (زمانہ حال) درست نہیں۔

۱۸۷ اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو اِدھر دیکھو — مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

پہلے مصرع میں کیا ذبح کرتے ہو، سے مذبوح کے متعلق استفسار ثابت ہوتا ہے، طریقۂ ذبح پر متوجہ کرنے کے لیے "کیا" کے عوض "کیوں" چاہیئے۔

۱۸۸ غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے — کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

"خاک میں ملتی جوانی" بول چال کے خلاف ہے، "خاک میں ملتی ہے جوانی" چاہیئے۔

۱۸۹ چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

"چلے بھی آؤ" "صحیح نہیں" بھی "زاید ہے۔ نیز "تم اپنے مرنے والے" یہ ترکیب درست نہیں، "تم پہ مرنے والے" چاہیئے۔

سکونِ موت مری لاش کو نصیب نہیں — رہے گر کوئی اتنا نہ بیقرار رہے — ۱۹۰

پہلے مصرع میں "نہیں" کے بدلے "کہاں" چاہیئے، اس لیے نظم جملہ خبریہ سے جملہ انشایہ زیادہ بہتر ہے۔

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا — جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی — ۱۹۱

پھولوں کا لفظ اگر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو لفظ "تعلق" موزوں نہیں، اگر مجازی میں استعمال ہوا ہے تو "تعلق" سے کہنا رکیک ہے۔

ترجمانِ غمِ دل رنگِ شکستہ ہے نہ آہ — کون اس عہد میں اب دادِ زباں دانی دے — ۱۹۲

پہلے مصرع سے ظاہر ہے کہ غمِ دل کی ترجمانی رنگِ شکستہ سے ہو سکی نہ آہ سے! جب دونوں ترجمانی سے قاصر ہیں تو اب شاعر کس کی زباں دانی کی داد کا خواہاں ہے؟

ادا سے آڑ میں خنجر کے منھ چھپائے ہوئے — مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے — ۱۹۳

یہ واضح نہیں کہ قضا سے مراد خنجر ہے یا معشوق کا منھ، اگر خنجر مراد ہے تو یہ صحیح نہیں، کیونکہ خنجر تو سرِ آڑ ہے؛ اگر معشوق کا منھ مراد ہے تو منھ کو قضا سے تعبیر کرنا کیا معنی!!

طوفانِ اضطرابِ جنوں اٹھ کہ دیر سے — بیٹھا ہوں جمع خاطرِ داماں کیے ہوئے — ۱۹۴

"خاطر" کو داماں کی طرف مضاف کرنا بے معنی ہے۔

دل کی لحد پہ خاک اُڑانے چلا ہے عشق — ذرّے سے اکتسابِ بیاباں کیے ہوئے — ۱۹۵

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ عشق نے اکتسابِ بیاباں کس ذرّے سے کیا ہے؟

بلا سے ہجر میں جینے کی انتہا تو ہے — وہ ایک بار ہوئی یا ہزار بار ہوئی — ۱۹۶

"جینے کی انتہا" سے مراد زندگی کا خاتمہ یعنی موت، اس لحاظ سے مصرع اول کو مصرع ثانی سے کیا ربط؟

رہ جائے یا بلا سے یہ جان رہ نہ جائے — تیرا تو اے ستمگر ارمان رہ نہ جائے — ۱۹۷

"رہ جائے یا نہ رہ جائے" یہ ترکیب مہمل ہے، "رہے یا نہ رہے" چاہیئے۔

دل کی صورت آکے پہلو سے نہیں جانا نہ تھا — اور گئے بھی تھے تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے — ۱۹۸

دل کی صورت آنا تو ہو سکتا ہے، لیکن پہلو سے دل کی صورت جانا کیا معنی؟ نیز دوسرے مصرع میں "بھی" زاید ہے "تھے" رہے یا "بھی"۔

۱۹۹ — فانی بلائے مرگ سے غم کیجیے غلط — اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجیے

"غم کیجیے غلط" غلط، اُردو میں غم غلط کرنا، یعنی دل بہلانا کے معنی میں مستعمل ہے۔

۲۰۰ — خیالِ یار ہے اک حُسن و عشق کی دنیا — وہی نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

پہلے مصرع کی ترکیب درست نہیں "اک حُسن و عشق کی دنیا" کی بجائے "حُسن و عشق کی اک دنیا" چاہیئے۔ علیٰ ہٰذا دوسرے مصرع میں "وہی" کا لفظ گردش سے پہلے لانا چاہیئے۔

۲۰۱ — شوق کی گرمیٔ ہنگامہ کو وحشت جانا — جمع جب خاطرِ وحشت ہوئی ارماں سمجھے

لفظ جمع اور خاطر میں فصل ہونے کی وجہ سے خاطر کے الگ اور جمع کے الگ لغوی معنی ہوں گے، اصطلاحی نہیں۔

۲۰۲ — ہماری لاش مرقع ہے بیقراری کا — اک اضطراب کی صورت اس قرار میں ہے

"لاش" مردہ جسم، لاش کو بیقراری کا مرقع قرار دینا ذوقِ سلیم کے خلاف ہے۔

۲۰۳ — مری میت پہ ان کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے — دلِ بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

"دلِ بے مدعا" سے مدعا دریافت کرنے کو ماتم سے کیا تعلق؟

۲۰۴ — ساتھ جائے گا وہی میت کے سامانِ خلش — دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں تیر کے

"پیکاں" کا لفظ بطور جمع کے استعمال ہوا ہے، گویا ایک تیر کے کئی پیکاں ہوتے ہیں!

۲۰۵ — مجھ تک اس محفل میں پھر جامِ شراب آنے کو ہے — عمرِ رفتہ پلٹی آتی ہے شباب آنے کو ہے

"پلٹی آتی ہے" سے قطع نظر "عمرِ رفتہ" کی واپسی خود دلیلِ شباب!

۲۰۶ — ناامیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر — آس کہتی ہے ٹھہر خط کا جواب آنے کو ہے

"اپنا کام کر" اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی اپنے کام کو چھوڑ کر دوسری طرف مخاطب ہو جائے۔ یہاں تو ناامیدی جو موت سے کہہ رہی ہے کہ اے موت تو اپنا کام کر، صحیح نہیں، اس لیے کہ ہنوز موت نے اپنے کام کا آغاز کیا اور نہ آغاز کرنے کے بعد کچھ توقف کیا!!

۲۰۷ — گریہ کے آداب کے تو اس ہیں کس کو — ہائے کہ تابِ احتیاط نہیں ہے

"گریہ" کے بعد کئی "ک" متعاقب جمع ہو گئے ہیں، اور یہ عیبِ تنافر ہے، نیز دوسرے مصرع میں ہائے کے بعد "کہ" کانوں کو ناگوار!

داغ بہ اندازۂ جگر نہیں فانی　　وسعتِ منزل بقدرِ بساط نہیں ہے　　۲۰۸

اس شعر میں "داغ" بساط اور "جگر" منزل ہے۔ اس لحاظ سے دوسرے مصرع کی عبارت یوں ہونی چاہیئے۔ (بساط بقدرِ وسعتِ منزل نہیں ہے)۔

مشتاق خبردار رہیں ان کی نظر سے　　ملتی ہے نظر ان کی زمانے کی نظر سے　　۲۰۹

"زمانے" سے اگر اہلِ زمانہ مُراد ہیں تو مصرع اول میں لفظ "مشتاق" زاید ہے۔ اس لیے کہ اہلِ زمانہ میں مشتاق غیر مشتاق سب داخل ہیں۔

ہے فنا آبادِ غم اک معنی لفظ آفریں　　صورتِ آبادِ جہاں اک لفظِ معنی خیز ہے　　۲۱۰

لفظ معنی خیز تو ہو سکتا ہے، لیکن معنی کا لفظ آفریں ہونا بے معنی ہے۔

مرا قتل ان کے ہاتھوں یہ تو باتیں　　کچھ ان کے منھ کی ہیں کچھ نامہ بر کی　　۲۱۱

"نامہ بر" قافیہ مفید معنی نہیں اس لیے کہ نامہ بر کا کام نامہ بری ہے باتیں بنانا نہیں۔

شبِ فرقت کٹی یا عمرِ فانی　　اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی　　۲۱۲

مصرع ثانی سے ظاہر ہے کہ اجل اور سحر ملکر آنے کے آثار ایسی حالت میں ان کی آمد سے پہلے یہ سوال کرنا کہ شبِ فرقت کٹی، یا عمرِ فانی، مہمل ہے۔

مرحوم کس ادا کی تماشائیوں میں تھا　　پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی　　۲۱۳

پہلے مصرع میں "مرحوم" دوسرے مصرع میں "دل" اس طرح اضمار قبل از ذکر ناجائز ہے

تعمیرِ دل نے تجھ سے لیا انتقامِ عشق　　تیری ہی بزمِ جلوہ کہ عاشقی ہوئی　　۲۱۴

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تعمیرِ دل" نے انتقام کیوں لیا؟ حالانکہ تعمیر ہوئی بربادی نہیں ہوئی۔

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی　　اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے　　۲۱۵

پہلے مصرع میں "اپنی" کا لفظ بے محل واقع ہوا ہے۔ اس کی ضمیر غمِ انتظار کی طرف راجع ہے۔ لفظ "فانی" کی طرف نہیں۔

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے لوگوں کے آوازے　　محبت میں دلِ مجبور کو سب کچھ گوارا ہے　　۲۱۶

پہلے مصرع میں "لوگوں" بے معنی ہے، اس لیے کہ "غیر" لوگوں سے جدا نہیں۔

وصل سے محروم ہوں میں ورنہ گستاخی معاف　　بوسے لیتا ہے تصور آپ کی تصویر کے　　۲۱۷

پہلے مصرع میں لفظ "ورنہ" محض تکمیلِ وزن کے لیے ہے اور مخلِ معنی بھی۔ دوسرے مصرع میں یہ کہنا کہ تصور خود تصویر کے بوسے لیتا ہے ٹھیک نہیں۔

دیکھئے کیا ہو وہ اور آزردگیٔ بے سبب — ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے ۲۱۸

"آزردگی" میں جو مضاف واقع ہوا ہے حرفِ "ی" کو مشدد لانا غیر فصیح ہے۔

یہ ہستی دو روزہ گویا کہ نہیں فانی — اللہ رے تِرا اے دل اندازِ پریشانی ۲۱۹

"دو" میں واوِ ملفوظہ اردو ترکیب میں تو جائز ہے لیکن فارسی ترکیب میں نہیں۔

پھر خواب میں طوق آیا زنجیر نظر آئی — در پردہ ہے وحشت کی پھر سلسلہ جنبانی ۲۲۰

"خواب میں طوق آیا" اردو بول چال کے خلاف ہے۔

اپ ہو پاہی کہے اس سے ملوں یا نہ ملوں — موت مشتاق کو مٹی میں ملا بھی آئی ۲۲۱

پہلے مصرع "اس" دوسرے مصرع "مشتاق" اس طرح مشارٌ الیہ سے پہلے اسمِ اشارہ خلافِ قاعدہ ہے۔

دنیا میں دیارِ دلِ فانی کے سوا ہائے — کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے ۲۲۲

دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا "کوئی بھی وہ بستی ہے" مہمل ہے "بھی وہ" کے عوض "ایسی" ہونا چاہیئے۔

حدِ غم سے غمِ عشق بڑھ چلا فانی — وہ جامِ عمر کہ لبریز تھا چھلکتا ہے ۲۲۳

پہلے مصرع میں لفظ "غم" کی تکرار بے معنی ہے "غمِ عشق حد سے بڑھ چلا" کہنا ہی کافی ہے۔

آتی ہے خاک جادۂ ہستی سے بوئے گل — کس آرزو بھرے کی تمنا کچل گئی ۲۲۴

مطلق "آرزو بھرا" صحیح نہیں۔ آرزو بھرا دل وغیرہ مستعمل ہے۔ نیز "بو" کی مناسبت سے خونِ دل لایا جاتا تو بہتر تھا۔

دردمندانِ وفا کی ہائے رے مجبوریاں — دردِ دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کیے ۲۲۵

"دیکھا نہ جاتا تھا" عموماً اس موقع پر بولتے ہیں جب کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو، اور دیکھنے والا کہے کہ اس کی مصیبت دیکھی نہیں جاتی ا چونکہ دردمندانِ وفا خود دردِ دل میں مبتلا ہیں اس لیے یہ کہنا کہ دردِ دیکھا نہ جاتا تھا بے معنی ہے۔

رُخ مری جانب نگاہِ لطف دشمن کی طرف — یوں ادھر دیکھا کیے گویا ادھر دیکھا کیے ۲۲۶

دوسرے مصرع میں ردیف "دیکھا کیے" صحیح نہیں "دیکھ رہے ہیں" یا "دیکھتے ہیں" چاہیئے۔

مجھے قسم ہے ترے صبر آزمانے کی ۔۔۔ کہ دل کو اب نہیں برداشت غم اُٹھانے کی ۔۔۔ ۲۲۷

"مجھے قسم ہے" کہہ کر یہ معنی لینا کہ میں قسم کھاتا ہوں صحیح نہیں۔

محاورہ یہ ہے کہ ہمیں فلاں شے کی قسم ہے یعنی اس سے کچھ تعلق نہیں۔

کیا کیا نہ اس نے کام لیا اک حجاب سے ۔۔۔ اکثر سفیں نظر کی اُلٹ دیں نقاب سے ۔۔۔ ۲۲۸

"کیا کیا" عموماً مختلف کاموں کے اظہار کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ ایک ہی کام کی کثرت کے لیے نہیں۔

یا میرے بے شمار گناہوں سے درگذر ۔۔۔ یا میرے عذر سُن کرم بے حساب سے ۔۔۔ ۲۲۹

دوسرے مصرع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عذر بیان کرنے سے قاصر ہے اور التجا کرتا ہے اپنے کرم بے حساب سے میرے عذر سماعت کر، گویا کرم بے حساب کو خود گنہگاروں کے عذر بیان کرنا چاہیئے۔

جانی ہے اے امید کہاں دل اُجاڑ کر ۔۔۔ چل دے کوئی نہ اُٹھ کے جہانِ خراب سے ۔۔۔ ۲۳۰

دوسرے مصرع کی ترکیب اچھی نہیں ہے "اُٹھ کے چل دینا" فوت ہو جانے کے معنی پر صحیح نہیں، اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اُردو میں دنیا سے اُٹھ جانا۔ دنیا سے چل بسنا مستعمل ہے۔

اے حد ضبطِ درد نہ کر دل سے اب دریغ ۔۔۔ اک آہِ بے صدا کہ دعا بھی دوا بھی ہے ۔۔۔ ۲۳۱

پہلے مصرع میں لفظ "حد" زاید ہے، صرف ضبطِ درد کافی ہے۔ نیز آہ کی صفت بے صدا بے معنی!!

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند ۔۔۔ کس سے کہیں کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے ۔۔۔ ۲۳۲

دوسرے مصرع میں لفظ "دل" زاید ہے اس لیے کہ درد آشنا کہنے سے شخص کا دل ہی مراد ہوتا ہے مجرد شخص نہیں۔

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خوں بہا بھی ہے ۔۔۔ وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے ۔۔۔ ۲۳۳

اس شعر میں "خوں بہا" کی ایک حد تک "حیا" سے مناسبت ہوسکتی ہے لیکن عذرِ قتل کو گلہ سے کیا تعلق!!

برگشتہ تقدیر کی تاثیر ارے توبہ ۔۔۔ دل ہی پہ پلٹ آئی کی آہ جہاں کوئی ۔۔۔ ۲۳۴

لفظ "آہ" کے ساتھ "کوئی" بطور تنکیر استعمال کرنا خلافِ قاعدہ ہے۔

اظہارِ محبت کی حسرت کو خدا سمجھے ۔۔۔ ہم نے یہ کہانی بھی سو بار سنا ڈالی ۔۔۔ ۲۳۵

"حسرت کو خدا سمجھے" نعوذ باللہ، "خدا سمجھے" یعنی خدا بدلا دے، خدا سزا دے کے معنی میں "سے" کے ساتھ اُردو میں مستعمل ہے۔

جینے میں نہ اب فانی مرنے میں شمار اپنا ماتم کی بساط اس نے کیا کہہ کے اٹھا ڈالی ۲۳۶

"ماتم کی بساط" کسی کی وفات کے بعد بچھائی جاتی ہے چونکہ فانی کا فوت ہونا مصرع اول سے ثابت نہیں ہوتا اس لیے یہ شعر مہمل ہے۔

ہر لمحۂ حیات رہا وقف کار شوق مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی ۲۳۷

"کار شوق" سے کیا مراد ہے؟ اور کس کام کی طرف یہ اشارہ ہے۔ نیز وہ ایسا کیا کام ہے جس کی انجام دہی میں شاعر کا ہر لمحۂ حیات وقف رہا؟

اک نالۂ خموش مسلسل ہے اور ہم یا دشمن بخیر ضبط کی طاقت نہیں رہی ۲۳۸

"خموش" بمعنی ساکت، چپ، اس کو نالہ کی صفت قرار دینا درست نہیں۔

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی ۲۳۹

دوسرے مصرع میں "دوست" کا لفظ لایا گیا ہے اس مناسبت سے مصرع اول میں اغیار یا دشمن وغیرہ کا ذکر چاہیے، مطلق "زمانہ" کہنا صحیح نہیں، اس لیے کہ "زمانہ" سے مراد اہل زمانہ ہیں اور اس میں دوست دشمن سبھی داخل ہیں۔

دل اور ہوائے سلسلہ جنبانی نشاط کیوں پاس وضع غم تجھے غیرت نہیں رہی ۲۴۰

"وضع غم" یعنی غم کی وضع، گویا "غم" بدوضع بھی ہوتا ہے!

غربت نے بیکسی کا نشاں بھی مٹا دیا اڑتی تھی جس پہ خاک وہ تربت نہیں رہی ۲۴۱

"خاک اڑنا" تباہ ہونا، برباد ہونا لیکن مصرع ثانی میں "جس پہ" کے الفاظ ہیں اس وجہ سے اصطلاحی معنی مراد نہ ہوں گے، بلکہ لغوی معنی یعنی "وہ تربت نہیں رہی" جس پر گرد و غبار اڑتا تھا۔

امید مرگ پہ فانی نثار کیا کیجیے وہ زندگی جو ہوئی بھی تو مستعار ہوئی ۲۴۲

مصرع ثانی میں "ہوئی" کا لفظ دو جگہ استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ بے معنی ہے اس کے عوض دونوں جگہ "ہی" چاہیے۔

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید اب تصور بھی ترا نقش بر آب آتا ہے ۲۴۳

"دل کا خون ہو گیا" سے قطع نظر مصرع ثانی میں لفظ "آتا" (جزو ردیف) مخل معنی ہے، "نقش بر آب ہے" کافی تھا۔

ملتی جلتی ہے تری عمرِ دو روزہ فسانی   بن بھر آتا ہے اگر ذکرِ حباب آتا ہے   ۲۴۴

"ملتی جلتی" اظہارِ شباہت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ حباب سے عمر ملتی جلتی ہے مضحکہ خیز ہے۔

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے   بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے   ۲۴۵

پہلے مصرع میں ردیف "رہے" صحیح نہیں، یہ مقام "ہو" کا ہے۔

سکون موت مری لاش کو نصیب نہیں   رہے اگر کوئی اتنا نہ بیقرار رہے   ۲۴۶

پہلے مصرع میں "نہیں" کے بدلے "کہاں" چاہیے اس لیے کہ نظم میں جملۂ خبریہ سے جملۂ انشائیہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ وعدہ آساں پر ہال نظر آتا ہے   اب کارِ تمنا پھر مشکل نظر آتا ہے   ۲۴۷

وعدہ فی نفسہ نہ آساں ہے نہ مشکل، البتہ وعدہ کرنا یا ایفائے عہد آساں اور مشکل ہو سکتا ہے۔

نیز مصرع ثانی "اب" کا لفظ ہوتے ہوئے "پھر" کا لفظ زاید ہے۔

دل کھوئے ہوئے برسوں گذرے ہیں مگر اب بھی   آنسو نکل آنے میں جب دل نظر آتا ہے   ۲۴۸

"دل نظر آتا ہے" کہنا مہمل ہے، خواہ لفظِ دل حقیقی معنی میں مستعمل ہو یا مجازی معنی میں۔

روداد محبت کی تصویر ہے ہر آنسو   ہر قطرۂ خونیں میں اک دل نظر آتا ہے   ۲۴۹

پہلے مصرع میں "ہر آنسو" دوسرے مصرع میں "ہر قطرۂ خونیں" ہونے کی وجہ سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ آنسو قطرۂ خونیں سے جدا ہے۔

کافر ہوں گر یقیں نہ ہو کافر کی بات کا   وعدے میں اعتبارِ قیامت لیے ہوئے   ۲۵۰

لفظ "اعتبار" خواہ کسی معنی میں استعمال ہوا ہو، اس کے ساتھ "لیے ہوئے" کہنا صحیح نہیں۔

کعبے میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا   اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی   ۲۵۱

دوسرے مصرع میں لفظ "قصر" مفید معنی نہیں ہے۔ بجائے "قصرِ وفا" صرف "وفا" سے خطاب ہوتا تو قافیہ "تعمیر" بامعنی ہوتا۔

خرابِ لذتِ جاں کاہیِ محبت ہوں   مآلِ عشق سے قطعِ نظر نہیں ہے مجھے   ۲۵۲

"قطعِ نظر" بمعنی تاہم، اس پر بھی، اس کے سوا، لہذا ردیف "نہیں ہے مجھے" سے "قطعِ نظر" کو کیا ربط؟

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق   جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی   ۲۵۳

"آشیاں" بمعنی مکان اور گھونسلہ مستعمل ہے "آشیاں" اگر بمعنی مکان استعمال ہوتا تو تعمیر کا لفظ صحیح ہو سکتا

چونکہ مصرع ثانی میں شاخ کا ذکر آگیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آشیاں سے مراد یہاں گھونسلہ ہے اس لیے گھونسلے کے ساتھ لفظ تعمیر استعمال کرنا غلط ہے۔

تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام　　الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے　۲۵۴

مصرع اول میں "تری خدائی" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور مصرع ثانی میں لفظ "الٰہی" سے تخاطب کیا گیا ہے اس لیے "اپنی" صحیح نہیں۔ یہ مقام "ہماری" کا ہے۔

شکوہ کیا کیجئے نگاہ یار خود نم دیدہ ہے　　کیا تماشا ہے کہ دل چور بھی دزدیدہ ہے　۲۵۵

دزدیدہ کے حقیقی معنی "چرایا ہوا" اور جب یہ لفظ نگاہ یا نظر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے دزدیدہ نظر یا نگاہِ دزدیدہ تو اس کے معنی کن انکھیوں سے دیکھنے کے ہیں، اگر یہ لفظ یہاں حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے تو جب بھی مصرع ثانی بے معنی ہے اس لیے کہ دل کا چور جب دزدیدہ ہے یعنی چرایا ہوا، تو چور کا چرایا ہوا کیا معنی؟ دزدیدہ اگر اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس کے ساتھ نظر یا نگاہ کا لفظ ہونا چاہیئے۔ بحالت موجودہ مصرع ثانی بے معنی ہے۔

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصلِ دلبر کی　　بلائیں لے رہی ہیں میری تدبیریں مقدر کی　۲۵۶

پہلے مصرع میں "خبر" کے عوض "پیام" کا لفظ چاہیئے تھا۔ بحالتِ موجودہ یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دلبر کا وصل ہوا ہے یا نہیں اس خبر کے قاصد سے سننے کا شاعر منتظر ہے۔

نہ سانس کا ہے بھروسا نہ آہ میں تاثیر　　وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی　۲۵۷

"پھرنا" یہ لفظ "سے" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو منحرف ہونے کے معنی دیتا ہے۔ مطلق "پھرنا" کے معنی چکر کھانے کے ہیں، "وہ کیا پھرے" کے عوض "مجھ سے وہ کیا پھرے" چاہیئے۔

کہتے ہیں جن کو عرف محبت میں داغِ دل　　وہ نقش تو نہ ہوں ترے پائے خیال کے　۲۵۸

"عرف" کے معنی مشہور نام، عام نام، مصرع اول میں عرف کو جو محبت کی طرف مضاف کیا گیا ہے صحیح نہیں۔

اُڑا لیے ہیں کچھ انداز موت نے فانیؔ　　عتابِ یار کے روزِ سیاہ فرقت کے　۲۵۹

"اُڑا لینا" یعنی کسی کا ڈھنگ سیکھ لینا یا کسی کی طرز اُڑا لینا۔ لہذا روزِ سیاہ کا ڈھنگ یا انداز اُڑانا کیا معنی؟

اجل کی آرزو ہو دل میں فانیؔ اور دنیا ہو　　خدا رکھے یہی رونق ہے بس اُجڑے ہوئے گھر کی　۲۶۰

پہلے مصرع میں اس بات کی تمنا کی جا رہی ہے کہ دل میں اجل کی آرزو ہو، اور دوسرے مصرع میں "خدا رکھے"

کہا گیا ہے، حالانکہ اُس کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز موجود ہے اور اس کے برقرار رکھنے کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ دوسرے مصرع میں "یہی رونق ہے" بھی صحیح نہیں، ایسے موقع پر اسی سے رونق ہے، کہتے ہیں۔

۲۶۱ — سیکڑوں شکووں کے نرغے میں لب خاموش ہے — پھیر لے میت کی جانب سے نگاہ التفات

لفظ "نرغہ" ہجوم اور انبوہ پر دلالت کرتا ہے اس لیے "سیکڑوں" زاید ہے۔

۲۶۲ — بت انھیں بنا پایا اب خدا خدا کرکے — وہ مری شکایت پر چپ کھڑے ہیں محشر میں

مصرع ثانی کی بندش کا کیا کہنا! انھیں بت بنا پایا! بت بنا پایا! کیا خوب۔

۲۶۳ — یہ ہے اپنی کہانی قصہ کوتہ زندگی بھر کی — دیا اک جان کے دشمن کو دل جاں نذر دلبر کی

پہلے مصرع کی ترکیب درست نہیں "اک دشمن جاں" کی مناسبت سے جاں اک دلبر کے نذر کی چاہیے۔ اس کے علاوہ ع رسم عاشق نیست بایکدل دو دلبر داشتن!!

۲۶۴ — زلف جاناں سے بنا ہے کبھی سودا نہ بنے — جنس دل مفت پھنسا کر کوئی دیوانہ بنے

"پھنسا" کا استعمال دل کے ساتھ تو صحیح ہے لیکن "جنس" کے ساتھ اس کا استعمال درست نہیں۔

۲۶۵ — آپ سن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے — لب تک آجائے غم ہجر تو شکوہ ہو جائے

"لب تک آجائے غم ہجر" یہ ترکیب بے معنی ہے، اس لیے کہ غم "لب تک" نہیں آتا بلکہ حرف غم یا ذکر غم لب تک آسکتا ہے۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی گزشتہ اشاعت میں شعر نمبر (۶۶) میں مصرع دوم کا قافیہ بجائے "مزار" کے "فراز" چھپ گیا ہے اور شعر نمبر (۱۲۲) کے مصرع اول میں بجائے "اے دل" کے لفظ "باقی" سہواً لکھ دیا گیا ہے، ناظرین تصحیح فرمالیں۔ ۱۲

برسات کی رات

کتنا پُر شور ہے دریا کا تلاطم یارب
کتنی تاریک ہے جنگل میں یہ برسات کی رات

بادِ صرصر کے چلے آتے ہیں جھونکے کیسے
ڈر ہے خاموش نہ ہو جائے مری شمعِ حیات

ظلمتِ ابر نے معدوم کیا ہے سب کو
نہ فلک پہ ہیں ستارے نہ زمیں پر ذرات

گُلِ رنگیں بھی سیہ پوش ہوئے ہیں افسوس
آج بدلے نظر آتے ہیں چمن کے حالات

اک اندھیرے میں ہیں پوشیدہ ازل اور ابد
نہ زمیں ہے نہ زماں ہے نہ جہت ہے نہ جہات

ظلمتِ یاس میں پوشیدہ ہوئی ہے امید
اک کرن بھی نظر آتی نہیں اب تو ہیہات

اتنا مایوس نہ ہو اے دلِ بے تاب و تواں
کچھ ہمیشہ تو رہے گی نہیں برسات کی رات

دیکھ! جگنو وہ چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
دیکھ! بجلی وہ دکھاتی ہے زمیں کے ذرات

دیکھ! ہاں دیکھ! ذرا غور سے مشرق کی طرف
صبحِ صادق کے نظر آتے ہیں شاید جلوات

کیا تعجب ہے کہ خورشیدِ جہاں تاب اپنا
ہو نمودار کرے چاک ردائے ظلمات

محمد جلال الدین اشک بی اے ال ال بی (عثمانیہ)

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی

باب اول

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

ہندوستان کے اسلامی بادشاہوں میں سب سے پہلے سلطان علاء الدین خلجی نے تسخیر دکن کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے کسی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ یہ حملہ ۶۹۴ھ مطابق ۱۲۹۴ء میں اتفاقاً ہوا اور قسمت نے اس کو دکن کا پہلا فاتح بنا دیا۔ علاء الدین خلجی نے بادشاہ ہونے کے بعد ۷۰۶ھ مطابق ۱۳۰۶ء میں دکن کیطرف توجہ کر کے ۷۱۲ھ مطابق ۱۳۱۲ء تک مزید فتوحات حاصل کیں۔ دکن کے متعلق اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ دکن سلطنت دہلی کا ایک باجگذار علاقہ رہے اور اس کی سیادت کو تسلیم کرے۔ اس لیے اُس نے دکن کا الحاق دہلی کے ساتھ نہیں کیا۔ اسی حکمت عملی کے تحت اس کے زمانے میں دکن بالکل آزاد تھا۔ یہاں کے راجہ علاء الدین خلجی کی شہنشاہیت کو تسلیم کرتے اور سالانہ خراج ادا کرتے تھے۔ اس لیے دکن میں نہ تو فتنہ و فساد ہوا اور نہ کوئی نئی حکومت قایم ہو سکی۔ اور اس کی یہ حکمت عملی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔

خاندان خلجی کے خاتمہ کے بعد ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں ارکان سلطنت کی رائے سے غازی خاں تغلق غیاث الدین کے لقب سے دہلی کا بادشاہ قرار پایا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد تغلق ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا۔ ایام شہزادگی میں اس نے دکن میں فتوحات حاصل کیں۔ اس کے عہد میں دکن کے راجاؤں نے سرکشی اور بغاوت کر کے ملک میں بدامنی پھیلائی اور خراج بھی وقت مقررہ پر روانہ نہیں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے

نت بہمنیہ کا
م اور استحکام

مرکزی حکومت کو ہر وقت فوج روانہ کرنی پڑتی تھی۔ علاء الدین خلجی کے برعکس محمد تغلق پورے ہندوستان پر اپنی موثر حکومت قایم کرنی چاہتا تھا اس پر حکومت کرنے کے لیے اس کو ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے وہ پورے ہندوستان پر حکومت کر سکے۔ یہ مرکزی مقام سوائے دیوگری کے دوسرا نہیں ہوسکتا تھا اس کے علاوہ سلطان محمد تغلق دکن کی بغاوتوں کا بھی سد باب کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کی حکمت عملی علاء الدین خلجی کی حکمت عملی کے خلاف یہ تھی کہ دکن کا الحاق سلطنت دہلی کے ساتھ کرلیا جائے۔ تاکہ بغاوتوں کا انسداد ہو لیکن اس سے تمام ہندوستان میں بغاوتیں شروع ہوگئیں اور اس کی وجہ سے دکن میں سلطنت بہمنیہ قایم ہوئی کیا عجب ہے کہ اگر محمد تغلق کی حکمت عملی سلطان علاء الدین خلجی کی سی ہوتی تو سلطنت بہمنیہ وجود ہی میں نہ آتی۔ غرض دکن کا الحاق سلطنت دہلی سے کرکے ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۹ء میں سلطان محمد تغلق نے تخت سلطنت کو دہلی سے دیوگری میں منتقل کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا لیکن اس کو شمالی ہند کی بغاوتوں کی وجہ سے بہت جلد دہلی کو دوبارہ آباد کرنا پڑا۔ بادشاہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے دکن کے راجاؤں نے پھر سرکشی کی اور بغاوت کرکے شہر بیجانگر آباد کیا۔ دکن کے ممالک مفتوحہ تقریباً سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے البتہ صرف دیوگری پر سلطان محمد تغلق کا قبضہ رہا۔

۷۴۲ھ مطابق ۱۳۴۱ء میں ملابار میں بغاوت برپا ہوئی جس کو فرو کرنے کے لیے سلطان روانہ ہوا لیکن راستہ میں ایسا سخت بیمار ہوا کہ واپسی کے بغیر چارہ نہ رہا۔

سلطان محمد تغلق دوآبہ کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بیدر میں نصرت خاں اور گلبرگہ میں علی شاہ نے بغاوت کی جس کو فرو کرنے کے لیے قتلغ خاں حاکم دیوگری روانہ کیا گیا۔ جس نے نصرت خاں کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا اور علی شاہ کو گرفتار کرکے سلطان محمد تغلق کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر ساتھ ہی تغلق نے یہ غلطی کی کہ قتلغ خاں کو دکن سے طلب کرکے نظام الدین عالم الملک کو دکن روانہ کیا۔ سلطان محمد تغلق نے امیران صدہ کی بغاوتوں سے تنگ ہوکر ان کے قتل کا ارادہ کیا اور سپہ سالار دکن کے نام فرمان بھیجا کہ ایک ہزار پانسو سواروں اور امیران صدہ کو بھروچ روانہ کردے۔ عالم الملک نے نہایت ہی وقت سے امیران صدہ کو دولت آباد (دیوگری) بلوایا اور سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر جب یہ لوگ درہ مانک گنج[1] پہنچے تو سلطان کی تلون مزاجی

---

[1] درہ مانک گنج کا اب ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ برنی کی تاریخ (صفحہ ۵۱۴) میں لکھا ہے کہ یہ قضیہ دولت آباد سے

اور غضبناک طبیعت سے خائف ہو کر آپس میں مشورے کرنے لگے اور واپسی کا ارادہ کر لیا۔ ملک لاچین کی شامت جو آئی تو اس نے روکنا چاہا مگر یہ کب ماننے والے تھے۔ اس کو قتل کر دیا اور مال و اسباب لوٹ کر دولت آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ دولت آباد پہنچکر قلعہ کا سختی کے ساتھ محاصرہ کیا اور چند ہی روز میں فتح کر کے خزانہ بانٹ لیا۔ اور اسمٰعیل مخ کو بادشاہ تسلیم کر کے ناصر الدین کا خطاب دیا۔ چتر شاہی سے عزت افزائی کی۔ حسن خاں کو ظفر خاں خطاب اور ہیکری[1]۔ رائے باغ۔ مرچ کلھر حسن آباد (گلبرگہ) کے پرگنے جاگیر میں دیئے پھر ہر ایک اپنی اپنی جاگیر میں جا کر باغی ہو گیا۔

(بسلسلۂ گذشتہ) ایک ہی منزل یعنی آٹھ دس میل کے فاصلہ پر پیش آیا......... اور شمال مغرب کی سمت کا پتہ دینے سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید مانک گنج کا درہ اُن پہاڑیوں میں کہیں ہوگا جو موجودہ دیوگاؤں کے قریب قدیم شاہی سڑک کے راستے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ (حواشی تاریخ فرشتہ جلد سوم ترجمہ اُردو مولفہ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی) فرشتہ نے اس درہ کا نام بہمنوں کے بیان میں مانک گنج اور محمد تغلق کے بیان میں مانک دون جو قصبہ دون اور گنج کے مابین ہے لکھا ہے۔ سلسلۂ آصفیہ جلد سوم تاریخ دکن حصہ اول میں بھی اس درہ کا نام مانک دون ہی لکھا ہے لیکن برنی کی تاریخ محمد تغلق کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے اور فرشتہ بہت بعد کی ہے اس لیے درہ کا نام مانک گنج ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[1] ہیکری۔ بلگام کے ضلع میں رائے باغ سے کوئی تیس میل جنوب میں واقع ہے یہ پہلے مشہور شہر تھا۔

رائے باغ۔ بیجاپور کے تقریباً پچاس میل مغرب میں ہے آج کل کولھاپور کی ریاست میں داخل اور چھوٹا قصبہ رہ گیا ہے۔

مرچ۔ بیجاپور کے مغرب میں ابھی تک موجود ہے۔

کلھر کا اب پتہ نہیں چلتا۔ لیکن عادل شاہی تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام مرچ کے شمال میں مان دیس (یعنی مان ندی کے علاقہ) کے مغرب میں واقع تھا۔ (از حواشی تاریخ فرشتہ مولفہ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)۔

نت بہمنیہ کا ہ اور استحکام

۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء میں حسن خاں نے بھیرون رائے[1] حاکم گلبرگہ کو قتل کر کے تسلط جمایا اور اطراف کے امیران صدہ کو بلا کر حکومت مستحکم کی چند ہی مہینوں میں سارا دکن سلطان محمد تغلق کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان پریشان ہو کر دولت آباد پہنچا۔ اسمٰعیل منج نے مقابلہ کیا مگر شکست ہوئی۔ اور وہ دولت آباد[2] میں جا کر قلعہ بند ہو گیا دوسرے اُمراء بھی اپنی اپنی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے قلعۂ دولت آباد کا رُخ کیا ہی تھا کہ حاکم گجرات کے بغاوت کی خبر ملی، اور وہ قوام الدین خداوند زادہ اور دیگر اُمراء کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود گجرات روانہ ہو گیا۔

ادھر حسن خاں نے بیدر پر حملہ کر دیا اور تلنگانہ کے راجہ کی مدد سے عماد الملک[3] کے لشکر کو پسپا کر کے اور

---

[1] بھیرون رائے حاکم گلبرگہ۔ اس نام کو فرشتہ ایک اور مقام پر "بھرن" لکھا آیا ہے۔ اور برنی کی تاریخ میں اس کو "بھیرن" اور تذکرۃ الملوک میں "پرون راؤ" لکھا ہے۔ مگر برہان مآثر میں اس واقعہ کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس میں اس حاکم گلبرگہ کا نام "پوچا ریڈی" لکھا ہے۔ لیکن دکنی زبان کے ناموں پر نظر کیجیے تو "پوچا" یا "پوچیا ریڈی" ہی زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔ برہان مآثر کی روایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس "پوچا ریڈی" کو علاؤالدین حسن کے ایک سردار نے گلبرگہ میں محصور کر لیا تھا اور بعد میں گرفتار کر کے دکن کے نئے بادشاہ (علاوالدین) کے پاس دولت آباد بھیجا گویا اس کتاب سے خود علاوالدین کے گلبرگہ فتح کرنے اور وہاں کے اس ہندو حاکم کو قتل کرانے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

برہان مآثر تاریخ فرشتہ سے آٹھ دس برس پہلے کی لکھی ہوئی کتاب ہے اس لیے میں اس کی روایت کو فرشتہ سے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں۔

[2] فرشتہ نے بہمنیوں کے بیان میں اسمٰعیل منج کا قلعہ دولت آباد میں اور محمد تغلق کے بیان میں دھارا گڑھ میں جا کر قلعہ بند ہونا لکھا ہے۔ سلسلۂ آصفیہ جلد سوم تاریخ دکن حصۂ اول میں لکھا ہے کہ اسمٰعیل منج (ناصر الدین) دولت آباد کی پہاڑی پر دھارا گڑھ کے قلعہ میں جا کر متحصن ہو گیا۔

[3] اس جنگ اور عماد الملک کے مارے جانے کی روایت کو برہان مآثر میں بالکل دوسری طرح لکھا ہے اور اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سلطان محمد تغلق نے دولت آباد کے قریب دکن کے باغی امیروں کو شکست دی تو اسمٰعیل منج تو قلعہ دولت آباد میں محصور ہو گیا اور علاوالدین حسن اپنی فوج لیکر گلبرگہ روانہ ہوا لیکن راستے میں یہ سُنکر کہ اس کے تعاقب میں عماد الملک آ رہا ہے اُس نے گھات لگائی اور یک بیک عماد الملک پر حملہ کیا اور اسی ناگہانی حملے میں عماد الملک مارا گیا۔

سلطنت قیام اور

اس کو قتل کر کے اسمٰعیل منج کی مدد کے لیے روانہ ہوا حسن کا نام سنکر محاصرہ کنندہ اُمراء فرار ہو گئے اور حسن نے اطمینان سے دولت آباد پر قبضہ کر لیا۔ اسمٰعیل منج نے حسن کی ہر دلعزیزی اور شجاعت دیکھ کر مناسب خیال کیا کہ اسی کو بادشاہ بنائے چنانچہ وہ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور حسن گانگو کو بادشاہ بنا دیا۔ ۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء میں سلطان علاؤالدین حسن گانگو بہمنی کو دولت آباد کی مسجد میں سب اُمراء نے ملکر بادشاہ تسلیم کیا، اور سر پر تاج سلطانی اور چتر سیاہ قایم کیا گیا اور ممالک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ حسن نے گلبرگہ کو پسند کر کے دارالسلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

سلطنت بہمنیہ کا بانی یہی علاؤالدین حسن گانگو بہمنی تھا اس کے ابتدائی حالات نہایت تاریکی میں ہیں اس کے نسب کے متعلق مورخین نے سخت اختلاف کیا ہے چنانچہ اس عہد کی مشہور تاریخوں میں سے زبدۃ التواریخ[۱] نے اس کو مفلوک الحال ترکی الاصل بتایا ہے محمود شاہی[۲] نے افاغنہ سے لکھا ہے تحفۃ السلاطین[۳] سراج التاریخ[۴] بہمن نامہ دکنی[۵] برہان ماثر اور ہفت اقلیم میں عیون التواریخ[۶] کے حوالہ سے نیز طبقات الاکبری[۷] مراۃ العالم[۸] اور مراۃ الصفا[۹] میں اس کو بہمن بن اسفندیار شاہ ایران کی نسل میں ثابت کیا ہے۔ اور شجرہ اس طرح لکھا ہے:۔

سلطان علاؤالدین حسن ابن کیکاوس ابن محمد ابن علی ابن حسن ابن سہام ابن سیمون ابن سلام ابن ابراہیم ابن نصیر ابن منصور ابن رستم ابن کیقباد ابن منوچہر ابن نامدار ابن اسفندیار ابن کیومرث ابن خورشید ابن صمصامی ابن فغفور ابن فرخ ابن شہریار ابن عامر ابن شہد ابن ملک داؤد ابن ہوشنگ ابن نیک کردار ابن فیروز بخت ابن نوح ابن صانع اور صانع سے بہرام گور تک چند واسطے ہیں اور بہرام گور ساسان کی اولاد میں اور ساسان بہمن بن اسفندیار کیانی کی نسل سے ہے اور بہمنی کہلانے کی یہی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ لفظ گانگو کے اضافہ کے متعلق مراۃ العالم کے مولف کا بیان ہے کہ ایک منجم گانگو نامی تھا اس نے زائچہ دیکھ کر حسن سے کہا کہ تو دولتمند اور بادشاہ ہو گا تو میرے نام کو اپنے

۱۔ زبدۃ التواریخ مولفہٗ مولانا نورالحق دہلوی اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۲۔ محمود شاہی مولفہ شمس الدین محمد شیرازی۔ یہ کتاب آجکل نہیں ملتی اس کا مواد تاریخ فرشتہ اور دیگر تواریخ میں ملتا ہے اسی سے یہاں مدد لیگئی ہے۔

ت بہمنیہ کا / بر استحکام

نام کے ساتھ ملانا حسن نے گانگو منجم کی بات مان لی اور بادشاہ ہونے کے بعد اپنے نام کے ساتھ لفظ گانگو کا اضافہ کیا۔

فرشتہ[۱] نے علاء الدین حسن کو گانگو پنڈت منجم کا ملازم ٹھہرایا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے کہ دہلی میں شہزادہ محمد تغلق کا مقرب ایک منجم مسمی گانگو برہمن تھا حسن اس برہمن کے پاس نوکر تھا اور بوجہ غربت نہایت فلاکت سے گذران کرتا تھا برہمن نے حسن کی غربت پر ترس کھا کر دو راس بیل اور کچھ افتادہ زمین اس کو

(بسلسلۂ گذشتہ) ۳۔ تحفۃ السلاطین۔ مولفۂ ملا داؤد بیدری۔ ۴۔ سراج التاریخ۔ مولفۂ خواجہ محمد لاری۔ ۵۔ بہمن نامہ۔ مولفۂ شیخ آذری۔ یہ کتابیں آجکل نایاب ہیں طبقات الاکبری میں سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے حالات سراج التاریخ سے اخذ کیے گئے ہیں اور تاریخ فرشتہ میں سراج التاریخ، تحفۃ السلاطین اور بہمن نامہ سے۔ یہ تواریخ خاص سلاطین بہمنیہ کے زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اس لیے انھیں خاص وقعت حاصل ہے اور ان کی روایات معتبر ہیں۔

۶۔ عیون التواریخ خاص سلاطین بہمنیہ کے زمانے کی لکھی ہوئی ہے اور اس وقت ناپید ہے۔ برہان ماثر۔ مولفۂ علی بن عزیز اللہ طباطبائی ۱۰۰۰ھ اور ہفت اقلیم مولفۂ امین احمد رازی ۱۰۰۲ھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں عیون التواریخ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ برہان ماثر کا آب خوردہ قلمی نسخہ مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ہاں موجود ہے اس سے نیز اس کے انگریزی ترجمہ مترجمہ میجر کنگ سے مدد لیگئی ہے۔ ہفت اقلیم شمس اللہ قادری صاحب رسالہ تاریخ میں شایع ہوئی ہے۔ میں نے اسی رسالہ سے مدد لی ہے۔

۷۔ طبقات الاکبری مولفۂ ملا نظام الدین احمد کا ماخذ سراج التاریخ ہے اور یہ ۱۰۰۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

۸۔ مراۃ العالم مولفۂ بختاور خاں عالمگیری۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۹۔ مراۃ الصفا مولفۂ محمد علی بن محمد صادق۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

[۱] تاریخ فرشتہ۔ مولفۂ حکیم محمد قاسم فرشتہ ۱۰۱۵ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ بیجاپور کا درباری مورخ تھا۔ اس نے شاہان بیجاپور کے حالات کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے اور سلاطین بہمنیہ کے حالات میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے اس کے پیش نظر نہایت مستند تواریخ تھیں۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

وہی حسن زراعت کے لیے زمین ہموار کرنے میں مصروف ہوا۔ اتفاق سے حسن کے ہل چلاتے وقت ہل کا ایک سرا زنجیر میں اٹک گیا۔ زنجیر نکالنے کی کوشش کی تو اُس کے ساتھ اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک دیگچی ملی۔ وہ اُس کو گانگو کے پاس لے گیا اور حقیقت حال بیان کی گانگو کو اس کی ایمانداری اور کھراپن پسند آیا۔ اُسی وقت اُس نے حسن کا حال شہزادہ محمد تغلق کو جا سنایا۔ شہزادہ نے اپنے باپ بادشاہ غیاث الدین سے اس کی سفارش کی، بادشاہ نے حسن کی راستبازی سے خوش ہو کر اُس کو منصب ایک صدی عنایت کیا، اور امیروں کے سلسلہ میں شامل کیا۔

ایک دن گانگو نے حسن کا زائچہ دیکھ کر کہا کہ تو مرتبہ شاہی کو پہنچے گا۔ پس اقرار کر کہ تجھے بادشاہی ملے گی تو میرے نام کو اپنے نام کے ساتھ شامل کرے گا تاکہ تیرے نام کی شہرت اور برکت سے میرا نام بھی بقائے دوام حاصل کرے۔ حسن نے قبول کیا اور جب بادشاہ ہوا تو ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن حضرت شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہ کے پاس شہزادہ محمد تغلق کی دعوت تھی جب دعوت سے فارغ ہو کر شہزادہ چلا گیا تو حسن خانقاہ کے دروازہ پر آیا حضرت ممدوح نے فرمایا سلطانے رفت و سلطانے آمد" یہ کہہ کر اُس کو اندر بلایا اور اس کے حال پر بہت التفات کی۔ اور جو روٹی اپنے حصہ کی رکھی ہوئی تھی اُس کو کھلائی اور زبان گوہر نثار سے یہ ارشاد فرمایا کہ "انشاء اللہ تجھے دکن میں بادشاہی نصیب ہوگی"[۱] پس اسی وقت سے حسن کو دکن جانے کا اشتیاق اور اضطراب رہنے لگا۔

فرشتہ نے ایک دوسرے مقام پر حسن کو ظفر خاں علائی ملک ہزبر الدین سپہ سالار سلطان علاء الدین خلجی کا بھانجہ ہونا اس طرح لکھا ہے کہ ظفر خاں علائی کے قتل کے بعد اُس کا خاندان پریشان ہو گیا حسن شاہ اور علی شاہ اُس کے دو بھانجے بھی اُن ہی پریشان حال لوگوں میں تھے، فاقہ کشی سے تنگ آکر حسن نے دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی آنے کے بعد برہمن منجم کا ملازم ہوا۔ اس سے حسن کا ملک زادہ اور امیر زادہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی تائید تاریخ فیروز شاہی مولفہ ضیاء الدین برنی سے ہوتی ہے۔

تذکرۃ الملوک[۲] میں لکھا ہے کہ حسن خاندانی شخص تھا وہ بحالت تباہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ہمراہ

---

[۱] فرشتہ۔

[۲] تذکرۃ الملوک، مولفہ ملا رفیع الدین ابراہیم شیرازی ۱۰۱۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے اس میں سلاطین بہمنیہ کے حالات نہایت مختصر ہیں۔

بہمنیہ کا استحکام

گلبرگہ میں آکر حضرت مخدوم شیخ سراج الدین جنیدی قدس سرہ کا مرید ہوا اور اُن کی خدمت کیا کرتا تھا۔ آپ کی دعا لینے سے اُس کو بادشاہی ملی تھی۔ تذکرۃ الملوک میں حسن کے بادشاہ ہونے کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ حسن گانگو اکابر کی اولاد سے تھا جو روزگار کی تلاش میں سرگرداں و بے سروساماں تھا۔ ایک دن جنگل میں ایک درخت کے نیچے سویا تھا۔ ایک بڑا کالا زہریلا سانپ پھن کھولے ہوئے اُس کے چہرہ پر مگس رانی کرنے لگا۔ ایک برہمن مسمی گانگو یہ حالت دیکھکر وہاں کھڑا رہا۔ جب حسن بیدار ہوا تو وہ سانپ اپنا سر نیچے کرکے سوراخ میں چلا گیا۔ برہمن نے حسن کا زائچہ دیکھ کر اُس سے کہا کہ تم کو بادشاہت ملے گی۔ اور اپنی آرزو ظاہر کی کہ جب تم کو بادشاہت ملے تو میرا نام اپنے نام کے ساتھ شریک کرکے تم اور تمہاری اولاد اپنے فرامین میں بہمنی لکھا کریں۔ حسن نے اس کی یہ بات قبول کی اور اپنے کو بہمنی لکھنے لگا۔ اور اس کی اولاد میں جو اٹھارہ بادشاہ ہوئے وہ بھی اپنے آپ کو بہمنی لکھا کرتے تھے۔[1]

روایت ہے کہ حسن گانگو شیخ الاقطاب شیخ محمد سراج الدین جنیدی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت شیخؒ وضو کر رہے تھے، سر کا مسح کرتے وقت اپنی دستار سر سے اُتار کر حسن کو دی۔ حسن یہ خیال کرکے کہ حضرت نے مرحمت فرمائی ہے فوراً اپنے سر پر رکھ کر قدمبوس ہوا۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ "انشاء اللہ تیرے سر پر تاج شاہی رکھا جائے گا۔"[2]

روایت ہے کہ جب ملک دکن میں مسلمانوں کی کوئی مسجد نہ تھی تو شیخؒ نے ایک مسجد کی بنا ڈالی اور مسلمانوں نے اتفاق کرکے اس کی تعمیر میں شیخ کو مدد دی۔ اس کی تعمیر کے وقت حسن مٹی اور پتھر کا گراں بوجھ خود اٹھا کر پہنچاتا تھا۔ حضرت شیخ نے یہ محنت دیکھ کر اس کو دعا دی اور فرمایا کہ "حسن پر ملک کی بادشاہت کا بوجھ عاید ہوگا۔"[3]

روایت ہے کہ ایک روز حسن کی والدہ نے حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر حسن کی

---

[1] یہ واقعہ مرہٹی کتاب "سلطان سوری" میں بھی مذکور ہے۔

[2] تذکرۃ الملوک۔

[3]

سلطنت قیام اور

پریشان حالی عرض کی۔ شیخؒ نے فرمایا کہ حسن کو چاہیئے کہ فلاں مقام پر زراعت کرے وہاں اس کا مقصد اسکو حاصل ہوگا۔ حسن نے زراعت شروع کی، اس زمین میں ہل چلاتے وقت اس کو خزانے کا ظرف ملا۔ اسکی اطلاع شیخؒ کو کی گئی ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کیا جائے کہ مطلب حاصل ہوا اور عسرت و پریشانی دفع ہوئی۔[1]

روایت ہے کہ ان روپیوں سے حسن نے فوج جمع کی اور لشکرکشی کے لیے شیخ سے اجازت چاہی۔[2] گنگو برہمن پنڈت نے بھی حسن کے اُن کاموں میں نہایت سعی کی۔ شیخؒ نے فرمایا کہ جمعہ کی رات کو حاضر رہے۔ حسبہٗ حاضر ہونے پر۔ شیخؒ نے فاتحہ پڑھی اور تلوار شجاعت حسن کے کمر پر باندھی اور کفار کی طرف روانہ ہونے کا حکم فرمایا۔ حضرت کے حکم کے بموجب حسن اپنی فوج کے ساتھ مرچ کی طرف روانہ ہوا۔ حاکم قلعہ رانی درگاوتی تھی جو بے خبری میں سیر کے لیے باہر گئی ہوئی تھی۔ باہر ہی حسن کا مقابلہ درگاوتی سے ہوا۔ رانی قید ہوئی اور لشکر اسلام قلعہ میں داخل ہوا، اور فتح کے بعد شیخؒ کی خدمت میں اطلاع کی جس کا جواب شیخؒ نے ذریعہ تحریر دیا کہ قلعہ کا نام مبارک آباد رکھا جائے۔ اُسکے بعد حسن نے حوالی مبارک آباد میں فتوحات حاصل کیں۔ شیخؒ نے اُس کے بعد گلبرگہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حسن قدمبوس ہوکر روانہ ہوا اور قلعہ گلبرگہ کا محاصرہ کیا۔ اہل قلعہ نے اس خیال سے کہ قلعہ کا مالک پردن راؤ[3] جو تین کوس کے فاصلہ پر بت خانہ کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا آیا ہے، قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔ حسن نے قلعہ میں داخل ہوکر اہل قلعہ کو قید کیا۔ جب اس کی خبر پردن راؤ کو پہنچی وہ پریشان ہوکر واپس آیا اور لشکر اسلام سے اُس کی لڑائی شروع ہوئی۔ جانبین کے بہت سارے لوگ قتل ہوئے اور لشکر اسلام نے تیر برسانا شروع کیا۔ ایک تیر پردن راؤ کو ایسا لگا کہ وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اُس کے مرتے ہی اُس کا لشکر فرار ہوگیا اور ملک پر حسن کا قبضہ ہوا، اور گلبرگہ کو حسن آباد کے نام سے موسوم کیا گیا، اور حسن سلطان علاؤالدین بہمن شاہ کے لقب سے تخت پر جلوس کرکے سلطان قرار پایا۔

بعض واقعات ممکن ہے کہ تاریخی تحقیق کی کسوٹی پر پورے نہ اتریں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت

لہ۔ تذکرۃ الملوک۔

سلہ۔ " " "

سلہ۔ پردن راؤ کے متعلق اس سے پہلے کے نوٹ میں صراحت کردی گئی ہے۔

ملطنت بہمنیہ کا یام اور استحکام

ہوتا ہے کہ حسن کو حضرت شیخ محمد سراجؒ جنیدی سے خاص عقیدت تھی۔

علاؤالدین حسن گنگو کے نسب نامہ پر جو بہمن بن اسفندیار سے ملایا گیا ہے مورخ اعتبار نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ خوشامدیوں نے اُسے عالی نژاد بنانے کے لیے بہمن کی نسل سے ملا دیا ہے۔ درحقیقت وہ ایک برہمن کا نوکر تھا اور اُس کے احسان کے باعث اپنے آپ کو بہمنی سے ملقب کیا کرتا تھا، مگر میری تحقیق میں یہ غلط ثابت ہوا ہے۔ اور بہمنی کہلانے کی وجہ تسمیہ علاؤالدین حسن کا بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں ہونا ہے۔ کیونکہ ان تمام تواریخ[1] میں جو خاص عہد بہمنیہ میں لکھی گئی ہیں بہمنی کہلانے کی یہی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔ اسکے علاوہ سلطان علاؤالدین بن احمد شاہ دوم بن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانے کے کتبہ[2] میں اس نے اپنے کو بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں لکھا ہے۔ اور کتبہ کی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے۔ "من آل بہمن بن اسفندیار الخ" اس کے علاوہ ایک دوسرا کتبہ[3] خود علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کے زمانے کا ہے۔ جس میں اُس نے اپنے کو بہمن شاہ لکھا ہے۔ پس ان دونوں کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمن بن اسفندیار کی نسل سے ہے اور بہمنی کہلانے کی یہی وجہ ہے۔ کتبات بہ نسبت تاریخوں کے زیادہ معتبر ہوا کرتے ہیں کیونکہ یہ خود بادشاہ وقت کے کندہ کرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کے اصلی ماخذ کتبات ہی ہوا کرتے ہیں پس بہمنی کہلانے کی وجہ اس کے سوا اور کوئی دوسری نہیں ہوسکتی یہ بہت ممکن ہے کہ حسن غربت کی وجہ سے ہندوستان آکر برہمن منجم مسمی گنگو کا ملازم ہوا ہوگا اور فرشتہ کی روایت کے

---

[1] تحفۃ السلاطین، بہمن نامہ دکنی، سراج التواریخ اور عیون التواریخ آجکل موجود نہیں ہیں۔ لیکن ہفت اقلیم برہان المآثر اور طبقات اکبری اور فرشتہ نے ان کے حوالے دیئے ہیں۔

[2] اس کتبہ کا نصف حصہ فارسی اور نصف سنسکرت عبارت میں ہے۔ دونوں عبارتوں کا مفہوم ایک ہی ہے یہ ۸۴۸ھ بعہد سلطان علاؤالدین احمد شاہ دوم بن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کا ہے۔ یہ ایک زمانے تک سلطان مذکور کے گنبد واقع ضلع بیدر میں رکھا رہا، اس کے بعد قلعہ بیدر میں رکھا گیا۔ اب نمائش گاہ باغ عامہ میں رکھا ہوا ہے۔

[3] یہ کتبہ سلطان علاؤالدین حسن بہمنی نے اپنی تیار کرائی ہوئی مسجد واقع گلبرگہ میں نصب کرایا تھا۔ آجکل یہ باغ عامہ کی نمائش گاہ میں رکھا ہوا ہے، اور یہ نہایت خوشخط فارسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

بموجب اس نے برہمن کے احسان و وعدہ کے باعث لفظ گنگو کا اضافہ اپنے نام کے ساتھ کیا ہوگا اور یہی گنگو کہلانے کی وجہ تسمیہ ہوسکتی ہے، نہ کہ بہمنی کہلانے کی جیسا کہ مراۃ العالم کے مولف نے بیان کیا ہے۔

جب محمد تغلق[1] نے دکن پر چڑھائی کی تو حسن بھی ہمراہ تھا اور جب محمد تغلق واپس ہوا تو اپنے استاد قتلق خاں کو حاکم دولت آباد مقرر کیا۔ محمد تغلق نے عام حکم دیا کہ امیروں اور منصبداروں میں جس کسی کا جی چاہے قتلق کے ساتھ دکن میں قیام کرے۔ حسن کی مراد بر آئی اور اس نے بعض یکصدی امیروں کے ساتھ جو سب کے سب اس کے دوست اور آشنا تھے قتلق خاں کی رفاقت اختیار کی اور دکن ہی میں رہنے لگا۔ بادشاہ نے حسن کو قریۂ کونجی اور رائے باغ وغیرہ جاگیریں عنایت کیے۔ دکن میں حسن نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر لکھی جاچکی ہے۔

جمعہ ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ م ۱۳۴۷ء کو دولت آباد میں قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی مسجد میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی رحمتہ اللہ علیہ نے حسن کو تخت نشین فرمایا۔ اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور تاج زریں پہنا کر چتر سیاہ تبرکاً بطور لوازمہ شاہی سر پر لگایا کیونکہ حضرت شیخؒ نے اس سیاہ چتر کو خلفائے عباسیہ کا نشان سمجھ کر پسند فرمایا تھا۔

حسن نے گلبرگہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ گنگو برہمن نے جب حسن کے بادشاہ ہونے کی خبر سنی تو شہنشاہ ہند کی ملازمت ترک کرکے حسن کے پاس آیا۔ حسن نے اس کو اپنے پاس محاسب کی خدمت دی۔ پنڈت گنگو پہلا برہمن تھا جس نے مسلمانوں کی نوکری دکن میں اختیار کی اور یہ طریقہ ۱۰۱۶ھ تک جاری رہا کہ شاہان دکن کے محاسب کی خدمت برہمنوں ہی کو ملتی رہی۔

حسن نے اپنی حسن تدبیر سے حکمرانی کی اور زور شمشیر سے بہت سے قلعے فتح کیے۔ ایک مہم کرناٹک کی طرف بھیجکر اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اہل گجرات محمد تغلق کے ہاتھوں تنگ تھے انھوں نے حسن کو بلوایا، مگر وہ خود نہ جاسکا، اس لیے اپنے بیٹے محمد کو روانہ کردیا۔ شہزادہ محمد گلبرگہ سے نکل کر نوساری پہنچا اور وہاں شکار کی کثرت دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ خود بھی وہیں ٹھیر گیا اور حسن کو بھی بلوایا۔ مگر حسن کو نوساری پہنچتے ہی ہیضہ ہوگیا، اور اس سے صحت پاکر اور امراض میں مبتلا ہوگیا جن کا

---

[1] فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

سلسلہ چھ مہینے تک رہا اور آخر غرہ ربیع الاول[1] ۷۵۹ھ م ۱۳۵۸ء میں سرسٹھ سال کی عمر پاکر گیارہ سال دو ماہ سات روز سلطنت کرنے کے بعد انتقال کرگیا۔

علاوالدین حسن کے انتقال کے وقت مرہٹواڑی، تلنگانہ اور کرناٹک کے مختلف حصے سلطنت بہمنیہ میں شامل تھے، جس پر ہندو راجاؤں کا تسلط تھا۔ سلطان محمد تغلق کے آخری زمانے میں اس کے امیروں کے ہاتھ میں دکن کے جس قدر ممالک تھے، سب پر حسن نے قبضہ کرلیا تھا۔ بیدر اور قندھار کے قلعوں کے حاکموں کو ملاکران کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ کولاس اور اس کے مضافات کو ورنگل کے راجہ سے لیا۔ اس کی سلطنت کے شمال میں دریائے نربدہ تھا اور مغرب میں مغربی گھاٹ، جنوب میں دریائے کرشنا، مشرق میں گونڈوانہ کا جنگل اور تلنگانہ۔ مالوہ اور خاندیس جو دہلی کے ماتحت تھے، اب آزاد ہوتے جاتے تھے۔ بہمنی سلطنت کو یہ ہندوستان سے ملاتے تھے۔ مالوہ نربدہ کے شمال میں اور خاندیس اس کے جنوب میں تھا۔

سلطنت بہمنی کے تین طرف مغرب، مشرق اور جنوب میں ہندوؤں کی سلطنتیں تھیں۔ بہمنی رعایا بھی ہندو تھی۔ تلنگانہ اور کرناٹک کی حکومتیں جو سلطنت بہمنیہ کے مشرق اور جنوب میں تھیں اسکی سخت دشمن تھیں، آخری سلطنت جو وجیانگر (بیجانگر) کہلاتی تھی، وجیانگر (دارالحکومت) دریائے تنگ بھدرا کے کنارے حسن آباد گلبرگہ سے جنوب کی طرف ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھا اور ورنگل (دارالحکومت تلنگانہ) مشرق کی طرف اتنے ہی فاصلہ پر تھا۔ یہ ایسے بڑے مہرے تھے جن سے ہمیشہ حسن کو خدشہ لگا رہتا تھا۔ سلطان علاوالدین حسن کا رقبہ سلطنت اتنا وسیع تھا کہ ہر ضلع تقریباً تین سو مربع میل کا تھا۔

غرض علاوالدین حسن نے سلطنت کو بہت وسعت دی اور نہایت ہی بیدار مغزی کے ساتھ نئی نئی اصلاحیں کیں اور سلطنت بہمنیہ کی جڑیں اس قدر مضبوط کردیں کہ وہ دیر تک حوادثات زمانہ کا مقابلہ کرتی رہی۔ انتظام مملکت، عدالت، سیاست وغیرہ سے اسے خاص دلچسپی تھی اور وہ ہر کام نہایت ہی

---

[1] تاریخ فرشتہ میں حسن کی تاریخ وفات غرہ ربیع الاول ۷۵۹ھ لکھی گئی ہے لیکن دوسری تواریخ میں حسن کا ۵ ربیع الاول ۷۵۹ھ م ۱۰ فروری ۱۳۵۸ء کو انتقال کرنا لکھا ہے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

تجربہ کاری اور وسیع النظری سے کیا کرتا تھا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ اس نے کیسے عہدے قایم کیے تھے اور ان عہدوں پر کس قدر تجربہ کار اور موزوں اشخاص کا تقرر کیا تھا:۔

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید صدر الشریف سمرقندی	صدر عدالت	سکندر خاں	باربک
سید محمد بدخشی	قاضی عسکر	قیر خاں	کوتوال شہر
سید اسمٰعیل منج	امیر الامراء	بہرام خاں مازندرانی	شقدار صوبۂ دولت آباد
سید رضی الدین جگاجوت	معتمد وکیل سلطنت	صفدر خاں سیستانی	شقدار صوبۂ برار
ملک سیف الدین غوری	وکیل سلطنت	اعظم ہمایون	شقدار صوبۂ ورنگل
گنگو پنڈت	صدر محاسب	خان محمد بن علی شاہ	نائب شقدار صوبۂ دولت آباد
محمد اسحٰق سرہندی	صدر وقائع نگاران	بہادر خاں ابن اسمٰعیل منج	سپہ سالار
کلیم اللہ مازندرانی	سرخیل	بایزید خاں	میر بحری
ملک چھجو	شحنۂ فیل	ملک رشدو	جام دار
سید جمال الدین	خزانہ دار	فولاد خاں	توربیگی
سید احمد ہروی	مفتی	سید نور الدین	محتسب
سید نقی اصفہانی	صدر محصلین	میرزین العابدین	تمغابی کرڑوڑ

اس کے علاوہ ملک رستم پردہ دار۔ ملک قوام الدین غوری افسر خاصہ خیل۔ شیخ منہاج الدین جنیدی قاضی گلبرگہ۔ ملک الثنہ شحنہ بارگاہ و آبدار خانہ۔ خدمت عرض مکرر۔ تعمیرات وغیرہ کے لیے جائیدادیں نامزد کی گئی تھیں۔ ہفتہ میں ایکبار چہارشنبہ کو صبح سے دوپہر تک دربار عام ہوا کرتا تھا! انتظام عدالت بالکل شرعی تھا۔ ایک صدر عدالت اور اس کی ماتحتی میں کئی مفتی، محتسب، قاضی، فوجدار، داروغہ وغیرہ تھے سلطنت چار صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر ایک صوبہ کے مستقر پر دس ہزار پیادہ فوج رہتی تھی، اور پایہ تخت میں ایک لاکھ جمعیت، فوج کے لیے خاص وردی مقرر کی گئی تھی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں مساجد بنائے گئے تھے اور ہر ایک مسجد کے لیے امام، موذن اور مدرس مقرر تھے جو لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بڑی مساجد میں طلبا، کے لحاظ سے مدرسین مقرر تھے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم[1] کے لیے مدارس کا انتظام ایلچ پور۔

[1] فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا نظم اور استحکام

برار، دولت آباد اور گلبرگہ میں قایم تھا۔ ان مدرسوں میں فن سپہ گری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ محاصل بہت کم مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے زمانے میں متعدد قسم کے سکّے مثلاً ہون اور تنگہ وغیرہ رائج تھے۔ اس نے رسم ستی کو کم کر کے بند کرنے کی کوشش کی۔ دکن میں متعدد منادر بنائے، اور ان کے اخراجات کے لیے جاگیرات وقف کیں۔ برہمنوں اور پجاریوں کے لیے معاش مقرر کی۔

خود حسن کو علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ ہمیشہ علما کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ مولانا لطف اللہ سبزواری۔ ملا معین ہروی۔ مفتی احمد ہروی۔ ملا اسحٰق شیرازی۔ ملا فضل اللہ انجو (شہزادوں کی تعلیم و تربیت انھی کے سپرد تھی۔ ان کی نگرانی میں اور بھی اساتذہ مقرر تھے) ملا حکیم علیم الدین تبریزی۔ حکیم نصیر الدین شیرازی۔ صدر شریف سمرقندی۔ ملک رکن الدین غوری۔ ملک سیف الدین غوری۔ سید رضی الدین جگاجوت وغیرہ جیسے علما و حکما اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

سلطان علاء الدین حسن کے بیٹوں کی تعداد اور ان کے ناموں میں مورخوں نے اختلاف کیا ہے۔ تاریخ فرشتہ کی رو سے اس کے تین بیٹے محمد، محمود اور داؤد تھے۔ اور برہان المآثر کی رو سے محمد، محمود خاں اور احمد خاں تھے۔ اختلاف صرف ایک کے نام میں ہے۔ فرشتہ، داؤد شاہ کہتا ہے اور اسی کا نام برہان المآثر کے مولف نے احمد خاں لکھا ہے۔ ہفت اقلیم کے مولف نے اس کے صرف دو بیٹے محمد شاہ اور محمود خاں ہونا لکھا ہے، اور داؤد شاہ کو یہ مورخ محمود خاں کا بیٹا اور علاء الدین حسن کا پوتا بتاتا ہے۔ اور برہان المآثر نے بھی اپنی تحقیق میں اس کے چار بیٹے محمد، محمود خاں، داؤد شاہ اور احمد خاں ہونا ظاہر کیا ہے۔[1]

سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان محمد شاہ بہمنی ۷۵۹ھ م ۱۳۵۸ء میں تخت نشیں ہوا۔ دکن کے کل مشائخین نے اس بادشاہ سے بیعت کی لیکن حضرت شیخ زین الدین قدس سرہ نے اس وجہ سے کہ سلطان شراب خوار تھا بیعت نہیں کی اور بادشاہ کے کہلا بھیجنے پر بھی انھوں نے بیعت سے صاف انکار کیا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر شیخؒ کو شہر بدر ہونے کا حکم دیا مگر چند دن کے بعد شیخؒ جیسے مقدس بزرگ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے سے بہت نادم ہوا۔

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔

سلطنت بہمنیہ قیام اور استحکام

اور معذرت تحریری روانہ کی جس میں یہ فقرہ بھی لکھا ہوا تھا "من زآن تو ام تو زآن من باشی" شیخ نے لکھا کہ "اگر تو سلطان محمد شاہ غازی شریعت محمدی کا تابع اور ممالک محروسہ کے شراب خانے اٹھادے اور خود مے نوشی ترک کرے اور آبائی طریقے پر چلے تو زین الدین فقیر سے زیادہ کوئی تیرا دلی دوست نہ ہوگا" جب یہ تحریر بادشاہ نے دیکھی تو شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے اُس کو "سلطان غازی" لکھنے پر وہ بہت خوش ہوا اس وقت سے اپنے نام میں لفظ "غازی" زیادہ کیا۔ اس نے شریعت کی ترویج میں بڑی کوشش کی۔ ملک میں شراب فروشی کی دوکانیں بند کرادیں اُس کے بعد نہایت عیش اور کامرانی کیساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ یہ بادشاہ عقیل، شجیع، فیاض اور اولوالعزم تھا سپاہ و رعایا کے ساتھ بہت ہی خلق و مروت سے پیش آتا تھا اس نے اپنی سلطنت کے چار صوبے کیے گلبرگہ۔ دولت آباد۔ تلنگانہ۔ برار اور ہر حصہ پر ایک ایک طرفدار بعطائے خطاب مقرر کیا اس بادشاہ نے اپنے عہد میں سونے کے سکے چلائے جس کے ایک رُخ پر کلمہ طیبہ کے ساتھ چار یاروںؓ کے اسمائے پاک اور دوسرے رُخ پر بادشاہ کا نام اور سن جلوس مسکوک تھا۔ یہ اپنے باپ کے نقرئی[1] تخت پر جلوس کرتا تھا مگر بعد میں ایک آبنوس طلا کار تخت پر جلوس کرنے لگا جس کو رائے تلنگ نے خاص طور پر بنوا کر اس کے پاس روانہ کیا تھا۔ یہ تخت تخت فیروزہ کے نام سے دکن میں مشہور ہوا اس نے راجگان وجیانگر و رایان تلنگ وغیرہ سے بڑی بڑی جنگیں کیں اور ہمیشہ فتحیاب رہا۔ سب سے پہلے اس بادشاہ نے در دولت پر نوبت مقرر کی اور پانچ وقت نوبت نوازی ہونے لگی جس کا رواج اب تک دکن میں ہے۔ ہر جمعہ کو صبح سے دوپہر تک دربار عام کیا کرتا تھا۔ اور ہر ایک شخص کی شکایات سُنتا تھا اس نے قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کر کے حسب ذیل خدمات قایم کی تھیں:۔

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
ملک سیف الدین غوری	وکیل سلطنت ملک نائب	عیسیٰ خاں	افسر میسرہ

---

[1] علاء الدین حسن بہمن شاہ کا بنوایا ہوا نقرئی تخت فیروز شاہ کے عہد میں مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ اور تخت فیروزہ سو برس تک خاندان بہمنیہ میں رہا ۔ تمام بہمنی سلاطین اُسی پر بیٹھا کرتے تھے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام، استحکام

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
بایزید خاں سیستانی	افسر خاصہ خیل	محمود افغان	افسر سلحداران
بہادر خاں بن اسمٰعیل منح	امیر الامراء	محمد اسمٰعیل ناعطہ	داروغہ جواہر خانہ
کلیم اللہ خاں مازندرانی	افسر جوانان یکہ	سید جلال حمید	مصاحب
مقرب خاں بن صفدر خاں سیستانی	میر آتش	ملک محمود	خوان سالار
سید شریف سمرقندی	صدر	ملا محمد بن معین الدین بیجاپوری	مفتی عسکر
شاہ ملک غوری	مصاحب	موسیٰ خاں افغان	افسر میمنہ
ملا محمد مشہدی	میر ساماں	....	....

ملکۂ جہاں، والدۂ سلطان محمد شاہ نے جب حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو بادشاہ نے چاہا کہ باپ کا جمع کیا ہوا خزانہ ملکۂ جہاں کے ہمراہ روانہ کرے تاکہ وہ وہاں فقراء اور مساکین کو خیرات کر دیا جائے۔ لیکن امراء نے عرض کی کہ شہنشاہ دہلی اس ملک کو لینے کی فکر میں ہے، پس اخراجات فوج اور تحفظ مملکت کیلیے بادشاہوں کو خزانہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن بادشاہ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ خدا کی راہ میں دینے کی نیت سے نکالا ہوا روپیہ پھر داخل خزانہ ہو۔ اس نے امراء سے کہا کہ میرے باپ کو بیدگنج وحشم یوں ہی خداوند کریم نے دیا، ایسی بڑی سلطنت عطا کی، اگر وہ چاہے گا تو مجھے بھی اس سے زیادہ دولت عطا کرے گا۔ آخر ملکہ کو خزانۂ کثیر کے ساتھ روانہ حج بیت اللہ کیا، اور جب وہ حج سے فارغ ہوکر اور خزانہ کو فقراء و مساکین میں تقسیم کر کے واپس آئی تو اس مسرت و انبساط کے اظہار میں اس نے جشن منایا۔ آخر سترہ سال نو ماہ پانچ یوم کی سلطنت[1] کے بعد ۹ ذیقعدہ ۷۶۲ھ م ۱۲ مارچ ۱۳۷۵ء کو اس اقبالمند، جنگجو، غیور، فاتح، حق پسند، فقیر دوست، حامی شریعت سلطان محمد شاہ بہمنی نے انتقال کیا۔ اس کے خزانے[2] میں جس قدر مال و اسباب تھا، اور اس کے عہد میں جس قدر ہاتھی تھے،

---

[1] یہ مدت سلطنت، فرشتہ نے لکھی ہے۔ لیکن برہان المآثر (نسخہ مولوی عبدالحق صاحب) سے اس بادشاہ کا اٹھارہ سال سات ماہ حکومت کرنا ثابت ہوتا ہے۔

[2] اس واقعہ کو مولف تاریخ فرشتہ نے سراج التاریخ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

سلاطین بہمنیہ میں سے کسی کے عہد میں نہیں رہے۔ دوسرے بادشاہوں کے عہد میں دو ہزار سے زیادہ ہاتھی نہیں تھے۔ اس کے پاس تین ہزار تھے خزانہ تو اتنا تھا کہ اس کے خاندان کے دوسرے بادشاہوں کے پاس اس کا نصف بھی کبھی نہیں جمع ہوا کرناٹک کا ملک جیسا اس کے ہاتھوں مغلوب ہوا، ایسا دہلی اور بہمنی سلطنت کے کسی بادشاہ سے نہ ہو سکا۔

سلطنت ب قیام اور

محمد شاہ کے دور حکومت میں ہندوؤں سے جنگ و جدال اور ان کا کشت و خون نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن اس کو محمد شاہ کے دامن پر بدنما داغ نہیں کہا جا سکتا۔ لڑائی کی چھیڑ چھاڑ پہلے محمد شاہ کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوؤں کی طرف سے ہوئی۔ بعد میں بھی ہندوؤں نے عداوت و دشمنی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جب ان کو موقع ملا انھوں نے سلطنت بہمنیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، یہ محمد شاہ کا اقبال اور اس کی شجاعت اور اس کا تدبر تھا کہ وہ اپنے دشمنوں کے ہر وار سے محفوظ رہا اور ان کو جرائم کی خاطر خواہ سزا دینے میں کامیاب ہوتا رہا۔ پھر بھی جب اس کے دشمن زیر ہو گئے تو اس نے مدت العمر کے لیے تلوار نیام میں کر لی۔ محمد شاہ کی زندگی کے آخری ایام اس بات کے زبردست شاہد ہیں۔

باوجودیکہ سلطنت بہمنیہ کی ابتدا تھی اور سلطان محمد شاہ اس خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا پھر بھی اس کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ تعجب ہوتا ہے۔ تلنگانہ اور بیجانگر کو جو اس کے خونخوار دشمن تھے انتہائی طور پر مغلوب کر لیا۔ مال و خزانہ کے اعتبار سے اس درجہ سلطنت کو ترقی ہوئی جس کی مثال اس کے خاندان میں نہیں ملتی جس طرح بیرونی دشمنوں کی سرکوبی میں حیرتناک کامیابی ہوئی اسی طرح اندرونی مفسدوں کی سرزنش میں بھی تعجب خیز طور پر کامیاب ہوا۔ بیجانگر کے سفیروں کی التماس پر اس نے جو عہد کیا کہ آیندہ کسی جنگ میں فتح کے بعد کسی ہندو کو قتل نہ کیا جائے گا اور حضرت شیخ زین الدین رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحتوں اور ہدایتوں پر اس نے جس طرح تعمیل کی اس سے محمد شاہ کی حق پسندی اور فقیر دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

محمد شاہ بہمنی کی حیرتناک جرات و دلیری اگرچہ اس کی زندگی کے ہر واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے لیکن دو موقعے ایسے ہیں جو اس کو بہت ہی بڑا دلیر اور غیر معمولی دل و دماغ کا بادشاہ ثابت کرتے ہیں ایک تو وہ موقع کہ جب تمام اُمرا اس کے خلاف ہو گئے تھے، اور قریب کے ہندو راجاؤں کو محمد شاہ کا نیست و نابود کر دینا آسان ہو گیا تھا، اس وقت محمد شاہ کا ثابت قدم رہنا اور حکمت عملی سے انتظام درست کر لینا اور اپنے امیروں کی شرارت سے سراسیمہ نہ ہونا، اُس کے عزم و استقلال کی علامت تھی اور راجاؤں کے سفیروں کو

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

ٹال دینا اور پہلے اپنے گھر کا بند و بست کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ محمد شاہ کے اندر غیر معمولی عقل اور مدبری کے اوصاف موجود تھے، ورنہ ایسے نازک وقت میں بڑے بڑے ہمت والے گھبرا جاتے ہیں اور پریشانی کے سبب بے سرو پا تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔

دوسرا واقعہ سب سے زیادہ نازک وہ تھا جب محمد شاہ نو ہزار آدمیوں کو لیکر نو لاکھ پیادوں اور تیس ہزار سواروں کے مقابلے کے لیے گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ نو لاکھ اور نو ہزار میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، اور خاصکر ایسی حالت میں کہ آس پاس کے سب ہندو راجہ پرخاش پر آمادہ تھے یہ محمد شاہ ہی کا دل تھا جو اتنی سی فوج لیکر اس نے ٹڈی دل دشمنوں پر حملہ کیا اور فتح پائی۔ خود ہندوؤں کو بھی اس پر تعجب تھا کہ اتنی بڑی تعداد ہندو لشکروں کی اتنے کم مسلمانوں سے کیونکر مغلوب ہوگئی، اور ایسے فتحیاب ہوئے کہ ہندوؤں کی تمام قوتیں پامال کردیں۔

بہرحال محمد شاہ کی یہ غیر معمولی قابلیت بہمنیہ سلاطین کے دور اول میں خاص طور پر قابل توجہ ہے اور ایسی نہیں ہے جس کو نظر انداز کیا جائے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی نے ایک بیٹا مجاہد شاہ اور ایک بیٹی روح پرور آغا چھوڑی۔

سلطان محمد شاہ بہمنی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا، ملک سیف الدین غوری کا نواسا سلطان مجاہد شاہ ۷۷۶ھ م ۱۳۷۵ء میں تخت نشیں ہوا۔ یہ بادشاہ قوی ہیکل، تنومند اور شجاعت میں بینظیر تھا۔ اس کو شاہ بلونت بہمنی بھی کہتے ہیں۔ راجہ وجیانگر سے اس نے جنگ کی اور اس کو شکست دی۔ اس کے قتل کے متعلق متعدد روایتیں مشہور ہیں۔ تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ حبشی اور اُمراء اکثر اس سے ناخوش رہا کرتے تھے، وجیانگر کی فتح کے بعد جبکہ وہ گلبرگہ کے باہر مقیم تھا، ایک رات حبشیوں نے موقع پاکر اس کو قتل کردیا۔ فرشتہ اور ہفت اقلیم کے مولفوں نے لکھا ہے کہ جس وقت وجیانگر کی جنگ میں داؤد خاں سودرہ کو چھوڑکر جہاں اس کو مجاہد شاہ نے متعین کیا تھا، میدان جنگ میں چلا آیا تو مجاہد شاہ نے اس کو غصہ میں گالی دی۔ اسی وقت سے داؤد خاں مجاہد شاہ سے ناراض رہتا تھا۔ فرشتہ کی ایک اور روایت ہے کہ ایک پہلوان مبارک نامی تھا جس کو بادشاہ نے چودہ سال کی عمر میں کشتی میں پچھاڑ کر مار ڈالا تھا۔ اس پہلوان کے بیٹے مسعود نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے داؤد خاں سے ملکر سازش کی اور

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

دونوں موقع کی تلاش میں رہنے لگے آخر، ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ م ۱۴ اپریل ۱۳۷۸ء کو جبکہ بادشاہ اپنے خیمے میں دریائے کرشنا کے کنارے سو رہا تھا جہاں وہ مچھلی کا شکار کھیلنے آیا تھا داؤد اور مسعود کچھ جوان لیکر چوکی کے بہانے سے آئے، جب آدھی رات کے وقت سب لوگ سو گئے تو داؤد خاں اور مسعود خیمے کے اندر گھسے اور مجاہد شاہ کو سوتے میں مار ڈالا ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ داؤد خاں نے اس کو تنہا مار ڈالا[له]

مجاہد شاہ تیر کمان کا بچپن ہی سے شایق تھا اس کی زبان پر تیغ و سناں ہی کا ذکر رہتا تھا فارسی کے علاوہ ترکی زبان بھی خوب بولتا تھا۔

مجاہد شاہ کی شجاعت اور جنگجوئی کے متعلق اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ اس نے تین سال تک حکومت کی اور اس عرصے میں ہمیشہ بیجانگر سے لڑتا رہا۔ حالانکہ اس وقت مجاہد شاہ کا حریف بیجانگر وسعت ملک اور کثرت فوج کے اعتبار سے سلطنت بہمنیہ سے کہیں قوی تھا۔ صدہا برس سے کرشن راؤ کے خاندان میں حکومت تھی اور اس خاندان کے تمام فرمانروا خاص طور پر خزانہ جمع کیا کرتے تھے، اس لیے دولتمندی میں تو سلطنت بیجانگر اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہمپایہ تھی سیلون، ملیبار اور دوسری بندرگاہوں اور جزیروں کے فرمانروا کرشن راؤ کے پاس اپنے سفیروں کے ذریعہ تحائف اور ہدایا بھیجکر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے تھے مگر ایسے زبردست حریف کو مجاہد شاہ کا شکست دینا بڑا کارنامہ ہے۔

جس وقت مجاہد شاہ مارا گیا تو ملک میں فتنہ و فساد کھڑا ہوا بعض لوگ چاہتے تھے کہ سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کا چھوٹا بیٹا محمود شاہ بادشاہ ہو بعض یہ چاہتے تھے کہ داؤد شاہ کو بادشاہ بنائیں۔ آخر کار ملک سیف الدین غوری کی کوشش سے داؤد شاہ بہمنی تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔

مجاہد شاہ بہمنی کی بہن روح پرور آغا بھائی کے خون کے انتقام کی فکر میں رہتی تھی آخر اس نے

له۔ داؤد شاہ کو ہفت اقلیم اور برہان ماثر نے علاؤالدین کا پوتا لکھا ہے، مگر مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی حواشی تاریخ فرشتہ جلد سوم ترجمہ اُردو میں تحریر فرماتے ہیں کہ برہان ماثر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ سکوں اور دوسری تمام تاریخوں سے فرشتہ کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ سر ولزلی ہیگ کی بھی یہی رائے ہے کہ داؤد شاہ سلطان علاؤالدین کا بیٹا تھا۔

ہت بہمنیکا ر استحکام

"باکہ" نامی ایک شخص سے سازش کرکے داؤد شاہ کو بروز جمعہ بتاریخ ۲۱ محرم ۷۸۰ھ م ۱۹ ارمئی ۱۳۷۸ء جامع مسجد میں عین نماز میں سجدے کے وقت قتل کرادیا۔ اس بادشاہ نے صرف ایک ماہ پانچ یوم حکومت کی۔

داؤد شاہ بہمنی کے مقتول ہونے کے بعد مسند عالی محمد خاں، داؤد شاہ کے بیٹے محمد سنجر کو جو نو برس کا تھا تخت نشین کرنا چاہتا تھا مگر مجاہد شاہ کی بہن روح پرور آغا نے کہا کہ ایسے ظالم کا بیٹا جس نے میرے بھائی کو قتل کیا کبھی بادشاہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اور اسی کی کوشش سے اکابر و عمائد سلطنت نے محمد شاہ بہمنی[1] کو اپنا بادشاہ بنایا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اُس نے ملک سیف الدین غوری کو وکیل السلطنت۔ بہادر خاں افغاں کو امیر الامراء۔ صفدر خاں سیستانی کو طرفدار برار۔ اعظم ہمایوں کو طرفدار تلنگانہ۔ میر فضل اللہ انجو شاگرد علامہ سعد الدین تفتازانی کو صدر، ملا محمد قاسم مشہدی کو میر ساماں۔

---

[1] برہان ماثر، ہفت اقلیم اور تذکرۃ الملوک میں اس بادشاہ کا نام محمد بن محمود خاں لکھا ہے، اور فرشتہ نے محمود شاہ بہمنی بن سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی لکھا ہے۔ فرشتہ نے دکن کے حالات خاص اہتمام سے کئی مستند اور قدیم تاریخوں کو سامنے رکھ کر تحریر کیے ہیں اور اس کی اکثر روایات بہ نسبت اور کتابوں کے باوقعت ہیں لیکن اس معاملے میں فرشتہ کا قول غلط معلوم ہوتا ہے۔ ڈورڈ ٹامس نے اس بہمنی بادشاہ کے ایک سکّے کی تصویر اپنی کتاب میں دی ہے، اس کے دو جانب یہ عبارت نقش ہے۔ "الواثق بتائید الرحمٰن ابو المظفر محمد شاہ سلطان ۷۹۷۔ الناصر لدین الانان (المنان) الحامی لاہل الایمان"۔ بایں ہمہ یہ محتاط مورخ فرشتہ کے قول سے انکار نہیں کرتا اور اس نے سلاطین بہمنیہ کی فہرست میں پانچویں بادشاہ کا نام محمود شاہ بن علاؤ الدین ہی تحریر کیا ہے (کرانیکل صفحہ ۳۴۱) محکمہ آثار قدیمہ سرکار عالی کے ذخیرے میں شاہان بہمنی کے سکّے موجود ہیں اور ان میں سلطان محمد بن محمود کے صحیح نام اور سنہ و مقام ضرب کے چھ سکّے محفوظ ہیں۔ پس فرشتہ کی یہ روایت غلط ہے۔ اور اس بہمنی خاندان کے پانچویں بادشاہ کا صحیح نام سلطان محمد (ثانی) ابن محمود خاں ہی تھا۔ (از حواشی تاریخ فرشتہ جلد سوم) میں نے بھی محکمہ آثار قدیمہ کے سکّے دیکھے ہیں۔ ان میں اس بادشاہ کا سکّہ موجود ہے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

بہاء الدین ولد رمضان دولت آبادی کو حاکم ساغر۔ خواجہ مقرب ولد بہاء الدین دولت آبادی کو مقرب۔ محمد ولد بہاء الدین دولت آبادی کو مقرب۔ سید محمد المخاطب بہ کالا پہاڑ کو امیر صدہ۔ یوسف ازدر کو سرلشکر بنایا۔ ملک سیف الدین غوری کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔

اس بادشاہ کے آخر عہد میں صرف ساغر کے حاکم بہاء الدین اور اس کے بیٹوں نے بغاوت کی اور وہ قتل ہوئے۔ اس کے سوا سلطنت میں کسی کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا۔ اور راجہ بیجانگر بھی رائچور وغیرہ کے دعوے سے دست کش ہو کر خوشی سے خراج ادا کرتا رہا۔

یہ بادشاہ نہایت سلیم الطبع، خوش خلق، عادل اور شرع شریف کا پابند تھا۔ اس نے سوائے ایک بیوی کے دوسری بیوی نہیں کی، صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا۔ قرآن مجید بہت اچھی طرح پڑھتا تھا، بہت بڑا خوشنویس اور شاعر تھا۔ عربی، فارسی زبان نہایت صحت کے ساتھ بولتا تھا۔ علم و ہنر کا شایق اور عالموں کا قدرداں تھا۔ چنانچہ اس نے خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کو شیراز سے بلوایا، کشتی محمودی دکن سے اُن کے لانے کے لیے روانہ کی، مگر جب وہ کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو بادِ مخالف سے کشتی ڈگمگانے لگی، حافظ صاحب نے گھبرا کر روانگی ترک کر دی اور حسب ذیل غزل لکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ میں روانہ کی۔

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بہ مے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

بہ کوئے مے فروشانش بہ جائے بر نمی گیرند
زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہِ دلکش است اما بدردِ سر نمی ارزد

رقیبم سرزنشہا کرد کزیں باب رخ برتاب
چہ افتاد ایں سر ما را کہ خاکِ در نمی ارزد

ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقاں بپوشانی
کہ سودائے جہاں داری غمِ لشکر نمی ارزد

بشو ایں نقش دلتنگی کہ در بازار یک رنگی
بنعمتہائے گوناگوں مئے احمر نمی ارزد

دیار دیار مردم را مقید میکند لیکن
بہ جائے پارسی کیں محنت جہاں یکسر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غمِ دریا بہ بوئے سود
غلط گفتم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

برو گنجِ قناعت جو بکنج عافیت بنشیں
کہ یکدم تنگدل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر
کہ یک جو منت دوناں بصد من زر نمی ارزد

لہ۔ فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

سلطان نے جب یہ غزل سُنی تو ایک ہزار سکۂ طلائی حضرت حافظ علیہ الرحمتہ کے پاس روانہ کیے اس بادشاہ کو جنگ و جدال سے نفرت تھی علم و ہنر کی ترقی کا اس کو بہت خیال تھا اس نے مدارس قایم کیے۔ مسجدیں بنوائیں۔ رفاہِ عام کے بہت سے کام کیے بڑی داد و دہش کے ساتھ بعیش و کامرانی سلطنت کی سپاہ و رعیت اس بادشاہ سے بہت خوش تھی۔ اپنے چچا احمد خاں مرحوم کے جو دو صغیر سن لڑکے فیروز خاں اور احمد خاں تھے اُن کی اس نے پرورش کی، اور عالموں سے ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں کو بیاہ دیں آخر انیس[۱] سال نو ماہ بیس[۲] یوم حکومت کرنے کے بعد تپ محرقہ سے بتاریخ ۲۱ رجب ۷۹۹ھ م ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء اس نے رحلت کی۔

سلطان محمد شاہ ثانی بہمنی کے بعد اس کا بڑا بیٹا غیاث الدین[۱] سترہ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا ایک ترکی غلام تغلچین نے وزارت کی خواہش کی۔ غیاث الدین نے اس بنا پر اس کی خواہش رد کر دی کہ لوگوں میں بہت سے سادات بھی ہوتے ہیں، ایک غلام کو ان پر حاکم بنانا مناسب نہیں ہے تغلچین غیاث الدین کے نقصان کے درپے ہو گیا۔ تغلچین کی بیٹی بڑی حسین و جمیل اور ہندی فن موسیقی کی ماہر تھی۔ اس نے نوعمر بادشاہ کو اپنے دام میں پھنسا لیا اس کے ذریعہ سے غلام تغلچین نے بادشاہ کو دعوت میں بلایا اور عیاری سے تنہائی میں لیجا کر اس کی آنکھیں نکال دیں اس کی مدت سلطنت صرف ایک ماہ بیس یوم رہی۔

سلطان غیاث الدین کے نابینا ہونے کے بعد اس کا چھوٹا بھائی شمس الدین[۲] پندرہ سال[۳] کی عمر میں تخت شاہی پر بیٹھا۔ تغلچین ملک نائب اور امیر الاُمرا بنا۔ شمس الدین کی ماں لونڈی تھی۔ اس کا لقب مخدومۂ جہاں رکھا۔ تغلچین نے مخدومۂ جہاں کو ملا رکھا جو برابر شمس الدین کو تغلچین کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی تاکید کرتی رہتی تھی سب اُمرا نے اس کی اطاعت قبول کی لیکن فیروز خاں اور احمد خاں جو احمد خاں مرحوم کے بیٹے تھے شمس الدین اور تغلچین کے مخالف ہو گئے اور غیاث الدین کا بدلہ لینے کے درپے ہوئے، اور گلبرگہ پر فوج کشی کی جس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد اُمرا کے

[۱و۲] برہان ماثر ہفت اقلیم اور تذکرۃ الملوک۔

[۳] فرشتہ۔ لیکن برہان ماثر نے اس بادشاہ کی عمر سات سال لکھی ہے۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

ایما سے ایک روز فیروز خاں نے محل میں گھسکر دونوں کو پابزنجیر کیا[1] اور باہر آکر باتفاق ارکان دولت تخت فیروزہ پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ واقعہ ۷ رمضان ۷۹۹ھ م ۱۳۹۷ء کا ہے۔ ہفت اقلیم کے مولف نے لکھا ہے کہ فیروز شاہ نے چند روز کے بعد شمس الدین کو قتل کردیا لیکن فرشتہ کا بیان ہے کہ ان واقعات کے بعد شمس الدین اور اس کی ماں، فیروز شاہ کی اجازت سے مدینۂ طیبہ ہجرت کرکے چلے گئے۔ جہاں شمس الدین ۸۱۶ھ میں مرگیا۔ پانچہزار فیروز شاہی اشرفیاں اور دوسری چیزیں سالانہ دکن سے شمس الدین کے لیے بھیجی جاتی تھیں۔

۸۰۰ھ م ۱۳۹۷ء میں سلطان شمس الدین کو معزول کرکے فیروز شاہ[2] باتفاق ارکان دولت تخت نشین ہوا، اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا اپنے بھائی احمد خاں[3] کو خانخاناں کا خطاب دیکر امیر الأمراء، مولانا میر فضل اللہ انجو شیرازی کو وکیل السلطنت۔ مولانا لطیف اللہ شیرازی کو نائب وکیل السلطنت۔ راجہ سدھو، حاکم ساغر کو سپہ سالار، قاضی محمد سراج حسن آبادی کو امیر صدہ۔ مولانا تقی الدین، داماد میر فضل اللہ انجو کو میر سامان، مولانا میر غیاث الدین بن میر فضل اللہ انجو کو صدر۔ میر شجاعت خاں، میر دلاور خاں، رستم خاں اور بہادر خاں کو امیران صدہ شمس اللہ دین محمد انجو، صدر جہاں (داماد بادشاہ) کو طرفدار دولت آباد۔ محمد صلابت خاں بن صفدر خاں سیستانی کو طرفدار برار۔ ملا اسحق سرہندی کو مصاحب بادشاہ۔ ملا داؤد بیدری کو مورخ کتابدار۔ مولانا حسن گیلانی مہندس اور مولانا سید محمد گازرونی کو مصاحب۔ شیر خاں خواہرزادہ کو سلحدار۔ ہشیار عین الملک اور بیدار نظام الملک کو طرفدار۔ محمد منہاج جنیدی، شاہ کمال کشمیری اور سید محمد بن مولانا عین الدین بیجاپوری کو بزرگ دعاگو مقرر کیا۔ ان اُمراء کے علاوہ بہت سے مشایخ و قضاۃ و علماء، و شعراء، و حکماء و شحنہ بارگاہ دربار میں حاضر تھے۔

سلطان فیروز شاہ[4] شرع کا پابند اور کریم النفس تھا صوم و صلواۃ کا پابند اور روزانہ

---

[1] ۔ فرشتہ۔

[2] ۔ اس سلطان کی ولدیت کے متعلق احمد شاہ ولی بہمنی کے بیان میں مفصل بحث کیجائے گی۔

[3] ۔ ۸۳ و ۸۴۔ فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

قرآن شریف کا پاؤ پارہ نقل کرکے معاش پیدا کرتا تھا۔ فرائض کے علاوہ متبرک دنوں میں اکثر روزے رکھتا، اور نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ عدل[1] و انصاف میں بھی اس نے بہت نام پایا۔ اگرچہ وہ رقص و سرود[2] کا دلدادہ اور عیاش تھا، مگر ان افعال سے وہ خود نادم بھی رہتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ گانا مجھ کو یادِ الٰہی میں مشغول کرتا ہے، اور شراب میرے نفس میں کوئی فساد پیدا نہیں کرتی جس سے اُمید ہے کہ خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اس کا رجحان طبع زیادہ تر علم و ہنر کی طرف تھا۔ دوسرے علوم کے علاوہ تفسیر، اصول، حکمت طبعی و نظری کا ماہر تھا، اور صوفیوں کے اصطلاحات سے بھی آگاہ تھا۔ ہفتہ میں تین روز شنبہ، دوشنبہ اور چہارشنبہ کو شرح تذکرہ ریاضی میں۔ شرح مقاصد کلام میں تحریر اقلیدس ہندسہ میں اور مطول ملا سعد الدین معانی و بیان میں درس دیا کرتا تھا۔ جس روز دن کو فرصت نہ ملتی رات کو طلباء کو پڑھاتا۔ بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ چنانچہ جس ملک کے آدمی سے گفتگو کرتا اُسی کی زبان میں کرتا تھا۔ متقدمین کے اشعار بہت یاد تھے کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا تھا۔ عروجی و فیروزی تخلص کرتا تھا۔ ایسا قوی حافظہ تھا کہ دو مرتبہ جس چیز کو سُنتا یاد کرلیتا اور اس کو کبھی نہ بھولتا تھا۔ اس کو دوسرے ملکوں کی نادر چیزوں کی فراہمی کا بڑا شوق تھا، اور اس کا قول تھا کہ کسی ملک کا بہترین تحفہ وہاں کے اہل کمال ہیں چنانچہ ارباب علم و اہل ہنر کو دور دراز ممالک سے طلب کرکے اپنے ملک میں انھیں بساتا اور توقع سے زیادہ ان کی قدر اور ان سے سلوک کرتا تھا۔

رات کو علماء، مشائخ، شعراء، قصہ گو، ندیموں کی غیر سرکاری مجلس منعقد کرتا تھا[3] جس میں خود بھی مثل دوسرے لوگوں کے شریک ہوتا اور اپنے ہمجلیسوں سے کہتا کہ جب تاج شاہی پہنکر دربار میں بیٹھتا ہوں تو مجبوراً لوگوں کے ساتھ شاہانہ شان سے پیش آتا ہوں، اگر ایسا نہ کروں تو رُعب سلطنت میں فرق آجائے اور نظام حکومت میں خلل پڑجائے لیکن تم لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو تمہیں میں کا ایک شخص اپنے کو بھی سمجھتا ہوں اس لیے جس طرح بے تکلفی کے ساتھ تم آپس میں ہنستے اور باتیں کرتے ہو میرے ساتھ بھی بولا کرو تاکہ مجھے شاہی اور غیر شاہی دونوں طرح کے لطف حاصل ہوں"۔

---

[1] ۔ ہفت اقلیم۔

[2,3] ۔ فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا قیام اور استحکام

اس نے اہل مجلس کو عام اجازت دے دی تھی کہ جب چاہیں آئیں اور جب چاہیں چلے جائیں اور جو چیز چاہیں بے تکلف ملازموں سے مانگ کر کھائیں پئیں۔ صرف دو باتوں کی ممانعت تھی ایک یہ کہ ایک دوسرے کی غیبت نہ کریں، دوسری یہ کہ دنیوی امُور کے متعلق کچھ نہ کہیں اس کو دربار پر موقوف رکھیں۔

اس کے زمانے میں گلبرگہ کی سلطنت، شان و شوکت اور عظمت میں بڑھ گئی اور جنوبی ہند کی سب سے بڑی سلطنت ہو گئی۔ یہ دکن کا پہلا بادشاہ تھا جس نے دستار کی شکل کا جواہرات کا جڑاؤ تاج پہنا۔ اس نے ملک کی تجارت کو بہت ترقی دی، ہر سال گوآ اور دوسری بندرگاہوں سے جہاز بھیجکر عمدہ، اور نایاب چیزیں منگواتا تھا۔

راجایانؔ وجیانگر اور رایان کرناٹک سے اس نے بڑی بڑی چوبیس جنگیں کیں سب میں فیروز ہی کو فتح حاصل ہوئی اس نے نرسنگھ والی گونڈوانہ اور دیورائے والی بیجانگر کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ اس نے یہ شادیاں دکن کی ہندو ریاستوں سے عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لیے کی تھیں لیکن دیورائے والی بیجانگر کی بیٹی کی شادی کے باوجود دلوں میں شکر رنجی زیادہ ہو گئی اور جنگیں بجائے نہ ہونے کے زیادہ ہو گئیں۔

اس کے محلؔ میں متعدد ملکوں کی عورتیں مثلاً چرکس، ترکی، روسی، گرجی، ایرانی، خطائی، فرنگی، افغانی، گجراتی، تلنگی، بنگالی، کنڑی، مرہٹی، راجپوت، عرب وغیرہ تھیں سلطان باری باری تمام محلوں میں جاتا تھا اور سب سے اس خوبی سے پیش آتا تھا کہ سب کا خیال یہی تھا کہ سلطان سب سے زیادہ ہم کو چاہتا ہے۔ سلطان ان سب کی زبانیں جانتا تھا، اور جن کے ہاں جاتا اس کی زبان بولتا تھا۔ عرب کی عورتیں بھی اس کے محل میں تھیں۔ یہ عورتیں حجاز اور مکہ کی رہنے والیاں تھیں ان کی خدمتگار عورتیں بھی عربی زبان بولتی تھیں سلطان کو عربی زبان سے بڑی محبت تھی کسی غیر عربی بولنے والی خادمہ کو اس محل میں جانے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ یہ عورتیں جدا جدا محلوں میں رہتی تھیں دکنی محل یعنی دختر سلطان محمد شاہ بہمنی کی سب سے بڑی عزت تھی اس کے بعد عربی محل تھا اور اسی طرح ہر ایک کا درجہ تھا۔ ہر بی بی کے تین تین خادمہ ہوتی تھیں یہ خادم عورتیں اسُی ملک کی اور وہی زبان جاننے والی ہوتی تھیں جس ملک کی بی بی ہوتی تھی۔ عربی محل کی نو خادمہ تھیں۔ اس نے ندی بیما کے کنارے پر ایک خوبصورت شہر آباد کیا جس کا نام

ا؎ ۲ ہ۔ فرشتہ۔

سلطنت بہمنیہ کا استحکام اور استحکام

اس نے اپنے نام پر فیروزآباد رکھا اسی شہر میں عالیشان محلات ان عورتوں کے لیے اس نے بنوائے تھے جس میں یہ رہتی تھیں

سنہ ۸۰۱ھ م سنہ ۱۳۹۸ء[۱] میں فیروز شاہ کو خبر ملی کہ امیر تیمور اپنے کسی شہزادہ کو سلطنت دہلی پر مامور کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تمام ہندوستان پر قبضہ کرے۔ یہ خبر پاکر فیروز شاہ نے میر فضل اللہ کے داماد تقی الدین محمد اور مولانا لطیف اللہ سبزواری کو تحفے تحایف دیکر امیر تیمور کی خدمت میں بھیجا اور عرض کرایا کہ فیروز شاہ اپنے کو آپ کا مخلص اور خیر خواہ سمجھتا ہے اس لیے وہ عرض کرتا ہے کہ جب آپ دہلی کا قصد فرمائیں گے یا کسی شہزادہ کو بھیجیں گے تو وہ حاضر ہوکر ضروری خدمت انجام دے گا۔ امیر تیمور یہ سُنکر بہت خوش ہوا اور کہا کہ میں دکن، مالوہ اور گجرات کی بادشاہی فیروز شاہ کو دیتا ہوں[۲] اور اس کو مجاز کرتا ہوں کہ وہ چتر اور دوسرے لوازم شاہی کا استعمال کرے۔ امیر تیمور نے اسی مضمون کا فرمان بھی صادر کیا جس میں فیروز شاہ کو اپنا فرزند اور خیر خواہ لکھا تیمور نے فیروز شاہ کیلیے خلعت اور گھوڑے بھی بھیجے۔

سنہ ۸۱۵ھ م سنہ ۱۴۱۲ء[۳] میں مخبران سعادت نشان نے فیروزآباد میں بادشاہ کے سمع مبارک میں پہنچایا کہ دہلی کی طرف سے ایک سید عالی مقام عرش احترام حضرت سید محمد گیسودراز بندہ نواز دکن میں رونق افزا ہوکر حسن آباد گلبرگہ کے اطراف میں پہنچے ہیں سلطان فیروز شاہ چونکہ ہمیشہ سے عالم و مقدس بزرگوں کی خدمت کا خواہاں رہتا تھا اس بشارت سے نہایت شاد ہوکر فیروزآباد سے حسن آباد گلبرگہ میں آیا اور جمیع ارکان دولت اور امراو اولاد کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور باعزاز و اکرام تمام اُن کو شہر میں لایا۔ لیکن بادشاہ حکیم طبیعت تھا جب حضرت رحمتہ اللہ علیہ کو علم ظاہری میں خصوصیت معقولات سے خالی دیکھا تو آپ کی طرف اس نے زیادہ توجہ نہیں کی برخلاف اس کے بادشاہ کے بھائی احمد خاں خانخاناں نے اعتقاد تمام حضرت سے پیدا کیا اس کا مفصل حال احمد خاں کے بیان میں لکھا جائے گا۔

اس کی مدت سلطنت پچیس سال سات ماہ پندرہ دن رہی پندرھویں شوال سنہ ۸۲۵ھ م ۱۵ ستمبر سنہ ۱۴۲۲ء کو اس کا انتقال ہوا اور یہ تاریخ وفات "جنت آشیانہ" سے نکلتی ہے۔

۱و۲و۳۔ فرشتہ۔

باب دوم

سلطان احمد شاہ ولیؔ[1] بہمنی کے حالات قبل بادشاہت

احمد خاں بہمنی کے یہ ہونہار اور بلند اقبال بیٹے سلطان محمد شاہ بن سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کے زمانے میں ۷۷۴ھ م ۱۳۷۳ء میں پیدا ہوئے آپ کا نام احمد تھا، اور فرشتہ کے قول کے مطابق آپ داؤد شاہ بہمنی کے تیسرے اور چھوٹے فرزند تھے لیکن مورخین کا اس میں اختلاف ہے کہ دراصل آپ داؤد شاہ بہمنی کے صاحبزادے تھے یا نہیں۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کے تین بیٹے محمد شاہ۔ داؤد خاں اور محمود خاں تھے۔ داؤد خاں کے تین بیٹے محمد سنجر فیروز خاں اور احمد خاں تھے اگرچہ برہان ماثر کے مولف نے بھی یہ لکھا ہے کہ حسن گنگو بہمنی کے تین بیٹے تھے لیکن فرشتہ کے اور برہان ماثر کے ناموں میں اختلاف ہے۔ برہان ماثر کی رو سے ان کے نام محمد اول محمود خاں اور احمد خاں تھے، اور محمود خاں کے دو بیٹے داؤد اور محمد ثانی تھے اس نے داؤد خاں کو سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کا پوتا لکھا ہے، اور احمد خاں بن سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کے دو بیٹے فیروز اور احمد ہونا تحریر کیا ہے۔ کتاب ہفت اقلیم کی رو سے سلطان علاءالدین حسن گنگو بہمنی کے دو بیٹے محمد شاہ اور محمود خاں تھے محمود خاں کے دو بیٹے محمد شاہ اور داؤد شاہ تھے اور محمد شاہ کے چار بیٹے غیاث الدین شمس الدین فیروز شاہ اور احمد شاہ تھے۔ اس لحاظ سے فیروز شاہ اور احمد شاہ محمد شاہ ثانی کے بیٹے ہوئے۔ تذکرۃ الملوک مولفہ رفیع الدین شیرازی نے بھی

---

[1] حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان احمد شاہ کو "ولی اللہ" مانتے ہیں اور ان کا نام نہایت تعظیم سے لیا کرتے ہیں، اس لیے میں نے بھی ان کے نام کے بجائے پورے مقالے میں لفظ "آپ" کا استعمال کیا ہے۔

احمد شاہ ولی بہمنی کے قبل بادشاہت

بارے میں صاحب برہان ماثر کی تائید کی ہے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کی رو سے سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے چار بیٹے محمد شاہ۔ داؤد شاہ۔ احمد خاں اور محمود خاں تھے۔ داؤد شاہ کا ایک بیٹا محمد سنجر تھا، اور احمد خاں کے دو بیٹے فیروز خاں اور احمد خاں تھے ان تمام تاریخوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ اور احمد شاہ دونوں حقیقی بہائی تھے اختلاف صرف ولدیت میں ہے یعنی فرشتہ نے ان دونوں کو داؤد شاہ کے بیٹے" اور ہفت اقلیم نے محمد شاہ ثانی کے" اور برہان ماثر اور تذکرۃ الملوک نے احمد خاں کی اولاد ہونا بتایا ہے۔ ان کے علاوہ بعض مورخین ایسے ہیں جو یہ تسلیم نہیں کرتے کہ فیروز شاہ اور احمد شاہ حقیقی بہائی تھے۔ فرشتہ۔ برہان ماثر۔ ہفت اقلیم اور کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے دیئے ہوئے شجرے حسب ذیل ہیں:۔

از رو ے برہان ماثر (قلمی) اور تذکرۃ الملوک

۱۔ علاء الدین حسن گنگو بہمنی
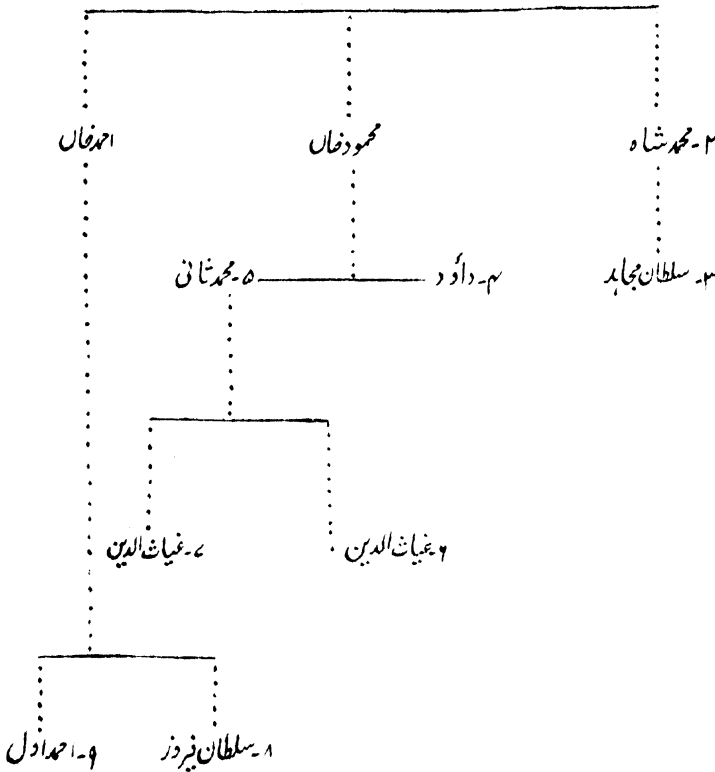
۲۔ محمد شاہ — محمود خاں — احمد خاں

۲۔ محمد شاہ ← ۳۔ سلطان مجاہد

محمود خاں ← ۴۔ داؤد — ۵۔ محمد ثانی

۵۔ محمد ثانی ← ۶۔ غیاث الدین — ۷۔ غیاث الدین

احمد خاں ← ۸۔ سلطان فیروز — ۹۔ احمد اول

ازروئے ہفت اقلیم

۱۔سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی

۲۔محمد شاہ

۳۔مجاہد شاہ

محمود خاں

۵۔محمد شاہ

۴۔داؤد شاہ

۹۔احمد شاہ

۸۔فیروز شاہ

۷۔شمس الدین

۶۔غیاث الدین
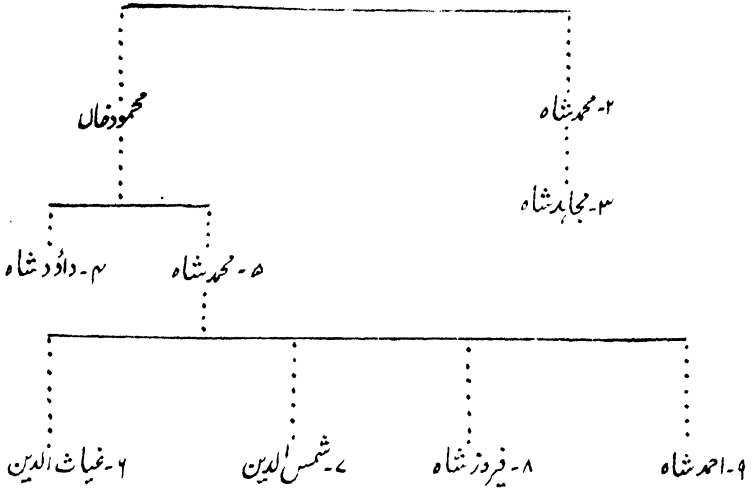
ازروئے تاریخ فرشتہ

۱۔علاء الدین حسن گنگو بہمنی

۲۔سلطان محمد اول

۳۔سلطان مجاہد شاہ

۴۔داؤد شاہ

۸۔سلطان فیروز

۹۔سلطان احمد اول

۵۔سلطان محمود اول

۶۔سلطان غیاث الدین

۷۔سلطان شمس الدین
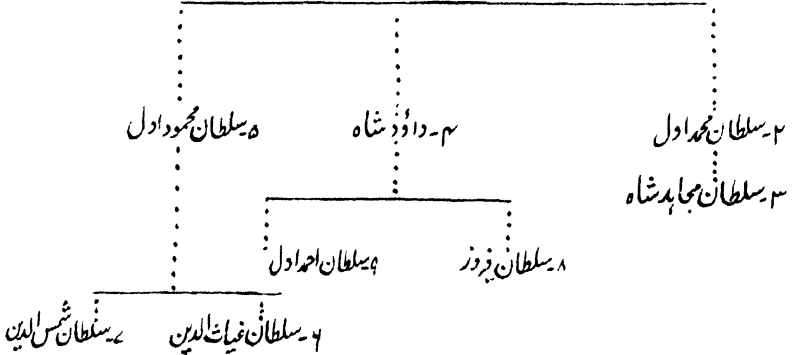
سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے حالات قبل بادشاہت

از روئے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم
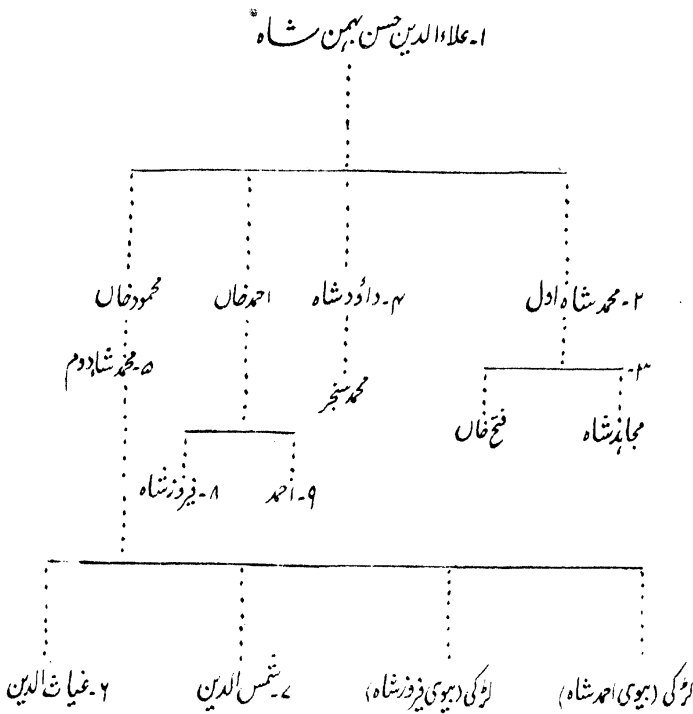
ہفت اقلیم مولفہ امین رازی سنہ ۱۰۰۲ھ کی برہان ماثر مولفہ علی مازندرانی سنہ ۱۰۰۴ھ کی اور تذکرۃ الملوک مولفہ رفیع الدین شیرازی سنہ ۱۰۱۷ھ کی تالیفات ہیں ہفت اقلیم اور برہان ماثر میں سلاطین بہمنیہ کے جو حالات درج ہیں ان کو مولفین نے عیون التواریخ سے اخذ کیا ہے۔ یہ تاریخ سلاطین بہمنیہ کے عہد میں لکھی گئی تھی اور وہ اس وقت ناپید ہے۔ تاریخ فرشتہ مولفہ حکیم محمد قاسم فرشتہ سنہ ۱۰۱۵ھ کی لکھی ہوئی ہے اس میں سلاطین بہمنیہ کے جو حالات درج ہیں ان کو مولف مذکور نے تحفۃ السلاطین، سراج التواریخ، بہمن نامہ دکن، ملحقات طبقات ناصری مولفہ مولانا شیخ عین الدین بیجاپوری، فتوح السلاطین، تاریخ محمود شاہی مولفہ ملا عبدالکریم ہمدانی سے اخذ کیا ہے۔ یہ تمام تاریخیں سلاطین بہمنیہ کے عہد میں لکھی گئی تھیں اور اس وقت ناپید ہیں۔ ہفت اقلیم، برہان ماثر کے پیش نظر صرف ایک ہی قدیم کتاب تھی اور فرشتہ نے کئی مستند اور

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی
حالات قبل بادشاہی

قدیم تاریخوں کو سامنے رکھکر سلاطین بہمنیہ کے حالات خاص اہتمام سے تحریر کیے ہیں، لیکن اس کی یہ روایت غلط ہے۔کیونکہ سررشتۂ آثار قدیمہ حیدر آباد میں[1] آپ کے زمانے کے سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ احمد بن حسن بہمنی کے بیٹے تھے۔ اور فرشتہ اور ہفت اقلیم کی روایتیں سکوں کے مقابلے میں چنداں با وقعت نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے احمد خاں سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا بیٹا تھا۔ اس کی تصدیق برہان ماثر اور تذکرۃ الملوک سے ہوتی ہے۔لہٰذا فیروز شاہ اور احمد شاہ احمد خاں کے بیٹے اور حقیقی بھائی تھے۔

کسی بڑے شخص کے بچپن کے حالات بالعموم مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ خاصکر مشرقی ممالک میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مشرقی مورخ اس طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ پرانی تواریخ سے آپ کے بچپن کے حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ صرف ہمیں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان داؤد شاہ بہمنی کی شہادت کے وقت آپ کی عمر چھ سال کی اور آپ کے بڑے بھائی فیروز شاہ کی سات سال کی تھی، اور سایہ پدری بھی آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ اور اس وقت محمد سنجر[2] بن داؤد شاہ بہمنی کی عمر نو برس کی تھی جن کو روح پرور آغا نے اندھا کر دیا تھا۔ آپ کی اور آپ کے بھائی فیروز شاہ کی پرورش و پرداخت آپ کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی بہمنی نے کی۔ آپ دونوں ذہین اور محنتی تھے۔ چچیرے بھائی نے ان دونوں کو تیر اندازی، چوگان بازی، سواری، پڑھنا، لکھنا، غرض کہ ہر شاہی فن و علم کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو جو علامہ سعد الدین تفتازانی کے شاگرد رشید تھے اور جن کے تبحر علمی کا معمولی اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ چند سلاطین بہمنیہ نے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرنے کو اپنا فخر خیال کیا تھا، ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا۔ اور علامہ شیرازی نے بڑی محنت اور محبت سے ان کو ہر فن میں ماہر بنا دیا۔ ایک عرصہ تک محمد شاہ ثانی بہمنی کے گھر بیٹا تولد نہیں ہوا، اس لیے بادشاہ نے دونوں کو اپنی دامادی میں قبول کیا، اور فیروز خاں کو اپنا ولیعہد قرار دیا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد

---

[1] سکوں کی مفصل کیفیت اور عبارت میں نے باب چہارم میں بیان کی ہے۔

[2] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم۔

شاہ ولی البہمنی کے بادشاہت

محمد شاہ ثانی بہمنی کے محل میں دو بیٹے تولد ہوئے، اور اس نے بڑے بیٹے غیاث الدین کو اپنا ولیعہد مقرر کر کے مرتے وقت فیروز اور احمد دونوں بھائیوں کو غیاث الدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کی وصیت کی۔ ان دونوں نے چچیرے بھائی کی وصیت پر عمل کیا اور ہمیشہ غیاث الدین کے ساتھ خلوص و راستی سے ملتے رہے جب تغلچین نے غیاث الدین کو اندھا کر کے شمس الدین کو تخت نشین کیا تو غیاث الدین کی حقیقی بہنوں نے جو فیروز شاہ اور احمد شاہ کی بیبیاں تھیں، اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے شوہروں کو اُبھارا۔ دونوں بھائیوں نے بیبیوں کی ترغیب پر تغلچین کی تباہی کی کوشش کی۔ تغلچین اس سے واقف ہو کر دونوں بھائیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگا اور ان کے قتل و قید کے لیے شمس الدین کو اُبھارا لیکن اس نے نہ مانا۔ اس لیے تغلچین نے مخدومہ جہاں والدہ شمس الدین کے ذریعہ کوشش شروع کی۔ آخر مخدومہ جہاں نے شمس الدین کو فیروز شاہ اور احمد شاہ کے قتل پر آمادہ کر دیا۔ فیروز شاہ اور احمد شاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھاگ کر ساغر کے حاکم سدّو کے پاس چلے گئے۔ سدّو نے ان دونوں کی ہر طرح مدد کی۔ وہاں سے فیروز شاہ نے شمس الدین کو لکھا کہ اگر تغلچین کو اس کی بداعمالیوں کی سزا نہ دی گئی تو ہم لوگ تمہاری مخالفت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں گے۔ شمس الدین نے اس کا جواب تغلچین اور مخدومہ جہاں کے مشورے سے ایسا دیا جس نے فیروز شاہ اور احمد شاہ کو اور بھی برہم کر دیا۔ اس لیے دونوں بھائیوں نے گلبرگہ پر فوج کشی کی جس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ چند ہی روز میں تغلچین اور مخدومہ جہاں کی کارروائیوں سے گلبرگہ کی رعایا ناراض ہو گئی۔ دربار کے اراکین بھی مخالف ہو گئے اور انھوں نے فیروز شاہ کو رائے دی کہ تم بادشاہ سے امان حاصل کر کے گلبرگہ چلے آؤ تمام لوگ تمہارے موافق ہیں۔ اس رائے کے مطابق فیروز شاہ اور احمد شاہ شمس الدین سے امان حاصل کر کے گلبرگہ میں داخل ہوئے اور حکمت عملی سے شمس الدین اور تغلچین کو قید کر لیا۔ شمس الدین کو فیروز شاہ نے اندھا کر کے بیدر کے قلعہ میں قید کر دیا، اور معزول سلطان غیاث الدین کو قید سے نکلوا کر تغلچین کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ غیاث الدین نے باوجود نابینا ہونے کے تغلچین کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔

اس کے بعد فیروز شاہ نے بادشاہ ہو کر خطبہ اور سکّہ اپنے نام سے جاری کیا۔ اپنے بھائی کو

خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامراء مقرر کیا۔ بزمانہ حکمرانی فیروز شاہ آپ سپہداری اور ملک گیری کے ذریعہ سے بھائی کی اطاعت کا حق ادا کرتے تھے۔ چنانچہ ۸۰۱ھ م ۱۳۹۸ء میں بیجانگر کے راجہ دیورائے کے شکست کھا کر بیجانگر میں پناہ لینے کے بعد فیروز شاہ نے دیورائے کو تو چھوڑ دیا اور اپنے بھائی خانخاناں اور میر فضل اللہ انجو شیرازی کو دیورائے کے جنوبی ممالک کی طرف بھیجا۔ آپ اور میر فضل اللہ ان ملکوں سے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو پکڑ لائے! ان قیدیوں میں جو لوگ معزز اور دولتمند تھے، ان کے وارثوں نے دیورائے سے کہا کہ جس قدر مال درکار ہوگا ہم لوگ دیں گے مسلمانوں سے صلح کر لینی چاہیئے، تاکہ ہمارے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ان کی قید سے رہائی ملے۔ دیورائے نے اس کو منظور کر لیا اور اپنے سفیروں کو فیروز شاہ کے پاس بھیجا آخر اس شرط پر صلح ہوئی کہ دس لاکھ دکنی اشرفی دیورائے سلطان کے خزانہ میں داخل کرے! اور ایک لاکھ میر فضل اللہ کو دے جنھوں نے درمیان میں پڑکر صلح کرائی۔ دیورائے نے یہ رقم ادا کی اور کل قیدی رہا کر دیئے گئے۔

جس زمانے میں فیروز شاہ ساگر میں دیورائے کی مدافعت کا سامان کر رہا تھا برار سے راجہ نرسنگھ والی گونڈوانہ کے تاخت و تاراج اور ظلم کرنے کی خبر ملی تو فیروز شاہ نے اس کی سرکوبی پر دولت آباد اور برار کی فوجوں کو مقرر کر دیا تھا اب جو فیروز شاہ کو دیورائے سے فرصت ملی تو اس نے ۸۰۲ھ م ۱۳۹۹ء میں نرسنگھ کی طرف توجہ کی قلعۂ ماہور کا حاکم جس کے اطراف کو نرسنگھ نے لوٹ لیا تھا، نرسنگھ کے بہکانے سے باغی ہو گیا۔ فیروز شاہ کے ماہور پہنچتے ہی اس نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ پانچ مہینے ماہور میں قیام کر کے فیروز شاہ نرسنگھ کے پایہ تخت کھیرلا کی طرف بڑھا۔ ادھر نرسنگھ بھی تیار تھا۔ فیروز شاہ نے چاہا کہ خود بہ نفس نفیس میدان جنگ میں جائے لیکن آپ (خانخاناں) اور میر فضل اللہ شیرازی نے بادشاہ سے عرض کیا کہ فیروز شاہ کا خود ایسے معرکہ میں جانا غیر ضروری ہے۔ اس مہم کے سر کرنے کے لیے یہ دونوں امیر کافی ہیں۔ فیروز شاہ نے یہ رائے پسند کی اور آپ (خانخاناں) اور میر فضل اللہ شیرازی کو خلعت سے سرفراز کر کے دونوں کو نرسنگھ کے مقابلہ میں میدان جنگ کو جانے کی اجازت دی آپ اور فضل اللہ نے نرسنگھ کے بیٹے کو شکست دی اور نرسنگھ کو بھگاتے ہوئے قلعہ کھیرلا تک لے گئے دس ہزار آدمی مارے گئے۔ نرسنگھ نے قلعہ میں پناہ لی اور مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ دو ہی مہینہ میں اہل قلعہ کا حال برا ہو گیا، اور وہ امن مانگنے پر مجبور ہوئے میر فضل اللہ اور آپ (خانخاناں) نے

لہ فرشتہ۔

کہا کہ جب تک نرسنگھ سلطان کی خدمت میں حاضر نہ ہوگا صلح نہیں ہو سکتی۔ نرسنگھ فیروز شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فیروز شاہ نے اس کی بیٹی سے شادی کی اور چالیس ہاتھی پانچ من سونا پچاس من چاندی، بہت سے دوسرے تحفے تحایف لیکر گلبرگہ واپس ہوا۔

دیورائے[1] والی بیجانگر نے خراج روک دیا اور اس کی فوج نے فیروز شاہ کے ملک پر دست درازی کرکے فیروز شاہ کو مشتعل کر دیا چنانچہ ۸۰۹ھ م ۱۴۰۶ء میں سلطان فیروز شاہ بیجانگر پر حملہ آور ہوا۔ دیورائے کو مقابلہ کی جرات نہیں ہوئی اس نے بیجانگر میں پناہ لی سلطان نے بیجانگر سے تھوڑے فاصلہ پر ایک میدان میں اپنا مورچہ قایم کیا اپنے بھائی خانخاناں اور سدھو سر نوبت کو دس ہزار سوار ونکے ساتھ بیجانگر کے جنوبی علاقوں کی تاخت و تاراج کے لیے روانہ کیا میر فضل اللہ شیرازی کو لشکر برار کے ساتھ کرناٹک کے مشہور حصار قلعہ بنکاپور کی تسخیر پر مامور کیا۔ چار مہینے تک فیروز شاہ بیجانگر کے سامنے پڑا رہا، اور اس درمیان میں سلطانی فوج اور دیورائے کی سپاہ میں آٹھ معرکے ہوئے اور ہر معرکہ میں سلطان کو فتح ہوئی اس عرصہ میں آپ (خانخاناں) برابر بیجانگر کے وسیع ملک کی تاخت و تاراج میں مصروف رہے۔ میر فضل اللہ کو بھی کامیابی ہوئی اور اس نے قلعہ بنکاپور کو فتح کر لیا آپ (خانخاناں) بیشمار مال و اسباب اور کثیر التعداد قیدی لیکر اور میر فضل اللہ قلعہ بنکاپور کو سدھو سر نوبت کے سپرد کرکے فیروز شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فیروز شاہ نے آپ (خانخاناں) کو دیورائے کے مقابلہ پر مقرر کیا اور میر فضل اللہ کو قلعہ ادونی کی فتح کے لیے بھیجا قلعہ ادونی بیجانگر کی سلطنت کے تمام قلعوں سے بڑھ کر تھا دیورائے نے اس سے گھبرا کر فیروز شاہ کی خدمت میں صلح کی درخواست کی، اور شرایط صلح یہ قرار پائے:- دیورائے اپنی بیٹی کی شادی فیروز شاہ سے کرے گا۔ دس لاکھ دکنی اشرفی۔ پانچ من موتی پچاس ہاتھی۔ دو ہزار غلام، لونڈی نذر کرے گا۔ قلعہ بنکاپور جس کو مسلمانوں نے فتح کر لیا ہے، دیورائے جہیز میں دینا منظور کرے گا اور اس کی واپسی وغیرہ کی کوئی تحریک نہ کرے گا۔

ان شرایط کی تکمیل ہونے کے بعد دونوں طرف دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

فیروز شاہ کی قیام گاہ سے بیجانگر تک سڑک کے دونوں طرف ہر طرح کی دوکانیں لگائی گئیں۔ ہنرمندوں اور کاریگروں نے اپنی ہنرمندی اور کاریگری کے نمونے لا لاکر رکھے کھیل اور تماشے والوں نے اپنے اکھاڑے جمائے۔ فیروز شاہ کی خیمہ گاہ سے بیجانگر تک اکیس میل کا فاصلہ تھا اور چالیس روز تک

[1] فرشتہ۔

یہ چہل پہل اور دھوم دھام رہی۔ آپ (خانخاناں) اور میر فضل اللہ بیجانگر گئے اور سات روز تک مہمان رہے۔ اس کے بعد دُلہن کو جہیز کے ساتھ فیروز شاہ کے پاس لائے۔

دیورائے نے فیروز شاہ کو اپنے گھر بلایا۔ فیروز شاہ نے آپ (خانخاناں) کو لشکر حوالے کیا اور دلہن کے ساتھ بیجانگر میں داخل ہوا۔ دیورائے نے پندرہ میل تک مخمل، اطلس اور مشجر کا فرش بچھوایا تھا۔ یہیں سے استقبال کرکے اپنے ساتھ بیجانگر لے گیا۔ سلطان بیجانگر میں پہنچا تو دونوں طرف سے عورتوں اور لڑکوں نے فیروز شاہ پر سونے چاندی کے پھول نثار کیے۔ امیروں، سپاہیوں اور رعایا نے بھی نچھاور کی رسم ادا کی۔ دُلھا دُلہن دونوں ایک پُر تکلف اور آراستہ محل میں اُتارے گئے۔

حضرت سید محمد بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ جنید وقت اور شبلی دہر تھے لوگوں کو برکات اور فیوض سے مالامال فرماتے تھے۔ کُل ملک دکن روحانی طور پر حضرتؒ کا مسخر تھا۔ چنانچہ حضرتؒ نے آپ (احمد شاہ) کی نسبت بھی بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی! اس کی کیفیت یہ ہے کہ ۸۱۸ھ م ۱۴۱۵ء میں سلطان فیروز شاہ نے اپنے بیٹے حسن خاں کو اپنا جانشین قرار دیا، اور اس کو شاہی خلعت وغیرہ عنایت کیا اس کے بعد اس کو حضرت سید محمد بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا کہ آپ اس کے لیے دعائے خیر فرمائیں حضرتؒ نے کہا کہ جس کو بادشاہ نے انتخاب کرلیا ہے اس کے لیے ایک غریب درویش کی دعا کیا کام آئے گی! اور یہ بھی فرمایا کہ خدا کی مرضی تو یہ ہے کہ تاج شاہی سلطان کے بھائی احمد خاں کو ملے نہ کہ اُس کے بیٹے حسن خاں کو۔ سلطان اس بات سے بہت رنجیدہ ہوا، اور آپ کو شہر گلبرگہ سے باہر جاکر رہنے کا حکم دیا۔

تلنگانے کے راجہ نے کئی سال سے خراج فیروز شاہ کو نہیں دیا تھا، اس لیے ۸۲۰ھ م ۱۴۱۷ء میں فیروز شاہ نے تلنگانہ کے قلعہ نلگنڈہ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دو برس تک قایم رہا۔ لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔ آخر میں فیروز شاہ کے لشکر میں ہیضہ پھوٹا اور آدمی اور جانور مرنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر سپاہی محاصرہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے، اس لیے ہندوؤں کی بن آئی۔

دیورائے نے فیروز شاہ کی ابتر حالت، دیکھ کر بہت سی فوج جمع کرنا شروع کی۔ دوسرے راجاؤں سے جن میں تلنگانہ کا راجہ بھی تھا مدد مانگی اور بہت بڑی جمعیت کے ساتھ دھاوا کرکے مسلمانوں کو لوٹنا اور قتل و غارت کرنا شروع کیا! اگرچہ فیروز شاہ براہ راست دیورائے کا

مدمقابل نہیں تھا۔ تاہم اس کی شاہی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے
جائیں اور وہ خاموش رہے چنانچہ وہ باوجود اپنی شکستہ حالی کے دیورائے کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔
ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک بڑی جنگ ہوئی جس میں ہندوؤں کی فتح رہی اور میر فضل اللہ کے
ہندو ملازم نے جس کو دیورائے نے ملالیا تھا، میر فضل اللہ کو عین جنگ میں دغا سے قتل کر ڈالا۔ آپ
(احمد خاں) بڑی جوانمردی اور ہشیاری سے بادشاہ کو بچا کر لے گئے۔ فیروز شاہ کے بہت سے بہادر
مارے گئے۔ فیروز شاہ کے میدان جنگ سے چلے جانے کے بعد دیورائے نے مسلمانوں کا قتل عام کیا
اور میدان جنگ میں مسلمانوں کے سروں کا چبوترہ بنایا گیا۔ اس کے بعد دیورائے نے سلطان فیروز شاہ کے
مقبوضات پر حملہ کر کے مسلمانوں کو لوٹا اور ان کا قتل عام کیا۔ مسجدیں شہید کیں اور سفاکی اور
بیرحمی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی فیروز شاہ نے عاجز آ کر گجرات سے مدد طلب کی اور میر غیاث الدین
ولد میر فضل اللہ شیرازی کو قاصد بنا کر احمد شاہ گجراتی کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر وہاں سے کوئی مدد نہیں
پہنچی کیونکہ وہاں احمد شاہ گجراتی کی تخت نشینی کو زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا! اور خود اسی کے مہمات سلطنت
ابھی قابل توجہ تھے۔ فیروز شاہ کی اس تدبیر سے کچھ فائدہ نہ ہوا آخر چھکے چھوٹ گئے۔ بھاگنے کی
نوبت آگئی تھی لیکن آپ (خانخاناں) نے اس وقت خزانوں کے منہ کھول دیئے اور ہر طرف سے
لشکر جمع کر کے اس زور وشور سے ہندوؤں پر حملہ کیا کہ اُن کے پیر اکھڑ گئے۔ آپ نے دیورائے کا پیچھا
کر کے اس کو حدود مملکت بہمنیہ سے باہر کر دیا۔ آخر ہندوؤں کو شکست فاش دے کر داد مردانگی دی۔
پھر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے بھائی کی مستعدی اور حُسن انتظام سے خوش ہو کر
آپ کو شاہی عنایتوں سے سرفراز کیا۔ لوگوں پر آپ کی شجاعت کا بہت اثر ہوا اور سلطان فیروز شاہ کے
مصاحبین نے حسد سے بادشاہ کو آپ کی طرف سے بدظن کرنا شروع کیا۔ فیروز شاہ کو اس شکست کا بڑا
صدمہ ہوا۔ ضعیفی کی عمر تھی، اس لیے اس صدمہ کا اثر اس کی صحت پر خراب پڑا اور وہ بیمار ہو گیا اور
جب فیروز شاہ کی بیماری بڑھنے لگی اور اس کو یقین ہو گیا کہ موت قریب آگئی ہے تو اس کے
دو غلاموں نے جن کے نام ہوشیار (عین الملک) اور بیدار (نظام الملک) تھے اور جو بڑے درجے پر پہنچے ہوئے تھے اور آپ سے بہت
جلتے تھے، فیروز شاہ کو حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز کی پیشین گوئی (کہ اس کے بعد احمد خاں بادشاہ ہوگا)
یاد دلائی اور یہ صلاح دی کہ وہ آپ کو اندھا کر دے اور فیروز شاہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور اس نے آپ کو

اندھا کروانے کا ارادہ کیا لیکن جب آپ کو آپ کے بھانجے شیر خاں[1] کے زبانی یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے بیٹے
علاء الدین سمیت شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر جا کر آپ کی
قدمبوسی کی اور اظہار حال کر کے دلی ارادتمندی سے عرض کیا کہ یا حضرت آرزو ہے کہ دنیا کے جھگڑوں سے
دست بردار ہو کر آپ کی خدمت اقدس میں عمر گذاروں حضرتؒ نے فرمایا کہ شکستہ دل نہ ہو،
خداوند کریم نے اپنی کمال عنایت سے تم کو بادشاہ مقرر کیا ہے پس تم پر فرض ہے کہ ہمت سے کام لو
اور سلطنت حاصل کر کے اپنی رعایا کی خبر گیری اور دلجوئی کرو، فقیر سے اس بادشاہ کا بہت بڑا مرتبہ ہے
جو سلطنت کو نیک نامی سے چلائے اور رعایا کے ساتھ انصاف کرے اور عبادت معبود کو بھی ہاتھ سے
جانے نہ دے۔ یہ کہکر حضرتؒ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور پھر دونوں باپ بیٹے کو مژدۂ سلطنت دیکر
فاتحہ خیر پڑھی اور اپنی دستار مبارک دو ٹکڑے کر کے اپنے ہاتھ سے باپ اور بیٹے کے سر پر باندھی اور
شگون مبارک کے لیے جو کھانا آپ کے پاس موجود تھا تینوں نے ایک طباق میں تناول کیا
اور مطمئن و شاد ہو کر آپ وہاں سے رخصت ہوئے۔

رات بھر سامان سفر کی تیاری کر کے علی الصباح چار سو جوان مسلح اور جرار جنگ آزمودہ
جنھوں نے تمام معرکوں میں نام پایا اور حق وفاداری ادا کیا تھا ہمراہ لیکر روانہ ہوئے اس درمیان میں
ایک شخص خلف حسن بصری جو آپ کا قدیم دوست تھا، آپ کے ارادہ سے واقف ہو کر اپنے
دروازہ سے باہر کھڑا ہوا تھا، روبرو آکر آداب شاہی بجالایا آپ نے اس کو شگون نیک سمجھ کر
اس سے فرمایا کہ تو جلد اپنے مکان پر جا ورنہ میری دوستی سے تجھ کو نقصان پہنچے گا خلف حسن بصری نے
جواب دیا کہ ایام راحت میں دوست رہنا اور ایام تعب میں بے وفا ہونا ہرگز درست نہیں، خدا کی قسم
آپ کی ہمراہی سے منہ نہ موڑوں گا آپ کو خلف حسن بصری کی خالص عقیدت و یکجہتی پسند آئی اس کو
آپ نے ہمراہ لیا اور یہ وعدہ فرمایا کہ اگر میں بادشاہ ہوا تو تجھ کو سرفراز کروں گا یہ کہہ کر منزل مقصود کی طرف آپ
روانہ ہوئے اور اپنے دوستوں کو اطلاع دینے اور اپنی فوجی قوت کو بڑھانے کی تدبیر کرنے لگے غرض آگے بڑھ کر
اُس روز آپ خانہ پور میں مقیم رہے۔ آپ نے منت کی کہ اگر خدا آپ کو بادشاہ کرے گا تو آپ اس قصبہ کو
رسول آباد کے نام سے موسوم کر کے اس کی آمدنی مکہ، مدینہ، نجف اور کربلا کے سیدوں کو مدد معاش کیلیے وقف کرینگے
جب آپ کے بھاگ جانے کی خبر معلوم ہوئی تو فیروز شاہ کے دونوں غلام ہشیار اور بیدار مضطرب ہو کر

[1] برہان ماثر۔

سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے حقیقت حال عرض کرکے فوج لیکر آپ کا پیچھا کرنے اور پکڑ لانے کی اجازت حاصل کی تین چار ہزار سوار اور کئی جنگی فیل لیکر آپ کے سُراغ میں روانہ ہوئے آپ رفقا کی قلت اور اعدا کی کثرت سے چاہتے تھے کہ بیرون شہر توقف کرکے بعض اُمرا کو اپنے ساتھ متفق کریں لیکن خلف حسن بصری مانع ہوا اور چتر سیاہ آپ کے سر مبارک پر لگایا اور آدمی حسن آباد گلبرگہ بیدر کلیانی کو بھیجکر ایک جماعت ملازمان شاہ تیز ادباش و بیکار کو بہ وعدہائے دلفریب آپ کے جھنڈے کے نیچے لایا، اور ان کی دلداری اور ساز و سامان سے مددگاری کی لیکن یہ جماعت اس قدر مختصر تھی کہ آپ ہشیار اور بیدار سے جن کے ساتھ شاہی فوج بہت تھی جنگ کرنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے اور گلبرگہ کے اطراف پھرتے تھے۔ یکایک ہشیار اور بیدار نے آپ کو چاروں طرف سے ہجوم کرکے گھیرا، اور دونوں کے پاس اُس وقت آٹھ ہزار فوج سلطانی تھی اور آپ کے پاس کُل ایک ہزار آدمی تھے، عین اُسی وقت جبکہ آپ سوچ رہے تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں بنجاروں کا ایک گروہ آپ کے پاس سے گزرا اس گروہ کے پاس کوئی دو ہزار بیل تھے جن پر وہ غلہ لاد کر برار کی طرف سے آکر کلیانی کے حوالی میں اُترے تھے۔ اسی طرح تین سو گھوڑے سوداگروں نے لاہور سے لاکر خرابی راہ کے سبب سے کلیانی میں قیام کیا تھا خلف حسن بصری نے جو جنگ کے انصرام میں ساعی تھا، آپ سے کہا کہ آپ گھوڑے سوداگروں سے بہ قیمت اور بیل بنجاروں سے بعاریت لیں اور بدستور دکن رنگ برنگ کے جھنڈے بانس کے چھڑیوں پر باندھ کر پیادوں کے حوالے کرکے ہر ایک کو ایک بیل پر سوار کرا کے فوج اعدا کے مقابل جائیں، اور جنگ شروع کریں، اور عین موقعہ جنگ میں بیلوں کو فوج کے ایک طرف سے نمایاں کریں اور بہ آواز بلند مخالفوں کو سنادیں کہ اُمرا جو اپنے جاگیروں میں تھے ہماری کمک کو آگئے ہیں، شاید اس تدبیر سے غلام خایف ہوکر بھاگ جائیں۔ آپ اس بات کو خرافات سمجھ کر رضامند نہ ہوئے، اور جب آپ نے سُنا کہ افواج شاہی آپ کی طرف روانہ ہوچکی ہیں تو آپ بھی کوچ کرکے عین طے مسافت میں متحیر و محزون ایک درخت کے سایہ میں اُتر کر سو گئے۔ عالم رویا میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ فقیرانہ لباس پہنے ہوئے آپ کی طرف تشریف لائے اور ایک سبز تاج[1] بارہ گوشوں کا ایک ہتیلی پر رکھا ہوا ہے، آپ نے ان کا استقبال کرکے قدمبوسی کی حضرت نے آپ کو مبارکباد دی، اور تاج آپ کے سر پر رکھکر فرمایا کہ

[1] فرشتہ۔ برہان ماثر نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔

یہ تحفۂ درویش، تاج شاہی ہے، جسے ایک گوشہ نشین ولی کامل نے تیرے لیے بھیجا ہے۔ ایسے خواب وخیال تذبذب واضطراب کے وقت میں بڑا کام دیتے ہیں۔ آپ بستر خواب سے بہ نہایت محظوظ ہو کر اٹھے اور خلف حسن بصری کو طلب کر کے صورت خواب بیان کی اور فرمایا کہ میں جنگ کے بارے میں متردد تھا اب چونکہ بشارت غیب سے پہنچی ہے اس لیے حسب ایمائے باطنی عازم جنگ ہوتا ہوں۔ پس جو تدبیر تو نے بیان کی تھی اس کو عمل میں لا، ممکن ہے کہ کامیابی ہو۔ خلف حسن بصری زمین خدمت کو لب ادب سے بوسہ دیکر دوسو بہادر ہمراہ لیکر کلیانی کی طرف روانہ ہوا اور شیریں زبانی اور لطف بیانی کے ساتھ گھوڑے اور بیل اُن کے مالکوں سے لیکر پلٹ آیا اور رات کو رنگین بیرقیں درست کرلیں اور اس کا اظہار کسی پر نہیں کیا۔

دوسرے روز علی الصباح ہر ایک آدمی کو ایک ایک جھنڈا دیکر ایک ایک بیل کی پیٹھ پر سوار کرادیا۔ اس نے اپنی اس عجیب فوج کو درختوں کے پیچھے کھڑا کیا اور اُن کے آگے سواروں کی قطاریں کھڑی کردیں تاکہ پیچھے والے اچھی طرح نہ دکھائی دیں۔ یہ سب کے سب درختوں میں سے ایک بڑی فوج معلوم ہوتی تھی جس کے ہاتھوں میں طرح طرح کے جھنڈے تھے۔ نقارہ بجا کر حریف سے مقابلہ کرنے کے لیے خلف حسن بصری نے میمنہ اور میسرہ کو مرتب کر کے بیحد آہستگی کیساتھ شاہی فوج کے مقابلہ میں آیا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو شاہی فوج جو اُن دو غلاموں یعنی ہشیار اور بیدار کیساتھ تھی یہ دیکھکر کہ سواروں کا ایک بڑا رسالہ آرہا ہے ڈر کر بھاگ گئی۔ ہشیار (عین الملک) اور بیدار (نظام الملک) کو بھی حریف کی تازہ مدد پہنچنے کا یقین ہوگیا اور اپنے ارادوں میں ڈگمگانے لگے۔ اس وقت آپ نے بڑی ہشیاری سے کام لیا اور اپنے ایک ہزار یک دل و یک زبان سپاہیوں کے ساتھ دشمن کے قلب لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ ہشیار (عین الملک) اور بیدار (نظام الملک) دونوں قلب لشکر میں موجود تھے۔ ان امیروں نے دیکھا کہ میمنہ اور میسرہ کے افسروں نے میدان جنگ سے منہ موڑ لیا ہے تو خود بھی دو چار ہاتھ چلانے کے بعد فرار ہوئے۔ یہ بڑے مزے کی بات ہوئی کہ شاہی فوج کوئی دو ہزار آدمیوں کے سامنے سے جو بیلوں کی پیٹھوں پر سوار تھی اور جن کے پاس سوائے لال اور ہرے جھنڈیوں کے کوئی ہتھیار نہ تھا، بھاگ نکلی۔ آپ کو فتح ہوئی۔ آپ نے شاہی فوج کا تعاقب کر کے بیشمار گھوڑے، ہاتھی اور تمام مال غنیمت پر قبضہ کیا۔ اس لوٹ کے مال سے آپ نے اپنے لشکریوں کا سامان درست کیا۔

اس کے بعد آپ نے گلبرگہ سے چند کوس کے فاصلہ پر قیام کیا، اور شاہی لشکر کا ایک بڑا حصہ اور بہت سے شاہی امیر آپ سے مل گئے۔ فیروز شاہ باوجود مرض الموت میں مبتلا ہونے کے ہشیار (عین الملک)، بیدار (نظام الملک) کے مشورہ سے حسن خاں کو بادشاہ بنا کر اور قلعہ کا انتظام چند معتبر امیروں کے سپرد کر کے خود پالکی میں سوار ہو کر

تین چار ہزار[1] فوج کے ساتھ آپ کے مقابلہ کے لیے نکلا آپ کو بادشاہ کے آنیکی اطلاع ہوئی تو آپ بھی آگے بڑھے۔ جانبین سے صف آرائی ہونے لگی مگر اتفاقاً عین لڑائی کے وقت شدت بیماری سے فیروز شاہ بیہوش ہوگیا اور اس کے مرنے کی خبر مشہور ہوگئی۔ اس وجہ سے رہی سہی فوج بھی آپ سے جا ملی ہشیار اور بیدار فیروز شاہ کی پالکی قلعہ میں لے گئے جب قلعہ کے دروازے پر پہنچے تو فیروز شاہ کو ہوش آیا مگر اب جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا لیکن اس وقت آپ نے ادباً بادشاہ کا تعاقب نہیں کیا، ورنہ آپ چاہتے تو گرفتار کر لیتے۔

قلعے کے نیچے آکر آپ نے قیام کیا[2]۔ ہشیار اور بیدار[3] باتفاق حسن خاں قلعے پر چڑھے اور وہاں سے گولے مارنے شروع کیے یہاں تک کہ آپ کے پاس گولے جا جا کر گرنے لگے اور آپ کے خاص رفیقوں میں سے کچھ لوگ ان گولوں کی زد سے اُڑ گئے۔ اس سبب سے آپ قلعہ کے عقب میں چلے گئے لیکن جب سلطان فیروز شاہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے بیٹے کو بلا کر کہا کہ ہمیشہ سلطنت لشکر کی موافقت اور اُس کی رفاقت سے ہوتی ہے۔ اب جبکہ ساری فوج تیرے چچا کی حکمرانی کی خواہاں ہے تو تجھے بھی لازم ہے کہ نزاع و فساد کو جو باعث زوال و تباہی ہے چھوڑ کر چچا کی اطاعت قبول کرے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے خاص متدین اور معتبر اُمراء، سادات اور علما، کو آپ کو بلانے کیلئے روانہ کیا اور قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا۔ آپ معہ جماعت معتمدین قلعہ میں داخل ہوئے، اور اپنے بھائی کے قدموں پر گر کر جو حالت بیماری میں فرش تھا زار زار رونے لگے اور یہ دو بیتیں پڑھیں[4]:۔

ازیں سہ لو شتہ زسود و زیاں — فلک رابہانہ متم درمیاں

ازینش ستاند بآتش دہد — کند ہر چہ خواہد بما بر نہد

فیروز شاہ نے اظہار بشاشت کرکے کہا کہ میں نے تم کو اپنے حین حیات بادشاہ دیکھا، واللہ تم شایان سلطنت اور سزاوار مملکت ہو، اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہنچتا ہے، اور میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی میں حتی المقدور سعی کرتا رہا جب کار فرمایان قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لیے نامزد کرچکے ہیں تو دوسرے کے لیے کوشش بے فائدہ ہے۔ اب لو حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اُٹھو، آج ہی تخت سلطنت پر جلوہ آرا ہو کر مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کردیں اسی روز کہ شہر شوال کی پانچویں تاریخ ۸۲۵ھ م ۱۵ ستمبر ۱۴۲۲ء تھی تاج بادشاہی بھائی کا زیب سر کرکے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا خطبہ اور سکہ دکن کا اپنے نام پر جاری کیا۔

---

[1] لیکن برہان ماثر میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ سات ہزار سوار فوج کے ساتھ مقابلہ کیلئے قلعہ سے باہر نکلا۔ دوسرے دن سلطان کو معلوم ہوا کہ صرف تین ہزار فوج سلطان کے ساتھ باقی ہے اور سب فوج احمد شاہ سے مل گئی تو وہ بغیر جنگ لڑے واپس ہوگیا اور سادات اور علماء کے دربار کے ذریعہ قلعہ کی کنجیاں آپ کے پاس روانہ کیں۔

[2] فرشتہ۔ لیکن برہان ماثر میں لکھا ہے کہ آپ نے مسجد گلبرگہ کے قریب قیام کیا۔

[3] فرشتہ۔ برہان ماثر میں اس کا تذکرہ نہیں۔

[4] فرشتہ۔

تنقید و تبصرہ

سیاسی نصب العین | مترجمہ پروفیسر کرشن چندر رائے صاحب سیکسینہ ام اے (تاریخ) ۴۸۴ صفحات قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ رشی کیش۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن مکتبۂ ابراہیمیہ۔

اس کتاب کے مترجم کرشن چندر رائے سیکسینہ صاحب جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہیں۔ یہ پہلے کرسچن کالج اور پیالا نھو برن کالج میں بھی تاریخ کی پروفیسری کی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ انھوں نے علم سیاسیات سے متعلق اردو میں کتابیں منتقل کرنے کا بڑا اچھا کام شروع کیا ہے چنانچہ یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس کے علاوہ انھوں نے پروفیسر بنے کمار سرکار کی ایک کتاب "سیاسی ادارات و نظریات ہنود" کا بھی اردو میں ترجمہ کرلیا ہے جو اسی "سلسلہ کتب علم سیاسیات" میں شایع ہوگا۔

زیر نظر کتاب ڈیلائل برنس کی مشہور انگریزی کتاب "پولیٹکل آئیڈلیس" کا ترجمہ ہے اور اس کو موضوع کی مناسبت سے مترجم نے آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے اکسفو معین امیر جامعہ عثمانیہ و صدرالمہام تعلیمات و سیاسیات کے نام معنون کیا ہے۔ اصل انگریزی کتاب ۱۹۱۵ء میں جنگ یورپ کے خلاف بطور احتجاج شایع کی گئی تھی اور اس نے وہاں کے حالات اور موقتی دلچسپی کے لحاظ سے اس قدر قبولیت حاصل کی کہ پندرہ سال کے عرصہ میں تقریباً دس ایڈیشن شایع ہوئے۔ مترجم نے اپنے ترجمہ کو ۱۹۳۲ء کے انگریزی ایڈیشن پر مبنی کیا ہے۔

ابتدا میں سیکسینہ صاحب نے ایک "تقریب" لکھی ہے جس میں اصل کتاب کی اہمیت اور موضوع کی ضرورت کا اظہار کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اگر کتاب ہذا سے جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ کسی طرح پر مستفید ہو سکیں اور اُردو زبان اور
اس کے وسیلہ سے اس دور عہد آفریں میں "ملک و مالک" کی کچھ خدمت بھی انجام
پا سکے تو ناچیز کی یہ محنت رائگاں نہ جائے گی ع

فردوس کا منظر ہے نگاہوں کے مقابل

یہ بھی حُسن اتفاق ہے کہ حضور پر نور کی تخت نشینیٔ مبارک کی پچیسویں سالگرہ سعید کا
جشن ہمایونی عنقریب بڑے تزک و احتشام سے منایا جائے گا لہٰذا عقیدت و وفاداری کی
دلی آرزو یہی ہو سکتی ہے کہ اس مختصر مقدمہ کو شاہی ترانہ پر ختم کیا جائے جو قدرتاً
زباں زد خاص و عام ہے۔"

[اس] کے بعد حیدرآباد کے قومی ترانۂ شاہی سے اپنے دیباچہ یا تقریب کو زینت دی ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ مترجم نے جس حُسن عقیدت کے ساتھ اس کتاب کو جوبلیٔ شاہانہ کے ساتھ
[من]سوب کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں جملہ اقوام کے دل ذات شاہانہ کے ساتھ ایک غیر متزلزل
[ار]ادت مندی اور خاص جذبۂ وفاداری سے معمور ہیں ہندوستان کا عہد حاضر جس نازک سیاسی مرحلہ سے
[گز]ر رہا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب "سیاسی نصب العین" نہایت بر موقع اور مفید ہے۔
[ہم]ہیں توقع ہے کہ مترجم اسی طرح سیاسیات حاضرہ سے متعلق بھی مفید معلومات اُردو زبان میں
[پی]ش کریں گے اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ سے اقوام کے ذہنی ارتقا اور فہم عامہ میں خاص مدد ملتی ہے۔
کتاب جن (۱۴) ابواب پر مشتمل ہے سب پُر از معلومات اور مفید ہیں ان کے مطالعہ سے نہ صرف
[س]یاسیات کے طلبہ بلکہ سیاسی بیداری سے تعلق رکھنے والے جملہ اصحاب مستفید ہو سکتے ہیں مترجم نے نہایت
[شس]تہ اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے لیکن ترجمہ پھر بھی ترجمہ ہی ہوتا ہے اس میں اصل کی سی بات پیدا
[ہو]نا ممکن نہیں۔ پروفیسر سیکسنہ صاحب اس فن کے ماہر ہیں اور اگر وہ آیندہ سے تراجم کی بجائے خود تالیف
[کی] طرف متوجہ ہوں تو اہل اُردو کو زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔ "مسائل حاضرہ" اور "ہندوستان کے
[س]یاسی مستقبل" کے متعلق اگر وہ اپنے وسیع مطالعہ اور ذوق کی مدد سے چھوٹی چھوٹی کتابیں تالیف
[کر] کے شایع کریں گے تو اپنے ملک و قوم کے ایک قابل قدر خدمت گذار ثابت ہوں گے۔

سید محی الدین قادری زور

نظر کے دھوکے[1] یہ مختصر قصوں کا نفیس مجموعہ جامعہ عثمانیہ کے مشہور طیلسانی مولوی بدرالدین خاں شکیب بی اے ال ال بی کے تخیل کا کارنامہ ہے جو حال ہی میں شایع ہوا ہے اور ملک میں پسندیدگی حاصل کر رہا ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید اور تاریخ میں جامعہ کے طیلسانیوں نے اپنی زبان کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ان کے لیے اُردو کے مصنفین میں یقیناً جگہ پیدا کر چکی ہیں لیکن تخلیقی ادب ابھی توجہ کا محتاج ہے۔ یہ نہیں کہ اس برادری میں شعراء، ڈراما نگار یا افسانہ نویسوں کی کمی ہے، بلکہ یہ کہ تخلیقی ادب کے بہت کم کارنامے منظر عام پر آسکے ہیں۔ اس لحاظ سے زیر نظر تصنیف قابلِ قدر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس مجموعے کے قصوں میں کئی خوبیاں ایسی ہیں، جو پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی اور دلکشی کا خاصا مواد رکھتی ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عام اُردو قصوں کے مقابلہ میں یہ مجموعہ ایک نئی فضا پیش کرتا ہے جو اس میں شک نہیں کہ ٹھیٹ حیدر آبادی فضا تو نہیں کہی جاسکتی، تاہم اس کی رہنما ضرور ہے۔ قصے سب کے سب اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ گو مصنف نے دو افسانوں کی حد تک ماخوذ ہونے کا اعتراف کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قصہ جہاں زبان یا قلم سے نکلا کہ تمام عالم کی ملکیت بن جاتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے قصے ہمیشہ بدل بدل کر ہر زمانے اور ہر ملک کے عظیم الشان افسانہ نگاروں کے قلم سے حیات نو حاصل کرتے رہے ہیں۔ شکسپیر، دانتے اور اکثر قدیم یورپی قصہ نگاروں نے اپنا مواد اُن قدیم مشرقی قصوں سے حاصل کیا تھا جو صلیبی مجاہدین کے ساتھ یورپ میں پہنچے تھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے، اور افسانہ ہمیشہ افسانے ہی سے پیدا ہوتا رہے گا۔ فی الحقیقت بہت کم جدید قصے اچھے کہے جاسکتے ہیں اور بہت کم ماخوذ۔ اس معاملے میں سب کچھ، افسانہ نگار پر منحصر ہوتا ہے۔ قصہ گوئی میں اصلی چیز مصنف کی قابلیت ہوتی ہے۔ اگر وہ حقیقی افسانہ گو ہے تو فرسودہ اجزا سے ایک لازوال قصہ پیدا کر سکتا ہے، جیسا کہ گوئٹے نے "فاوسٹ" کی شکل میں اس نام کی ایک قدیم روایتی شخصیت کو زندہ جاوید بنا دیا یا واشنگٹن اِرونگ نے ایک فرسودہ جرمنی حکایت کو اپنے ملک کی محبوب فضا میں نشو و نما دے کر، "رِپ وان ونکل" کی صورت میں موجودہ زمانے کا سب سے بڑا قصہ بنا دیا۔

شکیب صاحب اچھے شاعر بھی ہیں اور افسانہ گوئی کا خاصا ذوق رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے

---

[1] قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن اور دیگر کتب فروش۔

افسانوں میں ادبیت اور افسانہ پن دونوں کی دلچسپیاں موجود ہیں۔ قصّوں کو پڑھنے سے یہ بات بھی آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے کہ وہ قصہ گوئی کے رموز سے واقف ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک قصّے کو کب شروع کرنا چاہیئے اور کس موقع پر ختم کرنا چاہیئے۔ یہ چیز وجدانی ہوتی ہے اور اس کی بدولت قصّوں کا لطف اور اہمیت دونوں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ شکیب صاحب نوجوان ہیں، اس لیے حسیات اُن کے لئے ایک دلچسپ رومان اور ایک مسلسل مہم ہیں، اس لئے ان کے یہ قصّے ان کے نوجوان تخیل کے دوفا شعار نقش بن گئے ہیں۔ ان کو پڑھتے وقت ہم ایک ایسی رومان خیز فضا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کی مشکلات بھی دلچسپ نظر آتی ہیں، اور جہاں سے واپس ہونے کو ہمارا جی نہیں چاہتا۔ یہ اثر قصہ نگار کے ذہن پر اس قدر حاوی ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد یا نزاع جیسے اہم ملکی مسئلہ کو چھیڑنا چاہتے ہیں، لیکن طبیعت کی افتاد کے سبب یہاں بھی وہ مہم اور رومانیت سے علحدہ نہیں ہو سکتے اور جہاں وہ انسان کُشی جیسے بھیانک فعل پر ملامت کرتے ہیں، ان کا بیان رقت انگیز نہیں بن جاتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس مجموعے میں تقریباً تمام قصّے، عشق و عاشقی اور مہم پسندی سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ اسی رومان خیز فضا میں حیدرآبادی زندگی بھی کہیں کہیں جھلک پڑتی ہے لیکن تمام قصّوں کا اصلی پس منظر نصب العینی ہے۔ "گم شدہ لاش" ایک مستثنیٰ قصہ ہے جس میں مصنف نے ایک حقیقی حیدرآبادی مسئلہ کو چھیڑنے کی کوشش کی ہے۔ حیدرآباد کی حقیقی زندگی اس کے مخصوص کرداران کی عظمت اور ان کے حسن و قبح پر لکھنے کی ابھی بڑی گنجائش ہے۔

یہ قصّے بظاہر مختلف موضوعات پر ہیں لیکن سب میں اصلی شخصِ قصّہ کا کردار ایک ہی ہے۔ اور یہ ایک رومان اور مہم پسند نوجوان ہے۔ جو اکثر صورتوں میں خود قصہ گو بھی ہے گویا یہ قصے ایک مرکز کے اطراف کے دائرے ہیں۔ ایسی صورت میں عموماً قصّوں کو علحدہ علحدہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ وہ ایک مرکزی شخص قصہ کی زندگی کے مختلف کارناموں کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ الڈیسن کے "ناظر" کی مثال میں کیا گیا ہے۔

قصہ نگار نے مغربی قصوں کی طرح انھیں اس قصے کی نفسی کیفیتوں اب ولہجہ اور زور کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی ہے اور اس سے قصّوں کا لطف دوبالا ہوگیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں کہیں عبارت کی روانی اور سلاست میں بھی سقم پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً "میں ایک سیدھے سادے لیکن سخت اور بھولکر لہجے میں اس سے مخاطب ہوا" (ص) ۔۔ "میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے سکوت کو توڑا" (ص

آصفہ نے متبسم ہو کر آہستہ سے کہا۔۔۔" (صلا) "آپ خاموش ہیں" "میں نے گفتگو کا آغاز کیا" وغیرہ انگریزی کی حد تک یہ طریقہ کچھ نامانوس نہیں ہے لیکن اُردو اس کی مشکل سے متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایسی صورتوں میں حتی الامکان، روزمرہ اور محاورے کی پابندی کو ترجیح دی جانی چاہیئے۔ پہلا جملہ اس طرح بھی لکھا جا سکتا تھا۔ "میں نے اس کو مخاطب کیا اور ایک سیدھے سادھے۔۔۔" اسی طرح "متبسم ہو کر" کی بجائے "تبسم کرتے ہوئے" یا "ایک تبسم کے ساتھ" اور روزمرہ کے زیادہ مطابق ہوتا۔

انگریزی کے اتباع میں اس طرح کے اسلوب اُردو میں بہت جگہ پانے لگے ہیں اور شاید ان کا روکنا بھی مشکل ہے لیکن ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ جہاں ہم کسی بات کو اپنے محاورے کے مطابق ظاہر کر سکتے ہیں تو اس سے کبھی دریغ نہ کریں۔

شکیب صاحب کا دل ہر سچے محب وطن کی طرح، وطن پرستی کے جذبات سے سرشار ہے۔ چنانچہ قصوں کی رفتار کے دوران میں جگہ جگہ ایسے جذبات ظاہر ہوئے ہیں، جن سے ملک و قوم کے ساتھ ان کی شدت الفت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس مجموعے کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ مغربی قصوں کی طرح ڈرامائی موقعوں اور اہم مناظر کی وضاحت تصویروں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اور یہ تصویریں ملک کے مشہور صناع عبدالقیوم آرٹسٹ کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں۔ طباعت اور ترتیب میں خاص سلیقہ، ذوق اور اہتمام سے کام لیا گیا ہے، لیکن پھر بھی بعض فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں، جن سے نہ صرف قصوں کے لطف میں ہرج ہوتا ہے بلکہ بعض جگہ مصنف کے متعلق غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ ذیل میں چند غلطیاں پیش کی جاتی ہیں:۔

صلا "میں اس کے قریب پہنچا اور دل کی حرکت معلوم کیا۔"

صہا "ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہمیں کیا کیا کرنا چاہیئے؟"

صوا "موٹر بھی بھیگ کر تر ابور ہو گئی تھی، اس کو آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے۔۔۔ درختوں کے جھنڈ میں لا کر کھڑا کر دیئے۔"

صٹا "میں دوڑتی ہوئی ادھر نکلی۔"

صٹا "پھر جھگڑا کو ان کرتے ہیں، جن کو کھانے نہیں ملتا۔"

امید ہے کہ یہ فروگذاشتیں، دوسرے اڈیشن میں دور کر دی جائیں گی جس سے یہ مجموعہ زیادہ مفید

بن جائے گا۔

سروری

اصول قانون ضمانت مسٹر بی۔ این۔ چوبے بی، اے ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ۔ قیمت عار۔
ملنے کا پتہ شمس المطابع بک ڈپو نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن۔

"قانون ضمانت" ملزمین کی مدافعت کا بہترین حربہ ہے۔ زبان اردو میں اس موضوع سے متعلق کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ ایک افسوسناک کمی تھی جس کو خوشی کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ایک جواں ہمت سپوت مسٹر چوبے نے پورا کرنے کا عزم کیا۔ زیر نظر کتاب انھی کی عرق ریزانہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو بڑی حد تک قانون ضمانت انگلیشیہ ضوابط فوجداری، قانون عدالت عالیہ، قانون آبکاری، قانون افیون و اشیائے منشی، قانون تحویل ملزمین، قانون صحرا، قواعد شکار، قانون کوتوالی اضلاع، قماربازی، انسداد بیرحمی برجانوران اور قانون بلدیہ فرخندہ بنیاد کا نچوڑ بھی ہے اور مرتب کے ذوق تحقیق کا معلومات آفریں مرقع بھی۔ علاوہ ازیں مجلس عالیہ عدالت۔ جوڈیشل کمیٹی اور برطانوی عدالتوں کے نظائر کی روشنی میں لایق مرتب نے نفس موضوع کی مناسب توجیہہ و توضیح کی ہے جس سے کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔ اس کے مفید مطلب ہونے کی نسبت نواب مرزا یار جنگ بہادر (جن کے نام نامی سے یہ کتاب معنون بھی کی گئی ہے) اپنی تقریظ میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

> "آئے دن ضمانت کی جس قدر درخواستیں عدالتوں میں پیش ہوتی رہتی ہیں اُن کے لحاظ سے قانون ضمانت کے صحیح اصولوں کا معلوم کرنا جج اور بار دونوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان اصولوں کے سمجھنے کے لیے مسٹر بی این چوبے نے جو مواد اس کتاب میں جمع کردیا ہے اس سے میری دانست میں ان ہر دو طبقوں کو بہت کچھ مدد ملے گی۔"

نیز معزز اراکین عدالت عالیہ اور وکلا اور بیرسٹر صاحبان نے بھی نہایت ہمت افزا آرا سے مرتب کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ایسی مفید اور پُر از معلومات کتاب کا قانون پیشہ اور وکلا کے پاس ہونا ازبس ضروری ہے اس لیے کہ ضرورت پر یہ کتاب اُن کو تلاش و جستجو کی زحمت سے

بجا کر کافی رہنمائی کر سکتی ہے۔ س م ح

سوال و جواب یہ کتاب بھی مسٹر چوبے کے فطری ذوق اور علمی شغف کی رہین منت ہے جس میں ۱۳۳۹ف تا ۱۳۴۲ف کے سوالات امتحان ال ال بی جامعہ عثمانیہ کے جوابات نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور بالخصوص دھرم شاستر، شرع محمدی، ضوابط دیوانی و فوجداری، قانون امانت مالگذاری، انتقال جائداد، اصول قانون اور تعزیرات آصفیہ سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ماخذ مستند ہیں اور حتیٰ الوسع کوشش کی گئی ہے کہ ماخذ کی اصل عبارت میں کسی قسم کا تصرف نہ ہونے پائے۔ مرتب کی یہ سعی بلاشبہ ہمت افزائی کی مستحق ہے کیونکہ امتحان کے قریب ایسے "حمائل ایڈیشن" کی افادیت ناقابل انکار ہے۔ کم از کم "ڈوبتے کے لیے تنکا" ضرور ہے۔ قیمت عاں۔ س م ح

شرح قانون آبکاری ریاست ابد مدت میں قانون آبکاری کا نفاذ ۱۳۱۲ف سے عمل میں آیا اور اس کو مشروط الامتحان بھی قرار دیا گیا اس لیے ضرورت تھی کہ اُس کی ایک جامع شرح لکھی جائے۔ چوبے صاحب نے اس طرف توجہ کی اور برطانوی ہند کے قوانین آبکاری اور مجلس عالیہ عدالت کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظائر کو اس ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے کہ فیصلہ کا ضروری جُز قلم انداز نہ ہو۔ سررشتہ آبکاری کی ضروری گشتیات جابجا درج کی گئی ہیں نیز وصول بقایا، مقدمات اور مصالحت وغیرہ کے طریقوں کی کافی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب عہدہ داران آبکاری، تعہدداران، دوکانداران، شرکائے امتحان اور وکلاء صاحبان کے لیے یکساں مفید ہے۔ مرتب کی انتھک سعی و کاوش کی ان حضرات کو قدر کرنی چاہیئے۔ قیمت عاں۔

مذکورۂ بالا تینوں کتابوں کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور قانون کی توجیہہ و توضیع کے لیے یہی اسلوب بیان موزوں تھا لیکن کتابت و طباعت ناقص ہے اور کاغذ بھی گھٹیا درجے کا استعمال کیا گیا ہیں توقع ہے کہ چوبے صاحب اشاعت ثانی میں ان امور کی جانب بھی توجہہ فرمائیں گے۔

س م ح

لیونارڈو گر ٹروڈ مترجمہ مولوی غلام حسن صاحب بی ایس سی ڈپ ایڈ معلم تعلیمات مدرسہ تعلیم المعلمین

گلبرگہ شریف۔ ملنے کے پتے مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی و مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

پستالوجی یورپ کے مشہور مصلحان تعلیم میں سے ہے۔ اس نے افسانے کی صورت میں اس نام سے جو معرکتہ الآرا کتاب فن تعلیم کے عملی پہلوؤں کے متعلق ۱۷۸۱ء میں جرمن زبان میں لکھی تھی وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ یورپ کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں اس کے کئی ترجمے کئے گئے۔ مولوی غلام حسن صاحب نے انگریزی کے شستہ ترجمے سے اس کو اردو میں منتقل کر کے نہ صرف معلمین و معلمات کے لیے ایک نہایت مفید کتاب مہیا کی ہے بلکہ اردو کے تعلیمی ادب میں ایک بیش قیمت کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ اردو ترجمہ نہایت صاف اور رواں ہے۔ طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔ کمسن بچوں کی تعلیم کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ ان کی عمدہ تعلیم و تربیت پر ہی قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اس کتاب میں بطور افسانے کے تعلیم و تربیت کے گوناگوں مسائل اس خوبی سے حل کئے گئے ہیں کہ اس کا مطالعہ تمام لکھے پڑھے والدین کے لیے ضروری ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ مائیں اس کے مطالعہ سے بہت زیادہ فایدہ اٹھا سکتی ہیں۔ مترجم کا طرز بیان اس قدر سلیس اور دلکش ہے کہ ایک مرتبہ کتاب شروع کرنے کے بعد آخر تک پڑھے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ س م

تمدن ہند میں دکن کا حصہ تالیف محمد عبداللہ چغتائی صاحب۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

یہ ایک مختصر سا مقالہ ہے جس میں چغتائی صاحب نے اجمالی طور پر ان تمام اہم امور کو بیان کیا ہے جن کا ذکر ہندوستان کی عام تہذیب و تمدن کی ترقی میں ریاست حیدرآباد کی تمدنی خصوصیات کے طور پر ناگزیر ہے۔ عہد حاضر میں ہندوستان کی ثقافتی (کلچرل) ترقی کی کوئی کتاب ان امور کے ذکر سے خالی نہیں ہوسکتی جو حیدرآباد کا حصہ ہیں۔ چغتائی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی اور دلکش انداز میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور مختصراً یہاں کی حسن کاری، فن کاری، علم و ادب، زبان اور دیگر اجزائے تمدن کو پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بہت وسیع ہے لیکن یہ مقالہ ایک خاکے کی حیثیت سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔

س م

مجلۂ طیلسانئین

۱۔ مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر مطابق بہمن، اردی بہشت، امرداد، آبان میں شائع ہوگا۔

۲۔ اس رسالہ میں طیلسانئین عثمانیہ کے علمی و ادبی مضامین، بلند پایہ نظمیں اور وہ تحقیقی مقالات بھی بالاقساط شائع ہونگے جو جامعہ عثمانیہ کی ام، اے اور ام ایس سی کی ڈگریوں کے لیے قبول کیے گئے ہیں۔ نیز انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی علمی سرگرمیوں کی روئداد بھی پیش کی جائیگی۔

۳۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت سے قابل اشاعت متصور نہ ہونگی۔

۴۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم (۱۲۵) صفحے ہوگی۔

۵۔ سالانہ چندہ پیشگی خریداران بلدہ حیدرآباد اور خریداران اضلاع سے ۱۲/ ہے بشمول محصول ٹپہ۔

۶۔ زر چندہ اور تمام مضامین نظم و نثر معتمد کے نام بھیجے جائیں اور دیگر امور کیلئے منتظم اعزازی سے مراسلت کی جائے۔

مطبوعات مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ

۱۔ اُردو ادب بیسویں صدی میں تالیف مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ایم اے

موجودہ صدی کے اُردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ .... قیمت ۱۲ار

۲۔ عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست تالیف

مولوی سید علی محسن صاحب ام، اے ری سرچ اسکالر (جامعہ عثمانیہ)۔ عادل شاہی ریاست کے دورِ تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ .... قیمت عاں

(ملنے کے پتے)

(۱) دفتر مجلس علمیہ گھانسی بازار حیدر آباد دکن۔

(۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ۔ "

(۳) بک اسٹال جامعہ عثمانیہ۔ "

(۴) مکتبہ علمیہ چار مینار۔ "

(۵) مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی

(۶) صدیق بک ڈپو لکھنو۔